اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے نظام معاشی کا مکمل خاکہ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی و معاشی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی ایسا نظام ہے جس نے سرمایہ و محنت کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے



تالیف

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

ترتیب جدید، تسہیل، تبویب، تخریج

پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

سابق استاذ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
سابق ممبر قومی اسمبلی



شیخ الہند اکیڈمی کراچی

0321-9297268

فہرست مضامین

بیت المال کے اخراجات ۲۷۶



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم الکتاب

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین، محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعھم بإحسان إلی یوم الدین.

''اسلام کا اقتصادی نظام'' کا نام آتے ہی انسان کا ذہن فوراً ان معاشی مسائل اور پریشانیوں کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے جنہوں نے اس ناتواں انسان کو روزِ اول سے ہی گھیرا ہوا ہے۔ جن کا حل اور علاج سوچتے اور کرتے اس کی زندگی گزر گئی، اور باقی گزر رہی ہے۔ مگر معاشی مسائل کی گتھی سلجھی نہیں مزید الجھی ضرور ہے یہ معاشی ناہمواریاں، دولت اور وسائلِ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، طبقاتی معاشی کشمکش، غربت اور امارت کا غیر فطرتی تفاوت وغیرہا کے حل اور دنیا کو پرامن جگہ بنانے کے لیے انسانی کاوش نے مثبت طرق (Positive Means) کے ساتھ ساتھ بارہا منفی ذرائع (Negative Ways) مثلاً لوٹ مار، جنگ و جدل اور نتیجۃً خونی انقلابات کا راستہ بھی اختیار کیا، مگر معاشی مسائل کی گھمبیر تا ہر بار پہلے سے زیادہ بھیانک صورت میں سامنے آئی۔ اور معاشی مسائل کے حل کی جدوجہد نے معاشی دہشت گردی کا روپ دھار لیا جس کی واضح مثال کارل مارکس (۱۸۱۸ء ـــــ ۱۸۸۳ء) کا نظریہ کمیونزم کی عملی شکل میں سامنے آئی جو اپنے غیر فطرتی وجود کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور اپنی موت مر گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام معاشی استحصال کا ایک ذریعہ تھا جس نے معاشی عدم مساوات، معاشی دست و برد، دولت اور ذرائع دولت کے ارتکاز، معاشی وسائل کے اکتناز، تجارتی اور پیداواری سرگرمیوں کے احتکار کی حوصلہ افزائی کی، طبقاتی کشمکش کو پروان چڑھایا، اور دنیا کو واضح طور پر امیر اور غریب دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ جہاں امیر ظالم، غریبوں کا ناحق خون کرنے والا، منافق اور معاشی ڈاکو ہو کر بھی قابلِ احترام و اکرام اور لائق وقار و اقتدار ہے، اور غریب اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود مظلوم و

مقہور اور محکوم و ذلیل ہے۔ لہذا طبقاتی نفرت (Class Hatred) کا بیج اگ کر تناور گھنا درخت بن گیا ہے۔ جو اپنی نحوست کے ساتھ پوری دنیا پر سایہ فگن ہے۔ غریب، کمزور اور محنت کش طبقہ کی معاشی مشکلات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور امیر طبقہ کی آسائشات تعیشات کا مقام لے چکی ہیں، معاشی ناہمواریوں کا یہ عالم کہ ایک طرف زرق برق قیمتی لباس اور دوسری طرف پیوند زدہ پیرہن، ایک طرف پر تعیش رنگا رنگ ماکولات و مشروبات اور دوسری طرف آتش شکم کی آنچ ٹھنڈی کرنے کا سامان تک میسر نہیں، ایک طرف جدید ترین ماڈل کی قیمتی گاڑیاں اور دوسری طرف فٹ پاتھ پر پیدل چلتے ہوئے بھی دھکے، ایک طرف یونین کونسل سے لے کر سینٹ (Senate) تک دولت مندوں کا حق نمائندگی اور انہی وڈیروں کا راج (Plutocracy) اور دوسری طرف انہی چنیدہ (Elected) وڈیروں کے ڈیروں میں غریب ووٹران (Voters) کی ذلت و رسوائی، ایک طرف اسلام آباد، لاہور، کراچی جیسے شہروں کے پوش علاقوں میں کئی کئی ایکڑ پر مشتمل کوٹھیاں اور بنگلے اور دوسری طرف غرباء کی آبادیوں (Slums) میں دس بارہ افراد کے کنبہ کا ایک چھوٹا سا مکان، جس کی چار دیواری میں سو سو خم، ایک طرف بنکوں میں پڑے فاضل سرمایہ کے مصرف (Consumption) کا وقت نہیں آتا، اور دوسری طرف جوان بیٹی کے لیے رشتہ نہیں ملتا کہ غریب والدین کے پاس اس غریب کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے روپیہ نہیں، اور تعلیم کے متوالے غریب لڑکے کے لیے فیس کی رقم نہیں۔ ایک طرف وڈیروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اراضی سینکڑوں مربعوں پر محیط اور دوسری طرف غریب کسان کو اپنے کنبہ کی کفالت کے لیے مزارعت پر بھی ٹکڑا زمین میسر نہیں۔ ایک طرف غریب کسانوں کی پیدا کردہ روئی سے سرمایہ دار کی ٹیکسٹائل ملز (Textile Mills) میں کپڑوں کے تھانوں کا انبار اور دوسری طرف اس غریب کی بیٹی کا دوپٹہ تار تار۔ ایک طرف وڈیروں کے گھر پر اناج اور نقد آور فصل کی پیداوار کا ڈھیر، اور دوسری طرف غریب کسان کے کھیت میں بھوک اور مفلسی اُگے۔ ستم ہے کہ غلہ اگانے والا غلہ کا محتاج ہے۔ روئی اگا کر ملوں کو

چلانے والا لباس کو ترسے، شاہرائیں بنانے والا شاہراہ پر اپنی ٹوٹی سائیکل چلانے یا آزادانہ پیدل چلنے کی آرزو بھی پوری نہ کر سکے۔

شاہرائیں اس واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان سے دیش کی جنتا سسک سسک کے مرے؟
زمین نے اس کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اس لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں؟
چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں؟

درحقیقت یہ ساری معاشی ناانصافیاں، معاشی استحصال، معاشی طبقاتی کشمکش، اور معاشی محرومیاں سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی ناجائز و نافرمانبر دار اولاد ہیں، جنہوں نے پوری دنیا کا معاشی فلاح کا خواب چکنا چور کر کے انسانوں کی غالب اکثریت (Overwhelming Majority) کو افلاس اور محتاجی کے منحوس چکر (Vicious Circle of Poverty and Need) میں پھنسا دیا ہے، جس سے نکلنے کا راستہ سرمایہ دارانہ نظام کے پاس نہیں ہے جس کا منہ بولتا ثبوت (Unequivocal Proof) موجودہ عالمی معاشی بحران ہے جس نے امریکہ ایسی نام نہاد سپر پاور کی معیشت کی بھی چولیں ہلا دی ہیں۔

"اسلام کا اقتصادی نظام" کی بنیاد ہی اللہ کریم کے رب (Provision Supplier) ہونے کے اعلان پر رکھی گئی، اللہ کریم نے اپنے پروردگار (Sustainer) ہونے کا اعلان اپنی نازل فرمودہ آخری کتاب قرآن کریم کی پہلی سورہ (Part) کی پہلی ہی آیت (Verse) میں یوں فرمایا:

﴿ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٢﴾﴾[1]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کریم کو زیبا ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

پھر اپنی ربوبیت کو پر امن زندگی عنایت کرنے کے اعلان کے ساتھ جوڑا ہے کہ روزی بھی ملے گی اور امن بھی۔ روزی کے حصول کے بدلے ذلت و رسوائی اور ظلم و ستم نہیں ہو گا، مگر شرط ایک ہی ہو گی اور وہ بھی بہت ہی سادہ اور آسان کہ اس کریم رزاق کو اپنا الٰہ حقیقی مان کر اس کی عبادت کرتے رہیئے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿فَلۡيَعۡبُدُواْ رَبَّ هَٰذَا ٱلۡبَيۡتِ ﴿٣﴾ ٱلَّذِيٓ أَطۡعَمَهُم مِّن جُوعٖ وَءَامَنَهُم مِّنۡ خَوۡفِۭ ﴿٤﴾﴾[2]

ترجمہ: بس ان (انسانوں) کو چاہیے کہ وہ اس گھر (بیت اللہ، خانہ کعبہ) کے مالک (اللہ کریم) کی عبادت کرتے رہیں، جس نے انہیں بھوک کے وقت روزی عنایت فرمائی اور خطرہ و ڈر کے وقت امن عطا فرمایا۔

انسانوں کو تلقین فرما دی کہ جو ان کی ضرورت سے زائد ہو وہ اپنے معاشی دکھوں کے مارے بھائیوں کو دے دیا کریں تاکہ وہ بھوک و محتاجی کا شکار ہو کر زندگی کی دوڑ میں ان (اغنیاء) سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَۖ قُلِ ٱلۡعَفۡوَۗ﴾[3]

ترجمہ: وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ سمجھا دیجئے جو (ان کی اپنی) ضرورت سے زائد ہو۔

---

(۱) سورہ الفاتحہ: آیت ۲

(۲) سورۃ ایلاف: (۱۰٤): ۳،٤

(۳) سورۃ البقرہ: (۲): ۲۱۹

گو بعض مفسرین نے اس حکم کو زکاۃ کی ادائیگی سے مشروط کیا ہے، مگر حکم کی روح زکاۃ کے علاوہ بھی محروم المعیشت (Destitutes) انسانوں کی کفالت کے لیے خرچ کرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔

غریبوں محتاجوں کی کفالت نہ کرنے والے اصحابِ ثروت کو سخت وعید بھی سنائی ہے۔ لیجئے پڑھیے:

الاغنیاء وکلائی، والفقراء عیالی فاذا بخل وکلائی علی عیالی اذقتھم وبالی ولا ابالی.

ترجمہ: ثروت والے (تقسیم مال اور محتاجوں پر خرچ کرنے میں) میرے وکیل (Agents) ہیں جبکہ فقراء میرے عیال (Family) ہیں۔ اگر یہ میرے وکلاء (یعنی امراء) میرے عیال (خاندان) پر خرچ کرنے میں کنجوسی سے کام لیں گے تو میں انہیں اپنا عذاب چکھاؤں گا پھر میں ان (مالداروں کے دکھوں) کی پرواہ بھی نہیں کروں گا۔

اسلام کے عادلانہ اور رحیمانہ نظام ربوبیت جسے اقتصادی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ کی عملی شکل (Practicle Form) اور ترویج (Introduction) اللہ کریم کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل (Verbal & Preactice) دونوں طریقوں سے کر کے دکھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نبی کریم ہیں جن کی فطرت کی اٹھان ہی معاشی دکھوں کے ماروں کی کفالت، مظلوموں کی داد رسی اور مشکلات میں پھنسے ہوؤں کو بچانے پر رکھی گئی۔ آئیے میرے ساتھ مل کر حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ شہادت (Testimony) پڑھ لیں جو آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی لانے والے فرشتہ جبرائیل امین علیہ السلام کے اچانک آنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچ کر وحی کی تلاوت کرانے کی وجہ سے اپنی زندگی کو خطرہ اور قوم قریش کے تمسخرانہ انکار کے ڈر کی وجہ سے پریشانی ہوئی اُسے زائل کرنے کے لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مربیانہ، رحیمانہ اور

کریمانہ خصوصیات کے بارے میں دی، جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں جبرائیل علیہ السلام کے پہلی وحی لانے پر گھبرا کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمبل اوڑھانے (زمّلونی، زمّلونی) کا ارشاد فرمایا اور گھبراہٹ سے افاقہ پر اپنی محرم راز باوفا، عاقلہ زوجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرمایا: مجھے اپنی زندگی کا خطرہ اور قوم سے رسوائی کا ڈر ہے۔ اس سادہ شعار خاتون رضی اللہ تعالیٰ عنہا ـــــ جس نے سوشلزم کا غیر معقول نعرہ سنا تھا نہ سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کا مطالعہ کیا تھا ـــــ نے عرض کیا:

كلا، ابشر، فوالله ما يخزيك الله أبدا، إنك لتصل الرحم، وتصدق الحديث، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق.(۱)

ترجمہ: ہرگز نہیں۔ خوش رہیے! اللہ عظیم وجلیل کی قسم! اللہ کریم آپ کو کبھی ہلکا نہیں کریں گے (نہ ہی کرنے دیں گے) کیونکہ آپ تو (وہ ستودہ صفات انسان ہیں جو) صلہ رحمی (رشتہ داروں کی کفالت) کرتے ہیں (بلا خوف وخطر) سچی بات کہتے ہیں، (محتاجوں، اپنے ہوں یا پرائے کی معاشی) ذمہ داری اٹھاتے ہیں، جس کا (یا جسے) کوئی کمانے والا نہ ہو اُسے کما کر دیتے (اور کھلاتے) ہیں (واقف اور اجنبی دونوں قسم کے) مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق (وانصاف) کے مواقع پر دستگیری فرماتے ہیں (بھلا ان کریمانہ صفات والے شخص کو قدر دان کریم اللہ کبھی ہلکا ہونے دے گا؟ ہرگز نہیں)۔

ذرا میرے ساتھ مل کر اُس وفا شعار زوجہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اپنے کریم النفس، علو المرتبت، غریبوں کے حامی، محتاجوں کے کارساز، صادق وامین خاوند صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے شہادت کو دوبارہ بلکہ بار بار پڑھیئے اور پھر بتائیے کہ فقراء

(۱) فی البخاری ومسلم، باب بدء الوحی

اور معاشی دکھوں کے ماروں کی مدد اور بحالی کا کونسا ذریعہ و وسیلہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ میں موجود نہ ہو؟ اور کریمانہ شان کا اندازہ کیجئے کہ یہ شہادت بقاعدہ منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کی آپ کی سیرت مطہرہ کے بارے میں ہے۔

آپ تھوڑا سا وقت نکالیں میں آپ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب (اللہ کریم قیامت کے روز ان سے آسانی کا معاملہ فرمائے) کی وہ شہادت بھی پڑھ کر سنادوں جو انہوں نے عرش کے کریم سلطان سے ابرِ رحمت کا سوال کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفارشی بنا کر بیت اللہ شریف کی دیوار کے سائے میں لا کھڑا کر نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر ابرِ رحمت کے کھل کر برسنے اور اہلِ مکہ مکرمہ کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بن جانے کے بعد خوش ہو کر ایک قصیدہ میں پیش کی، پڑھیئے ۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامی عصمة للارامل

ترجمہ: وہ روشن چہرے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کے وسیلہ سے باران رحمت کی درخواست کی جا سکتی ہے آپ یتیموں کے ملجا و ماوی، بیو گان کی عصمت وعفت کے پاسبان ہیں۔[1]

آئیے آخر میں آپ کو مصر کے شہرۂ آفاق شاعر احمد شوقی رحمہ اللہ (۱۸۶۸ ــــ ۱۹۳۲ء) کے مشہور قصیدہ ''الھمزیة النبویة'' کے دو اشعار سنادوں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے اسی معاشی پہلو پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالتے ہیں، چلیے سن لیجئے۔

انصفت اهل الفقر من اهل الغنی　　فکل فی حق الحیاة سواء

---

(۱) سیرۃ ابن هشام: ج ۱ شعر ابی طالب فی مفاداة خصومه

لــو أن إنســانا تخيـر ملــة   مــا اختــار و إلا دينــك الفقــراء

ترجمہ: (اے کریم النفس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ نے اہل ثروت سے انصاف کے ساتھ (نہ کہ کمیونزم کے خونی طریقہ سے) محتاجوں کو (ان کا حصہ) دلوایا، یوں تمام انسان (قطع نظر رنگ ونسل و مذہب کے) زندگی کے حق (معاش) میں برابر ہو گئے (لہذا) اگر انسانوں کو (اپنی مرضی اور پسند سے بھی کوئی) مسلک اپنانے کا اختیار دے دیا جاتا تو (معاشی دکھوں کے مارے) محتاج لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا دین پسند کرتے ہیں (کیونکہ اس میں انسانوں کو حقِ معیشت میں برابری اور انصاف کے ساتھ اغنیاء سے حصہ دلوانے کا وعدہ ہے)۔

"اسلام کا اقتصادی نظام" کے انہی کریمانہ، منصفانہ، جامع اور ہر دور میں قابلِ عمل پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے اسلام کے مخلص اور درد مند علماء نے کتب تصنیف کی ہیں، جن کی تعداد آج تک سینکڑوں سے تجاوز کرتی ہے۔ مگر ایک کتاب کو اردو زبان میں "اولین کوشش" کا مقام حاصل ہے، جو صرف اولین ہی نہیں، بہترین اور مفید ترین بھی ہے، جسے میں مرتب (Edit) کرنے کی سعادت پا رہا ہوں۔ یہ میرے کریم کا کرم ہے جو مجھ ایسے نالائق، گنہگار انسان سے بھی محض اپنی توفیق سے کوئی کام لے لیتا ہے "ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء" آئیے اس زندہ کتاب کے تعارف اور تحریر (Edit) کرنے کی وجوہ کی طرف۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہ مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی رحمہ اللہ (۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۱ء ــــ ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) کی "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے اس کتاب سے میرا تعارف اور تعلق ۱۹۶۹ء ــــ ۱۹۷۰ء کا ہے۔ جب میں ایم، اے اسلامیات کے ایک اختیاری پرچہ "اسلام کا معاشی نظام" کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ کتاب مجھے امیر مجلس تحفظ ختم نبوت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ نے اپنے مرکزی دفتر ملتان کی لائبریری سے لاہور لا کر دی تھی میں نے اس کتاب کا

مطالعہ اپنے ایم، اے کے امتحان کے لیے شروع کیا، مگر اس سے تعلق وہ بنا کہ زندگی بھر کا ساتھ بن گیا۔ میرے ایم، اے معاشیات، پھر ڈاکٹریٹ اسلامی معاشیات، پھر تدریس اسلامی معاشیات، تحقیق وتصنیف اسلامی معاشیات، غرض یہ کتاب ہر مقام و ہر منزل پر میری رہنما بن کر رہی اور الحمد للہ آج بھی ہے اور جب تک حیات مستعار کا سلسلہ روز و شب باقی ہے یہ کتاب میری رہنما اور ساتھی ہے بلکہ سچی بات ہے کہ محسن ہے۔ میں نے اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق جو کچھ جانا اور لکھا اس کی اساس یہی کتاب ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۷ء اور مصنف رحمہ اللہ کی زندگی میں چوتھا اور آخری ایڈیشن ۱۳۷۰ھ (مطابق ۱۹۵۱ء) میں شائع ہوا۔ مصنف رحمہ اللہ کی وفات کے بعد پاک وہند سے اس کے متواتر اور متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے مگر وہ ۱۹۵۱ء والے ایڈیشن کی نقل ہیں اگر نقل بھی بمطابق اصل ــــــ طبع ثالث جو مصنف رحمہ اللہ کی نگرانی میں ۱۳۶۵ھ (مطابق ۱۹۴۳ء) شائع ہوا ــــــ کی جاتی تو پھر بھی اس "زندہ کتاب" اور اس کے قارئین کرام کے ساتھ انصاف ہوتا اور علم کی خدمت ہوتی مگر پبلشرز حضرات ایسا کرنے میں ناکام رہے۔

اس محسن کتاب کے بارے میں میری ذاتی رائے ــــــ جو محض معتقدانہ نہیں بلکہ مُحقّقانہ اور غیر جانبدارانہ ہے ــــــ یہ ہے کہ "اسلام کے اقتصادی نظام" پر ــــــ نظریہ اور فکر کی حد تک ــــــ اس سے بہتر کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اردو، عربی اور انگلش تینوں زبانوں کے اس موضوع پر لٹریچر میں اس جیسی کتاب مجھے نہیں ملی۔ میں نے اس موضوع پر مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ، جناب ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ، سید قطب رحمہ اللہ، علامہ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر انس زرقاء، باقر الصدر، شیخ ابوزہراء کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ ان علماء کی بلند پایہ تصانیف اور ان کے علمی مقام سے ہرگز انکار نہیں مگر مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

رحمہ اللہ نے جس طرح ''اسلام کا اقتصادی نظام'' لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے نہیں کہ یہ کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' پر نقش اولین کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے فاضل مصنف کو اس قلمی اور علمی جہاد میں قائد ہونے کا شرف حاصل ہے، گو یہ بھی وجہ انتخاب و پسندیدگی کا بہت بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور صرف اس لیے بھی نہیں کہ اس کتاب کا مصنف علماء کرام کے اس صدق و وفا کا ایک ہمراہی تھا جس نے خاک و خون کے سمندر عبور کر کے اللہ کریم کے دین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی طریقوں کو زندہ رکھا، جو خود تو قربان گاہ کے گھاٹ اتر گئے مگر پرچم اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دیا اگرچہ یہ بھی انتخاب کی بڑی وجہ بن سکتی ہے کیونکہ ایسے قافلہ کا کوئی اہل قلم لالچ، خیانت اور احساسِ کمتری (Inferiority Complexe) کا شکار ہو کر اسلامی تعلیمات کی غلط تعبیر و تشریح نہیں کرے گا جو اسلام کے کسی موضوع پر کسی کتاب کی اولین خوبی ہونی چاہیے۔ اور اس لیے بھی نہیں کہ اس کا مصنف ایک متوسط درجہ کا انسان تھا جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے خوب خوب کام لے کر اللہ کریم کے فضل سے سیاست، قیادت، اور ہر علم و فضل میں وہ مقام پا لیا جس کے عشر عشیر کو بھی نام نہاد ''رواجی بڑے'' ترستے ہیں وہ ملتِ اسلامیانِ ہند کا نامور سیاسی قائد، پارلیمنٹ میں ان کا نمائندہ پرجوش خطیب، ماہر و تجربہ کار معلم، مشّاق مصنف اور صاحب قلم تھا۔

بلکہ اس لیے کہ:

❶ اس کتاب کا مصنف رحمہ اللہ مستند عالم دین محدث، مفسر، مؤرخ، مصنف، عربی، اردو اور فارسی زبانوں کا ماہر، معیشت، معاشرت اور سیاست کے گرم و سرد چشیدہ، مسلمانان عالم اور بالخصوص مسلمانان برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی معاشی حالتِ زار کے رازدان، انگریز کے سرمایہ دارانہ تسلط و جبر اور اس کے رد عمل میں انسانوں کے معاشی دکھوں کی کوکھ سے جنم لینے والا غیر فطرتی نظام سوشلزم اور کمیونزم (Socialism & Communism) کے چشم دید گواہ اور اسلام کے رحیمانہ اور

عادلانہ نظام معیشت سے خود آگاہ، تجربہ کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنے والا جامع انسان تھا۔ جس کا سیال (Flucid) قلم "اسلام کا اقتصادی نظام" کی بہتر سے بہتر تعبیر و تشریح کر گیا۔

❷ یہ کتاب چونکہ "اسلام کے اقتصادی نظام" پر نقش اولین ہے، لہذا کسی کی نقل نہیں بلکہ اصل (Original) ہے جسے اسلام کے بنیادی مصادر اور امہات الکتب کے منبع صافی سے تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب بنیادی مصادر (Original Sources) کے حوالہ جات (References) سے بھری نظر آتی ہے۔ جس کی مثال اس موضوع پر کسی اور کتاب میں نہیں ملتی۔

❸ مصنف رحمہ اللہ کی جس ماحول میں تربیت ہوئی، جن صلحاء کے زیر سایہ وہ پروان چڑھے، جن راسخ العقیدہ علماء عظام سے انہوں نے سیکھا، پڑھا اور جس قافلہ کے وہ رفیق سفر بنے، اس نے ان کے مزاج میں اسلام کی حقانیت، عملیت پر، ہر ماحول اور ہر معاشرہ کے معاشی مسائل حل کرنے کی صلاحیت، اور اس کے وحی الٰہی ہونے پر مکمل ایمان، اعتماد اور یقین پیدا کر دیا تھا، لہذا انہوں نے اسلام کے اقتصادی نظام پر قلم اٹھایا تو بغیر کسی تردد و شک، بلا کسی ذہنی مرعوبیت و تحفظ (Reservation) کے لکھا جس کی مثال اس موضوع پر لکھنے والے کسی اور مصنف کے ہاں کم ہی ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمہ قسم کے علمی تعصب، سیاسی بُعد اور مسلکانہ تنگ نظری کے باوجود پاکستان و ہندوستان کی تمام جامعات میں "اسلام کا معاشی نظام" کے اختیاری مضمون خواہ وہ ایم اے معاشیات کا ہو یا ایم اے اسلامیات کا دونوں کے لیے اس زندہ کتاب کی سفارش کی جاتی ہے۔ اور میری مخلصانہ رائے ہے کہ اسلامی معاشیات کی بنیادی سوجھ بوجھ (Basic Understanding) سے لے کر اعلیٰ درجہ تک تحقیق کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ نہایت ضروری ہو گا۔ اس کی یہی خصوصیت اسے زندہ کتابوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مخلص اہل علم مجھے اصرار کے ساتھ مشورہ دیتے رہے کہ اس کتاب کو

اگر جدید قالب دیا جائے تو اسلامی علوم (Islamic Lores) کی بڑی خدمت اور اللہ کریم کی رضا کا مؤثر ذریعہ ہو گا اسی اور بالخصوص مؤخر الذکر "مؤثر ذریعہ" کے لیے میں نے اس عظیم کتاب کی تجدید کا ارادہ کیا۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی علمی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا —— جدید عربی علماء و مصنفین کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا —— کہ اردو زبان میں اسلام کے معاشی نظام پر غالباً یہ کتاب اولین کوشش کا درجہ رکھتی ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سی مفید کتب منصہ شہود پر آئی ہیں مگر اولیت کا سہرا کتاب کے مصنف کے سر ہے جس کا ذکر مصنف رحمہ اللہ نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اگرچہ علماء اسلام اور فقہاء کرام نے اسلام کے معاشی نظام پر گرانقدر تصانیف چھوڑی ہیں مثلاً نظام محصولات، سرکاری خزانہ، ریاست کے مصارف اور آمدن پر "کتاب الخراج" سے نام سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ (۱۱۳ھ —— ۱۸۲ھ) اور یحییٰ بن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ) کی تصانیف، مالیاتی پالیسی، بین الاقوامی تجارت اور معاشی تعلقات پر "کتاب الاموال" کے عنوان سے حمید بن زنجویہ رحمہ اللہ اور ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ (م ۲۲۴ھ) کی نگارشات اور تجارتی کاروبار، قرض اور دیگر معاشی سرگرمیوں کے لیے "الاحکام السلطانیہ" کے نام سے ابو یعلی محمد بن حسین الفراء (م ۴۵۸ھ) اور علی بن حبیب الماوردی رحمہ اللہ کی کتب نہایت اہم ہیں، علاوہ ازیں فقہاء کرام نے اپنی کتب فقہ میں "معاملات مالیہ"، زکاۃ، نفقات وغیرہا کے عنوانات سے اسلامی معاشیات پر بہت بڑا علمی ذخیرہ مرتب کیا ہے۔ مگر "اسلام کا اقتصادی نظام" کے عنوان سے کوئی مستقل کتاب ہمارے اسلاف (Forefathers) نے نہیں لکھی، غالباً انہوں نے رزق، معاش کا کفیل اللہ کریم کو مان کر معاش کے موضوع کو چھیڑنا پسند نہیں کیا کہ یہ اس رزاق کریم کا معاملہ ہے البتہ اپنی ذمہ داری اشاعتِ اسلام جان کر وہ اپنے تمام ممکنہ وسائل اور بہترین صلاحیتوں کے ساتھ اس میں لگے رہے، مگر جب مسلمانوں نے اپنا اصل کام چھوڑ دیا

اور فکر معاش کو اوڑھنا بچھونا بنالیا اور غیر مسلموں کے درمیان بلکہ اُن کے تسلط میں رہنے پر مجبور ہوئے تو دردِ دل والے علماء اسلام نے اُن کی رہنمائی کے لیے اسلام کے معاشی نظام پر تصنیف و تالیف کا کام کیا اور یہ کتاب اس مخلصانہ کاوش کا ثمرہ ہے۔

مجھ پر اس کتاب کا بڑا احسان ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ لہذا اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے میں نے اس کتاب کو نئے سرے سے مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسا کرنے میں میرے سامنے چند وجوہ اور مقاصد تھے۔

❶ اس زندہ کتاب کی عمر تقریباً ایک صدی پر محیط ہے، گو اس کی علمی اہمیت و افادیت کم نہیں ہوئی مگر زمانہ کی کہنگی، گردش اور اس کے بدلتے مطالبات، علمی تعصب، اپنوں کی عدم توجہی اور بیگانوں کی مؤثر مخالفت نے اسے گہنا دیا ہے، ضرورت ہے کہ اس مفید کتاب کا احیاء کیا جائے۔

❷ کتاب کی زبان ۷۵ سال پرانی ہے، عمرانیات کا اصول کہ ہر دور کے لیے اپنی زبان اور نظریہ ہوتا ہے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کتاب کی زبان کو جدید بنایا جائے۔ مگر میں اس اصول پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کتاب کا نظریہ "اسلام کا اقتصادی نظام" ابدی ہے جس کی تشریح اور تطبیق (Explaination & Implementaition) میں تبدیلی اور اختلاف کی گنجائش ہے مگر بنیاد (Base) پر نہیں، جبکہ یہ کتاب تو بنیادی تعلیمات (Basic Teachings) پر ہی ہے، رہا مسئلہ زبان کا تو میں کتاب کی اصل زبان کو چھیڑ نہیں سکتا البتہ جہاں ضرورت محسوس کی گئی قوسین (Brackets) کے اندر متبادل انگریزی لفظ یا ترجمہ لکھ دیا ہے۔

❸ مصنف رحمہ اللہ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہہ اور مؤرخ تھے انہوں نے کتاب میں فقیہانہ، محدثانہ اور مفسرانہ زبان اور مصطلحات و رموز (Terminologies & Nomenclatures) استعمال کی ہیں۔ جو عام گریجویٹ (Graduate) کو بھی نامانوس (Uunfamilar) لگتی ہیں، لہذا میں نے کوشش کی ہے کہ ایسے تمام اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی میں کرتے جاؤں۔

اس طرح ترجمہ کی اہمیت کا احساس حضرت مصنف رحمہ اللہ کو بھی تھا انہوں نے بعض مقامات پر معاشی اصطلاحات اور معیشت دانوں کے ناموں کو انگلش میں لکھا ہے، اگرچہ ان کی کتابت (Composing) اکثر غلط ہے، میں نے اللہ کریم کی بخشی ہوئی توفیق سے انہیں درست کرنے کی پوری سعی کی ہے۔

❹ بعض مقامات پر متن (Text) کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے مثلاً کئی احادیث بغیر راوی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام کے ہیں، حدیث کے متن میں راوی کا نام اور ہے اردو ترجمہ میں اور ہے، ترجمہ اور عربی متن میں سہو ہو گیا ہے، عربی متن بغیر ترقیم (Punctuation) کے عدم سلیقگی کی شکایت کرتا نظر آتا ہے غالباً یہ سارے کا سارا کمال مصحح (Proof Reader) کا ہے، مگر الزام بے گناہ مصنف پر ہی آتا ہے، اس اہم کتاب کو اس نکتہ نظر سے بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ بعض مقامات پر عجلت اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، مثلاً حصہ دوم کے معاشی مضامین وغیرہ۔ ایسے مقامات پر حاشیہ میں اضافہ درج کر دیا گیا ہے۔

❺ کتاب کے حوالہ جات کو مسلمہ مروجہ بین الاقوامی معیار پر لانے کی ضرورت غالباً تمام ضرورتوں سے اہم ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے اس دور کے رواج کے مطابق یا قارئین کرام کو بھی علوم اسلامیہ کا واقف خیال کر کے حوالہ جات کو اکثر و بیشتر مقامات پر محض اشارہ تک محدود رکھا ہے۔ مثلاً بخاری شریف سے نقل کردہ روایت میں انہوں نے صرف ”رواہ بخاری“ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) لکھا ہے جبکہ معیاری طریقہ مطالبہ کرتا ہے کہ بخاری شریف کے مصنف رحمہ اللہ کا پورا نام (ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری) پھر بخاری کی جلد پھر اس کی کتاب، پھر باب اور پھر حدیث کا حوالہ درج کیا جائے، مگر حضرت مصنف رحمہ اللہ نے غالباً اپنی پوری کتاب میں اس کا التزام نہیں فرمایا۔ اس پہلو کو معیاری بنانے کے لیے حوالہ جات کی تخریج (Docomentation) کا نہایت کٹھن کام مکمل کیا گیا ہے تمام کتب اصلیہ اور مصادر (Original Books & Sourses) کو تلاش کر کے مصنف رحمہ اللہ کے حوالہ

جات کا اصل کتب کی عبارات سے موازنہ کر کے جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اصلاح کر دی گئی ہے۔ بعض کتب مثلاً "اشہر مشاہیر الاسلام" مجھے تلاش کے باوجود نہیں مل سکی مگر جن جن مصادر (مثلاً طبری، کتاب الخراج، البدایۃ والنہایۃ وغیرہا) سے نہ ملنے والی کتاب میں حوالہ جات لیے گئے، اُن سے حوالہ جات نقل کر کے تکمیل کر لی گئی۔

❻ بعض مقامات پر کتاب کے مصنف کا نام ہے مگر کتاب کا نام نہیں مثلاً ایک مقام پر "ابن متین رحمہ اللہ" کا قول درج ہے مگر کتاب وغیرہ کا ذکر نہیں، ایک کتاب "اشہر مشاہیر الاسلام" کے کئی حوالہ جات درج کیے گئے ہیں مگر مصنف رحمہ اللہ کا کہیں ذکر نہیں، اس طرح کا معاملہ کتاب "سعیدیات" کا ہے اس کے حوالہ جات کئی مقامات پر دیئے گئے ہیں مگر مصنف رحمہ اللہ کا نام نہیں لکھا، نہ کتاب کا مطبع اور سن طباعت کا ذکر ہے۔ اسی طرح کا سلوک "مختار الکونین" کے ساتھ کیا گیا ہے۔

❼ یہ ایک معتدل ضخامت کی کتاب ہے مگر حضرت مصنف رحمہ اللہ نے مواد کی ابواب بندی (Classification) نہیں کی، جس سے مواد کی ترتیب و تقسیم مزید بہتر ہو سکتی تھی۔ میں نے اس بلند مرتبہ کتاب کو ابواب میں تقسیم کرنے کی ضرورت کو سمجھا ہے، لہٰذا چودہ (۱۴) چھوٹے بڑے ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ان کے عنوانات مقرر کیے ہیں۔

❽ کتاب میں جن محدثین، مفسرین، فقہاء، معیشت دانوں اور دیگر عظماء امت مثلاً صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسماء گرامی آئے ہیں ان کا مختصر تعارفی خاکہ حاشیہ میں درج کیا گیا ہے البتہ جن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے عام اہلِ علم واقف ہیں مثلاً خلفاء اَربعۃ ــــــ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ــــــ کے حالات درج نہیں کیے۔ بعض ایسے حضرات کے اسماء گرامی بھی ہیں جن کے حالات تحقیق نہیں ہو سکے، وہ رہ

گئے ہیں البتہ آئمہ حدیث ـــــ مؤلفین صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کے مؤلفین جن کا نام کتاب میں آیا ہے ـــــ کے تعارف کے لیے کتاب کے آخر میں ایک ''ضمیمہ'' درج کر دیا ہے علاوہ ازیں، ایک دوسرا ''ضمیمہ'' مختلف اموالِ زکاۃ کے نصاب پر اور ایک تیسرا ''ضمیمہ'' اسلامی اوزان و پیمانے کے عنوان سے درج کیا ہے۔

❾ کتاب کے متن میں دو تین مقامات پر معمولی اضافہ بھی کیا گیا ہے، اُسے حضرت مصنف رحمہ اللہ کے متن سے ممیز کرنے کے لئے قوسین (Brackets) کے اندر لایا گیا ہے۔

ان تمام مقاصد حسنہ کی تکمیل کے لیے اور اس علمی ذخیرہ کو سہل بنانے کے لیے چار کام کیے گئے ہیں۔

(الف) مواد کی تبویب و تہذیب (Classification & Edification)

(ب) ترتیب و تخریج (Editing & Doucmentaiton)

(ج) ترمیم و ترقیم (Modification & Punctuation)

(د) ترجمہ (Translation)

مصنف رحمہ اللہ نے مختلف معاشی موضوعات پر مسلم معیشت دانوں اور مفکرین مثلاً امام ابو یوسف، شاہ ولی اللہ دہلوی، امام ابن تیمیہ، امام غزالی، امام رازی، حافظ ابن قیم جوزیہ، امام ابن حزم اندلسی رحمہم اللہ کے طویل اقتباسات نقل کیے، جن سے معاشیات کے خشک موضوع کو تھکا دینے والا بننے کا خطرہ تھا۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان طویل اقتباسات کو ضمنی عنوانات (Sub Headings) میں تقسیم کر کے اکتاہٹ اور الجھن کے احساس کو کم کیا جائے۔

تخریج حوالہ جات (Documentation) کے لیے مجھے صبر آزما اور طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ آج کل میرا اکثر وقت اپنے گاؤں میں اپنے حلقہ کے عوام میں رہ کر گزرا ہے جہاں تحقیقی کام کرنے کا ماحول ہے نہ لائبریری کی سہولیات، نہ اہل علم و فضل کی مشاورت، نہ علمی خدمت کی حوصلہ افزائی۔ مگر مجھے جہاں کسی کتاب یا حوالہ کا

پتہ چلا وہاں کا سفر اختیار کیا۔ اللہ کریم کی رحمت ہو مولانا جلیل احمد اخون صاحب شیخ الحدیث و مہتمم جامع العلوم بہاولنگر پر جنہوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے مجھے استفادہ کا پورا پورا موقع عنایت فرمایا، جناب فیاض احمد رانجھا لائبریرین اور سید نصیب شاہ حسن زئی (دونوں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے منسلک ہیں) کا شکر گزار ہوں جنہوں نے حوالہ جات کی تلاش میں میرا تعاون کیا۔ اسی طرح دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے نگران حافظ سعد اللہ صاحب نے لائبریری کی کتب تک میری رسائی کو آسان بنایا۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بہاولنگر کی لائبریری کے انچارج اور عملہ نے بھی مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں اللہ کریم انہیں اپنے اجر وثواب سے نوازے۔ (آمین)

آخر میں میں اپنے عظیم و جلیل و حلیم و کریم پروردگار کا سائل ہوں کہ وہ کریم ذات محض اپنا کرم و فضل فرما کر میری اس حقیر خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کی قدر دانی کے طور پر مجھے مزید کی توفیق سے نوازے۔ اور میری حیات مستعار کے جو دن اور لمحات باقی ہیں انہیں اپنے دین کی سربلندی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی بھلائی اور اللہ کریم کے بندوں کی خدمت کے لیے قبول کرے۔

"ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم" (آمین)

ع با کریماں کارہا دشوار نیست

واسال الله جلت عظمته ان يمن علينا بالقبول والتوفيق والسداد، والنجاح في اعمال الدنيا والآخرة، انه سميع مجيب الدعا. رب صل وسلم وبارك على سيدنا محمد وعلى اله وصحبه واتباعه واحبابه الى يوم الدين. والحمد لله رب العالمين.

اسلام کا ناکارہ خادم
نور محمد غفاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

دیباچہ طبع اول

بعد حمد و صلوٰۃ، موجودہ زمانہ مادیت کی ترقی کا زمانہ ہے، یعنی اس زمانے میں روحانی (مذہبی) جذبات سرد پڑ رہے ہیں اور لادینی خیالات آہستہ آہستہ ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں، ایسے زمانہ میں مذہب کے نام سے کسی چیز کا پیش کرنا خصوصاً اس کے نام سے کسی ''اقتصادی نظام'' کی ہمہ گیری کا دعویٰ کرنا اور اس کو محنت و سرمایہ کی موجودہ کشاکش کا بہترین عمل بتانا بہت بڑی جرأت اور حیرت انگیز جسارت سمجھا جائے گا، مگر قدرت نے جنہیں چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے اور جن کو مشکوٰۃِ نبوت کے فیضان سے حصہ وافر ملا ہے وہ بحمد اللہ آج بھی اس مادی ترقی کے مسموم اثرات یعنی مذہب سے بے اعتنائی برتنے اس کی تعلیمات سے تمسخر کرنے اور اس کو نظر حقارت سے دیکھنے کو ''ذہنی غلامی'' اور ''دماغی پستی'' یقین کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے موجودہ انقلابی ہنگاموں میں بھی صحیح راہ وہی ہے جو اسلام کی ہمہ رس دعوت انقلاب نے ہم کو بتائی ہے اور امن عالم کے لیے آج بھی یہی نسخہ ''نسخۂ کیمیا'' ہے اور بس!

تاہم یہ قول چونکہ قول کی حد تک صرف ایک مقلدانہ خوش اعتقادی پر محمول کیا جاتا ہے، بنابریں ضرورت تھی کہ اقتصادی ہلچل اور یورپین نظریوں کی کورانہ تقلید اور اتباع کے اس دور میں جرأت و ہمت اور صداقت و اعتدال کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی نقشہ پیش کیا جائے تاکہ انصاف پسند اور حق نگاہ اصحاب کو غور کرنے کا موقع ملے کہ دنیا کے موجودہ نظامہائے اقتصادی میں اقتصادی مشکلوں کے حل کے لیے کون سی راہ مفید، خس و خاشاک سے پاک اور قابلِ عمل ہے۔

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمَٰتُ وَالنُّورُ﴾ (۱)

ترجمہ: کہہ دیجیے کیا نابینا و بینا مساوی ہو سکتے ہیں اور کیا تاریکی اور روشنی برابر ہیں؟

نیز میری یہ "صدا" ان درد مند انسانوں کے لیے ہے جو غریبوں، مفلسوں اور عام بد حال انسانوں کی فاقہ مستیوں اور ان کے مقابلہ میں خود غرض، عیش پسند، متکبر و مغرور اور قارونی خصلتوں سے متصف سرمایہ داروں کو دیکھتے اور اس خود ساختہ اور غیر فطری تفاوت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو حیرت و اضطراب سے پکار اٹھتے ہیں کہ سوسائٹی کا یہ بے رحمانہ طبقاتی نظام کیا خدا ہی نے اپنے بندوں کے درمیان قائم کر دیا ہے، یا چند انسان نما درندوں نے محض جبر و قہر سے سوسائٹی کا یہ نقشہ تیار کر کے اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنی اغراض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے، اور پھر اپنی نادانی و بے علمی سے کبھی سوشلزم (Socialism) و کمیونزم (Communism) کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور کبھی نیشنلزم (Nationalism) کی پناہ لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ اس عذاب سے نجات کی صرف یہی راہیں ہیں۔ میری یہ کتاب ایسے زخمی دلوں کے لیے مرہم اور ایسے مصیبت زدہ قلوب کے لیے آبِ حیات ہے، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں مدارج معیشت (Economic Gradations) کا فرق اسی حد تک جائز اور فطری ہے کہ کسی حال میں بھی "اجتماعی زندگی" انفرادیت کے تیشہ سے گھائل نہ ہونے پائے اور عوام کی فلاح و بہبود کسی صورت میں بھی چند افراد کی اغراض پر قربان ہو کر نہ رہ جائے۔

رزق کی وسعت و تنگی کا دامن بلاشبہ خالقِ کردگار کے ید قدرت کی گرفت میں ہے لیکن اسی کے قولِ فیصل (قرآن عزیز) نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ دنیا کے اربابِ

---

(۱) سورۃ الرعد (۱۳):۱۶

دولت کی دولت کا راز اجتماعی مفاد ہی سے وابستہ ہے اور کارزار ہستی میں کسی کا فاقہ و مستی اور تنگدستی سے مجبور و مقہور رہنا خود اس نظام کا ''ناقابل معافی'' جرم ہے جس میں وہ آباد ہے اور ایسے نظام کا پہلی فرصت میں تباہ ہو جانا ضروری ہے، لہٰذا فرعون سامان اور فاقہ کش دو طبقوں میں انسانوں کی تقسیم کر کے جو کوئی اس ظالمانہ نظام کی نسبت خدا کی طرف کرتا ہے شاید وہ اس کے اس ظلم شکن اعلان اور پاداشِ عمل کے قانون سے ناآشنا اور بے خبر ہے۔

﴿ظَهَرَ ٱلْفَسَادُ فِى ٱلْبَرِّ وَٱلْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِى ٱلنَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ ٱلَّذِى عَمِلُوا۟ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾﴾[۱]

ترجمہ: خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے ان کو اپنے کرتوں کا مزہ کچھ چکھنا چاہیے تاکہ وہ باز آجائیں۔

بہرحال میری اس نگارش میں نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو دستِ غیب کا کوئی نسخہ ہاتھ آسکتا ہے اور نہ ان مذہب نما انسانوں کے لیے کوئی پیغامِ جانفزاء دستیاب ہو سکتا ہے جن کے نزدیک دنیا کے یہ موجودہ ظالمانہ نظام ہی خدا کی مرضی اور اس کا منشاء ہیں۔

میری یہ محنت صرف ان ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے ہے جو موجودہ ظالمانہ نظام کی دستبرد سے مایوس ہو کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اور کسی عادلانہ نظام کے بروئے کار آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور میری یہ پکار مذہب سے ناآشنا اور یورپ کے انقلاب سے مرعوب ان نوجوانوں کے لیے ہے جو ''الحاد'' کے جھوٹے مگر چمکتے ہوئے نگینوں کو جوہر و گوہر جانتے اور دنیا کے اس ظالمانہ کردار کا ردِ عمل کبھی ہیگل[۲] اور کارل مارکس[۱] کے فلسفہ سوشلزم اور کمیونزم میں سمجھتے ہیں اور کبھی نیشنلزم اور

---

(۱) سورۃ الروم (۳۰): ۴۱

(۲) ہیگل، جورج ولہلم فیڈرک (Hegel, Georg Wilhelm Friedrick) مشہور جرمن فلسفی ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوئے ۱۸۳۱ء میں وفات پائی۔ منطق جدلی ہیگلی (Hegelian Theory of Dialectical Process) کے بانی ہیں۔ جس

یورپ کی ڈیمو کریسی (جمہوریت) کو کعبۂ مقصود یقین کرنے لگتے ہیں۔

وہ دیکھیں اور غور وانصاف کی راہ سے دیکھیں کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے بتائے اور سکھائے ہوئے نظام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ظالمانہ نظام کے خلاف محنت و سرمایہ کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے نجات دلاتا ہے اور جس سے انسانوں کی آزادی اور عام خوش حالی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔

﴿قَدْ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ يَهْدِى بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾﴾ [۲]

ترجمہ: اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی اور ایسی کتاب نازل ہو چکی جو اپنی ہدایات میں نہایت روشن کتاب ہے خدا نے اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو ہوائے نفس کی جگہ خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں، سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے یعنی اپنے مقررہ قانون کے بموجب انہیں تاریکیوں سے نکالتا روشنی میں لاتا اور کامیابی وسعادت کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

میری اس پیشکش میں بھٹکے ہوئے انسانوں کے لیے تسکین کا سامان اور ان کی حیات اجتماعی کے لیے روح پرور پیغام ہے بشرطیکہ ان کو حق کی تلاش ہو اور ان کا دل

کی رو سے کسی نظریہ نظام کی بقاء یا رواج پذیری صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اس کے چاہنے والے نہ چاہنے والوں سے لڑنے میں طاقت ور ہوں کہ اپنے نظام کو رواج دینے کے لیے پہلے نظام کے ماننے والوں سے لڑ کر انہیں شکست دیں اور اپنی پسند کا نظام جاری کریں۔

(۱) کارل ماکس (Karl Marx) کا تعارف باب (۱) کے حاشیہ میں آرہا ہے۔

(۲) سورۃ المائدہ (۵): ۱۵، ۱۶

خدا اور اس کی بتائی ہوئی راہ ہدایت اور روشن کیے ہوئے آفتاب رسالت سے باغی اور جان بوجھ کر نافرمانی و سرکشی کے لیے جری و بے باک نہ ہو۔

﴿وما اسئلکم عَلَیهِ مِنْ أجرٍ انّ أجرِی الا علی اللّٰہ﴾ (۱)

ترجمہ: میں تم سے اس پر اجرت کا خواہش مند نہیں ہوں، میری (اس خدمت کی) اُجرت صرف اللہ کے پاس ہے۔

اس تصنیف کے متعلق "مقصد کی وضاحت کے بعد" اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں مخلصانہ گزارش ہے کہ براہ کرم وہ میری اس محنت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا شکار نہ بنائیں اور تنقید کرتے وقت اسی حیثیت سے نظر ڈالیں جس کے لیے وہ معرضِ تحریر میں آئی ہے۔ اہلِ علم حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ "اسلام کے اقتصادی نظام" کا یہ نقشہ موجودہ اقتصادی نظریوں اور ان کے پروگراموں کی طرح کسی کتاب کی صورت میں مدون و مرتب نہیں ہے اور نہ اس کے نظام عمل کا کوئی خاکہ اس جدید طرز و طریق پر اب تک شائع ہوا ہے بلکہ یہ اسلام کے بتائے ہوئے اصول اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی اس عملی حیات کے نظامِ عمل سے ماخوذ ہے جو زمانۂ نبوت اور دورِ خلافت میں بروئے کار آئے اور جس کو دنیا کے تمام اقتصادی و سیاسی نظامہائے عمل کے مقابلہ میں مساوات، امن و اطمینان اور عام رفاہیت کے پیشِ نظر تاریخی برتری حاصل ہے۔

تاہم اس کی تفصیل و تشریح اور ترتیب و جمع میں ایک خاص طرزِ نگارش کی وجہ سے جو اسلامی لٹریچر میں اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک نئے انداز کا حامل ہے۔ میری یہ سعی و کاوش بہت ممکن ہے کہ خامیوں اور لغزشوں سے خالی نہ ہو اور جو مطالب کہ اپنی توضیحات میں ضخیم جلدوں اور دقیق نکتہ سنجیوں کے محتاج ہیں میری لغزشِ

(۱) سورۃ الشعراء (۶۲): ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰

قلم کی وجہ سے وہ صحیح طور پر ادا نہ ہو سکے ہوں۔

اس لیے یہ بھی التماس ہے کہ مجھ کو ہدفِ ملامت بنانے کی بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے، خدا نے چاہا تو میں دوسرے ایڈیشن میں اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔

خادم ملت ـــــ محمد حفظ الرحمٰن

۱۸ر رجب المرجب ۱۳۵۸ھ

ـــــ☆☆☆ـــــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُخن گفتنی

دیباچہ طبع ثانی

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ، اما بعد!

مصنف نے جب "اسلام کا اقتصادی نظام" لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کی اس محنت کی ملک کے اہلِ قلم، اہلِ علم اور اہلِ فکر کی نظروں میں اس قدر اہمیت ہوگی جس کا احساس نہیں، بلکہ مشاہدہ کتاب کی اشاعت کے بعد ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایسے بحرانی دور میں جبکہ حق و صداقت بھی شخصی عداوتوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، اس کتاب کو شرفِ قبولیت بخشا اور ندوۃ المصنفین کی اس خدمتِ علمی و مذہبی کو جدید اور قدیم دونوں حلقوں میں "سعی مشکور" بنایا۔

مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں جہاں کتاب کی نوعیت کے اعتبار سے اس کو اسلام کے علمی ذخیرہ میں ایک جدید اضافہ ظاہر کیا تھا، وہاں اپنی خامی اور نقشِ اولین کی حیثیت سے کتاب میں اضافہ اور ترمیم کی گنجائش کا بھی اعتراف تھا اور اربابِ علم و بصیرت اور اصحابِ قلم سے مخلصانہ درخواست کی تھی کہ وہ مصنف کے سیاسی رجحانات سے اختلاف کے باوجود بھی دیانت کے ساتھ صرف کتاب پر تبصرہ اور ریویو (Review) کی زحمت گوارا فرمائیں اور بے لاگ تنقید کر کے مصنف کی راہنمائی کریں۔

مصنف اس سلسلے میں ان اربابِ علم و اصحابِ قلم حضرات کا شکر گزار ہے۔ جنہوں نے اس اصولی نقطہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب پر تنقید بھی کی اور تقریظ بھی لکھی اور سب نے باتفاق یہ تسلیم کیا کہ بلاشبہ یہ کتاب وقت کی پکار کا اسلام کی جانب سے

بہترین جواب ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ علمی ذخیرہ میں پہلی کتاب اور بیش بہا ذخیرہ اسلامی کی حامل ہے۔

مصنف ساتھ ہی ان بعض اہلِ قلم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اصولِ تنقید سے گریز کرتے ہوئے کتاب کی جگہ مصنف کے سیاسی مسلک کو ہدفِ طعن بنایا اور اس کی جماعت کو غیر مہذب الفاظ میں یاد کرنا ضروری سمجھا اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ معاصرانہ حسد اور بغض و عناد ادعاءِ امامت و قیادت اور ادعاءِ تقویٰ و طہارت کے باوجود پستیٔ اخلاق کے کس عمیق غار میں لے جا کر گرا دیتا ہے، مگر مصنف ان کا بھی اس لیے شکر گزار ہے کہ ان کی اس غیر سنجیدہ روش نے کتاب کو ملک میں بہت زیادہ مقبول بنا دیا اور اربابِ ذوق نے اس پر زیادہ سے زیادہ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس کا اندازہ ندوۃ المصنفین کے دفتر میں آئے ہوئے ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو کتاب کے متعلق ملک کے مختلف گوشوں سے اظہارِ خیال اور کتاب کی خریداری کے متعلق آئے، یا اس کا صحیح اندازہ علومِ جدیدہ کے ان اہلِ قلم کے تحریری تقاضوں سے ہو سکتا ہے جو جدید کے ساتھ قدیم کا بھی ذوقِ کامل رکھتے ہوئے مُصِر ہیں کہ ہمیں اس کتاب کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کی اجازت دی جائے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اگرچہ ہاتھوں ہاتھ نکل چکا تھا اور ان تھوڑے سے نسخوں کے علاوہ جو دفتر میں اصولِ تجارت کی بنا پر روک لیے جاتے ہیں، کتاب کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا تاہم بعض دیگر تصنیفی مشاغل نے فوراً دوسرے ایڈیشن کی ترتیب کی جانب متوجہ نہ ہونے دیا۔ مگر اربابِ ذوق کے پیہم تقاضوں اور وقتی ضرورت کے احساس نے مہمیز کا کام دیا اور بحمد اللہ دوسرا ایڈیشن بھی منصۂ شہود پر آ گیا۔

اس ایڈیشن میں ''نقشِ اولین'' کو ''نقشِ ثانی'' بنانے کی پوری سعی کی گئی ہے اور جدید اضافات اور ترمیم و اصلاحات نے نیز تقطیع اور ضخامت کی زیادت نے گویا کتاب کو بالکل نیا جنم دے دیا ہے اور اس طرح وہ پہلے ایڈیشن سے الگ نئی اور مستقل

کتاب بن گئی ہے۔

مصنف ایک مرتبہ پھر اربابِ علم اور اصحابِ قلم کی خدمت میں مخلصانہ ملتمس ہے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت، زیر بحث مسئلہ میں اسلامی نظریوں کی وضاحت، معاشیات میں اس کے عملی نظام اور اجتماعی احکام کے پیشِ نظر مصنف کی محنت و کاوش پر آزادانہ مگر دیانتدارانہ تنقید یا تقریظ کے لیے قلم اٹھائیں۔

اور ان چند آخری صفحات پر بھی ”جو کہ ضمنی طور پر ہندوستان میں معاشی مسئلہ کے متعلق زیر قلم آ گئے ہیں۔“ اگر کچھ لکھا جائے تو انصاف اور اسلامی اخلاق کی متانت کی روشنی میں معرضِ تحریر میں آئے تاکہ زیر بحث مسائل میں قارئینِ کرام کو فیصلہ کرنے میں مدد ملے، ”وما توفیقی الا باللّٰہ“.

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)

۲ر ربیع الاول ۱۳۶۱ھ

———☆☆☆———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثالث

کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' اپنی ارتقائی منزلوں سے گزر کر اب تیسرے ایڈیشن کی صورت میں پیش ہے، اس ایڈیشن میں حذف و اضافہ دونوں سے کام لیا گیا ہے مگر حذف بہت کم اور اضافہ غیر معمولی ہے، اس لیے اس ایڈیشن میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی معاشیات کے مفکرین شاہ ولی اللہ دہلوی، حافظ ابن قیم جوزی، امام رازی، امام غزالی اور ابن حزم اندلسی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ان نظریات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو انہوں نے قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی روشنی میں خالص معاشی نقطۂ نگاہ سے پیش فرمائے ہیں۔

ان نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ معاشی مسائل کے حل میں مذہب سے آزاد یا مخالف ہو کر جن مفکرین نے کاوشیں کی ہیں اور نظری و عملی پہلوؤں کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے، ان کے مقابلہ میں اسلام کے ان مفکرین نے دینِ حق کی روشنی میں اس خوبی سے اس کا حل کیا ہے کہ ایک طرف لادینیت، طبقاتی جنگ و جدل اور انتقامی خام کاریوں سے تحفظ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب وہ پوری افادیت موجود رہتی ہے، جو لادینی مفکرین کے معاشی نظام کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

اس مرتبہ یہ بھی سعی کی گئی ہے کہ مسئلہ سود (ربوا) پر بھی سیر حاصل بحث کی جائے کیونکہ موجودہ دور کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے ''سود'' کو اس طرح تجارت کا جزو بنا دیا ہے کہ آج اگر سود اور سودی تجارت کے خلاف کچھ کہا یا لکھا جائے تو وقت کے اہلِ نظر (معاشیین) اس کو تعجب وحیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ''حرمتِ سود'' اور معاشی سسٹم میں عدمِ جوازِ سود پر دلائل کا

ذخیرہ ایک روحانی نظریہ یا ایک اچھے دفاع (Defence) سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اور یہ تو وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی معاشرہ میں سودی کاروبار ایک لغو اور باطل سسٹم ہے اور یہ کہ موجودہ ماہرین اقتصادیات کی ایک قابلِ ذکر جماعت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے کہ معاشیین کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ "سود" کے لیے معاشی نظام میں کوئی دخل نہیں اور شرح سود کو صفر تک پہنچادینا ہی معاشی حل کی کلید ہے۔

چنانچہ موجودہ ایڈیشن میں "ربوا" اور صحیح تجارتی لین دین کے درمیان تفاوت ظاہر کرتے ہوئے اسلامی نقطۂ نگاہ سے عدمِ جوازِ سود پر ایسے معاشی دلائل پیش کیے گئے ہیں جو مسئلہ کو دفاعی نقطۂ نظر سے آگے بڑھا کر ایک صحیح حل کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

"مسئلہ اراضی اور ہندوستان میں معاشی مشکلات کا حل" کے عنوانات میں بھی جدید ترتیب کے ساتھ مزید اضافات زیر قلم لائے گئے ہیں جنھوں نے کتاب کی افادیت کو اور زیادہ وزنی بنادیا ہے۔

غرض نقشِ ثالث "ثانی اور اول" کے مقابلہ میں مسئلہ ارتقاء کے بقاء اصلح کا آئینہ دار ہے اور اصحابِ فکر و نظر کے عمیق مطالعہ کا داعی۔ والی اللّٰہ المرجع والمآب۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللّٰہ لہ)

۲۰/ جمادی الاخری ۱۳۶۵ھ

☆☆☆

دیباچہ طبع چہارم

کتاب کا چوتھا ایڈیشن بڑے ہی نازک زمانے میں پیش کیا جارہا ہے ایسا نازک زمانہ کہ چشم فلک نے نہ سہی، کم سے کم ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں کے بعد ابھی تک پورا ملک بے اطمینانی کی تاریک لہروں میں گھرا ہوا ہے اور کہیں دور دور بھی روشنی کی کرن نظر نہیں آتی۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے خود اس کے بولنے والے اس کو دیس نکالا دینے کی فکر کر رہے ہیں پھر جہاں تک ندوۃ المصنفین کا تعلق ہے ستمبر ۱۹۴۷ء کی بربادی کے بعد اس کے ارادوں کی بساط الٹ کر رہ گئی اور اب اس کا وجود ہی کرشمۂ قدرت سے کم نہیں ہے۔

موجودہ انقلاب نے مؤلف گرامی قدر کی مشغولیتوں کا نقشہ بھی یک قلم تبدیل کر دیا ہے وہ رہ رہ کر تصنیف و تالیف کی پرسکون وادی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں لیکن وقت کی شورشیں ان کے قدم کھینچ لیتی ہیں اور ان کو اس خدمت کا موقع نہیں دیتیں، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں اس کتاب کا جو ایڈیشن نکلا تھا، زیر نظر ایڈیشن ٹھیک اس کی نقل ہے اور اس میں ایک سطر کا بھی رد و بدل نہیں ہو سکا، مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اگرچہ تیسرا ایڈیشن ہر حیثیت سے مکمل تھا اور اس میں کسی قابلِ ذکر اضافے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی تھی، تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ اگر مصنف کو نظر ثانی کا موقع مل جاتا تو اس کی نوعیت کیا ہوتی۔

کاغذ کی کمیابی اور ہوشربا گرانی کے باوجود اس دفعہ کاغذ پہلے سے دبیز بھی ہے اور عمدہ بھی، یقین رکھنا چاہیے کہ پانچواں ایڈیشن فاضل مؤلف کی نظر ثانی کے بعد جلد ہی وجود میں آسکے گا اور گزشتہ چند سال میں بحث و نظر اور تعبیر و بیاں کے جدید گوشے سامنے آگئے ہیں ان کو بھی سامنے رکھا جا سکے گا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین

(۱۲ر شوال المکرم ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۵۱ء)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

باب — ①

اقتصاد اور علم الاقتصاد کے مختلف نظریات کا تعارف

(Introduction to Economics and its Different Theories)

اقتصاد:

لغت کی زبان میں قصد و اقتصاد[1] "میانہ روی" اور "اچھے چلن" کا نام ہے، مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت و

(۱) اقتصاد —— میانہ روی، اعتدال، درمیانی راہ —— اسلام کے معتدل مزاج میں اس قدر اہم اور قابلِ ستائش ہے کہ اسے پیغمبرانہ خصائل واطوار کا حصہ قرار دیا گیا ہے اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

❶ عن عبداللّٰہ بن سرجس رضی اللّٰہ عنہ ان النبی الکریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: السمت الحسن والتؤدۃ والاقتصاد جزء من أربع وعشرین جزء من النبوۃ (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوۃ المصابیح، باب الحذر والتأنی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا طریقہ، احتیاط اور اقتصاد (میانہ روی) نبوت کا چوبیسواں (۲۴واں) حصہ ہیں۔

❷ عن عبداللّٰہ بن عباس رضی اللّٰہ عنہما ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: ان الھدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمس وعشرین جزء من النبوۃ.(رواہ ابوداؤد، بحوالہ مشکوۃ المصابیح، باب الحذر والتأنی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھی سیرت، اچھا برتاؤ اور اقتصاد (میانہ روی) نبوت کے پچیس حصوں میں سے ایک حصہ ہیں۔

=

بربادی کے "حقیقی اسباب" بتا سکیں۔

علم الاقتصاد (Economics):

اس لیے "علم الاقتصاد" اس علم کا نام ہے جو ان وسائل سے بحث کرتا ہے اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہے۔

"علم الاقتصاد" اس معنی کے اعتبار سے دو حصوں پر منقسم ہے، ایک اجتماعی (Collective Or Social) اور دوسرا انفرادی (Individual) یا "منزلی" (Domestic)۔ ہماری بحث کا نقطۂ نظر "اقتصادِ اجتماعی" (Social Economics) ہے اس لیے کہ یہی زندگی کی اصل بنیاد ہے اور "انفرادی و منزلی" اقتصاد کے لیے دلیلِ راہ (Guide)۔

مختلف اقتصادی نظریات:

علمی دنیا کے قدیم و جدید مفکرین (Thinkers) اور علماء مبصرین (Scholars) نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون (Plato) نے بھی اپنی کتاب "جمہوریہ" (Republic) میں اس مسئلہ کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ بیان کیا ہے، اور علماءِ جدید میں کیسل (Cassel)، مل (Mill)،[1] سمتھ (Smith)،[2] ریکارڈو (Ricardo)[3] اور جون (John)[4] نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی بنانے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ

---

(۱) جان اسٹورٹ مل (John Staurt Mill) (۱۸۷۳-۱۸۰۶) مشہور برطانوی معیشت دان جو فرد کی معاشی آزادی کے علم بردار تھے۔

(۲) آدم سمتھ (Adam Smith) (۱۷۹۰-۱۷۲۳) کلاسیکل نظریہ معاشیات (Classical Theory of Economics) کے بانی سمجھے جاتے ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب "دولت اقوام (Wealth of Nations) لکھ کر اس نظریہ کی بنیاد رکھی، یہ کتاب ۱۷۷۶ء میں چھپی۔

(۳) ڈیوڈ ریکارڈو (Devid Ricardo) (۱۸۲۳-۱۷۷۲) بعض مؤرخین انہیں کلاسیکی معاشی مکتب فکر (Classical Economic School of Thought) کا مؤسس (Founder) کہتے ہیں وہ لگان کے کلاسیکل نظریہ (Classical Theory of Rent) کے بانی ہیں جسے انہوں نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے جو ۱۸۱۷ میں چھپی۔

(۴) جون مینارڈ کینز (Lord John Maynord Keyns) (۱۹۴۶ - ۱۸۸۳) نامور برطانوی معیشت دان، جنہوں نے پہلی بار کلی معاشیات (Macro Economics) کا تعارف کرایا۔ دراصل ۱۹۳۶ تک معاشیات کا تمام لٹریچر

ان کی تصانیف اور ان کے نظریوں سے واضح ہے، اور آخر میں کارل مارکس (Karl Marx)[۱] نے نظریہ اشتراکیت (Socialism) اور اس کے "عملی پروگرام" کے ذریعہ سے یورپ میں جو انقلاب پیدا کیا اس سے علمی فکر و نظر، عملی نظام اور طرزِ حکومت پر جو اثر پڑا ہے وہ موافقت و مخالفت کے رنگ میں نہ صرف یورپ کو متاثر کر رہا ہے بلکہ ایشیا اور مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں زبردست ہیجان برپا کیے ہوئے ہیں اور روس جو کہ آج کل اشتراکیت کا عملی میدان بنا ہوا ہے، دوسروں کو بھی اس نظام میں منسلک کرنے کے لیے پیہم جد و جہد کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔[۲]

جزوی معاشیات (Micro Economics) پر مشتمل تھا۔ انہوں نے ۱۹۴۰ - ۱۹۲۹ کے عالمی معاشی بحران کے بھیانک نقصانات سے متاثر ہو کر اپنی کتاب روز گار، سود اور زر کا عام نظریہ (The General Theory of Employment Intrest and Money) لکھی جو ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی اور اس سے کلی معاشیات کی بنیاد پڑی۔ کلی معاشیات کے معیشت دان آج تک کینز ہی کے نظریہ کے پیروکار چلے آ رہے ہیں۔ کچھ مزید بحث آگے آ رہی ہے۔

(۱) کارل مارکس (Karl Marx) (۱۸۸۳ - ۱۸۱۸) مشہور جرمن فلسفی اور معیشت دان تھے۔ ان کی مشہور عالم کتاب سرمایہ (اصل زر) (Das Kapital) ہے جس نے عالمی معیشت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ کتاب (۱۸۶۷، ۱۸۹۵) کے درمیان شائع ہوتی رہی۔

(۲) یہ اُس دور یعنی ۱۹۳۶ کی بات ہے جب حضرت مصنف رحمہ اللہ اپنی کتاب لکھ رہے تھے۔ روس اشتراکیت کا داعی بن کر تقریباً ایک صدی تک اپنا کردار ادا کرتا رہا جس کی بدولت پوری دنیا کی معیشت و سیاست دو واضح بلاکوں (Blocks) میں منقسم رہی ہے یعنی اشتراکی یا روسی بلاک (Socialist or Russian Block) اور سرمایہ داری یا امریکی بلاک (Capitalist or American Block)۔ تمام اسلامی ممالک بھی سوائے ایک دو کے ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تھے جن میں اشتراکی بلاک سے منسلک ممالک مثلاً مصر، شام، الجزائر وغیرہ میں سوشلزم کا پرچار کیا جاتا تھا، خواہ اسے وہاں کامیابی ہوئی یا جزوی کامیابی ہو یا مکمل ناکامی ہو۔ اسی طرح جو اسلامی ممالک سرمایہ داری بلاک سے وابستہ تھے مثلاً پاکستان، افغانستان، ایران، مالیزیا، اردن وغیرہ ان میں نظام سرمایہ داری مروج رہا۔ پاکستان میں ۱۹۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے سوشلزم کا نعرہ لگایا، عوام نے ان کے نعرہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، ان کی پارٹی نے الیکشن بھی جیتا، مگر حکومت میں آنے کے بعد عملاً وہ بھی سرمایہ دارانہ نظام چلاتے رہے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی جماعت میں پنجاب اور سندھ کے وڈیروں، مخدوموں، قریشیوں، بلوچ سرداروں، بڑے بڑے گدی نشینوں اور جاگیرداروں کی شمولیت تھی۔ ۱۹۸۶ء میں روس میں میخائیل گورباچیف (Mikhail Gorbo Chif) نے اشتراکی پالیسیوں پر گرفت ڈھیلی کر دی، وہ مصلحتاً یا بین الاقوامی سیاسی حالات کے پیش نظر آزاد حیثیت (Free Economy) کے حامی بن کر سرمایہ دارانہ بلاک کے

لیکن دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قدیم و جدید تمام نظامہائے حکومت میں ایک بھی ایسا نظام نہیں بتایا جا سکتا جس کے نظام اقتصادی نے انسانی دنیا کے اندر رفاہیت و خوش عیشی اور عدل و انصاف دونوں کو باہم ملا کر امن و سلامتی کا علم بلند کیا ہو، اور یہ تو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کے پیش کردہ نظریوں اور عملی تجربوں نے دنیوی سربلندیوں کے ساتھ ساتھ انسانی حیات کے مقصدِ وحید (Sole Aim) یعنی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیانی رشتہ کو مضبوط کرنے اور اخلاقِ کریمانہ کی رفعتوں تک پہنچانے کی خدمت انجام دی ہو۔

افلاطون کا نظریہ اقتصاد (Palatonic Theory of Economics):[1]

افلاطون اپنی شہرۂ آفاق کتاب "جمہوریہ" میں اقتصادی حیثیت سے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کی دعوت دیتا ہے اور زیر دستوں پر زبردستوں کی قہرمانیت (Tyronny) کے لیے دروازہ کھولتا ہے اور صنفی تعلقات میں انارکی (Anarchy) پیدا کر کے معاشرتی نظام کو برباد کر دینے کے علاوہ معاشیات میں عوام و خواص کی تقسیم کو بڑی حد تک

قریب ہو گئے، انہوں نے سوویت یونین کی نئی اقتصادی شیرازہ بندی (Prestroika) اور کشادگی (Glasnost) متعارف کرایا، جس کا نتیجہ بالآخر اشتراکیت کا روس میں کمزوری میں نکلا۔ رہی سہی کسر روسی قیادت کی اس حماقت نے پوری کر دی جو اس نے دسمبر ۱۹۷۹ کو افغانستان پر یلغار کر کے کی۔ افغان اور دیگر مسلم مجاہدین نے روس کے سپر پاور کے خواب کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ۵ فروری ۱۹۸۹ میں روس نے ذلیل ہو کر افغانستان سے پسپائی اختیار کی۔ اس کے ساتھ ہی سوویت اشتراکی جمہوریاؤں کا اتحاد (USSR- Union of Soviet Socialist Republics) یعنی روسی وحدت کا خاتمہ اور عالمی سطح پر صرف امریکہ کے نام نہاد سپر پاور کی صورت میں ظاہر ہوا، میں نے نام نہاد سپر پاور (Super Power) اس لیے کہا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ دراصل سپر پاور اللہ کریم کی ذات کریم ہے اور ہم اس کے پرچارک بھی ہیں۔

(۱) افلاطون (Plato) (۳۴۷ - ۴۲۸ ق، م) مشہور یونانی فلسفی، دانشور اور مصلح مانے جاتے تھے۔ یہ سقراط (Socrates) (۴۷۰ - ۳۹۹ ق م) کے شاگرد تھے۔ سقراط اور ان کے دونوں شاگردوں افلاطون اور ارسطو (Aristotle) (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) کو جدید مغربی تہذیب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی کتاب "جمہوریت" (The Republic) کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔

=

باقی رکھتا ہے، یورپ کی جمہوریت کا نظام بھی اسی دیو استبداد کی قبا اوڑھے ہوئے ہے اور عام رفاہیت (Commonweal) وخوش عیشی کی بجائے مخصوص مالدار طبقوں کی کفالت کرتا نظر آتا ہے، اور اس لیے عدل وانصاف کے حقیقی معنی کو بھی مسخ کر دیا گیا ہے اور ظلم واستبداد کو عدل وانصاف کا نام دیا جارہا ہے اور حقیقت بین نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ نہ صرف معاشی نظام بلکہ پورا نظامِ حکومت محض ایک چھوٹی سی جماعت کے اغراض کو پورا کرتا ہے اور جمہور کو ان مقاصد کے لیے آلہ کار بناتا اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کا نام جمہوریت (Democracy) رکھتا ہے۔

روم اور فارس کا نظام:

روما اور فارس کا پرشوکت تمدن اور اس کی خوش آئند حضارت (Civilization) دنیائے انسانی کو مطمئن تو کیا کرتے خود اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب افراد کے لیے بھی دعوتِ حق اور پیغامِ رفاہیت نہ دے سکے اور جو کچھ بھی کیا وہ سب طبقۂ امراء وسلاطین ہی تک محدود رہا خصوصاً فارس کا وہ نظام تو قابلِ ذکر بھی نہیں جو مزدک [1] کی تعلیم

---

(۱) مزدک مشہور فارسی فلسفی ۴۸۷ م میں پیدا ہوا۔ اس کا فلسفہ تھا کہ تمام انسان برابر پیدا ہوئے اور تمام اشیاء بالخصوص مال اور عورت میں وہ برابر کے شریک ہیں، لہٰذا تمام قسم کے اموال اور نساء (عورتوں) انسانوں کا مشترکہ سرمایہ اور ناطہ ہیں، لہٰذا نہ کسی نکاح کی ضرورت ہے نہ مال کی حفاظت کی۔ نامور مصنف اور مؤرخ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں: ''احل النساء وأباح الاموال وجعل الناس شركة فيها كإشتراكهم فى الماء والنار والكلاء'' (علامه شهرستانى: الملل والنحل: ج ۱ (بر حاشيه ابن حزم) ۱۳۴۴ھ، ۱۳۴۸ھ ص: ۸۶) ترجمہ: اس نے عورتوں کو (تمام انسانوں کے لیے) حلال کر دیا، اور اموال (Properties) کو مباح (Permissible) ٹھہرادیا اور تمام انسانوں کو اس میں اس طرح شریک ٹھہرایا جیسے وہ پانی، آگ اور گھاس میں برابر کے شریک ہیں۔) اس کے فلسفہ کو نوجوانوں، مالداروں اور وڈیروں میں زیادہ پذیرائی ملی۔ اس کے دور کے حکمران قباذ ـــــ جو ابتداءً بہت اچھا اور مقبول بادشاہ سمجھا جاتا تھا ـــــ اس کے فلسفہ کا پیروکار اور حامی بن گیا اور حال یہ ہو گیا کہ سرکاری اہلکار کسی شہری کے گھر میں داخل ہو کر اس کے مال اور عورتوں پر قابو حاصل کر لیتے اور کوئی انکار یا رکاوٹ کرنے والا نہ تھا۔ عورتوں اور مردوں کے بے قید اختلاط (میل جول) کی وجہ سے ایک ایسی نسل تیار ہو گئی جہاں اولاد کے باپ کا پتہ تھا نہ باپ کی اولاد کا۔ علامہ طبری رحمہ اللہ کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں ''حتى صاروا لا يعرف الرجل ولده ولا المولود اباه'' (تاریخ طبری: ۸۸/۲) ترجمہ: یہاں تک کہ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ کوئی شخص اپنے بیٹا کو پہچانتا نہ بیٹا اپنے

سے بہرہ اندوز ہوا، موجودہ ڈکیٹر شپ بھی امن و سلامتی کی جگہ قہر و غلبہ کی اور عام رفاہیت کی جگہ دنیائے انسانی کو محکوم بنانے کی ہنگامہ آرائیوں کے سوائے دنیا کو کچھ نہ دے سکی۔

اشتراکیت اور اشتمالیت (Socialism & Communism):

اشتراکیت اور اشتمالیت نے اگرچہ عام خوشحالی اور رفاہیت کا پیغامبر بننے کی بہت کوشش کی مگر ایک طرف خدا سے بغاوت کر کے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان انارکی (Anarchy) کا باعث بنی اور دوسری جانب طبقاتی جنگ (Class Struggle) کے مراحل میں الجھ کر رہ گئی اور عالمگیر پیامِ امن بننے کے بجائے وہ بھی ایک طبقہ کی مخصوص حکمرانی کی قائل نظر آنے لگی، فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ سرمایہ داروں (Bourgeoisie) کا نہیں مزدوروں کا طبقہ (Proletariats) ہے۔

صالح معاشی نظریے کی ضرورت:

بہرحال دنیا کے تمام نظامہائے حکومت اور دنیا والوں کی ہر قسم کی جدوجہد ہمیشہ اس مرحلہ میں ناکام رہی اور آج کی ہولناک جنگِ یورپ اس ناکامی کو اس طرح برسر عام لا رہی ہے کہ تہذیب نو سے مرعوب ہونے والے انسان سرنگوں اور حیران نظر آرہے ہیں اور ان کو کوئی تاویل بن نہیں آتی۔

پس اب دو ہی مرحلے باقی ہیں یا دنیا ان ہلاکت آفرینیوں کا شکار ہو کر یکسر شر ہی شر بن کر رہ جائے اور یا پھر خیر اور حقیقی امن و سلامتی کی وہ دنیا بن جائے جس کا مظاہرہ اسلام آج سے چودہ سو سال قبل مکمل طور پر دور نبوت صلی اللہ علیہ وسلم، دور صدیقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دور فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں کر چکا ہے۔

﴿فَأَمَّا ٱلزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى

والد کو پہچانتا، اس طرح سارا ایران معاشی بحران، سماجی نراج اور شہوت رانی کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ (برائے تفصیل دیکھئے: ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، باب ۱ تذکرۃ ایران والحرکات الھدامۃ فیھا)

ٱلْأَرْضِ ﴾(۱)

ترجمہ: سو جھاگ تو سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔

لہٰذا آج کی صحبت میں ہم اسلامی نظامِ حکومت کے اس شعبہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو "اقتصادی نظام" سے معنون ہے اور جس نے اپنے وجود کے حقیقی زمانہ میں دنیا کی تاریخ کے لیے یہ مواد بہم پہنچایا کہ اس نظام میں اگرچہ دفتری اقتدار کی وہ جگمگاہٹ موجود نہیں ہے جو آج انسانوں کو سادہ راحت و آرام اور قلبی اطمینان و سکون بخشنے کی بجائے ان کی مشکلات و مصائب میں دن بدن اضافہ کا سبب بن رہا ہے اور جس کی بدولت حکومتوں کا اربوں روپیہ غریبوں اور مفلوک الحال انسانوں کی فلاح و بہبود کی جگہ جنگ کے استحکامات (Strengthings of War) پر صرف ہو رہا ہے لیکن اپنی عملی جد و جہد میں وہ علم المعیشت کے حقیقی مقصد کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس کی تمام تر روح انسانوں کی خدمت، فارغ البالی (Well being) اور قلبی سکون و اطمینان کا باعث بنتی رہی ہے اس لیے اس میں نہ طبقاتی جنگ کی گنجائش ہے اور نہ اونچ نیچ (Inequality) کا وہ غیر فطری (Unnatural) فرق ہی موجود ہے جس سے ایک جماعت بے قید سرمایہ دولت کی مالک بن جائے اور دوسری اس کے سامنے دستِ سوال پھیلا کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرے اور اس کے دستِ تظلم کا شکار بنے۔

صالح معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات:

قابلِ عمل اور مفید ہو:

الحاصل یہاں ایسے نظریئے (Theories) زیر بحث نہیں لائے جائیں گے جو اپنے منطقی استدلالات (Arguments) اور عقلی کاوشوں (Intellectual Gossips) کے اعتبار سے تو بہت بلند نظر آتے ہوں، لیکن ان کی عملی افادیت (Practical

(۱) القرآن سورۃ الرعد (۱۳):۱۷

(Importance) یا تو صفر ہو یا پھر تمدن کے فاسد کرنے میں تیز گام، بلکہ یہاں ایک ایسے نظام سے بحث ہے جو کائنات ہست و بود کی دنیوی ضروریات اور عملی معیشت کے لیے بہترین نظامِ عمل (پروگرام) رکھتا ہو اور تجرباتی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے چکا ہو کہ وہ انسانوں کا ان کے حقیقی آقا "خدا تعالیٰ" کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے اور ان کے اخلاق (کیرکٹر) کو بلند اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ ہر کہ ومہہ (All and Sundry) کے لیے یکساں معیشت کا کفیل رہا ہے اور انفرادی اور اجتماعی حیات کا ضامن اور طبقاتی جنگ کی جگہ عالمگیر اخوت کا پیغامبر ہے۔

ہمہ گیر عملی قدر و قیمت رکھتا ہو:

کسی نظریہ کے ساتھ اس کی "عملی قیمت (Practial Value) کا لحاظ' اس لیے ضروری ہے کہ بعض نظریئے اپنے منطقی دلائل کے اعتبار سے اگرچہ بہت زیادہ جاذبِ نظر اور دلکش معلوم ہوتے ہیں اور "علم المعیشت" کے مباحث میں ان کی بہت زیادہ اہمیت نظر آتی ہے، لیکن جب وہ عمل کی ترازو میں تولے جاتے اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں، تو ان کی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہے۔

مثلاً محنت (Labour) کا مفید مفہوم یہ ہے "وہ کام جس کا کچھ مادی معاوضہ ہاتھ آئے لیکن محنت کی علمی بحث میں" والدین کی خدمت اولاد کے لیے، عشاق کی ناز برداری اپنے محبوب کے لیے اور شوقین لوگوں کے لیے مشاغل تفریح طبع کے لیے یہ سب محنت میں شمار کیے جاتے ہیں اور محنت کے وسیع نظریہ کے پیشِ نظر زیرِ بحث لائے جاتے ہیں، تاہم علمائے اقتصادیات اس علمی نظریہ پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں:

یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں، محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں ان کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوا ہے۔[1]

اس کے برعکس بعض نظریئے نئی اصطلاحوں، جدید تعبیروں اور مخصوص ماحول

(۱) علم المعیشت: ص ۶۸

کے اثرات کے پیشِ نظر اگرچہ پہلے نظریوں کے مقابلے میں ظاہری چمک دمک نہیں رکھتے لیکن عملی تجربہ میں ان کی افادیت بہت زیادہ ان کی پذیرائی بہت وقیع اور نظامِ معیشت میں ان کی درست کاری بے حد موزوں ثابت ہوتی ہے۔

لہٰذا کسی ''عملی نظام'' میں وہی نظریئے قابلِ قدر جگہ پانے کے مستحق ہیں جو تعبیری (Illustrative) نقطۂ نظر سے اگرچہ انقلاب آفرین اور مسحور کن نظر نہ آتے ہوں مگر عملی دائرہ میں اس قدر مفید اور ہمہ گیر ہوں کہ اگر ان کو دلیلِ راہ بنایا جائے تو بلاشبہ وہ ایک ''صالح معاشی نظام'' اور ''امن عالم'' کے کفیل ہو سکتے ہیں اور تمام انسانوں کی خوش حالی اور امن و عافیت کے راہنما بن سکتے ہیں۔

محکم و مضبوط بنیاد رکھتا ہو مگر لچکدار بھی ہو:

نیز ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو کہ جہاں وہ ایک طرف ایسی محکم بنیاد اور مضبوط اساس رکھتے ہوں کہ زمانے کے ہزاروں انقلابات اور بے شمار تاثرات اور ذہنی رجحانات کے باوجود ان کی اساس و بنیاد کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے وہیں ان میں ایک ایسی لچک (Flexibility) پائی جاتی ہو کہ وہ وقتی تاثرات، ذہنی انقلابات و رجحانات اور نت نئے حوادثات کے لیے اپنی جزوی تفصیلات اور فروعی جزئیات میں وقت کی صحیح راہنمائی انجام دے سکیں۔ اور موجودہ دور کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ دنیا کے لیے بھی اسی طرح مشعلِ ہدایت کا کام دیں جس طرح گذشتہ دنیا کی عام فلاح و طمانیت کے لیے کامیاب ثابت ہو چکے ہیں اور یہ صرف وہی اصول ہیں جن کی روشنی میں اسلام کا معاشی نظام اپنے حقیقی دور میں ایک زرّیں تاریخ پیش کر چکا ہے اور جس کے لیے دوست اور دشمن دونوں نے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

الغرض، مذکورہ بالا تفصیلات کے پیشِ نظر یہ مناسب ہے کہ ''اسلامی نظامِ معیشت'' کو موضوعِ بحث بناتے وقت دنیا کے مختلف نظامہائے معاشی کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ عدل و انصاف کی روشنی میں یہ موازنہ ہو سکے کہ دنیا کے باقی نظامہائے اقتصادی میں اور اسلام کے نظامِ اقتصادی میں کیا فرق ہے اور یہ کہ

درحقیقت معاشی نظام کے حقیقی مقصد کو کون پورا کر سکتا ہے اور ان ہلاکت آفرین نظام ہائے حکومت سے نجات دلا سکتا ہے، جنہوں نے ''اقتصادی ترقی'' کے نام پر حیاتِ انسانی کو خس و خاشاک سے بھی زیادہ بے وقعت بنا دیا ہے اور جس انسان کی خوش حالی کے لیے یہ ڈھونگ رچایا گیا آہستہ آہستہ اسی کی تباہی و بربادی کا سامان مہیا کر دیا۔

ایک شبہ کا جواب:

آئندہ اوراق میں جس اسلوب کے ساتھ ''اسلام کے اقتصادی نظام'' کو پیش کیا جا رہا ہے اس کے مطالعہ کے بعد سطحی نظر میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور میں مختلف جماعتوں کے نام سے جس طرح منضبط نظریوں (Arranged Theories) مدون نظامِ عمل (Compiled System For Practice) اور مخصوص عنوانوں کے ساتھ معنون (Captioned) ''معاشی نظام'' ضخیم کتابوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور مستقل علم و فن (Science & Art) کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں، اس طرح ''اسلام کا معاشی نظام'' ایک جدا اور مستقل تدوین کی شکل و صورت میں مدون مخصوص نظریوں میں محدود اور خصوصی عنوانات سے معنون نظر نہیں آتا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے دورِ حاضر کی طرح یہ نہیں کیا کہ اول ''اقتصادی نظام'' کے نام سے ایک عنوان قائم کرتا اور اس کے تحت میں ایک خاص نظریہ یا چند مخصوص نظریئے بیان کرتا اور پھر ان نظریوں کے پیشِ نظر مختلف فصول و ابواب میں اس کے نظامِ علمی و عملی پر بحث کر کے کسی مخصوص نام کے ساتھ اس کو موسوم کرتا، لیکن اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ صرف اس لیے کہ موجودہ دنیا کے جس قدر بھی نظامہائے اقتصادی ہیں وہ عموماً انسانوں کے خود ساختہ اور ایسے فلسفہ پر مبنی ہیں جن میں روحانیت اور مذہب کو یا سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یا اس کی نہاد (Base) روحانیت اور مذہب کی مخالفت پر قائم کر کے اس کو فلسفیانہ رنگ میں ڈھال دیا ہے۔

اسلام کا صالح معاشی نظام:

اجمالی تعارف:

اس کے برعکس ''اسلام کا معاشی نظام'' ایک ایسے ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کا نام ''اسلام'' ہے جو عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے اور دنیائے انسانی کی ''صرف معاشی صلاح و فلاح'' کا ہی خواہش مند نہیں ہے بلکہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی معاشرتی اور معاشی، غرض ہر قسم کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود اور رشد و ہدایت کا علمبردار ہے اور اس طرح ایک وسیع اور مکمل نظامِ کائنات کا مدعی ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کا منتہائے مقصد صرف دنیوی ترقی و کمال ہی نہیں ہے بلکہ سعادتِ ابدی اور رضائے الٰہی اس کی حیات کا کعبۂ مقصود ہے اس لیے وہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے ''ایک صالح نظامِ اجتماعی'' کا طالب ہے اور ان ہی شعبہ ہائے زندگی کا ایک شعبہ ''صالح نظامِ معاش''[1] (Righteous Economic System) بھی ہے۔ نیز اس کا دعویٰ

---

(۱) صالح: مؤلف رحمہ اللہ کی استعمال کردہ عربی اصطلاح (Term) ''صالح'' ایک کثیر المعانی Mulit Meanings اور کثیر الجہت Multi Diminisional ہے۔ اس کے لیے انگلش لغت (Dictionary) میں مترادفات اور متبادلات کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ مثلاً Just (عادل) Beneficient (مخیر)، Generous (سخی، کریم) Rrformed (اصلاح شدہ) Well Being (رفاہی) Pure (پاکیزہ) (Practicable) (قابل عمل، عربی میں صالح للعمل) وغیرہا۔ مذکورہ مترادفات میں سے کسی ایک کو ''معاشی نظام'' کا لاحقہ کے طور پر لائیں آپ کو بامعنی نام مل جائے گا۔ مثلاً ''عادلانہ معاشی نظام''، ''مخیر معاشی نظام'' ''رفاہی معاشی نظام'' وغیرہا۔ مگر میری محدود سوچ کے مطابق صفت Righteous (صالح) اسلام کے اقتصادی نظام کے مفہوم اور روح کے قریب تر ہے یعنی اسلام ایسا صالح نظام اقتصاد دینا چاہتا ہے جو

1. عادلانہ (Just) ہو، معاشی دست و برد (Economic Enploitation) سے پاک ہو جہاں طاقتور کمزور کا استحصال نہ کر سکے بلکہ معاشی نظام اس ظالم طاقت ور کا احتساب یقینی بنائے۔
2. مخیر (Beneficient) ہو کہ محتاج کی کفالت کرنے والا ہو۔
3. کریمانہ (Generous) ہو کہ محتاج کی محتاجی کا خود خیال کرے اور اس کی کفالت کر کے احسان نہ جتلانے والا ہو۔
4. رفاہی (Well- Being- Welfare Oriented) ہو کہ فرد، معاشرہ، ریاست بلکہ پوری انسانیت کو فلاح کا راستہ دکھائے۔

=

❺ پاکیزہ ہو کہ ہمہ قسم کی معاشی آلائشوں مثلاً سود، جوا (Gambling)، سٹہ بازی، حرام کا کاروبار (مثلاً قحبہ گری (Prostitution) وغیرہ) کی کمائی، ناجائز ذرائع (مثلاً چوری، چکاری، ڈاکہ زنی، دھوکہ دہی، ملاوٹ وغیرہا) کی آمدن سے پاک ہو۔

❻ قابل عمل (صالح للعمل) (Practicable) ہو کہ ہر دور اور ہر معاشرہ کے انسان کی معاشی معاملات میں رہنمائی کر سکے، معاشی مشکلات کو حل کر سکے (اسلام کے معاشی نظام کے صالح للعمل) (Practicable) ہونے کی آج کی دلیل سود کے معاشی نقصانات کا اقرار اور اس کے خاتمہ کی کوشش کرنا ہے۔ آج (۸/اکتوبر ۲۰۰۸) کے امریکہ اور یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کو معاشی کساد بازاری (Economic Depression) نے آن گھیرا ہے ان تمام ممالک کے معاشی ماہرین (Economists) اور پالیسی سازوں (Policy Makers) نے اس کساد بازاری سے بچاؤ کے لیے جو اصلاحی تدابیر (Corrective Measures) استعمال کرنا شروع کی ہیں، ان میں سے پہلی تدبیر شرح سود کو کم کرنا ہے۔ ۸/اکتوبر ۲۰۰۸ کو فیڈرل امریکن ریزرو بنک (American Reserve Bank) نے شرح سود 5% کم کر دی تاکہ جاری معاشی بحران پر قابو پایا جا سکے، اس طریقہ کی سود کو قابل عمل اور مفید جان کر یورپی یونین کے ممالک، سوٹرزلینڈ، جاپان وغیرہ نے اپنے بنکوں کو $2\frac{1}{2}$% شرح سود کم کرنے کی ہدایات جاری کر دیں (حوالہ بی بی سی، لندن اور وائس آف امریکا "ریڈیو آپ کی دنیا" اور دیگر عالمی میڈیاز (Medias) کی ۸/ اکتوبر ۲۰۰۸ کی نشریاتی رپورٹس) پھر ۱۷ دسمبر ۲۰۰۸ کو امریکی مرکزی بنک نے شرح سود ۰۲۵% کر دی۔ کاش بحرانوں کا یہ الٰہی تازیانہ دنیا میں شرح سود کو صفر تک لے آئے جو اب بالکل قریب ہے۔ کیا یہ اسلام کے صالح معاشی نظام کے نظریہ حرمت سود (Prohibition of interast) کے جبری اقرار کی دلیل نہیں ہے؟ میں نے اپنی محدود فہم کے مطابق "صالح" کا ترجمہ یا متبادل (Righteaous) کو اس لیے بھی ترجیح دی ہے کہ ہو سکتا ہے اس خطہ ارض پر رواج میں رہنے والے تمام معاشی نظاموں —— خواہ وہ کسی بھی نام سے رواج میں رہ چکے ہوں یا رواج پذیر ہوں —— میں سے کسی نے بھی کبھی یہ نہیں بتایا کہ فلاں معاشی سرگرمی (Economic Activity) یا فلاں معاشی طریقہ (Method - Mode) یا ذریعہ (Tool - Mean) دینی، اخلاقی یا معاشرتی طور پر حلال (Permitted - Lawful) ہے یا حرام (Illicit - Prohibited) ہے۔ ان تمام نظاموں کا لٹریچر اس قسم کی مفید تعلیمات سے بالکل خالی ہے۔ مگر اسلام چونکہ دنیا و آخرت دونوں کی فلاح (Welfare) اور کامیابی کا مذہب ہے جیسا کہ اس کے صالح معاشی نظام کے اولین ماخذ (Primary Source) کتاب اللہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ حَسَنَةً ﴿٢٠١﴾﴾ (البقرہ: ۲۰۱) ترجمہ: ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں خیر عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی سے نواز۔

لہٰذا اسلام کا صالح معاشی نظام وہ ہے جو اس قسم کی معاشی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دیتا جو اس کے پیروکاروں (Followers) کو دنیا و آخرت میں ناکام کرے، شاید دنیا میں چند روزہ خوشحالی مل جائے مگر کہیں آخرت کی ابدی رسوائی کا موجب نہ بنے۔

الحاصل "صالح" کا ترجمہ (Righteous) نہ صرف اس کے دیگر عام تراجم کا جامع ہے بلکہ حلال و حرام اور پاک و ناپاک کی حدود بھی متعین کر دیتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ہے کہ "انسان" دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ حاکم مطلق (اللہ) کی نگرانی میں ایک ایسی حکومت برپا کرے جو "خلافت حقہ" کہلا سکے اور جس کا واضع قوانین (Law Giver) انسان نہیں بلکہ خود احکم الحاکمین ہو اور ان قوانین کی تنفیذ (Implementation) اس کے نائب "خلیفہ" کے ہاتھ میں ہو، اور یہ حکومت اگر ایک جانب خالص روحانی اور اخلاقی برتری کی معلم ہو تو دوسری جانب عالم و کائنات کی سیاسی، مدنی اور معاشی ترقی و کمال کی حامل بھی ہو۔

غرض ایسے "صالح نظام" کی حامل ہو کہ جس کی بدولت ساری کائنات نسل و قوم اور ملک و وطن کے محدود دائروں سے آزاد ہو کر یکساں طور پر عدل و نصفت (Equity) امن و طمانیت اور خوش حالی و معاشی رفاہیت سے مالا مال ہو کر اس اعتراف پر مجبور ہو جائے کہ وہ ابدی سعادت کے حصول میں بھی اس کو اپنا راہنما اور قائد تسلیم کرنے لگے، گویا اس کا "معاشی نظام" اس حیثیت سے ایک فلسفیانہ علم و فن نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی کاوشوں اور علمی و عملی موشگافیوں میں الجھا کر اصل مقصد سے محروم کر دے، بلکہ یہ "معاشی نظام" شعبہ ہے ایک مکمل نظام کا اور آلہ کار اور وسیلہ ہے مقصدِ حقیقی کے حصول کی آسانی راہ کا۔

بہرحال جبکہ اسلام کی دعوت اور اس کا پیغام کائنات کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی اور اس کا طریق کار ہمہ گیر اور عالمگیر وحدتِ اجتماعی کا مبلغ ہے اور اس لیے اس کی رشد و ہدایت نہ صرف دنیوی زندگی تک محدود ہے بلکہ "سعادتِ دارین" سے وابستہ اور قائم ہے اور دنیوی زندگی کی سعادت ابدی سعادت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ ہے تو بلاشبہ اس کے لیے کسی طرح یہ موزوں نہیں تھا کہ وہ زندگی کے اس مخصوص شعبہ (معاشی نظام) کو اپنے مکمل نظام سے علیحدہ کر کے ایک خاص محدود نظریہ اور خاص عنوان کے ساتھ ایک علیحدہ نظام کی حیثیت دیتا۔

بے شبہ وہ ایک "صالح معاشی نظام" کا مالک ہے، مگر وہ نظام بھی تمام دوسرے نظامہائے زندگی کے اصول و آئینِ اساسی کی طرح ایک مکمل نظامِ قانون (قرآن عزیز)

کا جز ہے اور اس سے علیحدہ اپنی مستقل زندگی نہیں رکھتا۔

دنیا کو اسلام کے صالح معاشی نظام کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے:

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (۱) نے اپنی مشہور کتاب حجۃ

---

(۱) شاہ ولی اللہ، قطب الدین احمد بن عبدالرحیم مشہور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ بروز بدھ ۴/ شوال ۱۱۱۴ھ بمطابق ۲/ فروری ۱۷۰۳ء دہلی میں پیدا ہوئے سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ الحرم حضرت ابو طاہر مدنی رحمہ اللہ سے اکتساب علم و فضل کیا۔ آپ کو اللہ کریم نے گوناگوں خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا۔ آپ بیک وقت محدث، مفسر، فقیہ، مدرس، فلسفی اور سیاست دان تھے۔ آپ نے پاک و ہند کے مسلمانوں کے کے لیے تبلیغی، تدریسی، تصنیفی، تحقیقی، روحانی، علمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی گویا ہر میدان میں کام کیا پھر آپ کے صاحبزادگان حضرت مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا عبدالعزیز، مولانا رفیع الدین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام کو آگے بڑھایا۔ مولانا شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا پہلا اردو ترجمہ کیا اور اتنا عمدہ اور تحت اللفظی کہ علماء اسلام کی رائے میں کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس طرح ہوتا۔ یہ آج تک مقبول عام و خاص ہے۔ میرے خیال میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا کوئی دینی اور علمی گھرانا ایسا نہیں ہوگا، جس پر آپ رحمہ اللہ اور آپ کی اولاد کے دینی و علمی احسانات نہ ہوں اور آپ کے شجرہ طوبیٰ سے فیض یاب نہ ہو۔ آپ نے اپنی تحریک کا آغاز اس وقت کیا جب مسلمانوں پر ہر طرف سے ادبار چھایا ہوا تھا اور مزید کے لیے گھنگھور گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔ آپ نے اہلیان ہند کی قابل رحم حالت پر ترس کھاتے ہوئے بیرون ہند کئی مقامات کا دورہ کیا مختلف حکمرانوں جن میں نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی ایسے اشخاص شامل ہیں سے رابطہ کیا اور انہیں ہندوستان کے مصیبت زدہ مسلمانوں کی مدد کے لیے پکارا۔ آپ نے مسلمانوں کو جہاد کرنے کا درس دیا اور انہیں اسلامی فوج تیار کرنے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آمادہ کیا۔

آپ رحمہ اللہ نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد رکھی جس نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد، معاشرتی برائیوں اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف جہاد کیا اور اسی سلسلہ کو آگے بڑھا کر آپ رحمہ اللہ کے بعد علماء اسلام نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جو آزادی ہند کا نقیب اور منبع و مرکز بنا اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کا موجب بھی۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی دینی خدمات و تصنیفات ہیں جو تمام عالم اسلام میں مقبولیت اور سند کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر میں فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، تفسیر فتح الخبیر اور الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، حدیث نبوی میں، موطا امام مالک رحمہ اللہ کی عربی اور فارسی شرح بنام المسوّی اور المصفّٰی، فلسفہ اسلام میں "حجۃ اللہ البالغہ" جو اپنی جامعیت میں عقائد، عبادات، فقہ، حدیث، معاش، معاشرت اور سیاست، تاریخ وغیرہا سب کو شامل ہے، تصوف میں فیوض الحرمین، فقہ اور اصول فقہ میں عقد الجید فی احکام الاجتہاد =

اللہ البالغہ میں ”صالح اقتصادی نظام کی ضرورت پر“ بحث کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ اسلام میں ”اقتصادی نظام“ کا اخلاقی اور مذہبی نظام کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے؟ فرماتے ہیں۔

پارسیوں اور رومیوں کی معاشی بے اعتدالیاں:

جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان کا ہر شخص سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے اور اترانے لگا، یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بے جا عیش پسندوں کو دادِ عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول و منہمک رہنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے اور کس طرح ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح و شام رقص و سرور کی محفلیں سرگرم ہوں اور جام سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں

والتقلید اور الانصاف فی بیان سبب الاختلاف فی الاحکام الفقہیۃ تاریخ میں ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء وغیرہا مشہور ہیں۔

آپ نے ۱۱۷۶ھ میں دہلی وفات پائی (تفصیل کے لیے دیکھیے: موطا امام محمد رحمہ اللہ، مطبوعہ پاک و ہند کا مقدمہ، ص ۲۵ اور دیگر کتب تاریخ ہند)

جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصۂ طولانی کے مرادف ہے۔

مذکورہ معاشی بے اعتدالیوں کے مہلک اثرات:

گمراہ کن عیش اور مضر معاشی تصرفات:

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے ''معاشی نظام'' کا اصل الاصول بن گیا تھا، اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا اور عوام و خواص سب میں یہی جذبۂ فاسد پایا جاتا اور ان کے ''معاشی نظام'' کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔

امن و سکون کی بربادی اور معاشی دست و برد کا آغاز:

نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا، ناامیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لیے کہ ایسی مفرطانہ (Extravagant) عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی البتہ اس کے لیے بادشاہ اور نو امراء اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کار پردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر اُن کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں، خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔

فاسد معاشی نظام کی بنیاد:

اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اُخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لیے بھی مہلت نہ ملتی تھی اور اس "فاسد معاشی نظام" (Daterioratiive / Corrupt Economic Order) کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظامِ عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یک قلم متروک ہو گئیں اور امراء و رؤسا کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ (Profession) شمار ہونے لگا، اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی۔ اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا، مثلاً ایک طبقہ جہاد کیے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کر رہا ہے، تو دوسرا مدبرین (Advisors) مملکت کے نام سے پل رہا ہے، کوئی بادشاہ اور امراء کی خوشامد میں قصہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ (Grant) پا رہا ہے تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔

کسب معاش کے باوقار طریقوں کا فقدان:

خلاصہ یہ کہ کسبِ معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور درباداری کو ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست و ارزل زندگی (Lowest Standard of Life) پر قانع کر دیا تھا۔

پس جب یہ فاسد مادہ وباء کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو اُن کے نفوس دنائت و خست (Meanness) سے بھر گئے اور ان کی طبائع اخلاق صالح سے نفرت کرنے لگیں اور ان کے تمام اخلاقِ کریمانہ کو گھن لگ گیا اور یہ سب اس "فاسد معاشی نظام" کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما

تھا۔

بعثت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) فاسد معاشی نظام کا خاتمہ اور صالح معاشی نظام کا آغاز:

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے، اس نے ایک نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد (Deteriorative / Corrupt) نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی دستبرد کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیاتِ دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں مثلاً مردوں کے لیے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا (Silky) کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی نفوس کے لیے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں۔

بہرحال خدا تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاقِ کریمانہ اور نیک نہادی کے لیے معیار اور طاہر و پاک امور کے لیے میزان بنا دیا۔ (۱)

اسی طرح "ارتفاقات" پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغۃ، مطبع منیریہ، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ، ج ۱، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم، ص ۱۰۴

"یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادت الٰہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسومِ فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے، اسی لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [1]

ترجمہ: میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں۔

اور اسی لیے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں "رہبانیت" کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے، لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔

پس اس مقام پر دو متعارض قیاس (Contradictory Analogies) کام کر رہے ہیں، ایک یہ کہ نظامِ معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود (Appreciated) شے ہے اس لیے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے ان کے اخلاقِ کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو اس لیے کہ بکیسانہ و

---

(۱) امام مالک نے مؤطا میں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں اس حدیث میں "مکارم" کی جگہ "حسن" ذکر کیا ہے دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی عمدہ، اچھا۔ ان کی روایت کردہ حدیث بھی پڑھ لیجئے۔

"عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بعثت لاتمم حسن الاخلاق" (كذا في مشكوة، باب حسن الخلق، الفصل الثالث) ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔ جبکہ "مکارم الاخلاق" والی حدیث کے راوی حضرت مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ (مشکوۃ باب حسن الخلق، فصل ثالث)

مجبورانہ افلاس (Heedless and Bounded Poverty) سوءِ تدبیر (Mal - Administration) اور مزاج کے اختلال (Upset) کا باعث ہوتا ہے دوسرے یہ کہ نظامِ معیشت میں دولت و ثروت ایک بد ترین چیز ہے، جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت و ثروت کے اطمینانِ قلب کو تعب اور حریصانہ کد و کاوش (Tiresome & Greedy Struggle) کے زہر سے مسموم (Poisoned) کرتی اور قوموں کو استحصال بالجبر (Forced Exploitation) اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لیے آمادہ کرتی ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بد اخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت اور یادِ الٰہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مصائب کا دروازہ کھولتی ہے لہذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت ''نظام معیشت'' میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم ہو اور افراط و تفریط (Excess and Less) سے پاک ہو۔[1] اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔

پس اسلام نے اپنا یہ فرض اس طرح انجام دیا کہ اسود و احمر، عجم و عرب غرض تمام عالم کے لیے اپنے مکمل نظام (قرآن) میں نظام اقتصادی سے متعلق چند اصول اور اساسی قوانین بیان کر دیئے جو رہتی دنیا تک ہر ''عقل سلیم'' اور ''فطرت مستقیم'' کے نزدیک یکساں طور پر واجب العمل اور قابلِ قبول ہوں اور اس کی تشریح و تفسیر میں دورِ نبوت و خلافت راشدہ نے وہ عدیم النظیر عملی پروگرام پیش کیا جس کے حسن و کمال کا اعتراف دوست اور دشمن دونوں نے یکساں طور پر کیا اور جو کتابی فن بننے کی جگہ اپنے مقصدِ وجود کے لحاظ سے ہر فردِ انسانی کی خوشحالی اور رفاہیت کا حامل ثابت ہوا۔

الحاصل، اسلام کا پیش کردہ ''اقتصادی نظام'' جو آئندہ صفحات میں سپردِ قلم کیا جا رہا ہے ان ہی اصولوں پر مبنی ہے، جن کا داعی قرآنِ عزیز ہے اور جن کی شرح و تفسیر ''احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''اسلامی فقہ'' نے بیان کی ہے۔

---

(۱) شاہ ولی اللہ: مختصر از حجۃ اللہ البالغہ، مطبع منیریہ، قاہرۃ ۱۳۵۲ھ، ج ۱، اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم، ص ۱۰۴ و ۲/ ۱۰۵، ۱۰۶

اس تمہید کے بعد یہ مناسب ہے کہ اول ان مبادیات کو بیان کر دیا جائے جو ایک "صالح معاشی نظام" کے لیے "اصولِ موضوعہ" کی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر اسلام کے "معاشی نظام" کی وضاحت کی جائے اور اس کے بعد اسلامی معاشی نظام کا دوسرے نظامہائے معاشی سے موازنہ کیا جائے تا کہ اصل حقیقت منقح اور روشن ہو جائے۔

اصول موضوعہ (Declaratory Principles)(۱)

کائنات ہست و بود میں "ایک صالح معاشی نظام" کی اس لیے ضرورت پیش آتی

---

(۱) اصول موضوعہ: علماء اصول ــــــ جنہیں فقہ کی اصطلاح میں اصوی (Usuli) بھی کہتے ہیں اور جن کا کام ادلہ شریعۃ (Shar`i Arguments) یعنی قرآن مجید، حدیث و سنت نبوی، اجماع (Consensus of Jurests) اور قیاس (Analogy) کے ذریعہ نت نئے پیدا ہونے والے معاشی اور دیگر مسائل کے حل سے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے ــــــ کے نزدیک اصول موضوعہ ایسے اصول (Basic Principles) ہیں جن کا پہلے سے اپنا وجود نہیں ہو گا مگر انہیں خاص سبب (ضرورت) یا شرط یا مانع (رکاوٹ) کو دور کرنے کے لیے وضع کیا (بنایا) جاتا ہے۔ مثلاً معاہدہ بیع (Contract of Sale) کا سبب اس کا انسانی ضرورت ہوتا ہے، مگر اس معاہدہ کی تکمیل اس وقت ہو گی جب مبیع (Good Or Property For Sale) پر خریدار کا قبضہ ہو جائے، لیکن اگر مبیع مقام بیع (Point of Sale) پر موجود نہ ہو یا موجود تو ہو مگر عیب دار ہو اور خریدار کے اسے دیکھنے پر اس میں وہ عیب (Defect) معلوم ہو جائے تو یہ موقع پر مبیع کی عدم موجودگی یا اس کا عیب خریدار کے قبضہ کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔ لہٰذا یہاں معاہدہ بیع کی اجازت مبیع (مال) کا خریدار کے قبضہ میں آنا اور قبضہ میں آنے کی راہ میں جو رکاوٹ ہو اسے دور کرنے کے لیے جو اصول و قواعد وضع کیے (بنائے) جائیں گے، وہ اصول موضوعہ کہلائیں گے۔

معاشیات کی اصطلاح میں اصول موضوعہ (Derived Principles) ایسے اصول ہو سکتے ہیں جنہیں انسان کی معاشی فلاح (Economic Wefare) اور اس کے حصول اور اس حصول کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اور معاشی طریقہ یا نظام ــــــ خواہ وہ فرد کا ہو یا معاشرہ کا، قومی ہو یا بین الاقوامی ــــــ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان فلاحی اصول موضوعہ کے تابع ہو تا کہ معاشی نظام یا طریقہ (Methaod) کے وضع کرنے کا سبب (یعنی انسانی فلاح کی ضرورت) اس کی شرط (یعنی اس کا نظام یا طریقہ کی کامیابی کے لیے تمام ضروری وسائل کا ہونا) اور رکاوٹ (یعنی انسانی فلاحی نظام کی راہ میں حائل رکاوٹ) کو دور کر سکے۔

فاضل مصنف رحمہ اللہ نے معاشی نظام کے جو اصول موضوعہ (Declaratory Or Derivad Principles) بیان فرمائے ہیں وہ ایسے اصول ہیں جن کے ذریعہ سے معاشی نظام کے اعلیٰ مقاصد ــــــ انسانی فلاح، اس کے لیے ذرائع کا حصول اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں مثلاً ارتکاز و اکتنازِ دولت، معاشی وسائل پر طاقتوروں کا قبضہ، کمزوروں کا استحصال، محنت و سرمایہ میں ظالمانہ رواج اور طریقے وغیرہا) کو دور کرنا کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ موجود ہے کہ اس کو خدائے تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مگر یہ انفرادی جذبہ جب زندگی کی کشمکش اور وسائلِ حیات کی کشاکش میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو قانونِ فطرت جو کہ خدا تعالیٰ کی جانب سے تمام کائنات پر حاوی ہے، ہر ایک انسان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن یہ حیاتِ اجتماعی بغیر کسی ایسے نظام کے متصور نہیں ہو سکتی جب تک ان کے درمیان ایسا تعاون و اشتراک موجود نہ ہو جس کی بنیاد عدل اور حقِ معیشت کی مساوات پر قائم ہو تاکہ وہ ''صالح معاشی نظام'' کے لیے کلید بن سکے اور اس قسم کا تعاون و اشتراک جب ہی عالمِ وجود میں آسکتا ہے کہ نظامِ معاشیات میں حسبِ ذیل اصول کارفرما ہوں:

❶ وہ نظام ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرہ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔

❷ ایسے اسباب و وسائل کا قلع قمع کرتا ہے جو معاشی دستبرد کا موقعہ مہیا کر کے افرادِ انسانی کے درمیان ظلم و استبداد کی راہیں کھولتے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔

❸ دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظامِ معیشت پر قابض و مسلط ہونے سے باز رکھتا ہو تاکہ معاشی نظام تمام کائناتِ انسانی کی فلاح کی بجائے مخصوص طبقوں کے اغراض کا آلۂ کار بن کر نہ رہ جائے۔

❹ محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن (True Balance) قائم کرتا اور ایک کو دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دستبرد سے بچاتا ہو۔

معاشیات کے جدید نظریئے (Modern Theories of Economics):

ان اصولوں پر تفصیلی نظر ڈالنے سے قبل یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ موجودہ علمی دور میں ''علم معاشیات'' کے متعلق جو موشگافیاں کی گئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے

کہ معاشیات پر جن نقطۂ ہائے نظر سے بحث کیا جانا ممکن ہے، وہ تین ہیں "مابعد الطبیعاتی علمی نقطۂ نظر" (Meta Physical Scientific Point of View)، "طبیعاتی علمی نقطۂ نظر (Physical Scintific Point of View) اور "تمدنی نقطۂ نظر (Social Point of View) اور علماء معاشیات ان کو حسبِ ترتیب، معیاری نقطۂ نظر، ترتیبی نقطۂ نظر (Ordinal Point of View) اور افہامی نقطۂ نظر سے تعبیر کرتے ہیں۔

معاشیات معیاری (Normative Ecomomics):

معاشیات معیاری کسے کہتے ہیں اس کو معاشیاتی علوم کے ایک بڑے ماہر کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

معاشیات معیاری کا مقصد معیشتِ موجودہ کی تشریح اور توجیہ نہیں بلکہ "معیشتِ صحیحہ" کا پتہ چلانا ہے، وہ محض یہ معلوم کرنے پر قانع نہیں کہ معاشی کل پرزے کیسے کام کرتے ہیں، بلکہ وہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ معاشی کل ہونی کیسے چاہیے؟

معاشیات معیاری کا مطمحِ نظر بہت بلند ہے وہ تو مقاصدِ معاشی کی تعیین (Determination) کرنا چاہتی ہے اور اس تعیینِ مقاصد کو وہ "علم" (Science) کا کام بتاتی ہے، وہ ان ازلی اور ابدی (Eternal) قوانین کے انکشاف کو اپنا فریضہ عملی جانتی ہے جو سارے عالم اخلاقی میں رائج ہیں اور جن کے زیر فرمان معیشتِ انسانی کا علاقہ بھی ہے، ان کا مقصدِ تلاش اور مطلوبِ جستجو "معیشت صحیحہ" (Righteous Economics) ہے، یعنی وہ معیشت جو مقصدِ حیاتِ انسانی اور مقصدِ کائنات کے مطابق اور ان سے ہم آہنگ ہو، یہی معیشتِ صحیحہ و صالحہ ان معیاریوں (Proposers and Followers of Normative Economics) کا مرکزی تصور ہے جس سے دوسرے تمام مسائل مثلاً "مناسب اور صحیح اجرت"، "مناسب اور صحیح قیمت"، "مناسب اور صحیح تقسیمِ دولت"، "سود کا جواز وعدم جواز" خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ ان کے نظام میں قدرِ اعلیٰ (High Value) "معیشتِ صحیحہ" ہے باقی سب اس سے ادنی اور اس کے

ماتحت قدریں ہیں، معاشیات کا کام یہ ہے کہ اس قدرِ اعلیٰ کا پتہ چلائے ماتحت قدروں کی اس سے مناسب و مطابق تشکیلات (Formation) کو معلوم کرے اور جو معاشی ادارے (Economic Institutions) واقعی موجود ہیں ان کو اس معیار پر پرکھ کر ان کے کھرے کھوٹے، صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔[1]

ترتیبی معاشیات (Ordinal Economics):

"ترتیبی معاشیات"[2] علم طبیعات کی ایک شاخ ہے جو علوم طبیعی کی اساس و بنیاد پر اپنی عمارت استوار کرتی ہے۔ مگر عملی زندگی میں اس کی قدر و اہمیت کے

---

(۱) ذاکر حسین، ڈاکٹر: معاشیات، مقاصد و منہاج: ص ۱۰، ۱۱

(۲) ترتیبی معاشیات (Ordinal Economics) کا تصور دینے والے وہ معیشت دان تھے جنہوں نے افادہ (Utility) کی ترتیبی پیائش (Ordinal Measurement) کا نظریہ دیا، جس کے مطابق کسی شے (Good) کے استعمال سے اس سے حاصل ہونے والے افادہ کی ترتیبی پیائش ممکن ہے یعنی اس شے (Good) مثلاً سیب کی اکائیوں (Units) کے ترتیب وار (مثلاً پہلا سیب، دوسرا سیب، تیسرا سیب وغیرہا کے) استعمال سے اُن اکائیوں میں سے ہر ایک کا ترتیب وار افادہ ماپا جا سکتا ہے اس نظریہ سے انہوں نے معاشیات کو افادہ کا علم بنانے میں سائنٹفک بنیادوں پر کام کیا۔ اس سے قبل افادہ کو عددی شکل (Cardinal) (یعنی ۱، ۲، ۳، ۴ آگے تک عددی طور پر قابل پیائش تصور کیا جاتا رہا ہے اور ہے بھی۔ مختلف اشیاء کو باہم جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور ایک شے سے حاصل ہونے والا افادہ کسی دوسری شے کے صرف (Consumption) سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ ہر شے کا افادہ الگ الگ وجود رکھتا ہے۔ اور مختلف اشیاء سے حاصل ہونے والا افادہ جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے مؤیدین (Supporters) میں جرمن معیشت دان گوسن (Gossen) (۱۸۱۰ء تا ۱۸۵۸ء)، پروفیسر جیونز (Prof Jevons) (۱۸۳۵ء تا ۱۸۸۲ء) اور والرس (Walres) (۱۸۳۴ء تا ۱۹۱۰ء) شامل تھے۔ بعد کے معیشت دان جن میں ارونگ فشر (Irving Fisher) اور پروفیسر ایجورتھ قابلِ ذکر ہیں ــــــ نے اس نظریہ پر اعتراض کیا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ افادہ ایک نفسیاتی کیفیت (Psychological Condition) کا نام ہے، جس کی پیائش ممکن ہی نہیں۔

لہٰذا اٹلی کے مشہور معیشت دان ویلفرڈ پریٹو (Velfredo Pareto) (۱۸۴۸ء تا ۱۹۲۳ء) نے افادہ کی ترتیبی پیائش (Ordinal Measurement) کا نظریہ پیش کیا اس ترتیبی پیائش نے نظریہ مختتم ترجیح (Theory of Marginal Preference) کو جنم دیا یوں معاشیات نے افادہ کا علم (Science of Utility) کا رخ اختیار کیا اور یہ علم ترتیبی معاشیات (Ordinal Economics) کا روپ دھارتا نظر آیا۔ جو بعد میں اثباتی معاشیات (Ppsitive Economics) کی اصل یا شاخ بن گیا۔

اعتراف کے باوجود اس کا سنگ بنیاد کیا ہے؟ وہ محترم مصنف کے اس پارۂ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان تینوں گروہوں (معروضیے (Objectivists)، موضوعیے (Subjectivists)، ریاضیاتی (Mathematicians) میں قدر مشترک یہ ہے کہ سب کے سب فلسفہ کے مقابلہ میں "علم" کے حامی ہیں یعنی جو کچھ ہے اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہونا چاہیے اس سے سروکار نہیں رکھتے، تمام مافوق التجربہ (Above Experiment) اور مابعد الطبیعی (Meta Physical) عناصر سے اپنے علم کو پاک اور صاف رکھنا چاہتے ہیں اور معاشیات میں اخلاقی احکام کے سختی سے مخالف ہیں، ان سب کے نزدیک علوم طبیعی زیادہ مکمل علوم ہیں انہیں سے تمام دوسرے علوم میں خصوصاً معاشیات میں نمونہ کا کام لینا چاہیے۔ لہٰذا ترتیبی معاشیات کا مقصد یہ ہے کہ قوانین مرتب کرے تاکہ ہر منفرد مظہر معاشی (Every Individual Economic Activity) کو کسی قانون کے تحت میں بہ حیثیت ایک مخصوص دفعہ کے لایا جاسکے کہ یہی ان کے نزدیک علم کی کل کائنات ہے۔[1]

علم المعیشت کے مشاہیر علماءِ یورپ اسی نظریئے کے حامی ہیں مثلاً جان اسٹارٹ مل (Jahn Staurt Mill) کارل منگر (Karl Minger) کارل مارکس (Karl Marx) پریٹو (Pareto) وغیرہ۔

افہامی معاشیات (Emperical Economics):

"افہامی معاشیات" کو علم تمدن (Social Science) کا ایک جزء سمجھنا چاہیے اور تمدن سے بھی وہ تمدن مراد ہے جو انسان ہی کا تمام ساختہ پرداختہ (Man Made) ہے اس لیے کہ افہام کی بنیاد و اساس اس اصول پر قائم ہے کہ ہم جنس (Homogenous) ہی کے لیے ہم جنس کا سمجھنا ممکن ہے، چنانچہ اس کی تعبیر یوں کی جاتی ہے:

"افہام کا یہ نظریہ علم ان بنیادی افکار پر مبنی ہے کہ ہم جنس کا علم یعنی

(۱) حوالہ بالا: ص ۵۷

ہم جنس کا سمجھنا ہم جنس ہی کے لیے ممکن ہے اور یہ کہ ہم پورے طور پر اور ہر پہلو سے اس چیز کو جان سکتے سمجھ سکتے ہیں جسے ہم بنا بھی سکیں، مظاہر تمدن کے فہم کی کوشش میں چونکہ مدرک (Grasper) بھی ذہنی ہے اور مدرک (Grasped) بھی تشکیل ذہنی، اس لیے دونوں ہم جنس ہیں اور اس لیے پورا علم ممکن ہے، پھر سارا تمدن آدمی کا ساختہ پرداختہ ہے اسی نے اسے بنایا ہے اس لیے یہ اسے سمجھ سکتا ہے، قدرت چونکہ ذہنِ انسانی کی خارجی شکل (Apparent Shape) نہیں ہے بلکہ امر الٰہی کی خارجی تشکیل (Apparent Formation) ہے، قدرت انسان کی ساختہ پرداختہ بھی نہیں ہے اس لیے قدرت کا سمجھنا قدرت کا پورا پورا حقیقی علم ذہن انسانی کے لیے ممکن نہیں ہے، لیکن معاشیاتِ افہامی چونکہ صرف تمدن کے ایک ٹکڑے کو سمجھنا چاہتی ہے، متمدن زندگی یا انسانی زندگی کے مقصد و منشاءِ مضمر کا پتہ چلانا نہیں چاہتی، اسی لیے افہامی معاشیات فلسفہ یا مابعد الطبیعات یا مذہب نہیں بلکہ سیدھا سادہ تجربی (Experimental) جماعتی (Collective) تمدنی (Social) علم ہے۔"[1]

---

(۱) حوالہ بالا: ص۷۹، ۸۰، الغرض یہ تو معاشیات کے وہ نظریے یا پہلو یا اقسام ہیں جو آج سے تقریباً ایک صدی قبل حضرت مؤلف رحمہ اللہ کے دور میں موجود تھے کیونکہ مؤلف کی اس کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" کا پہلا ایڈیشن آج سے ۷۲ سال قبل ۱۳۵۸ھ، ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر ہند کی کتاب "معاشیات، مقصد و منہاج" ـــــ جس سے مؤلف نے معاشیات کی ان قسام کے نظریات کو لیا ہے وہ اس سے کئی سال پہلے چھپی ہوگی۔ گو ان کا تذکرہ اپنی اہمیت رکھتا ہے اور کسی نہ کسی نئے نام یا اصطلاح (Term) سے ان کا استعمال جدید معاشیات میں موجود رہے گا۔ مگر جدید معاشیات اپنی بڑھتی ہوئی اہمیت اور زندگی کے مختلف مسائل کو زیر بحث لانے اور اُن سے حاصل شدہ نتائج کو ان کے حل کے لیے استعمال کرنے کی بنا پر اس کی روز بروز شکلیں پہلو اور اقسام بدلتی اور بڑھتی جارہی ہیں اور نئے نئے ناموں سے سامنے آرہی ہیں مثلاً نظریاتی معاشیات (Theoretical Economics)، پالیسی معاشیات (Policy Economics)، اطلاقی معاشیات (Applied Economics)، معیاری معاشیات (Normative Economics)، بیانیہ معاشیات (Descriptive Economics)، زرعی معاشیات (Agriculturar Economics)، صنعتی معاشیات (Industrial

(Economics) اور نہ جانے کیا کیا کچھ؟
مگر جدید معیشت دانوں نے معاشیات کی مذکورہ تمام اقسام یا پہلوؤں کو دو قسموں کے تحت بیان کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور اس پر آج کل وہ عمل پیرا بھی ہیں، جدید معیشت دانوں نے گاہے انہیں معاشی تجزیہ کے دو انداز (Two Approaches To Economics Analysis) کا نام بھی دیا ہے۔ یہ دو انداز یا پہلو ہیں: ① جزوی یا جزئی معاشیات (Micro- Economics) ② کلی یا کلیاتی معاشیات (Macro- Economics)۔ آئیے ان کا تعارف کرادوں۔

❶ جزوی معاشیات میں کسی معاشی نظام کو بنانے یا جاننے کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں یا اس کے الگ الگ شعبوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے مثلاً ملکی صنعت میں صرف فولاد یا ٹیکسٹائل یا آٹا کی صنعت کا ذکر کرنا بلکہ ٹیکسٹائل کی صنعت (Textile Industry) کا جائزہ لیتے وقت اس کے کسی ایک یونٹ ہی کا تجزیہ کرنا یا قیمتوں کا جائزہ لیتے وقت کسی ایک خاص شے (Good) مثلاً پٹرول یا چینی یا آٹا وغیرہ کی قیمت کا جائزہ لینا۔ گویا بقول پروفیسر سموئیل سن (Prof .Semuel Son) جزوی معاشیات میں کسی معیشت کے جزئی یا انفرادی اجزاء و عناصر کے رویے (Behaviour) کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ مثلاً کسی خاص ایک شے (Good) کی قیمت کا تعین یا کسی ایک صارف (Consumer) کا طرز عمل یا کسی ایک کاروباری ادارہ کے رویہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جدید معاشیات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ۱۹۳۶ء تک کے تمام معاشی لٹریچر پر جزئی معاشیات کا غلبہ تھا، یہاں آپ کو زیادہ تر زور فرد، فرم صنعت کے رویہ اور نظریہ قیمت (Price Theory) پر ہی نظر آئے گا۔

❷ کلی معاشیات میں کسی ملک یا نظام کے معاشی معاملات کو بحیثیت کل (As aWhole) زیر بحث لایا جاتا ہے اس کے معاشی مجموعات کا مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً قومی پیداوار، قومی آمدن، قومی اخراجات، روزگار کی مجموعی حالت، قومی قرضے، قومی بجٹ، برآمدات و درآمدات (Exports & Imports) وغیرہا مگر جے ایم کینز (John Maynard Keyns) نے ۱۹۴۰ء، ۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری کے نقصانات سے متاثر ہو کر ۱۹۳۶ء میں اپنی مشہور کتاب روزگار، سود اور زر کا نظریہ عام (General Theory of Employment, Interest and Money) لکھ کر دراصل کلی معاشیات کا آغاز کیا۔ مگر عملی معاشی معاملات اور رویوں میں یہ دونوں انداز یا پہلو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے مثلاً کوئی ملک بحیثیتِ مجموعی صنعت میں ترقی پذیر ہو مگر کوئی خاص صنعت زوال پذیر ہو یا ملک میں فی کس آمدنی کا اندازہ مجموعی آمدنیوں کے مجموعہ کو آبادی کے مجموعہ پر تقسیم کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ ملکی سطح پر مجموعی طور پر فی کس آمدنی (Per capita Income) کی صورت حال حوصلہ افزا ہو مثلاً ۲۰ ہزار فی کس ہو جبکہ درحقیقت آبادی کا ایک بڑا حصہ خط غربت (Porerty Line) سے بھی نیچے کی زندگی گزار رہا ہو، جیسا کہ پاکستان میں ہے یا بعض بڑے بڑے کاروباری ساہو کار (Business Maganates) ہوں مگر ان کے پہلو میں کوئی مفلوک الحال تنگدست بھی ہوں غالباً اسی لیے پروفیسر ایکلے رقم طراز ہیں۔

درحقیقت کلی اور جزوی معاشیات میں خطِ امتیاز (Disceriminatory Line) کھینچنا مشکل ہے۔ معاشیات کا حقیقی عمومی نظریہ (Real General Theory of Economics) ان دونوں کو شامل ہے جزوی نظریہ انفرادی طرز عمل،

یہ ہیں علم المعیشت کے وہ نظریئے جو موجودہ دور میں اس تمدنی علم کے مایۂ ناز سمجھے جاتے اور اس کو ایک "علم وفن" (Science & Art) کی حیثیت بخشتے ہیں۔

اسلامی معاشی نظریہ اور جدید نظریے:

لیکن اسلامی "نظامِ معیشت" کی حدود ان نظریوں سے زیادہ وسیع اور اس کی پرواز فکر (Range of Thought) ان سے کہیں زیادہ بلند ہے، وہ جیسا کہ گذشتہ سطور

انفرادی پیداواروں، انفرادی آمدنیوں اور قیمتوں کی وضاحت کرے گا۔ اور ان انفرادی نتائج کے مجموعے (Aggregates) اور اوساط (اوسطیں۔ Averages) ایسے مجموعات (کل Aggregates) مہیا کریں گی جن سے معاشیات کل کا واسطہ ہے۔

اسلامی معاشیات اور جزوی و کلی معاشیات:

اسلام جس طرح خود ایک جامع نظامِ حیات ہے۔ اس کا مجوزہ اقتصادی نظام بھی ایک جامع نظام ہے۔ جس کی معاشی تعلیمات ہر دور، ہر خطہ اور ہر قسم کے حالات میں اور ہر انسان کے لیے وافر رہنمائی رکھتی ہیں۔ یہ صرف خوش عقیدگی کا خوش کن دعوی نہیں بلکہ اپنی ذات میں واضح دلیل بھی ہے۔ آپ مصنف رحمہ اللہ کی کتاب پڑھ جائیے یا اسلام کے معاشی نظام پر مرتب دیگر مسلم مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرلیں آپ کو ہر معاشی پہلو پر رہنمائی کا سامان ملے گا۔

آپ جزوی اور کلی معاشیات کو لیں۔ یہاں انفرادی معاشیات (Individual Economics) فرد کے مصارف، ایک فرم کی کارکردگی، ذاتی وقف خیرات، انفرادی زمینداری، کاشتکاری، فرد کے مال پر جماعتی حقوق، وصیت و وراثت وغیرہ جزئی معاشیات (Micro Economics) کے موضوعات ہیں۔ جب کہ بیت المال یا سرکاری خزانہ، زرعی ترقیات کے مسائل، ٹیکسوں کا نظام، تنخواہوں کا نظام، سرکاری شعبہ، برآمدات درآمدات (Exports & Imports) وغیرہا کلی معاشیات (Macro- Economics) کے موضوعات ہیں اور ان دو قسموں یا اندازوں کا بیان حضرت مؤلف رحمہ اللہ کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں آپ کو ملے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ جزئی اور کلی معاشیات کے جدید معاشیات کی طرز کے عنوانات نہیں ہوں گے۔ البتہ موضوعات اور مواد (Materials) ہوں گے۔ جدید رواجی معاشیات (Traditional Economics) کی طرح یہاں اسلامی اقتصادیات میں بھی جزوی اور کلی کی تعلیمات آپس میں ملی جلی ہوتی ہیں۔ مثلاً جہاں اسلام معاشی استحصالی حربوں (Economics Exploitative Tools) جیسے سود، جوا، دھوکہ دہی، خیانت، چوری، اکتنازِ دولت وغیرہ کو حرام قرار دے رہا ہے تو یہ حرمت (Prohibition) فرد کے لیے بھی ہے اور اجتماع کے لیے بھی، جب وہ اسراف و تبذیر (Spend Thrift) کو ممنوع قرار دیتا ہے تو وہ جزوی معاشیات میں بھی ہے اور کلی میں بھی، الغرض، اسلامی معاشی تعلیمات، جزوی اور کلی معاشیات (Micro & Macro) دونوں کو شامل ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ جان لیں گے۔ (واللہ اعلم)

میں کہا جا چکا اور آئندہ تفصیلی طور پر آئے گا۔ اپنے معیاری نقطۂ نظر میں ان تمام افکار کا بھی حامل ہے جن کا ذکر "مقالہ"[1] میں موجود ہے اور ان سے وسیع تر افکار کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، اسی طرح وہ افہامی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ وقیع (High Toned) اور بہت زیادہ نافع (More Beneficial) نظامِ عمل کا بانی اور مؤسس (Founder) ہے۔

اسلامی معاشی نظریہ اور معیاری معاشیات کا نظریہ:

مثلاً جب کہ "معیاری معاشیات" کا اساسی تصور "معیشتِ صالحہ" (Righteous Economics) کا تصور ہے، تو گزشتہ سطور میں اسلامی نظامِ معاش میں "معیشتِ صالحہ" کی جو تشریح کی گئی ہے کیا اس سے بڑھ کر معیشت کے صالح ہونے کا تصور کسی بھی معاشی نظام میں موجود ہے اور کسی معاشی نظام کا نظریۂ فکر اس معراج اور رفعت (Height) پر پہنچا ہے کہ وہ "معاشی نظام" کی غرض و غایت صرف رفعِ حاجات و احتیاجات (Fulfillment of Needs & Necessities) کے وسائل کی درمیانی خلیج (Gap) کو پر کرنا ہی قرار نہ دیتا ہو بلکہ اس کو ذریعہ بناتا ہو اقوام کی باہمی اخوت و ہمدردی اور مساوات و مواسات کا، اور وسیلہ قرار دیتا ہو اخلاقی رفعت اور ابدی سعادت (Ever Blessing) کے حصول کا؟

اسلامی معاشی نظریہ اور افہامی معاشیات کا نظریہ:

اور جب کہ "افہامی معاشیات" کا نقطۂ نظر، نظر اور فکر کی جگہ موجودہ عملی معاشیات کا محور و مرکز ہے اور تمدن کے اس شعبہ کو جماعتی، تمدنی اور تجرباتی حیثیت سے بروئے کار لاتا ہے تو آئندہ صفحات اس امر کی شہادت دیں گے کہ تمدن کے اس ٹکڑے کو جس طرح اسلامی علم المعیشت نے سلجھایا اور اس کو طبقاتی جنگ اور سرمایہ داری کے غلبہ دونوں سے جدا رہ کر جس طرح عملی کسوٹی پر کسا اور تجرباتی خراد پر اتارا

---

(۱) معاشیات، مقصد، اور منہاج

اس سے بہتر اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر دوسرا کوئی نظامِ عمل نظر نہیں آتا۔

اسلامی معاشی نظریہ اور ترتیبی معاشیات کا نظریہ:

رہا ''ترتیبی معاشیات کا نظریہ'' تو وہ اپنی فلسفیانہ اور طبیعاتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے اسلامی نظریۂ معاشیات سے بالکل جدا بلکہ متضاد ہے۔ البتہ اس کے باوجود بھی اس کے چند جزوی پہلو جو اس نظریہ کی پابندی سے الگ خود اپنی جگہ مستقل ہونے کی حیثیت سے اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتے ہیں، سو اسلام کا نظامِ معاشی ان خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے مثلاً جبکہ معاشی نقطۂ نظر میں سب سے پہلا معاملہ ان اعمال سے وابستہ ہے جو رفع حاجات کے وسائل کی درمیانی خلیج کو پاٹتے ہیں تو خواہ کسی اسلوب سے بھی ہوں ان اعمال میں نقص و کمال اور تنزل و ترقی کا ہونا لازمی ہے اور یہی سبب بن جاتا ہے ایک ایسے فلسفہ کا جو ترتیبی درجات پر بحث کرتا اور ان کے نقص و کمال کو واضح کرتا ہے اور یہ اسلامی معاشیات میں اگرچہ کوئی خاص فن کی حیثیت نہیں رکھتا تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس کو ''ارتفاقات'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ اور اس کے مختلف درجات قائم کیے ہیں اور ان کو عملی معاشی نظام، تدبیر منزل، سیاست وغیرہ کے لیے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت دی ہے، پس موجودہ علم المعیشت کے یہ نظریئے ایک علم و فن کی حیثیت سے ''اسلامی معاشیات'' میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اس قسم کی فنی اور علمی کاوشوں کے مقابلے میں ایسے اصول اور ان اصول کے ماتحت ایسے عملی نظام کا داعی ہے جو انسانوں کی عام رفاہیت، خوشحالی اور ان کے امن و اطمینان کے لیے آلۂ کار بنیں اور معاشی راہ سے انسانوں کے درمیان غالب و مغلوب اور ظالم و مظلوم کی تقسیم کو مانع ہوں۔

جدید معاشیات کی ناکامی:

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ ''جدید علمی دور'' منجملہ دیگر علوم و فنون کے ''علم

المعیشت" کو بھی بڑی حد تک ایک علم و فن کی حیثیت حاصل ہے اور بڑے بڑے علماء یورپ و ایشیا نے اس پر ضخیم تصانیف (Voluminous Publications) پیش کی ہیں لیکن اس تمام این و آں اور چنیں و چناں کے باوجود "علم المعیشت" کا اصل مقصد یعنی عام رفاہیت و خوش حالی آج تک عنقا بنی ہوئی ہے اور دولت و ذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں اس طرح آ گئے ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لیے زندگی "موت" سے زیادہ بھیانک بن گئی ہے، بخلاف اس دور (دورِ نبوت و خلافتِ راشدہ) کے وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگرچہ عنقا تھیں مگر عام خوش حالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلالحاظ مسلم و کافر، مومن و مشرک مرد و عورت، صغیر و کبیر اور اجیر و مستاجر سب ہی امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے اور تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ اس دور میں ایک وقت مملکتِ اسلامیہ کے اندر ایسا آیا کہ لوگ صدقات کے مال کو لیے پھرتے تھے مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا۔[۱]

---

(۱)ابن کثیر، عماد الدین، البدایة والنهایة، قاهرة: ٥/ ٦٤

یہاں مؤلف رحمہ اللہ اسلام کے زریں ادوار اور بالخصوص حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں موجود مسلمانوں اور عام رعایا کی معاشی خوشحالی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جن ادوار میں اسلام کا صالح معاشی نظام کام کر رہا تھا جس کی بدولت ایک طرف اغنیاء کے اموال محفوظ تھے تو دوسری طرف محتاجوں کی معاشی حاجات پوری ہو رہی تھیں۔ جب ایسی حالت ہو کہ مال ان کے واقعی مستحقین (Beneficiaries) تک پہنچتا رہے تو زاویوں (Narrators) کا یہ بیان چنداں موجب حیرت نہیں کہ ان مبارک ادوار میں لوگوں کو فراخی نصیب ہو گئی تھی کہ مالدار زکاۃ کا مال لیے لیے پھرتے تھے اور کوئی محتاج لینے والا نہیں ملتا تھا۔ آئیے آپ شمالی افریقہ میں متعین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے عامل زکاۃ (Zakat Collector) یحییٰ بن سعد رحمہ اللہ کا یہ بیان پڑھ لیں۔

مجھے امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے افریقہ میں صدقات کی وصولی کے لیے روانہ فرمایا۔ میں نے صدقات اکٹھا کیے اور ایسے محتاج لوگوں کو تلاش کیا جنہیں صدقات تقسیم کر سکوں، مگر ایسا شخص نہ ملا جو صدقہ قبول کرے۔ بالآخر اس صدقہ (کے مال) سے غلام خرید کر انہیں آزاد کر دیا۔ (ابن عبدالحکیم: سیرة عمر بن عبدالعزیز رحمه الله، بیروت، ۱۳۸۷ء: ص ٦٩)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امتِ مسلمہ کو ایسی خوشحالی کی خبر بھی دے دی تھی گو اس اطلاع میں اغنیاء

معاشی نظام کا منشاء:

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا میں کوئی کام بغیر کسی منشاء اور محرک (Motive) کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور ہر عمل کی پشت پر ایک خاص ذہنیت کار فرما ہوتی ہے، پس کسی "معاشی نظام" کے صالح اور فاسد ہونے کا معیار بھی اس کے محرکات اور اس کے منشاء کے صالح اور فاسد ہونے پر موقوف ہے، سو اگر اس پشت پر فاسد ذہنیت (Corrupt / Deteriorative Intention) کام کر رہی ہے اور اس کے محرکات سر تا سر فاسد ہیں تو بلاشبہ وہ نظام "فاسد نظام" ہے اور اگر اس کی پشت پناہی ایک صالح ذہنیت (Righteous Intention) کر رہی ہے اور اس کے تمام تر محرکات صالح اور اس کا منشاء خیر ہی خیر ہے تو اس نظام کے صالح ہونے میں پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

—— صدقہ دینے والوں —— کو تنبیہ تھی مگر اس تنبیہ میں خوشخبری بھی پنہاں تھی، آیئے آپ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد پڑھاؤں۔

> عن حارثة بن وهب رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: تصدقوا فأنه یأتی علیکم زمان یمشی الرجل بصدقته فلا یجد من یقبلها، یقول الرجل: لو جئت بها بالأمس لقبلتها، فإمّا الیوم فلا حاجة لی بها. (متفق علیه، بخاری کتاب الزکاة، باب الصدقة قبل الرد، مشکاة المصابیح، کتاب الزکاة باب الانفاق وکراهیة الامساك، الفصل الاول)
>
> ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقہ دیا کرو، تم پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب ایک (مالدار) شخص اپنا صدقہ لے کر نکلے گا مگر اسے کوئی (صدقہ) قبول کرنے والا نہیں ملے گا وہ (جس) شخص (کے پاس صدقہ کا مال لے کر جائے گا) کہے گا: اگر تم کل (یا ماضی قریب میں لے کر آتے تو میں ضرور اسے قبول کر لیتا) مگر آج اس کی ضرورت نہیں رہی۔

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ الخزاعی ہیں۔ آپ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال فرمایا۔ (ابن حجر عسقلانی: الاصابة فی تمییز الصحابة رضی الله عنهم: ۱/۲۹۹ - ابن الاثیر: اسد الغابة: ۱/۳۵۹)

اس اصول کے پیشِ نظر جب ہم "معاشی نظام" پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور فکرِ عمیق سے کام لے کر جانچتے ہیں تو اس کے محرکات و منشاء یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صورتوں میں محدود پاتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ ذاتی نفع کمانے کا محرک:

ایک یہ کہ "معاشی نظام" کو اس لیے قائم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے تا کہ "ھل من مزید" (Is there any More to come?) کا نعرہ نفع بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جا کر ختم نہ ہو سکے، یہ نظریہ "سرمایہ دارانہ نظام" (Capitalism) کا بانی اور مؤسس ہے اور اسی کے زیر اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے۔

"فورڈ کمپنی" کا مالک کروڑ پتی اور ارب پتی ہونے کے باوجود بھی مارکیٹ میں ترقی اور اضافہ ہی کا خواہش مند رہتا ہے کیونکہ وہ معاشی نظام کے جس ماحول میں جدوجہد کر رہا ہے اس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ نفع کمانے (Profit Maximization) اور سودے بازی (Bargaining) پر قائم ہے اور یہ صرف اربابِ دولت و ثروت ہی کو اور زیادہ بلند کرتا ہے اور باقی تمام انسانی آبادی کو افلاس و احتیاج (Porerty & Need) سے دوچار بناتا ہے۔

ضروریات زندگی اور رفع حاجات کا محرک:

یہاں رفع حاجات و تکمیل ضروریات (Fulfillment of Needs) کے وہ محرکات کام نہیں کرتے جو عام رفاہیت کا پیغام لائیں اور عام خوشحالی کو بحال کریں۔
دوسرے یہ کہ معاشی نظام کا محرک اور منشاء نفع بازی نہ ہو بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور رفع حاجات ہو، اور اس کے منصۂ شہود پر لانے کے لیے صرف یہ ذہنیت کام کر رہی ہو کہ انفرادی و اجتماعی احتیاجات کو پورا کیا جائے نہ کہ زیادہ سے زیادہ نفع کو پیش نظر رکھا جائے۔

اسلامی معاشی نظام کا محرک و منشاء:

معاشی نظام کے ان ہر دو محرکات (Motives) یا ہر دو ذہنیتوں (Intensions) میں سے اسلام ایک ایسے معاشی نظام کا بانی اور موسّس ہے کہ جس کی بنیاد صرف کائنات انسانی کی رفع حاجات وضروریات اور انفرادی و اجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے، وہ معاشیات کو دولت مندوں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان نہیں بنانا چاہتے بلکہ رفع حاجات و تکمیلِ ضروریات کے لیے ایک مفید اور نفع بخش ذریعہ بنا کر اس کی افادیت کو عام کرنا چاہتا ہے۔ (بقول مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ)[1]

(گویا اس نظام معیشت میں) بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے، کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہو گا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت، بہ حیثیت جماعت کے خوشحال ہوتی جائے گی، قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے، لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے

---

(۱) مولانا آزاد، محی الدین احمد ابو الکلام آزاد، مولانا خطاب امام الہند بہت بڑے قادر الکلام صحافی، مقرر، شاعر، عالم، سیاستدان، معیشت دان، مؤرخ اور نہ جانے کیا کیا کچھ تھے۔

ع گر ایک ادا ہو تو اپنی قضا کہوں

آپ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں مولانا خیرالدین رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں آپ کے والد آپ کو لے کر ہندوستان آگئے۔ آپ نے علوم دینی و شرقی کی تعلیم مولوی محمد یعقوب رحمہ اللہ اور مولوی عبدالحق خیر آبادی، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس دوم شمس العلماء مولانا سعادت حسین رحمہ اللہ سے حاصل کی۔ مگر آپ کی تربیت و تعلیم اور شخصیت کے نکھار میں بڑا کردار آپ کے والد محترم کا تھا، جو بہت بلند پایہ عالم فاضل تھے۔ آپ مسلمانان ہند کے سیاسی رہنما، آزادی ہند کے ہیرو، بدیشی حکمرانوں کے نہ مصالحت کرنے والے مخالف تھے۔ تحریر وخطابت کے بادشاہ تھے، بہت سی نہایت مقبول تصانیف چھوڑی ہیں جن میں تذکرہ، ترجمان القرآن جلد اول و دوم مع تفسیر سورۃ فاتحہ، قول فیصل، مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب، جامع الشواہد، غبار خاطر، البلاغ اور الہلال کے شمارے قابلِ ذکر اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ آپ نے ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۱، ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب دارالبقاء کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔ (ماخوذ از غبار خاطر، تذکرہ)

تمام افرادِ قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے۔ جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔ (۱)

مذکورہ مباحث کا خلاصہ:

اس تمام تر تفصیل کے بعد اب غور کیجئے کہ جس معاشی نظام کے کل پرزے اس طرح ڈھالے گئے ہوں، اس کا نشوو نما اور اس کی ترقی ایسے ترتیبی اجزاء پر قائم ہو جو صرف طبیعات ہی تک آکر نہ ٹھہر جائیں، اخلاقی اور مذہبی محاسن کو بھی اپنی آغوش میں لیں، بلکہ مذہب اور دستورِ الٰہی کے زیرِ فرمان عالم وجود میں آئیں اور اس کے محرک فلاح دارین اور سعادتِ کائنات کے وہ اصول ہوں جن میں معاشیات رفع حاجات اور تکمیل ضروریات کے لیے ہو نہ کہ زیادہ سے زیادہ سودا بازی اور نفع طلبی کے لیے تو ایسے صالح اور صحیح نظام معاشی کا وجود بلاشبہ دنیا کے لیے پیامِ رحمت اور دعوتِ امن و سلامتی ہے۔

الحاصل ''اسلامی معاشی نظام'' ایسا بہتر نظام ہے جو اپنے اندر علم المعیشت کے قدیم و جدید نظامہائے مذہبی و عقلی کے تمام محاسن سموئے ہوئے ہے اور اس سے بھی زیادہ خوبیوں کا مالک ہے اور ان کے معائب و نقائص (Short Comings & Demerits) سے یکسر خالی بلکہ ان کے مسموم اثرات کا بے نظیر تریاق (Antidote) ہے اور ان تمام محاسن کے علاوہ اس کو یہ برتری حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ جس کی بنیاد انتقام (Retaliation) یا طبقاتی منافرت (Class Harted) جیسی خام کاریوں پر رکھی گئی ہو، بلکہ وہ نظامِ کائنات کے خالق کا بتایا ہوا نظام ہے۔



(۱) ابو الکلام آزاد، مولانا: ترجمان القرآن، ج ۲، مقبول اکیڈمی، لاہور، سن طباعت درج نہیں: ص ۱۳۲

باب ــــــ ۲

صالح معاشی نظام کے اصولِ معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں

(Principles of Ecnomics In The Light of The Holy Qur'ān)

یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن عزیز نے اپنی اساسی روش کے مطابق عبادات، معاشرتی معاملات، سیاسیات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح معاشیات میں بھی صرف اساسی اصول (Basic Principles) اور معجزانہ اختصار (Succinct) کے ساتھ اصول و کلیات (Principles & Theorems) کا ہی ذکر کیا ہے، اور ان کی تفصیلات و تشریحات کو ارشادات نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) (احادیث) اور ان سے مستنبط احکام (Inferred Rules) (فقہ) کے حوالہ کر دیا ہے معاشیات سے متعلق قرآن عزیز نے جن اساسی اصول کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

حق معیشت میں مساوات (Equality In Right To Livelihood):

رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذات الٰہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے اور اگرچہ اس کی مصلحتِ عام (Welfare For All) اور حکمتِ تام (Perfect Wisdom) کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوتِ درجات (Gradations) پایا جائے، لیکن امارت و غربت کے فطری تنوع (Natural Variation) کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت (Destitute) نہ رہنے پائے کیونکہ اس نے حقِ معیشت کو سب کے لیے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی

اس حقِ مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں فرمایا۔

قرآنی تعلیمات:

اللہ تعالیٰ ہر فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر ایک جاندار کی معیشت اس کے ذمے ہے۔ اس کے لیے حسبِ ذیل (قرآنی) نصوص قابلِ مطالعہ ہیں۔

❶ ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي ٱلْأَرْضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزْقُهَا﴾ (۱)

ترجمہ: اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ میں لے لی ہے۔ (۲)

---

(۱) القرآن الکریم: سورۃ ھود (۱۱): آیت ٦

(۲) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے اپنے دلائل کا آغاز کر کے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور حقیقت ہے رازق کریم کے رزاقی دسترخوان کی وسعت۔ ایک ایسا وسیع دسترخوان جس سے انسان و حیوان، پرند و چرند، ذی عقل و شعور اور کم فہم ولاشعور، آبی خاکی، فضائی و زمینی، پاؤں چلنے والے اور رینگنے والے، اپنے بھی اور پرائے بھی، احسان مند بھی اور احسان فراموش بھی، مومن بھی اور منکر بھی اپنا اپنا رزق پا رہے ہیں اور کھا رہے ہیں انسان ـــــ اس کی کچھ اور کتنی بھی حیثیت ہو امیر ہو، حاکم ہو محکوم ہو، آزاد ہو، مقید ہو ـــــ کو اس دستر خوان کا اس کی حیثیت، مرتبہ اور مقام کے مطابق نگران اور امین بنایا گیا ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنی حیثیت اور اپنے مقام کے مطابق اس دستر خوان کا انتظام سنبھالے اور اس دستر خوان سے اللہ کریم کی مخلوق کو مستفید ہونے دے اور کسی کو اس سے محروم نہ رکھے۔
دراصل اس رزاقی دستر خوان کو جاری و ساری رکھنے کے لیے آسمان رزق برسانے سے بخل نہیں کرتا نہ زمین اس کے رزق کو اُگانے میں کنجوسی سے کام لیتی ہے، نہ کارکنان قضاء و قدر اس دستر خوان کے رزق سے اللہ کریم کی مخلوق کو محروم کرنے میں کوئی زور زبردستی سے کام لیتے ہیں، یہ انسان ہی ہے جو دوسرے انسان اور دیگر مخلوقات کو اس رزق تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ لہٰذا مخلوقِ خدا کی اس محرومی کا ذمہ دار انسان ہی ٹھہرایا گیا ہے۔ انسان کو اس مجرمانہ حرکت سے باز رکھنے کے لیے ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے کام لیا گیا ہے اور اسے سخت سزا کا حقدار بتایا گیا ہے۔
مصنف رحمہ اللہ نے اپنی اس تصنیف (Publication) میں انسانوں کی کفالت اور اس ضمن میں فرد، معاشرہ اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری پر نہایت عمدہ انداز میں روشنی ڈالی ہے البتہ انسان کے علاوہ اللہ کریم کی بہت ہی بڑی مخلوق ـــــ زمینی. فضائی، اور بحری کی کفالت کی ذمہ داری کا موضوع قدرے تشنہ رہ گیا ہے۔ یعنی اللہ کریم کے رزاقی دستر خوان سے اللہ کریم کی اس بڑی مخلوق ـــــ جو عاقل ہے نہ ذمہ دار اور نہ ہی جواب دہ

ـــــ کی کفالت کی اہمیت اور ذمہ داری کو ترغیب و ترہیب دونوں طریقوں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ آئیے چند نظائر ملاحظہ ہوں:

١ ایک فاحشہ (Prostitute) عورت کو محض اس لیے جنت کا داخلہ دے دیا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تھا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: غفر لامراۃ موسۃ مرت بکلب علی رأس رکی یلھث کاد یقتلہ العطش، فنزعت خفھا فاوثقتہ بخمارھا، فنزعت لہ من الماء، فغفرلھا بذالك. قیل: ان لنا فی البھائم اجرا؟ قال: فی کل ذات کبد رطبۃ اجرٌ. (متفق علیہ، مشکوۃ المصابیح، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ.)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک فاحشہ کو بخش دیا گیا۔ وہ ایک (پیاسے) کتے کے پاس سے گزری جو ایک کنواں کے پاس (شدت پیاس سے) ہانپ رہا تھا اور قریب تھا کہ پیاس (کی شدت) اس کی جان لے لے، اس (عورت) نے (اس پر رحم کھاتے ہوئے) اپنا جوتا اتارا اسے اپنی اوڑھنی سے باندھا، اس کتے کے لیے (کنواں سے) پانی کے لیے لٹکا دیا۔ (اللہ کریم نے اس فاحشہ کے اس عمل کی قدر دانی میں) اس کی بخشش فرمادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: کیا ہمارے لیے حیوانات (کی کفالت) میں بھی اجر و ثواب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: ہر تر و تازہ (یعنی زندہ) دل رکھنے والے (کی روح کی کفالت) میں ثواب ہے۔

٢ ایک عورت کو اس لیے جہنم کا سزاوار بنا دیا گیا کہ اس نے بلی کو بھوکوں مار دیا۔

عن عبداللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ عنھما وابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قالا: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: عذبت امرأۃ فی ھرۃ، أمسکتھا حتی ماتت من الجوع فلم تطعمھا ولا ترسلھا فتأکل من خشاش الأرض. (متفق علیہ، مشکوۃ المصابیح، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ.)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اُس نے بلی کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی۔ اُس نے نہ خود اسے کھلایا پلایا نہ کھلا چھوڑا کہ وہ زمین کے جانور کھا کر اپنی بھوک مٹا لیتی۔

٣ ہر ذی روح کی کفالت کرنا بہترین صدقہ ہے۔

عن انس رضی اللّٰہ عنہ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: أفضل الصدقۃ إن تشبع کبدا جائعا. (امام بیھقی فی شعب الایمان، مشکوۃ المصابیح، باب افضل الصدقۃ)

=

❷ ﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾﴾ [1]

ترجمہ: اور تمہارا رزق اور جس شے کا تم وعدہ دیئے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں) ہے۔

❸ ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ﴾ [2]

ترجمہ: اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو ہم ہی تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

❹ ﴿وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ﴾ [3]

ترجمہ: اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟

❺ ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿٥٨﴾﴾ [4]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہترین صدقہ یہ (بھی) ہے کہ کسی بھوکے ذی روح کو (کھانا) کھلایا جائے۔

❹ جس ذی روح ــــ انسان ہو یا حیوان یا پرند ــــ کی روزی کسی کے ذمہ ہو وہ اسے بھوکوں مرنے سے بچائے۔

عن عبداللّٰه بن عمرو بن العاص رضی اللّٰه عنهما قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: كفى بالمرء إثما ان يضيّع من يقوت. (صحيح مسلم، وابوداود، رياض الصالحين، باب النفقة على العيال)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی شخص کے گنہگار ہونے کے لیے اتنا ہی کیا کم ہے کہ وہ اس جی (روح) کو (بھوکا رکھ کر) ضائع کر دے جس کی روزی اس کے ذمہ ہو۔

(۱) سورۃ الذاریات: (۵۱): آیت ۲۲

(۲) سورۃ الانعام (٦): آیت ۱۵۱

(۳) سورہ النمل (۲۷): آیت ٦٤

(۴) سورۃ الذاریات (۵۱): آیت ۵۸

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے بڑی مضبوط طاقت والا ہے۔

❻ ﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴿٢٠﴾﴾[1]

ترجمہ: اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیئے اور ان کے لیے جن کو تم روزی نہیں دیتے۔

❼ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾[2]

ترجمہ: وہ (خدا) وہ ذاتِ پاک ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص (Specification) کے ہر فرد و بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت و اسباب معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانۂ عامرہ (Ever Abundant Treasury) کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جاندار کو برابر کا حق ہے۔

حق معیشت میں برابری

اور ان آیات کی اس روح کی زیادہ وضاحت و صراحت حسبِ ذیل آیات کرتی ہیں:

❽ ﴿وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾﴾[3]

ترجمہ: اور رکھے اس زمین میں بوجھل پہاڑ (اس کی پیٹھ پر) اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں اس میں ان کی خوراکیں جو

(۱) سورۃ الحجر (۱۵): ۲۰

(۲) سورۃ البقرہ (۲): ۲۹

(۳) سورۃ فصلت (۴۱): ۱۰

برابر ہیں حاجت مندوں کے لیے۔

❾ ﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٧١﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی کو اپنے زیر دستوں پر لوٹا دیں حالانکہ اس روزی میں وہ سب کے سب برابر کے حقدار ہیں، پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں؟

ان آیات میں حق معیشت کی مساوات کا جس قدر صاف اور صریح اعلان ہے وہ آپ اپنی مثال ہے اور اس کا انکار بداہت وصراحت کا انکار ہے۔

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب
گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ بادشمناں نظر داری

مساواتِ حقِ معیشت پر نامور مفسرین کی آراء:

حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے ”حق معیشت میں مساوات“ کی بحث کے حاشیہ میں چند مقتدر (Authoritative) مفسرین کی مساوات رزق کی آیۃ (سورۃ النحل: (۱۶): (۷۱)) کی تفسیر آراء کو اکٹھا بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

روح المعانی جلد ۱۴، البحر المحیط جزو ۵ سورۃ النحل وتفسیر فتح القدیر جلد ۳، اس آیت کے ایک معنی یہ بھی کیے جاتے ہیں:

(۱) سورۃ النحل (١٦): آیت ٧١

وجوز ان یکون معنی الایة: ان اللّٰہ تعالٰی فضل بعض علی بعض فی الرزق وان المفضلین لا یردون من رزقهم علی من دونهم شیئا، وانما أنا رازقهم، فالمالك والمملوك فی اصل الرزق سواء. وان تفاوتا کما وکیفا، واختار فی الکشاف أن المعنی أنه سبحانه جعلکم متفقاوتین، أفبنعمة اللّٰه یجحدون. ویکون المعنی علی قراة الخطاب ان المالکین لیسوا برآدّی رزقهم علی مما لیکهم، بل أنا الذی أرزقهم فی الرزق فرزقکم أفضل رزق مما بدلکم وهم بشر مثلکم واخوانکم. وکان ینبغی أن تردو الفضل ما رزقتموه علیهم حتی تساووا فی الملبس والمطعم کما یحکی عن ابی ذر رضی اللّٰہ عنه الخ"[1] وایّا هم فلا یظنوا أنهم یعطونهم شیئاو أنما هو رزقی أجریه علی أیدیهم وهم جمیعا فی ذلك سواء لا مزیة لهم علی ممالیکهم فیکون المعطوف علیه المقدر یناسب هذا المعنی یقال لا یفهمون ذالك فیجحدون نعمة اللّٰه.[2]

ترجمہ: علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ[3] نے اپنی تفسیر روح المعانی جلد

---

(۱)روح المعانی: جلد ١٤

(۲)فتح القدیر للشوکانی: ۱۷۱/۳ وکذا فی البحر المحیط: ج ٥. (سید محمود آلوسی رحمہ اللہ کی روح المعانی وامام الشوکانی رحمہ اللہ کی فتح القدیر، امام زمخشری رحمہ اللہ کی کشاف اور ابو حیان رحمہ اللہ کی البحر المحیط میں سورۃ النحل کی آیت نمبر ۷۱ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔)

(۳) آلوسی، سید محمود آفندی ابو الثناء شہاب الدین آلوسی بغدادی رحمہ اللہ شام اور بغداد کے درمیان واقع گاؤں آلوس آپ کے آباو اجداد کا مسکن تھا۔ اسی نسبت سے آپ آلوسی کہلائے۔ آپ نے ۱۲۱۷ھ کو بغداد کے محلہ کرخ میں ولادت پائی۔ آپ نے اپنے والد محترم شیخ خالد نقشبندی رحمہ اللہ اور شیخ علی سویدی رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا۔ آپ مدرسہ مرجانیہ کے مہتمم اعلیٰ (پرنسپل) اور مفتی احناف رہے۔ ۱۲۶۷ھ سے ۱۲۶۹ھ تک اپنی تفسیر "روح المعانی" پر کام کیا اور اسے مکمل کر کے دولت عثمانیہ کے سلطان عبد المجید خان رحمہ اللہ کو پیش کیا۔ آپ کی دیگر مشہور تالیفات میں حاشیہ الفطر، الفوائد السنیہ فی اداب البحث، الاجوبۃ العراقیۃ، درۃ =

۱۴۔ ابو حیان[1] محمد بن یوسف بن علی بن یوسف اندلسی غرناطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر البحر المحیط (جزء سورۃ النحل (آیۃ ۷۱) اور امام الشوکانی[2] محمد بن علی بن محمد رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر فتح القدیر جلد ۳ (سورۃ النحل: آیت ۷۱ کی تفسیر) میں (تحریر کیا) ہے: اس آیت کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں: اور جائز ہو گا اگر آیتِ مذکورہ کے معنی یہ کیے جائیں کہ اللہ کریم نے ہم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے، جنہیں اس برتری سے نوازا گیا ہے وہ اپنے (عنایت کیے گئے) رزق میں سے کچھ حصہ اپنے سے رزق میں کمتر افراد پر (کیوں) نہیں لوٹا دیتے (تاکہ وہ حق رزق میں ان کے برابر ہو جائیں)۔ (اللہ کریم فرماتا ہے) حالانکہ ان (تمام) کا رازق تو میں ہی ہوں۔ لہٰذا (دنیوی) آقا اور ماتحت اصل (حق) رزق میں برابر ہیں۔ اگرچہ ہم (یعنی دنیوی نظم معیشت چلانے

الغواص فی اوہام الخواص، النفحات القدسیہ فی المباحث الامامیۃ مشہور ہیں۔ آپ نے جمعۃ المبارک کے دن ۲۵/ ذیقعدۃ ۱۲۷۰ھ کو وفات پائی اور بغداد کے محلہ کرخ میں حضرت شیخ معروف کرخی رحمہ اللہ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ رحمہ اللہ

(۱) ابو حیان ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن علی بن یوسف اثیرالدین غرناطی اندلسی مشہور بہ ابو حیان رحمہ اللہ ۶۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اندلس و افریقہ کے دیار و امصار کا سفر کیا۔ آپ کے اساتذہ کرام میں ابو طاہر اسماعیل بن عبداللہ، شیخ بہاؤالدین بن نحاس، عبدالنصیر بن علی مریوطی رحمہم اللہ تعالیٰ قابل ذکر ہیں۔ آپ بیک وقت مفسر، محدث، نحوی، شاعر اور تراجم رجال اور طبقات کے ماہر تھے۔ آپ نے گرانقدر تالیفات چھوڑی ہیں جن میں تفسیر البحر المحیط، غریب القران، نہایت الاعراب، خلاصۃ البیان اور شرح التسہیل قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ۷۴۵ھ میں مصر میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ

(۲) الشوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمہ اللہ ۲۲/ ذی القعدہ ۱۱۷۲ھ کو (یمن یا بحرین کے قصبہ) شوکان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے دینی و مروجہ علوم میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ کرام میں عبدالرحمٰن بن قاسم المدائنی، علامہ احمد بن عامر الحدائی، احمد بن محمد الحرازی، امام قاسم بن محمد، عبداللہ بن اسماعیل رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے یکتائے روزگار شامل ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر "فتح القدیر" کے علاوہ فقہ میں آپ کی مقبول کتاب "نیل الاَوطار" ہے جسے سعودی عرب کے ادارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد نے شائع کر کے عام کیا ہے۔ آپ نے جمادی الآخر ۱۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

میں) وزن (Quantity) اور کیفیت (Quality) رزق میں اس برابری کو قائم نہ بھی رکھا ہو۔

(امام زمخشری رحمہ اللہ[1] نے اپنی تفسیر) کشاف میں یہ معنی (بیان فرمائے) ہیں: اس ذات کریم نے تمہیں (رزق میں) درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ پھر (یہ برتری والے کمزوروں پر اپنے رزق کا کچھ حصہ نہ لوٹا کر) کیا اللہ کریم کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے؟ خطاب کی قرأت کے مطابق یہ معنی بھی ہیں کہ (دنیوی) آقا (طاقتور) اپنے (فاضل) رزق کا کچھ حصہ اپنے ماتحتوں پر لوٹا رہے ہیں کہ ان پر احسان رکھیں (کہ انہیں اپنا رزق دے رہے ہیں) بلکہ یہ تو میں (اللہ رزاق کریم) ہوں جو انہیں (فقراء کو ـــــ ان دنیوی فاضل رزق والوں کے رزق کا کچھ حصہ ان سے واپس دلوا کر ـــــ رزق بہم پہنچا رہا ہوں (ان فاضل رزق والوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ) تم سے جو حصہ (فاضل رزق کا) لیا گیا ہے۔ اس سے بہتر رزق تمہیں دیا گیا (حالانکہ تمہارا تمہارے فاضل اموال سے ان کمزوروں کو کچھ حصہ دینا تمہارا ان فقراء پر کوئی احسان نہیں، نہ یہ کچھ لوٹانا تمہارے لیے وجہ افتخار ہے بلکہ) وہ (کمزور) بھی تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں بلکہ تمہارے بھائی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جو تمہیں رزق دیا گیا ہے اس کا فاضل (زائد) حصہ ان ضرورت مندوں کو لوٹا دیتے (اور تم یہ عمل متواتر کرتے رہتے) یہاں تک کہ تم سارے لباس، خوراک (اور

---

(۱) امام زمخشری، قاسم بن محمود بن عمر خوارزمی، زمخشری رحمہ اللہ ماہ رجب ۴۶۷ھ کو زمخشر (خوارزم کا علاقہ) میں پیدا ہوئے، مشہور مفسر، محدث فقیہ اور متکلم تھے۔ مکہ مکرمہ میں عرصہ دراز تک رہائش اور بیت اللہ شریف کی بکثرت حاضری کی بنا پر "جار اللہ" (اللہ کریم کے پڑوسی) کہلائے۔ تحصیل علم کے لیے بغداد، خراسان، مکہ مکرمہ وغیرہا کا سفر اختیار کیا۔ اپنے علمی کمال اور فن میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کی مشہور تصانیف میں تفسیر کشاف، رؤس المسائل فی الفقہ، المفصل فی النحو، الفائق فی تفسیر الحدیث، اساس البلاغۃ فی النحو وغیرہا ہیں۔ تحریک اعتزال کے روحِ رواں تھے، لہٰذا ان کی تفسیر میں جا بجا یہی رنگ غالب ہے۔ ۵۳۸ھ میں مکہ مکرمہ سے واپس جرجانیہ (خوارزم) میں شب عرفہ میں وفات پائی (تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن خلکان، وفیات الاعیان: ۵۰۹/۲ ـــ علامہ جلال الدین سیوطی: طبقات المفسرین، ص ۴۱۔

دیگر بنیادی ضروریات زندگی) میں برابر ہو جاتے۔ جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱) کے عمل کے بارے میں آیا ہے۔

---

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر بلکہ محبوب صحابی ہیں وہ تاریخ اسلامی معاشیات میں رہتی دنیا تک حق معیشت میں مساوات کے سچے داعی اور سچے حامی کے طور پر جانے جائیں گے۔ آیئے میرے اس دعوی کی دلیل کے لیے عتبہ بن مسعود رحمہ اللہ کا یہ بیان پڑھ لیجئے۔

"کسی أبوذر رضي الله عنه بردين فأتزر باحدهما وارتدى بشملته وکسا أحدهما غلامه ثم خرج علی قوم فقالوا له: لو کنت لبستهما جمیعا کان أجمل قال: أجل ولکني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إطعموهم مما تاکلون و إلبسهم مما تلبسون" (ابن سعد: الطبقات الكبرى، ج ٤ بيروت، ١٣٧٧ھ، ١٩٥٧ء، ص ٢٣٧)

ترجمہ: ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (ایک دن) دو چادریں اوڑھنا تھیں۔ مگر انہوں نے ایک ہی کو اپنا تہہ بند بنا لیا، (اس طریقہ سے کہ) اس کا ایک حصہ لمبا چھوڑ کر اسے (بدن ڈھانپنے کی) چادر بنالیا۔ اور ایک (دوسری) اپنے خادم (ماتحت) کو دے دی۔ پھر جب وہ باہر لوگوں میں تشریف لائے تو انہوں نے ان سے عرض کیا: اگر آپ ہی وہ دونوں چادریں اوڑھتے تو زیادہ اچھے اور خوبصورت لگتے۔ فرمانے لگے: بات تو تمہاری بھی درست ہو گی، مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سن لیا تھا: انہیں (اپنے ماتحتوں کمزوروں کو) وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔

حضرت معرور رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ایک دن ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کا ماتحت ایک ہی قسم کے کپڑے کے حلے (Gowns) زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں تعجب سے دریافت کر بیٹھا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا بات ہے آپ اور آپ کا خادم ایک ہی کپڑے کے حلے پہنے ہوئے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: مجھے میرے حبیب ( ) کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا۔

ان إخوانکم خولکم جعلهم والله تحت أيديكم فمن کان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأکل وليلبسه مما يلبس (صحیح امام بخاری: ج ۲ کتاب العتق)

ترجمہ: یقیناً تمہارے ماتحت تمہارے بھائی ہی تو ہیں، جنہیں اللہ کریم نے تمہارے ماتحت بنایا ہے لہذا جس کسی کا کوئی بھائی اس کے ماتحت ہو اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے۔

اس فرمان کو نقل کر کے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں تو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالا رہا ہوں (ان مباحث کے لیے میری کتاب "حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کمزوروں اور غریبوں کے وکیل" کا مطالعہ انشاء اللہ مفید ہو گا)

(حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم کے محب صحابی تھے انہیں جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت کرنا ہوتی تو فرط محبت میں "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" کی بجائے

(اللہ کریم فرماتے ہیں) یہ امیر خبردار رہیں اور کہیں یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ وہ ان فقراء کو کچھ دے (کر ان پر احسان کر) رہے ہیں بلکہ وہ میرا رزق ہے جو ان امیروں کے ہاتھوں سے ان فقیروں میں جاری رکھتا ہوں۔ حالانکہ وہ (امیر اور غریب) اس حقِ رزق میں برابر ہیں۔ ان دنیوی وڈیروں کو اپنے کمزوروں پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ جو اُن کمزوروں کو یہ امیر کچھ عنایت کر کے ان پر اپنا احسان سمجھ رہے ہوں یہ ایسا نہیں بلکہ اُن کمزوروں کا مقدر کیا ہوا حصہ ہے جو انہیں اس طرح مل رہا ہے چونکہ یہ وڈیرے صحیح بات نہیں سمجھ پائے (اور نتیجۃً ان معاشی دکھوں کے ماروں کو اپنے فاضل اموال سے واپس نہیں لوٹاتے) اس لیے وہ اللہ کریم کی نعمتوں کے صریح منکر ہو رہے ہیں۔)

لیکن اب سوال یہ ہے کہ منشاءِ الٰہی کے اس مقصدِ عظیم کو پورا کون کرے اور اس عالمِ اسباب میں اس کی تکمیل کس کے ذمہ واجب ہے؟ تو اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ جن نگاہوں کے سامنے ہے وہ بآسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس "عالم تشریع" (World or Being of Legislation) میں یہ فریضہ نائبِ الٰہی (Vicegerent of Allah) "خلیفہ" پر عائد ہوتا ہے کہ قلمروِ اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حقِ معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حقِ معیشت میں در اندازی بن سکے اور جو حکومت اس منشاءِ الٰہی کو پورا نہ کرتی ہو وہ فاسد نظام کی حامل اور نظامِ عدل سے منحرف ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کی رائے:

(چنانچہ) سورہ بقرہ کی اس آیت "هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا" کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمد الحسن[1] صاحب رحمہ اللہ ارشاد

"قال حبی صلی اللہ علیہ وسلم، اوصانی حبیبی" (مجھے میرے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی، اور "أوصانی خلیلی" (مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی) کہا کرتے تھے، جن اہل علم کی ان سے مروی احادیث پر نگاہ ہے وہ یہ حقیقت جانتے ہیں۔

(۱) شیخ الہند محمود الحسن ایک متبحر عالم دین، فقیہ، محدث اور سیاست دان تھے۔ آپ ۱۲۶۸ھ (بمطابق ۱۸۵۱ء)

فرماتے ہیں:

جملہ اشیائے عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان ”خلق لکم ما فی الارض جمیعا“ تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرضِ خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے دفع حوائج جملۂ ناس (انسان) ہے اور کوئی شے فی حدِ ذاتہ کسی کی مملوکِ خاص نہیں بلکہ ہر شے سے اصل خلقت میں جملہ ناس (Mankind) میں مشترک (Common) ہے اور ”من وجہ“ سب کی مملوک (Possession) ہے، ہاں بوجہ رفع نزاع (Settelment of Dispute) و حصولِ انتفاع (Acquistition of Benefit) قبضہ کو عِلّت ملک (Reason for Ownerrhip) مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ (Absolute permanent Possession) باقی رہے اس وقت تلک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا، ہاں خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالِ کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا گو زکوٰۃ بھی ادا

بریلی (ہند) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اساتذہ کرام میں میانجی مولانا عبد اللطیف رحمہ اللہ، مولانا ملا محمود رحمہ اللہ (جو دیوبند کے پہلے مدرس تھے، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے ارشاد پر ۱۰۰ (سو) روپے کی ملازمت چھوڑ کر ۲۰ (بیس) روپے لینے دیوبند آ گئے) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ (بانی دارالعلوم دیوبند) ہیں، پھر ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں ہی آپ مدرس بن گئے۔ ۴۰ سال تک یعنی آخر عمر تک رہے۔ آپ آزادی کے لیے مسلمانوں کی ”تحریک ریشمی رومال“ کے روح رواں تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا، جہاں گورنر غالب پاشا، انور پاشا، کمال پاشا اور دیگر زعماء اور علماء کرام حرمین شریفین سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنا ہم خیال بنانے کے لیے کوششیں کیں۔ دورانِ قیام مکہ مکرمہ آپ کو انگریز حکومت کے اشارہ پر گرفتار کر کے براستہ قاہرہ (مصر) جزائر مالٹا (کالا پانی) بھجوا دیا گیا۔ یہ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کا دن تھا، وہاں تین سال سات ماہ قید رکھ کر ۲۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸/ جون ۱۹۲۰ء آپ کو رہائی اور سفر کے بعد بمبئی پہنچا کر آزاد کیا گیا۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کے دن اللہ کریم کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی تصانیف میں ترجمہ قرآن، حجۃ الاسلام (سوانح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ) بخاری شریف کے ابواب و تراجم پر ایک جامع رسالہ اور ایضاح الادلۃ مشہور ہیں۔

کر دی جائے، اور انبیاء و صلحاء اس سے بغایت مجتنب (Abstainers) رہے، چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے، بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمادیا۔ بہر کیف غیر مناسب و خلاف اولیٰ (Against the Better) ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجت (More than the Need) سے تو اس کی کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک "من وجہ" اس میں موجود، تو گویا شخص مذکور "من وجہ" مال غیر پر قابض و متصرف (Occupier & User) ہے اور اس کا حال بعینہٖ مالِ غنیمت کا تصور کرنا چاہیے وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت و حصولِ انتفاع (Utilization) بقدر حاجت (According to Need) ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے وہاں حاجت سے زائد جو رکھتا ہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے، (یعنی خائن (Treacherous) شمار ہو گا)۔[1]

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ کی روایات:

اور مشہور محدث ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ[2] نے اس سلسلے میں محلّی میں جو

---

(۱) مولانا محمود الحسن، شیخ الہند: ایضاح الادلہ، قدیمی کتب خانہ (بالمقابل آرام باغ)، کراچی، ۱۴۱۳ھ، ص ۴۴۱، ۴۴۲

(۲) ابن حزم ظاہری، علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن سفیان بن یزید کنیت ابو محمد اور شہرت ابن حزم رحمہ اللہ کے نام سے پائی۔ آپ اندلس کے نامور عالم دین، محدث اور فقیہہ تھے۔ آخری دن رمضان المبارک ۳۸۴ھ مشرقی قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد احمد بن سعید رحمہ اللہ اموی حکمران مظفر بن منصور کے وزیر تھے، آپ نے ناز و نعمت کے باوجود تحصیل علم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔
آپ قوی استدلال رکھنے والے فقیہہ اور محدث تھے۔ یہی استدلالی قوت ان کے افکار سے جھلکتی ہے۔ جو رائے یا نظریہ رکھتے اس کے لیے دلائل اور حوالہ جات کے انبار لگا دیتے۔ اپنے مخالفین کے لیے بہت سخت زبان استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ہے کہ ناز و نعمت سے پلے، وزیر ابن وزیر، اس دور میں کروڑوں کی جائیداد اور اندلس کے مختلف شہروں میں کوٹھیوں کے مالک ابن حزم رحمہ اللہ کو امیروں کے اموالِ فاضلہ میں فقراء اور معاشی دکھوں کے ماروں کے حقوق اور ان کی معاشی کفالت
=

روایات نقل کی ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہیں:

❶ عن ابي سعيد ن الخدری رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لا زاد له. قال فذكر من أصناف المال ما ذكر حتى رأينا أنه لا حق لاحد منا في فضل.[1]

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)[2] سے روایت ہے

کا مقدمہ اس شدت سے کیوں لڑنا پڑا؟ میرے ناقص علم میں کمزوروں اور بے نواؤں کے وکیل سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد فقراء کے حقوق کے لیے ایسی شد و مد اور براہین و دلائل کے ساتھ قلمی جہاد کسی نے نہیں کیا۔ یہ ان کی فقراء کے اغنیاء کے فاضل اموال میں واقعی حقوق (Acknowleged Rights) کے لیے اخلاص کے ساتھ جدوجہد تھی جس کی صدائے بازگشت رہتی دنیا تک قافلہ صدق و وفا کے لوگ، غریبوں کے حامی و خیر خواہ، محتاجوں کے حقوق کی خاطر لڑنے والے سنتے اور سناتے رہیں گے۔

معاشی دکھوں کے ماروں کی ہمدردی اور ان کے حقوق کے لیے لڑنے کا یہ محیر العقل انداز کی کچھ سیاسی، معاشی اور نفسیاتی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ کے والد اندلس کے اموی حکمرانوں کے وزیر تھے، ان کے بعد ابن حزم رحمہ اللہ بھی اموی وزیر رہے، مگر جب حمودی غالب آئے تو ابن حزم رحمہ اللہ کو اپنا نعمت کدہ چھوڑ کر جائے پناہ کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ ان کا مال و جائیداد لوٹ لیا گیا۔ اگرچہ ان کے والد محترم نے ان کی خاطر اندلس کے ہر بڑے شہر میں مکان چھوڑا، مگر وہ ایک گم نام دیہات میں رہ کر اپنا قلمی جہاد کرتے رہے، دکھ سہہ کر جیتے رہے اور یہیں رختِ سفر باندھ کر اللہ کریم کو پیارے ہوئے۔ زمانہ کی اس گردش نے بھی ان کے سیال قلم کو صیقل کر دیا اور انہوں نے معاشی طور پر پریشان حالوں کے دکھ بانٹنے اور ان کا صحیح حل تلاش کرنے کے لیے خوب خوب لکھا۔

آپ کی بہت سی تالیفات ہیں، زیادہ مشہور المحلی فی فروع الفقہ گیارہ جلدوں میں ''کتاب الاحکام لاصول الاحکام'' آٹھ جلدوں میں اور کتاب الفصل فی العلل والاھواء والنحل ہیں۔

آپ نے ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ میں وفات پائی (تفصیل کے لیے دیکھیں یاقوت حموی رحمہ اللہ، معجم الادباء، ج ۱۲ مطبع الرافع، قاہرۃ ص ۲۴۳-۲۳۷ شیخ ابو زہرہ رحمہ اللہ: حیات ابن حزم، ص ۲۷، ۴۳۔ ابن حزم: طوق الحمامہ، مطبوعہ قاہرۃ، ص ۱۵۴

(۱) امام مسلم: الصحيح: ج ۲ كتاب اللقطة. ابن حزم: المحلی، ۱۵۷/۶، ۱۵۸. النووی، امام ابو بكر يحيى بن شرف: رياض الصالحين باب الايثار والمواساة.

(۲) ابو سعید الخدری: سعد بن مالک ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کبار صحابہ کرام =

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس قوت وطاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہو اس کو چاہیے کہ اس فاضل سامان کو کمزور کو دے دے اور جس شخص کے پاس سامانِ خورد نوش حاجت سے زائد ہو اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دے دے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مختلف انواع مال کا ذکر فرماتے رہے حتی کہ ہم نے یہ گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔

❷ قال عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ لو استقبلت من امريِ ما استدبرت لاخذت فضول الاغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين.[1]

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں اس میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلا شبہ اربابِ ثروت کی فاضل دولت لے کر فقراء اور

رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ فقیہ، محدث اور معاشی لین دین کے مسائل کے ماہر تھے، سود اور تبادلہ (Exchange) کے مسائل پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ حضرت ابو نضرۃ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صرف (Barter۔ یعنی اشیاء کا آپس میں تبادلہ جب کہ وہ ہم جنس ہوں) کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انہوں نے فرمایا: کیا دست بدست یعنی حاضر سودا ہو گا؟ ابو نضرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: ہاں تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ پھر میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملا اور آپ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا جواب سنایا تو آپ نے فرمایا: میں عنقریب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو لکھوں گا پھر وہ اس طرح صرف (تبادلہ) کے جواز کا فتویٰ ہرگز نہیں دیں گے۔ (برائے تفصیل دیکھیں: ابن سعد: طبقات، ۲/۱۲۔ ابن منذر: الترتیب الاداریۃ، ۲/۷/۲۴۔ محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، تذکرہ ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۱) ابن حزم: حوالہ مذکورہ: ص ۱۵۸ ابن حزم اس روایت کی سند پر حکم لگاتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وھذا اسناد فی غایۃ الصحۃ و الجلالۃ'' اور یہ سند نہایت صحیح اور پر از جلالت ہے۔ محلی ابن حزم: ج ٦

مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں بانٹ دیتا۔

۳ وصحح عن أبو عبيده بن الجراح وثلث مائة من الصحابة رضى الله عنهم أن زادهم فنيٰ فأمرهم ابو عبيدة فجمعوا أزواد هم فى مزودين وجعل يقوتهم اياها على سواء.[1]

ترجمہ: حضرت ابو عبیدہ[2] اور تین سو صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے

---

(۱) حواله بالا: ١٥٨/٦ متفق عليه بحواله رياض الصالحين، باب الايثار والمواساة۔ بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں مساوات کے داعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خوش کن صورت حال سے کس قدر خوشی ہوئی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت میں یہ طریقہ معاش کس قدر عزیز تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ ان لوگوں کو اپنا قبیلہ، اپنی جماعت اور اپنا خاندان تصور فرماتے تھے۔ آئیے مدینہ منورہ کے اس سعادت مند قبیلہ "الاشعری" کا "مساویانہ معاشی رویہ" اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے پسندیدگی کا حال پڑھ لیں۔

إن الأشعريين إذا أرملوا فى الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم فى ثوب واحد، ثم اقتسموا بينهم فى اناء واحد بالسوية فهم منى وانا منهم. (صحيح بخارى: ج۱ كتاب الشركة) ترجمہ: اشعریین (ایسے ایثار پسند اور بامروت لوگ ہیں کہ) جب کبھی وہ سفر جہاد میں ہوں اور زادِ راہ کی کمی محسوس کریں یا مدینہ منورہ میں (مقیم) ہوں اور اُن کے اہل و عیال کا سامان خوراک کم پڑ جائے تو ان کے پاس (فرداً فرداً) جو کچھ ہوتا ہے اسے ایک کپڑا میں اکٹھا کر لیتے ہیں پھر ایک پیمانہ کے ذریعہ اسے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ یہ (ایثار شعار لوگ) مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

(۲) حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے بہادر، جری، صائب الرائے، معاملہ فہم، مدبر اور عالم صحابی تھے۔ مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے بدری تھے۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ ــــــ یعنی وہ سعادت مند اور منتخب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنہیں اللہ کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعہ دنیا میں جنت کی بشارت دی تھی ــــــ میں شمار ہوتا ہے۔ آپ امانت اور دیانت داری کے اس مقام پر تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امین الامت کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ آپ قائد لشکر اسلام تھے۔ آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں شام کے محاذ پر اسلام کے سپہ سالار تھے اور شام اور دیگر محاذوں پر فتوحات کے جھنڈے گاڑے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کمیٹی کے ممتاز رکن ــــــ بلکہ بعد میں سربراہ بن گئے ــــــ تھے جس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد امیر المومنین کا انتخاب کرنا تھا۔ آپ کو خلافت کی پیش کش ہوئی مگر آپ نے فیصلہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے کے بعد حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں دیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ =

متعلق یہ روایت صحت کو پہنچ چکی ہے کہ (ایک موقعہ پر) ان کا سامان خوردونوش ختم کے قریب آ لگا پس حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حکم دیا کہ جس جس کے پاس جس قدر موجود ہے وہ حاضر کرے اور پھر سب کو یکجا کر کے ان سب میں برابر تقسیم کر کے سب کی قوت لایموت کا سامان کر دیا۔

❹ عن محمد بن علی أنه سمع علی بن أبي طالب یقول: أن اللّٰه تعالی فرض علی الاغنیاء في أقواتهم بقدر ما یکفي فقراءهم فإن جاعوا أو عروا وجهدوا فبمنع الأغنیآء وان علی اللّٰه تعالی أن یحاسبهم یوم القیامة و یعذبهم علیه۔[1]

ترجمہ: محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجۂ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے، پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے وہ محض اس لیے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے اور اس لیے اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور اس کو تاہی پر ان کو عذاب دے گا۔

اور اسی قسم کی دوسری احادیث اور آیاتِ قرآنی کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے مشہور محدث ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ یہ مسئلہ تحریر فرماتے ہیں:

❺ وفرض علی الأغنیاء من أهل کل بلد أن یقوموا بفقرائهم، یجبرهم السلطان علی ذلك، إن لم تقم الزکاة بهم ولا فی سائر اموال المسلمین بهم. فیقام لهم بما یأ کلون من القوت الذی لا

تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیت المال سے وظائف کا تقرر آپ کی رائے سے ہوا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۸ھ مطابق ۶۳۹ء عمواس کی وبا سے جابیہ ملک شام میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۱) حوالہ بالا: ۱۵۸/۶

بد منه، ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك، وبمسكن يكنّهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة.(۱)

ترجمہ: اور ہر ایک بستی کے اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر زکوٰۃ اور مسلمانوں کے دیگر اموال فئ (بیت المال کی آمدنی) ان غرباء کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان اربابِ دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے (یعنی ان کے فاضل مال سے بجبر (Forcibly) لے کر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے) اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔

❻ اور حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی روایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس بات پر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا ننگا یا ضروریاتِ رہائش سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔(۲)

• اب ان تمام نصوصِ قرآنی اور ان کی مؤید (Supporting) احادیث و فقہی روایات کو سامنے رکھ کر بہ نظر انصاف غور فرمائیے کہ "اسلام کا معاشی نظام" حق

(۱) حوالہ بالا: ۱۵۶/۶، مسئلہ رقم: ۲۵، مصنف رحمہ اللہ نے "عیون المارۃ" کا ترجمہ سیلاب کیا ہے جب کہ اس کا ایک ترجمہ "گزرنے والوں کی نگاہیں" بھی کیا گیا ہے لہٰذا اس ترجمہ کی رو سے عبارت کے آخری حصہ کا مطلب ہو گا۔ ایسا مکان جو...... گزرنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھے یعنی اس کی پردہ داری اور خلوت (Privacy) میں دخل اندازی نہ ہونے دے۔

(۲) محلی: ۱۵۸/۶، تمام ائمہ مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے۔

معیشت کی مساوات کا کس طرح صاف اور واضح اعلان کرتا ہے اور امیر اسلام کے اختیارات میں وسعت دے کر اس کی حفاظت کے لیے کس قدر عادلانہ دستور قائم کرتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب:

جو دماغ اسلامی نظام کے حقائق سے ناآشنا اور موجودہ فاسد نظام ہی کو کہ جس میں امارت و غربت کا قابلِ نفرت حد تک تفاوت (Difference) نظر آتا ہے، اسلامی نظام سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ باتیں بلاشبہ حیرت زدہ (Wonderful) ہیں اور ان میں سے بعض تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے منشاء الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے جب خود ہی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو محروم المعیشت پیدا کیا ہے اور غربت و امارت کا یہ فرق بھی کہ ایک کروڑ پتی ہے اور دوسرا نانِ جویں (Bare Bread) سے بھی محروم۔ اُسی کا بنایا ہوا ہے تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ حقِ معیشت میں تمام افرادِ انسانی مساوی ہیں اور یہ کہ کوئی فرد اس کائنات میں محروم المعیشت نہ رہے؟

اور بعض اس گمراہی میں ہیں کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اسلامی نظام کو ہمہ گیر ثابت کرنے کے لیے ایک جدید کوشش ہے جو دنیا کے رجحانات اور وقت کے تقاضوں کے سامنے سُپر ڈالتے ہوئے (ہار تسلیم کرتے ہوئے) احکام الٰہی کی ترمیم و تبدیل کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے یا اشتراکیت (Socialism) و اشتمالیت (Communism) سے مرعوب ہو کر قبائے مارکسزم (Marxism) کو اسلام کے جسم پر موزوں کیا جا رہا ہے، لیکن افسوس اور صد ہزار افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں خیالات، وساوس اور اوہامِ فاسدہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور درحقیقت یہ نتیجہ ہے اس عام بے خبری کا جو اسلامی تعلیم کے متعلق مسلم فضا میں ابرِ محیط کی طرح چھائی ہوئی ہے اور یہ ثمرہ ہے اپنے حقائق سے یکسر ناآشنا رہتے ہوئے اس مرعوبیت کا، جو مغربی تعلیم کی بدولت ہم پر طاری و ساری ہے۔

عالم تکوین اور عالم تشریع [1]:

یہ دونوں خیالات، وسوسہ سفطہ (Illusion) کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہم اس قسم کے مسائل پر بحث کرتے وقت اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع میں کیا فرق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس قانونِ الٰہی کو کائنات کی کامرانی (Success) کا واحد حل تجویز فرمایا ہے، ذی عقل کائناتِ عالم (Wise Creation of the Globe i.e. the Man) کو جس کے امتثال کی تکلیف دی ہے اور جس کی تعمیل کے لیے مکلف بنایا ہے اس کا تعلق تکوینیات سے ہے یا تشریعیات سے سو اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو بلاشبہ اس قسم کے وساوس اور اوہام کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

انسان عالم تشریع کا پابند [2]:

یہ ایک حقیقت ہے کہ خالقِ کائنات نے کائنات کے آغاز و انجام کا جو تکوینی

---

(۱) عالم تکوین: (World of Being – Ruled by the Will of Allah- Alone) عالم تکوین اس عالم (دنیا) کا نام ہے، جہاں اللہ کریم کا ارادہ، حکم اور قضاء و قدر کا راج ہے یہاں جو اللہ کریم چاہیں وہ ہو گا، جو نہ چاہیں نہیں ہو گا۔ اس عالم میں کسی اور فرشتہ، انسان و جن کے ارادہ یا عمل کو دخل ہے نہ ان میں سے کوئی اس عالم میں کیوں؟ کیا؟ کیسے؟ اور کیونکر؟ کا ذمہ دار یا جوابدہ ہے۔ اس عالم پر مطلق حکم (Absolute Order) اللہ کریم ہی کا چلتا ہے۔

(۲) عالم تشریع: (World ruled by Legislation) اللہ کریم قادر مطلق (Absolute) ہوتے ہوئے اس عالم کا بھی حاکم اور مالک ہے اور یہ عالم بھی اسی کریم و قادر کے حکم سے چل رہا ہے۔ مگر اس نے یہاں انسان کو اپنا نائب (Vicegerent) بنایا ہے جس کا اشارہ قرآن کریم میں کیا ہے اس کو ارادہ اور عمل کی قوت سے نوازا ہے، اسے اس عالم کو چلانے کے لیے کچھ اختیارات عنایت کیے ہیں اس سلسلہ میں اس کی رہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام —— جن کے آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں —— مبعوث فرمائے جن میں سے بعض پر کتب اور صحائف —— جن کی تکمیل قرآن کریم پر ہوئی —— نازل فرمائے یہاں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس عالم کو اللہ کریم کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں تشریع (Legislation) کر کے چلائے، اپنی فلاح و بہبود کے لیے قوانین اور ضوابط (Rules & Regulations) وضع کرے، جن کی وہ خود بھی پابندی کرے اور دیگر انسانوں سے —— اپنی اپنی حیثیت کے مطابق —— پابندی کا مطالبہ کرے۔ انسان اس عالم تشریع میں اللہ —— قادر مطلق —— اور وقت کے نبی علیہ السلام کی رہنمائی میں اپنے وضع کردہ قوانین کا پابند ہو گا۔ انہی قوانین میں وہ معاشی قوانین بھی ہوں گے جن کا انسان پابند اور جواب دہ ہے۔

نظام بنایا ہے اس کا تمام تر تعلق صرف اپنی ذات احدیت (Oneness) ہی کے ساتھ رکھا ہے اور اس میں کسی دوسرے کے دخل کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ نظامِ تکوینی میں کسی شے کے لیے کیا ہے اور کیا نہیں اور نہ اس علم کا ہم کو مکلف بنایا گیا ہے اور اس کا تعلق سر تا سر ''عالم تکوین'' سے متعلق ہے، البتہ اس نے حضرت انسان (ثقلین) کو جبکہ عقل و شعور اور ادراک و تمیز عطا فرمائے ہیں تو اس عطا و بخشش کے بعد اس کو یونہی بیکار اور معطل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اشیاء کے حسن و قبح اور اپنی مرضیات و نامرضیات کی معرفت اور ہدایت و گمراہی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے نیز افراد کو اجتماعی سلک میں منسلک کرنے کے لیے ایک بہترین ''نظام'' عطا فرمایا اور اس میں اچھی اور بری دونوں راہوں کو واضح کر دیا ﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ ۝١٠﴾ [1] اس نظام کا نام ''نظامِ تشریعی'' (Legislative System) ہے اور کائنات میں ''پہلے انسان'' کے ساتھ ساتھ یہ ''نظام'' عالم تشریع پر حاوی ہے اور انبیاء و رسل کے ذریعہ برابر دنیائے انسانی پر کار فرما رہا ہے اور اس کی فلاح و بہود کا ضامن و کفیل ہے، پس یہی وہ نظام ہے کہ جب حد کمال کو پہنچا، تو ''قرآن عزیز'' کی شکل میں جلوہ افروز ہوا۔

پس اگر یہ بنیادی حقیقت ہمارے پیشِ نظر رہے تو ہم بآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے دائرہ سے یہ باہر ہے کہ ہم ''نظامِ تکوینی'' سے بحث کریں بلکہ ہم صرف ''نظامِ تشریعی'' (قانون تشریع) ہی کے دائرہ میں محدود رہ کر بحث کر سکتے ہیں، تو اب قرآنِ عزیز سے نقل شدہ نصوص کو ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجئے کہ کیا ان نصوص کی مراد یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحتِ عامہ اور حکمتِ بالغہ کی بنا پر کائناتِ انسانی میں امارت و غربت کے تفاوتِ درجات کو خلق کیا ہے اس لیے کہ مرد مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تفاوتِ درجات کو ترقی دینے کے لیے ایسا نظام قائم

(۱) ﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ ۝١٠﴾ (سورۃ البلد: (۹۰): ۱۰) اور ہم نے اُسے دونوں راہوں (بھلائی اور برائی) کی رہنمائی کر دی۔

کرے کہ تمام ثروت و دولت امیروں کے ہاتھ میں آجائے اور کروڑوں انسان فقیر اور محتاج بن کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جانِ آفرین کو جان سپرد کر دیں اور اس طرح "العیاذ باللہ" منشاء الٰہی کو پورا کریں۔

اور اگر ان آیاتِ قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے تو پھر اس کے سوائے دوسرے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ درجاتِ معیشت میں فطری حد تک تفاوت کے باوجود حق معیشت میں تمام کائناتِ انسانی مساوی اور برابر کی شریک ہے اور کسی صاحبِ ثروت کی دولت و ثروت غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیر فرمان غرباء و مساکین کی غربت و مسکنت (Poverty & Misery) کو فنا کرنے کے لیے استعمال ہونی چاہیے، گویا صاحبِ ثروت کی ثروت، غرباء کی غربت کے لیے رحمت ثابت ہو، نہ کہ زحمت۔[۱]

---

(۱) اسلام کے عادلانہ معاشی نظام نے ایک کریمانہ قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ وہ مالداروں کو اللہ کریم کے وکیل اور فقراء کو اللہ کریم کا خاندان بتاتا ہے۔ وہ مالداروں کو حکم کرتا ہے کہ وہ اللہ کریم کے قبیلہ یعنی فقراء کی ضروریات کی تکمیل پر خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لیں، ورنہ انہیں اللہ کریم کا عذاب آن لے گا۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک حدیث قدسی سن لیں اور حقِ معیشت میں محتاج کے حق کی اہمیت کا اندازہ کر لیں۔

الاغنیاء وکلائی، والفقراء عیالی، فاذا بخل وکلائی علی عیالی أذقتهم وبالی ولا أُبالی.

ترجمہ: مالدار (تقسیم مال اور خرچ مال میں) میرے وکیل ہیں جبکہ فقراء (محتاج لوگ) میرا خاندان ہیں، پھر اگر یہ میرے وکلاء میرے خاندان پر خرچ کرنے میں بخل (کنجوسی) سے کام لیں گے، تو میرا وبال (عذاب) انہیں آن لے گا پھر میں بھی ان (مالداروں کے دکھوں) کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا۔

مصر کے مشہور شاعر —— بلکہ جنہیں اشعر الشعراء یعنی تمام شاعروں کا بڑا شاعر کہا گیا ہے —— احمد شوقی رحمہ اللہ (۱۸۶۸ء-۱۹۳۲ء) کی قبر پر اللہ کریم کی رحمتیں نازل ہوں انہوں نے کس عمدہ پیرایہ میں اسلام کے اقتصادی نظام کے بانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ حسنہ کا بیان کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں سے محتاجوں کا حق لے کر دینے سے متعلق ہے۔ لیجئے آپ بھی اس عظیم شاعر کا انداز ملاحظہ کریں۔

انصفت اهل الفقر من اهل الغنى

فکل فی حق الحیاة سواء

=

مساواتِ حقِ معیشت میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری:

اور اگر اربابِ ثروت ایسے عادل سسٹم کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر خدا کے نائب (خلیفہ) کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے "اجتماعی معاشی نظام" کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے اور اگر بیت المال کا مالیہ کافی نہ ہو اور اس سے بھی قلمرو خلافت (Purview of Khilfah) میں محروم المعیشت انسان موجود رہ جائیں تو اہلِ دولت کے سرمایہ سے بہ جبر حاصل کر کے "حقِ معیشت کی مساوات" کو بروئے کار لائے خواہ وہ اہلِ دولت اپنے مال میں سے تمام عائد شدہ مالی فرائض و حقوق ادا کر چکے ہوں۔

مباحث کا خلاصہ:

الحاصل قرآنی نصوص اور ان کی موید احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے مستنبط فقہی احکام یہ واضح کرتے ہیں کہ "حقِ معیشت کی مساوات" کا یہ نظریہ منشاءِ الٰہی کے خلاف نہیں بلکہ عین منشاءِ الٰہی کے مطابق ہے اور یہ جدید نظریہ نہیں ہے کہ مارکسزم (Marxism) کی حمایت یا اس سے مرعوبیت کی بنا پر احکامِ اسلامی کی انوکھی تعبیر کے ذریعہ وجود میں آیا ہو بلکہ اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی حکم ہے جو اپنے وجود سے آج تک غیر متبدل و غیر متزلزل (Unchanged & Firm) رہا ہے اور اگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی یا دوسرے انسانوں کے اختراعی معاشی نظاموں (Human Modeled Economic Systems) سے مرعوب ہو کر ہم نے

لـــــــــــو ان انســــــــــــانا تخــــــــــــير ملــــــــــــة

مــــــــــا اختــــــــــار إلا دينــــــــــك الفقــــــــــراء

ترجمہ: (اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ نے دولت و ثروت والوں سے انصاف کے ساتھ حاجت والوں (فقراء و مساکین) کو (اُن کا) حق دلوایا۔ اس طرح تمام انسان زندگی کے حقِ (معیشت) میں برابر ہو گئے۔
(اے غریبوں کے ملجاء و ماوی نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) اگر انسان کو اپنی مرضی سے کسی (مذہب) و ملت کا اختیار کرنا ہوتا تو محتاج لوگ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا طریقہ (معیشت) پسند کرتے۔

"اسلامی معاشی نظام" کو یکسر بھلا دیا تو اس میں اپنا قصور ہے نہ کہ اسلامی نظام کے بیان کرنے والے اور اس کی اصل حقیقت سے روشناس کرانے والے کا۔ اور یہ بھی سخت گمراہی ہے کہ ہم یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ غربت و امارت کا یہ غیر فطری تفاوت اور ظالمانہ امتیاز جو آج ہم کو کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے خدا کا بنایا ہوا ہے، بلکہ یہ "فاسد نظامہائے معاشی" کے ثمرات و نتائج ہیں اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نظامہائے فاسد کو یک قلم سوخت ہو جانا چاہیے۔

درجات معیشت (Economic Gradation)

اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں ہیں، اور معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری (Natural) ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لیے سامانِ معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لیے۔

مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجۂ ظلم نہ بن سکے، یعنی تفاوتِ درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ "معیشت" انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسروں کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ جائے۔ قرآن عزیز نے اس تفاوتِ درجات کو اس طرح بیان کیا ہے:

❶ ﴿نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُم مَّعِيشَتَهُمۡ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَاۚ وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٖ دَرَجَٰتٖ﴾ (1)

ترجمہ: دنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو دوسرے بعض پر درجۂ معیشت میں بلندی حاصل ہے۔

---

(۱) سورۃ الزخرف (۴۳): ۳۲

۲ ﴿ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ﴾ (۱)

ترجمہ: اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی ڈالتا ہے۔

۳ ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ ﴾ (۲)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تا کہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔

۴ ﴿ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ ﴾ (۳)

ترجمہ: خدا تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی ہے وہ اپنی روزی سے اپنے زیر دستوں کو لوٹا دے۔ حالانکہ اس روزی میں سب برابر کے حق دار ہیں پھر کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں؟

گویا رزق میں تفاوتِ درجات کی مصلحت ایک خاص قسم کی آزمائش پر مبنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ایک جانب غنی کو صاحبِ ثروت بنا کر اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ثروت کو تنہا اپنی ملکیت نہ سمجھے بلکہ "انفرادی ملکیت (Individual Ownership) کے باوجود" یہ یقین رکھے کہ وہ جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت پر

(۱) سورۃ الرعد (۱۳): ۲٦

(۲) سورۃ الانعام (٦): ۱٦۵

(۳) سورۃ النحل (۱٦): ۷۱

اجتماعی حقوق (Social Obligations) زیادہ عائد ہوں گے، پس وہ صرف اپنے لیے نہیں کماتا بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لیے بھی کماتا ہے۔

نیز یہ ذہن نشین رہے کہ درجات کا یہ تفاوت جماعت کے دوسرے افراد کو محروم المعیشت بنانے اور ذاتی اغراض کی خاطر معاشی دستبرد (Economic Exploitation) کرنے کے لیے نہیں ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کی نعمت (عطاء ثروت) کا جاحد (منکر) ہے۔

کیونکہ یہاں دولت و سرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع بازی نہیں ہے بلکہ انفرادی حاجات و ضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات و ضروریات کی تکمیل ہے، دوسری جانب غیر متمول (The Poor) سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متمول (The Rich) افراد ملت کے تمول (Opulence) کو دیکھ کر خدا کے ساتھ کفران اور ناشکر گزاری نہ اختیار کرے اور نہ حسد و بغض کو دل میں جگہ دے بلکہ طمانیتِ قلب (Peace of Mind) کے ساتھ اپنی مختصر فارغ البالی اور خوشحالی (Short Well- Being & Presperity) پر شاکر رہے[1] اور یا پھر عملی جدوجہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوقِ معیشت سے متمتع (Utilizer) ہو اور غنا و دولت

---

(۱) لفظ فارغ البالی اس لیے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں کسی فرد کا محروم المعیشت رہنا ناجائز ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام نے اغنیاء کو یہ احساس بھی دلا دیا ہے کہ اپنے معاشی طور پر کمزور اور محتاج بھائیوں کی مدد کر کے یا انہیں بنیادی ضروریاتِ زندگی میں اپنے برابر کر کے وہ ان بے نواؤں پر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ ان (طاقتور اغنیاء) کو تو روزی اور مدد ان کے کمزور اور فقیروں کے سبب اللہ کریم کی طرف سے مل رہی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے جذبات ابھارنے والے انداز میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔:

عن ابی الدرداء عویمر رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ابغونی الضعفاء، فانما تنصرون، وترزقون بضعفائکم. (ابوداؤد، ریاض الصالحین، باب ملاطفة الیتیم ...... والضعفاء والمساکین الخ)

ترجمہ: حضرت ابودرداء عویمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: کمزوروں کے بارے میں مجھے خوش رکھا کرو (اور اس میں تمہارا بھی سراسر فائدہ ہے) کیونکہ تمہیں مدد اور رزق تمہارے کمزوروں کے سبب ہی ملتا ہے۔

(Richness & Riches) حاصل کرے جن کو تمام مخلوقِ خدا کے لیے عام اور مساوی کر دیا ہے اور دوسرے افرادِ ملت کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو اپنے حاصل کردہ مال پر اسی طرح عائد کرے جس طرح قانونِ اسلامی نے دوسرے اربابِ دولت پر عائد کیے ہیں۔

احتکار و اکتناز کی حرمت

(Prohibition of Hoarding & Concentration)

دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول قطعاً ناقابلِ تسلیم ہیں جن میں احتکار و اکتناز کی کوئی صورت بھی بن سکے اور ان سے دولت و کنز (Wealth & Treasure) پھیلنے اور تقسیم ہونے کی بجائے سمٹ کر خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو جائے۔ اور اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال (Poverty Stricken) بنادے، اکتناز و احتکار کی حرمت اور انفاق کے وجوب کے لیے ذیل کی آیات قابلِ توجہ ہیں:

❶ ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو درد ناک عذاب کی خوشخبری دے دو جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا اور چکھو مزہ

---

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): ۳۴، ۳۵

اپنے گاڑنے کا۔

❷ ﴿كَيۡ لَا يَكُونَ دُولَةَۢ بَيۡنَ ٱلۡأَغۡنِيَآءِ مِنكُمۡۚ﴾ (۱)

ترجمہ: (فقراء و مساکین، قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو خرچ کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے اس لیے ہے) تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔

❸ ﴿إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱلۡعَٰمِلِينَ عَلَيۡهَا وَٱلۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمۡ وَفِي ٱلرِّقَابِ وَٱلۡغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبۡنِ ٱلسَّبِيلِۖ فَرِيضَةٗ مِّنَ ٱللَّهِۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٞ ٦٠﴾ (۲)

ترجمہ: صدقات اور کسی کے لیے نہیں ہیں صرف فقیروں کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور ان کے لیے جو صدقات کے وصول کرنے پر مامور ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں کلمۂ حق کی الفت پیدا کرنی ہے اور ان کے لیے جن کی گردنیں (غلامی سے) آزاد کرانی ہیں اور قرض داروں کے لیے جو کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لیے (یعنی مجاہدین اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے، یہ اللہ کی جانب سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

❹ ﴿وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ﴾ (۳)

ترجمہ: اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔

---

(۱) سورۃ الحشر (۵۹):۷

(۲) سورۃ التوبۃ (۹):۶۰

(۳) سورۃ البقرہ (۲):۴۳

۵ ﴿وَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِمْ فِعْلَ ٱلْخَيْرَٰتِ وَإِقَامَ ٱلصَّلَوٰةِ وَإِيتَآءَ ٱلزَّكَوٰةِ ۖ وَكَانُوا۟ لَنَا عَٰبِدِينَ ۝٧٣﴾ (۱)

ترجمہ: اور ہم نے ان کی جانب (انبیاء علیہم السلام کی جانب) وحی کی نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

۶ ﴿وَأَنفِقُوا۟ مِن مَّا رَزَقْنَٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِىَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ﴾ (۲)

ترجمہ: اور جو ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس سے پہلے ہی خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آموجود ہو۔

۷ ﴿وَأَنفِقُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا تُلْقُوا۟ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى ٱلتَّهْلُكَةِ﴾ (۳)

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے رکنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے)۔

ان آیات میں اداءِ زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ایک بہت بڑا ذخیرہ ان ہی احکام کی ترغیب و ترہیب (رغبت دلانا اور ڈرانا) ان سے متعلق احکام اور تفصیلات پر مبنی ہے اور ان سب کی روح یہ ہے کہ دولت و ثروت جمع و ذخیرہ کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف و خرچ کے لیے ہے اور اس کا مصرف ذاتی و انفرادی تعیش (Personal & Individual Luxuries) کی بجائے انفرادی و اجتماعی ضروریات کی کفالت (Maintenance) ہے۔

اسی لیے ان آیات کی تفسیر (Exegsis) میں "جمہور" کا مسلک یہ ہے کہ جس مال میں سے زکوٰۃ اور دوسرے مالی فرائض ادا نہ کیے گئے ہوں تو وہ مال احتکار و اکتناز کی

(۱) سورۃ الانبیاء: (۲۱) ۷۳

(۲) سورۃ المنافقون (۶۳): ۱۰

(۳) سورۃ البقرہ (۲): ۱۹۵

فہرست میں شامل اور "کنز" سے متعلق وعید کا مصداق ہے اور اسی قسم کی دولت و ثروت کا نام "سرمایہ داری" ہے اور یہ حرام اور باطل ہے اور تباہ کردینے کے قابل۔

اور اپنی ضروریات اور اہل و عیال کی حاجات اصلیہ [1] (Basic Necessities) اور مالی فرائض و واجبات (Financial Obligations) کے اداء کے بعد بھی دولت باقی بچے تو اس کا پس انداز کرنا اگرچہ جائز ہے مگر خلافِ اولیٰ ہے کیونکہ اب اس مال پر اجتماعی حقوق عائد ہو چکے ہیں اور اب اس کو اجتماعی حاجات میں صرف ہونا چاہیے۔

اور جمہور کے خلاف حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ [2] اور بعض علماء

---

(۱) مصارف کے موقعہ پر ہم نے جگہ جگہ لفظ حاجات کے ساتھ اصلیہ کا اضافہ کیا ہے یہ اس لیے کہ وہ تمام اخراجات و مصارف نظام اسلامی میں غیر معتبر اور باطل ہیں جو اس کی نگاہ میں ممنوع یا حرام ہیں۔

(۲) کان من مذهب ابی ذر رضی الله عنه تحريم ادخار علی نفقة العيال وكان يفتی بذلك ويحثهم عليه ويامرهم به. (ابن كثير: تفسير، سوره توبه، آيات: ۳۴-۳۵)

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ اہل و عیال کے نفقہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا قطعاً حرام ہے، وہ اسی کا فتویٰ دیتے، اسی کی تبلیغ کرتے، اور اسی کا سب کو حکم دیتے تھے۔

اور اس کی بنیاد وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات اور ان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات پر رکھتے ہیں، جن میں جوڑ جوڑ کر رکھنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے، اور اللہ کریم کی رضاجوئی کے لیے محتاجوں پر خرچ کر دینے کی تاکید اور ستائش کی گئی ہے، اُن بہت سی احادیث میں سے ایک آپ کو سنائے دیتا ہوں:

كنت أمشي مع النبی صلی الله عليه وسلم فی حرة بالمدينة، فاستقبلنا أحد فقال: يا اباذر! قلت: لبيك يا رسول الله! فقال: ما يسرنی أن عندی مثل أُحد هذا ذهبا، تمضی عليها ثلاثة أيام وعندی منه دينار، إلا شی أرصده لدين، إلا ان أقول به فی عباد الله هكذا، وهكذا، وهكذا، عن يمينه وعن شماله وعن خلفه. ثم سار فقال: الأكثرون هم الأقلُّون يوم القيامة، إلّا من قال بالمال هكذا، وهكذا وهكذا عن يمينه وعن شماله وعن خلفه، وقليل ماهم. (متفق علیہ یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں)

ترجمہ: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ کے علاقہ حرہ میں چل رہا تھا۔ ہمارا رخ احد (پہاڑ) کی طرف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! میں نے عرض کیا: حاضر ہوں، اے اللہ کریم کے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس بات سے خوشی نہ ہوگی کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو پھر اس پر تین روز گزر جائیں اور میرے پاس اس میں سے ایک دینار بچ جائے، البتہ ادائیگی قرض کے لیے کچھ بچالوں تو اور بات ہے، ہاں میں اسے اللہ کریم کے بندوں میں ایسے اور =

ایسے اور ایسے بانٹوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں، بائیں اور پیچھے اشارہ کر کے دکھایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے اور فرماتے جاتے تھے: یقیناً آج جو کثرت (مال) والے ہیں وہ قیامت کے دن قلیل (ثواب) والے ہوں گے، ہاں البتہ جس نے ایسا کیا، اور ایسے کیا اور ایسے کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں، بائیں اور پیچھے ہاتھوں کو (گھما کر) دکھایا، مگر ایسے (خوش نصیب) بہت کم ہوں گے۔

یہ تو امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ آئیے میرے ساتھ مل کر مسند احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے الفاظ بھی پڑھ لیں:

قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: یا اباذر! أی جبل هذا؟ قلت: أُحد یا رسول اللّٰہ! قال: والذی نفسی بیده ما یسرّنی أنه لی ذهبا قطعا أنفقه فی سبیل اللّٰہ أدع منه قیراطا. قلت: قنطارا یا رسول اللّٰہ! قال: قیراط، قالها ثلاث مرات، ثم قال: انما أقول الذی أقلّ، ولا اقول الذی وهو اکثر. (احمد بن حنبل رحمه اللّٰہ تعالیٰ: مسند، مرویات ابی ذر رضی اللّٰہ عنه)

ترجمہ: مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ابوذر! یہ کونسا پہاڑ ہے؟ میں نے عرض کیا: احد ہے، اے اللہ کریم کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس ذاتِ کریم کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں خوش نہیں ہوں گا، اگر یہ احد میرے لیے سونے کا ٹکڑا بن جائے، پھر میں اسے اللہ کریم کی راہ میں خرچ کروں مگر میرے پاس ایک قیراط بچ جائے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کریم کے رسول کریم! آپ کی مراد ہے قنطار؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیراط اور پھر (مجھے ذہن نشین کرانے کے لیے) تین بار دہرایا، پھر فرمایا! میں تو وہ کہہ رہا ہوں جو تھوڑا ہے (یعنی قیراط)، وہ نہیں کہہ رہا ہوں جو زیادہ ہے (یعنی قنطار)۔

میں اپنے آپ کو سنگ دل اور ناقدر شناس تصور کروں گا اگر اس حدیث کو ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس انداز میں نہ سناؤں جس انداز میں وہ بیان کر کے روحانی فرحت اور بالیدگی محسوس کرتے تھے کیونکہ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی وارفتگی کو تمام ظاہری آداب پر غالب کر دیتے تھے اس طرح وہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون پا لیتے تھے۔ لیجیے پڑھیے:

إنّ خلیلی أبا القاسم صلی اللّٰہ علیه وسلم دعانی فقال: هل تری أحد؟ فنظرت ما علا من الشمس. وأنا أظنه یبعثنی فی حاجته، فقلت: أراه. قال: ما یسرّنی أن لی مثله ذهبا نفقته کله إلّا ثلاثة دنانیر. (ابن سعد، طبقات، ترجمه ابی ذر الغفاری رضی اللّٰہ عنه، احمد بن حنبل: مسند، حواله بالا)

ترجمہ: مجھے میرے حبیب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا: (میں حاضر ہوا تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو احد (پہاڑ) دیکھ رہا ہے؟ میں نے اوپر سورج کی طرف نظر دوڑائی (کہ پہاڑ کی اونچائی کو اچھی طرح دیکھ لوں)۔ میں نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی کام کے لیے مجھے ادھر بھیجیں گے۔ میں نے عرض کیا: ہاں دیکھ رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے خوشی نہیں ہوگی کہ میرے پاس اس (احد) =

اسلام اس کو بھی جمع کر کے رکھنا حرام بتاتے ہیں۔

اور ان آیاتِ زکوٰۃ و صدقات اور منع اکتناز و احتکار کے علاوہ آیاتِ میراث اور قانونِ وراثت بھی اسی حکمت پر مبنی ہے کہ دولت و ثروت ''جمع و ذخیرہ'' کے لیے نہیں ہے بلکہ تقسیم اور پھیلنے کے لیے ہے تاکہ اس کا افادہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو سکے۔

فاسد نظامِ معیشت کا انسداد اور سرمایہ و محنت میں عادلانہ توازن

خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں جس سے فاسد نظامِ معیشت بروئے کار آئے یا اس کو کسی قسم کی بھی اعانت پہنچے یا محنت اور معیشت کے لیے جائز جد و جہد بے حقیقت ہو کر رہ جائے اور اس طرح محنت اور سرمایہ کے درمیان اعتدال اور توازن باقی نہ رہے، اسی لیے اس نے ربوا (سود) کے ہر قسم کے تجارتی کاروبار قمار (جوا) کی تمام ظاہری و خفی اقسام و اصناف، احتکار و اکتناز (Hoarding & Concentration) کی تمام اشکال اور اسی طرح کے عقود فاسدہ (Invalid Contracts) کی دوسری تمام صورتوں کو ناجائز اور مردود قرار دیا اور معاملات کے کسی شعبہ میں بھی ''فاسد معاشیات'' کو دخیل اور بروئے کار نہیں آنے دیا اور دوسرے شعبوں کی طرح معاملات کے اس شعبہ میں بھی عدل و انصاف ہی کو اساس و بنیاد قرار دیا ہے۔

چنانچہ حسبِ ذیل تصریحات اس کی شاہد ہیں:

❶ ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰا۟ ﴾ (۱)

کے برابر سونا ہو اور میں وہ سارا خرچ کر دوں اور میرے پاس تین دینار بچے رہیں۔

اب فیصلہ فرمائیے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مال کے جمع کرنے، بچا کر رکھنے اور اللہ کریم کی راہ میں اس کے محتاج بندوں پر خرچ کرنے میں کیا مسلک اختیار کرتے؟

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۷۵

ترجمہ: اللہ نے خرید و فروخت کے معاملات کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کر دیا ہے۔

❷ ﴿ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَٰتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴾(۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو مٹاتا ہے اور صدقات و خیرات کو ترقی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکر گزار گناہ کار کو دوست نہیں رکھتا۔

❸ ﴿ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَٰنِ فَاجْتَنِبُوهُ ﴾(۲)

ترجمہ: بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک ہیں، کار شیطان ہیں، پس ان سے بچو۔

❹ ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝١ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝٢ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝٣ ﴾(۳)

ترجمہ: خرابی ہے کمی کرنے والوں کے لیے ان لوگوں کے لیے کہ جب مال تول کر لیں تو لوگوں سے تو پورا پورا بھر لیں اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔

❺ ﴿ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝١٨٢ ﴾(۴)

ترجمہ: اور تول کر دو برابر وزن کے ساتھ۔

❻ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم

(۱)سورۃ البقرہ (۲): ۲۷۶

(۲)سورۃ المائدہ: (۵) ۹۰

(۳)سورۃ المطففین (۸۳): ۱، ۳

(۴)سورۃ الشعراء (۲۶): ۱۸۲

بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ﴾[۱]

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل (ناجائز طریقہ) سے نہ کھاؤ! ہاں! اگر آپس کی رضا مندی سے تجارت ہو تو اس طرح کھا سکتے ہو (گویا ہر شخص اپنے حصے کے مطابق اپنا حق لے)۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ[۲] (نور اللہ مرقدہ) حجۃ اللہ البالغہ میں اسی اساسی اصول کی روشنی میں ''باب ابتغاء الرزق'' (In quest for Provision) کے عنوان سے حسبِ ذیل نہایت پر شوکت اور مدلل مضمون تحریر فرماتے ہیں:

اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی وقیع رائے

وسائلِ معاش سب کے لیے یکساں:

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور زمین میں ان کی معاشی حیات (Economic Life) کے لیے سب کچھ سامان فراہم کر دیا اور ان سب کو سب کے لیے مباح (Permissible) اور عام (Common) کر دیا تو ان سے متمتع ہونے میں مخلوقات کے درمیان مزاحمت اور مناقشت (Struggle) شروع ہو گئی، تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب کوئی شخص سبقت اور پہل کر کے کسی شے کو اپنے قبضہ میں کر لے یا مورث کے قبضہ کی وجہ سے اس کی وراثت میں آجائے یا ان کے علاوہ ایسے دوسرے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز طریقے قرار پا چکے ہیں تو ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کو اس کی مقبوضہ (Possessed - Owned) شے میں مزاحمت کا حق نہیں ہے۔

---

(۱) سورۃ النساء (٤): ۲۹

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

حصول ملکیت وسیلہ معاش کا جائز طریقہ:

البتہ دوسرے کی مقبوضہ شے کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ یا خرید و فروخت اور لین دین کے ذریعے تبادلہ (Exchange) کی شکل پیدا کرے یا معتبر طریقوں سے باہمی رضا مندی کا معاملہ اس طرح انجام پا جائے کہ ہر دو جانب میں اس کے متعلق صحیح علم ہو اور اس معاملہ میں نہ التباس اور دھوکے کا دخل ہو اور نہ خلط ملط کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

معاشی زندگی میں تعاون و اشتراک کی اہمیت:

نیز جب کہ انسان مدنی الطبع (Sociable) واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون و اشتراک کے بغیر ناممکن ہے ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراکِ عمل کو واجب کر دیا اور یہ بھی لازم قرار دیا کہ کسی فرد کو بھی ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں جو تمدن میں دخیل ہیں مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کر دیں۔

ترقی وسائل کا صحیح طریقہ:

نیز اسبابِ معیشت کے "اسباب" بننے میں اصل الاصول یہ ہے کہ اموالِ مباح (Permissible Properties & Goods) میں سے کسی شے کو اپنے قبضہ میں لیا جائے یا ان اموالِ مباح کے وسیلہ سے جو کہ مالی ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں اپنے مقبوضہ اور مُشخّصہ مال (Private Property) کو ترقی دی جائے، مثلاً چرائی کے ذریعہ سے چوپایوں کی افزائش نسل (Breeding of Race) یا زمین کی درستی اور پانی کی سیرابی کے ذریعہ سے زراعت و کاشتکاری، لیکن مالِ مباح کو اپنے لیے خاص کرنے یا دوسرے مباح اموال کو اپنے مال کی ترقی کا ذریعہ بنانے میں شرطِ اولین یہ ہے کہ یہ تصرفات اس طرح عمل میں نہ آنے پائیں کہ ایک فرد دوسرے فرد کے لیے معاشی ذرائع کی تنگی اور ضیق کا باعث بن جائے اور اس طرح تمدن کو فاسد اور برباد کر دے (یعنی جبکہ

حلال وسائل معاش سب کے لیے یکساں طور پر مباح الاصل (Originally Permissible) ہیں تو اب کسی شخص کو اپنی شخصی معاش کے لیے اسی قدر اس میں تصرف اور دعوی ملکیت جائز ہے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کی معاشی زندگی کی پریشانی کا باعث نہ بن جائے اور اس کی دولت مندی دوسروں کے افلاس اور فقر و فاقہ کا سبب نہ ثابت ہو)۔

معاشی ترقی و نمو کے مناسب طریقے:

پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر "معاشی معاملات" میں لوگوں کے درمیان باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کے ذریعہ مالی ترقی و نمو بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا صالح اور صحیح رہنا دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا، مثلاً ایک چاہتا ہے کہ وہ تجارتی مال کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جائے اور ایک معین مدت کے لیے وہ اس ایاب و ذہاب (Arrival & Deparure) کی گارنٹی چاہتا ہے (یعنی تجارت کو ذریعہ معاش بناتا ہے) یا مثلاً ایک دوسرا شخص اپنی عملی جد و جہد کے ذریعے دوسروں کے مال کی دلالی کرتا ہے (یعنی محنت کو ذریعہ معاش بناتا ہے) یا ایک تیسرا شخص اپنی نئی نئی پسندیدہ ایجادات کے ذریعے دوسروں کے مال کو بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے (یعنی صنعت و حرفت کو وسیلہ معاش بناتا ہے) اور اس طرح دوسرے جائز طریقے اختیار کرتا ہے تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہو سکتی۔ بہرحال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون و اشتراکِ عمل ضروری اور واجب ہے اور اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقہ سے کی جائے کہ اس میں سرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو جیسا کہ قمار (جوا) کا کاروبار یا ایسے طریقہ سے عمل میں لائے کہ بظاہر تو تعاون نظر آتا ہو لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو، حقیقی تعاون نہ ہو جیسا کہ مثلاً ربوا (سود) کا کاروبار، اس لیے کہ یہ بات بہت صاف ہے کہ ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے ذمہ ایسی ذمہ داریوں کو لینے کے لیے مجبور و مضطر ہو جاتا ہے جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا اور اس کی اس قسم کی

رضامندی ہرگز رضامندی نہیں کہلائی جاسکتی پس اس طرح کے کاروبار نہ پسندیدہ اور جائز معاملات کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ ان کو معاشیات کے اسباب صالحہ کہا جاسکتا ہے اور بلاشبہ اس قسم کے تمام معاملات حکمتِ تمدن کی نگاہ میں باطل اور ظلم ہیں۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے سے ماخوذ سنہری معاشی اصول:

حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت سے صرف آخری اصول ہی پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ اصولِ چہار گانہ کی ایک جامع اور مبسوط تفصیل سامنے آجاتی ہے، یعنی

(الف) معیشت میں فطری تفاوتِ درجات کے باوجود تمام مخلوق یکساں اور برابر ہے[2] اور خدا نے تمام معاشی وسائل میں زمین اور پیداوارِ زمین کو سب کے لیے مباح الاصل (Originally Permissible) پیدا کیا ہے اور تعیین و تشخیص (Determination&Specification) جائز قبضہ سے ہی وجود میں آتی ہے۔

(ب) اور کسی فرد کو ان اموالِ مباح میں اسی قدر اور اسی طریق سے قبضہ و تصرف (Possession & Utlization) جائز ہے کہ اس سے دوسرے فرد کے لیے معاشی ضیق (تنگی) کے اسباب پیدا نہ ہو جائیں۔

(ج) نیز معاشی معاملات میں "باہمی تعاون و اشتراکِ عمل" (Mutual – Co – Operation & Partnership) واجب اور ضروری ہے۔

(د) اور یہ تعاون ایسے صحیح اور سالم طریقوں پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس سے نظامِ تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے، یعنی ان کے ذریعے معاشی معاملات میں ایک دوسرے کو مدد ملے نہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کی مضرت پر موقوف ہو۔

(ہ) اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ کائنات میں ایک "صالح معاشی نظام" موجود ہو جو

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ابواب ابتغاء الرزق، ۲/۲۰۲

(۲) یعنی حقِ معیشت میں برابر ہیں۔

خدائے تعالیٰ کے حکم اور منشاء کو پورا کرتا ہو۔

(و) پس اس ”صالح معاشی نظام“ میں وہ تمام معاملات ناجائز اور حرام ہیں جن میں تعاونِ باہمی کا مطلق دخل ہی نہ ہو بلکہ ایک فرد کی تباہی اور مضرت پر جو دوسرے فرد کی مالی منفعت کا مدار ہو جیسا کہ قمار (جوا) خواہ وہ غیر مہذب طریقوں سے عمل میں آئے یا سٹہ اور لاٹری وغیرہ مہذب طریقہ ہائے تجارت کے ذریعے سے۔

(ز) اور وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں جن میں بہ ظاہر اگرچہ باہمی رضا اور تعاون نظر آتا ہو لیکن اس کی تہہ میں زبردستی کے سوا اور کچھ نہ ہو جیسا کہ مثلاً ربوا (سودی لین دین) اور ایسے تمام اجارات و معاملات (Hires & Dealings) جن میں ایک جانب سرمایہ دار کا سرمایہ ہے اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی اضطراری ضرورت، اور سرمایہ دار مفلس کے افلاس اور اس کی اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اجارہ (Rent) رہن (Pledge) اور دوسرے معاملاتِ لین دین میں اس سے ایسی شرائط منظور کرالیتا ہے جو انصاف اور عدل کی نگاہ میں کسی طرح جائز نہیں تھیں، مگر مفلس کے افلاس اور ضرورت مند کی ضرورت نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔

(ح) پس اس قسم کے تمام معاملات اگرچہ باہمی رضامندی سے بھی طے پاجائیں تب بھی اسلام اور خدائے کائنات کے نزدیک باطل اور ظلم ہیں۔ اور ”صالح معاشی نظام“ میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں خواہ ان کے ظاہری فائدے کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں، اس لیے کہ اس قسم کے کاروبار کا آخری نتیجہ عوام کی فلاکت و افلاس اور ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری کے سوائے اور کچھ نہیں ہے اس لیے یہاں مہاجنی سود کا کاروبار بھی ملعون ہے اور سودی بینکوں کا سسٹم بھی مذموم و مطرود، اور یہاں مستاجروں (Employers / Renters) کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں جن میں اجیر (Employee) کے جائز اور عادلانہ اجرت و حقوق کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو، اور اجیر کی وہ خیانت بھی ناجائز

جس سے صاحبِ سرمایہ کو ناحق نقصان پہنچانے کی سعی کی جائے۔

مباحث کا خلاصہ:

بہرحال ''معاشی نظام سے متعلق'' ان آیات میں قرآن عزیز نے جن نصوصِ قطعیہ کو بیان کیا ہے اور معجزانہ بلاغت (Succinct) اور حکیمانہ اسلوب کے ساتھ راہنمائی فرمائی ہے، اسلام کا معاشی نظام انہی نوامیس الٰہی (Revelations of Allah) کی شرح و تفسیر ہے، پس آئندہ صفحات میں جو کچھ بھی سپردِ قلم ہو گا وہ صرف ان ہی حقائق کی تفصیلات ہوں گی کہ یہی درحقیقت ''صالح معاشی نظام'' کے لیے بہترین دلیلِ راہ ہیں اور اس کے وجود کے ضامن اور کفیل۔

اب ان تفصیلات سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ''معاشی نظام'' کا جو اساسی مقصد ہے اس کو کامیاب بنانے کے لیے ''اسلام کے اقتصادی نظام'' کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے۔ یہاں مارکسزم (اشتمالیت) کی طرح مذہبی انار کی بھی نہیں ہے اور طبقاتی جنگ بھی موجود نہیں بلکہ ایک عالمگیر اخوت کا غیر قانونی اعلان ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت و وسائلِ دولت کو سمیٹ کر مخصوص طبقہ کے حوالہ کرنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے تاکہ باطل اور ظلم کی بنیادیں کسی حالت میں بھی قدم نہ جما سکیں اور دنیائے انسانی کے کسی ایک فرد کو بھی اپنی معاشی حیات میں انسانوں کے ہاتھوں میں ضیق اور تنگی پیدا نہ ہو۔

امتِ مسلمہ کی ذمہ داری:

اب یہ ہمارا کام ہے کہ معاشیات کی علمی کاوشوں اور فنی بحثوں (Technical Discussions) سے مرعوب ہو کر اس جال میں پھنس جائیں جس نے اور سب کچھ تو کیا مگر انسانی دنیا کو امن و سلامتی اور عام خوشحالی و رفاہیت (Welfare) سے کبھی روشناس نہ ہونے دیا اور اس طرح اپنی بدبختی پر اپنے ہاتھ سے مہر لگا لی اور یا اس سادہ مگر امن و سلامتی کے شاہکار نظام کو اپنا قائد بنا لیں جس نے اپنی عملی زندگی کی عمر اگرچہ کم پائی

اور خلافتِ راشدہ کے بعد شاہان اسلام نے اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر جس کو کبھی بروئے کار نہ آنے دیا، تاہم جس قدر بھی عمر پائی اس میں معاشی نظام کی غرض وغایت کو ایسے بے نظیر پروگرام کے ساتھ منصہ شہود پر جلوہ گر کیا کہ دوست اور دشمن دونوں آج تک اس کی ہمہ گیر اخوت وپیامِ مساوات اور عام معاشی خوشحالی اور رفاہیت کے معترف ہیں۔



باب ــــــ ۳

انفرادی معیشت

(Indiviual Economics)

بنیادی موضوعات

معیشت اور اسبابِ معیشت کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی سے وابستہ ہے اور چونکہ جماعت جسم کی حیثیت رکھتی ہے اور فرد اس جسم کے ایک عضو کی اس لیے اجتماعی اور انفرادی شعبہ ہائے حیات کے مابین لازم و ملزوم کا رشتہ قائم ہے اور ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا ناگزیر ہے، تاہم دونوں شعبوں کی تفصیلات جدا جدا قابلِ بحث ہیں، اور ان میں سے قدرتی ترتیب کے لحاظ سے پہلا نمبر انفرادی معیشت کو زیر بحث لانے کا ہے۔

"اسلام کے معاشی نظام" میں فرد سے متعلق احکامِ معیشت کیا ہیں؟ عمیق نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں تین [1] چیزیں فطری طور پر سامنے

(۱) فاضل مصنف رحمہ اللہ نے یہاں فرد کی معاشیات کے موضوعات تین (کیا کمائیں؟، کیا خرچ کریں؟ اور کس پر خرچ کریں؟) بتائے ہیں، البتہ دو اور نہایت اہم موضوع ــــــ جن میں سے ایک پر انہوں نے آگے چل کر سیر حاصل بحث بھی کی ہے ــــــ یہاں بیان نہیں کر سکے اور وہ ہیں: کہاں سے کمائے؟ اور کتنا خرچ کریں؟ غالبا فرد کی ساری معاشیات زیادہ تر انہی دو کے گرد گھومتی ہے، لہذا فرد کی معاشیات کے چھ اہم موضوعات ہوسکتے ہیں کہ فرد:

❶ کیوں کمائے؟ اس پر حضرت مصنف رحمہ اللہ نے بحث کی ہے۔

❷ کیا کمائے؟ اس کی بحث مصنف رحمہ اللہ نے کی ہے۔

❸ کہاں سے کمائے؟ حلال اور طیب ذرائع سے کمائے، گو اس پر مصنف رحمہ اللہ نے زیادہ بحث نہیں کی مگر جو ارشادات بیان کیے گئے ہیں وہ موضوع کے فہم کے لیے کافی ہیں۔

=

آتی ہیں:

① کیا کمائیں؟ ② کیا خرچ کریں؟ ③ اور کس پر خرچ کریں؟

یعنی وہ کون سی آمدنی ہے جس کو جائز آمدنی کہا جا سکتا ہے؟ اور اس آمدنی میں سے کیا خرچ کرنا چاہیے؟ اور کس پر خرچ کرنا چاہیے؟ چنانچہ اسلام نے ان تینوں فطری سوالات کو حل کرنے کے لیے "انفرادی معیشت" کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں انسان کو جدوجہد کی ترغیب اور کسبِ معاش کے لیے حرکت کی دعوت دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسان کو اپنی معاش خود اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمانا چاہیے، کیونکہ جمود اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے کی زندگی موت کے مترادف ہے اور اس کو حیات کہنا بے معنی ہے اور نہ اس طریقِ زندگی کو "توکل" کی زندگی کہا جا سکتا ہے اور باقی تین حصوں میں ان ہی سوالات کو حل کیا گیا ہے جو معیشت کے مسئلہ میں فطری طور پر سامنے آتے ہیں۔

کسبِ معاش کے لیے ترغیبات (IncentivesforEarning)

انفرادی مسائلِ معیشت میں سب سے پہلی منزل "کسب معیشت" اور "ابتغاءِ رزق" (Quest for Provision) کی منزل ہے، قرآن عزیز کہتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی استعداد کے مطابق معیشت کے لیے جدوجہد کرنا ضروری ہے، دنیا میدانِ عمل ہے یہاں جمود و خمود (Stagnation) موت کے مترادف ہے اس کارگاہِ ہستی میں خدا تعالیٰ نے سامانِ رزق کے ذخیرے جمع کر دیئے ہیں۔ مگر تلاش و سعی شرط ہے۔

---

④ کیا خرچ کرے؟ حلال و طیب خرچ کرے بحث آگے آرہی ہے۔

⑤ کس پر خرچ کرے؟ جس کی کفالت کی ذمہ داری فرد پر ہے ان سے شروع کرے اور آگے درجہ بدرجہ کمزوروں اور محتاجوں پر خرچ کرے۔

⑥ کتنا خرچ کرے؟ اسلام کی سربلندی اور امتِ مسلمہ کو زوال سے بچانے کے لیے سارا مال بھی مگر عام حالات میں میانہ روی (Middle Path) اختیار کرے۔

قرآنی تعلیمات:

❶ ﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَٱبۡتَغُواْ مِن فَضۡلِ ٱللَّهِ ﴾ (۱)

ترجمہ: پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو تلاش کرو۔

❷ ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ تَعۡبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ لَا يَمۡلِكُونَ لَكُمۡ رِزۡقٗا فَٱبۡتَغُواْ عِندَ ٱللَّهِ ٱلرِّزۡقَ ﴾ (۲)

ترجمہ: جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں، سو تم تلاش کرو اللہ کے پاس سے روزی۔

❸ ﴿ وَءَاخَرُونَ يَضۡرِبُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِ يَبۡتَغُونَ مِن فَضۡلِ ٱللَّهِ ﴾ (۳)

ترجمہ: اور کتنے اور لوگ ہیں جو پھرتے ہیں ملک میں اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو تلاش کرتے۔

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

❶ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة (۴)

---

(۱) القرآن الکریم، سورة الجمعة (۶۲): ۱۰

(۲) سورة العنکبوت (۲۹): ۱۷

(۳) سورة المزمل (۷۳): ۲۰

(۴) برہان پوری، علامہ علاؤالدین علی المتقی بن حسام الدین: کنز العمال، ج ۲، مطبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد (ہندوستان)، حدیث نمبر ۹۲۱۶ انہی محدث نے اسی حدیث کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد نقل کیا ہے:

ان أطیب ما أکلتم من کسبکم.

یقیناً جو تم پاکیزہ ترین شے کھا سکتے ہو وہ تمہاری اپنی کمائی سے ہو سکتی ہے۔

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال معیشت کا طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے فریضہ عبادت کے بعد (سب سے بڑا) فریضہ ہے۔

۲ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اذا صلیتم الفجر فلا تنوموا عن طلب أرزاقکم[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی جدوجہد کے بغیر نیند (آرام) کا نام نہ لو۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف نماز فجر کے بعد معاشی جدوجہد کے لیے نماز کا درس ہی نہیں دیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح جلد بیدار ہونے کی ترغیب بصورت معاشی خوشحالی بھی دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے آپ کے ارشاد پر عمل کیا۔ انہیں خوشحالی اور برکت نصیب ہوئی۔ اور اس طرح آپ کا ارشاد اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عمل ہمیشہ کے لیے امتِ مسلمہ کے لیے نمونہ اور درس بن گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عمل اور نتیجہ دیکھیے۔

عن صخر بن وداعة الغامدی رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: اللهم بارك لأمتی فی بکورها ...... وکان صخر تاجرا، فکان یبعث تجارته أوّل النهار فأثری وکثر ماله.[2]

ترجمہ: حضرت صخر بن وداعۃ الغامدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ کریم! میری امت کی سحر خیزی میں برکت عطا فرما........ حضرت صخر بن وداعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (راوی

---

(۱) حوالہ بالا، حدیث نمبر ٤١٦٨

(۲) رواہ الترمذی وابوداؤد والدارمی، بحوالہ مشکوۃ المصابیح باب اداب السفر، الفصل الثانی

حدیث) تاجر پیشہ تھے، وہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت کے حصول کے لیے) اپنا سامانِ تجارت صبح سویرے روانہ کرتے نتیجۃً وہ امیر ہو گئے اور اُن کے مال و دولت میں اضافہ ہوا۔)

۳ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: الذنوب ذنوب لا یکفرھا إلا الھم فی طلب المعیشۃ.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض گناہوں سے ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ طلبِ معیشت کی فکر اور جدوجہد میں کاوش ہی سے ہو سکتا ہے۔

اقوال عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

(ا) عن عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ: أطلبوا الرزق فی خبایا الأَرضِ.[2]

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم اپنی روزی کو زمین کے پوشیدہ خزانوں میں تلاش کرو۔

(ب) قال عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ: لا یقعد أحدکم عن طلب الرزق.[3]

---

(۱) الھیثمی: مجمع الزوائد منبع الفوائد، قاھرۃ، ۲/۶۳، ٦٤

(۲) حوالا بالا، باب الکسب والتجارۃ الخ، ص ٦٣۔ یہاں یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے.

(۳) حوالا بالا.

انہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول تھا کہ جس کسی شخص کو بظاہر خوشحال دیکھتے تو دریافت فرماتے کہ وہ کوئی کمانے کا کام بھی کرتا ہے جب جواب نفی میں ملتا تو وہ شخص آپ کی نگاہوں میں بے وقعت ہو جاتا۔ اس ضمن میں آپ نہایت حکیمانہ انداز میں فرمایا کرتے تھے:

مکسبۃ فیھا دناءۃ خیر من مسئالۃ الناس. (الماوردی: الاحکام السلطانیہ، مطبوعہ قاھرۃ: ص ۲۳۵)

ترجمہ: کسی کا کم تر پیشہ اختیار کر لینا، لوگوں سے سوال (مانگنے) سے بہتر ہے۔

=

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص بھی طلبِ رزق کی جدوجہد میں پست ہو کر نہ بیٹھے۔

سید مرتضی زبیدی (۱) شرح احیاء علوم الدین میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

أی لا بد للعبد من حركة ومباشرت بسبب من اسباب يتحصل به طريق الوصول الى الرزق. (۲)

آپ مفت خوری (Parasitism) کے سخت مخالف تھے، اور مسلمانوں کو برملا اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے:

لا تكونوا عيالا على المسلمين. (ابن جوزی: سيرة العمرين)

ترجمہ: مسلمانوں پر (خواہ مخواہ) اپنا بار کفالت نہ ڈالو۔

(۱) علامہ سید محمد بن محمد الحسینی الزبیدی مشہور بہ مرتضی زبیدی الحنفی رحمہ اللہ ۱۱۴۵ھ، ۱۷۳۲ء میں ہندوستان کے مردم خیز خطہ بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بلگرام میں، پھر الہ آباد میں علامہ فاخر الہ آبادی رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا، بعد میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے اکتساب علم و فضل کیا۔ پھر عین عنفوانِ شباب میں حج کے لیے حرمین شریفین حاضری دی اور تعلیم کے لیے یمن کے شہر زبید کا رخ کیا اور اتنا لمبا قیام کیا کہ زبیدی کہلائے یہاں تک کہ عرب و عجم کے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ہندوستانی تھے یا عربی یمنی۔ یمن میں آپ کا رابطہ علامہ سید عبدالرحمٰن بن مصطفی عید دوسی رحمہ اللہ سے ہوا اور ان کی ترغیب پر آپ نے قاہرہ مصر میں رہائش اختیار کی اور تالیف و تصنیف کو ذریعہ اشاعتِ اسلام بنایا۔ آپ فقہ حنفی کے بہت مقتدر عالم، محدث، فلسفی اور مصنف تھے۔ آپ نے اسلام اور شریعۃ اسلام پر ساٹھ بلند پایہ تصانیف کی ہیں، جن میں امام غزالی رحمہ اللہ کی احیاء علوم الدین کی شرح اتحاف السادۃ المتقین، تاج العروس فی شرح القاموس، مصنف ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کا مخطوطہ مشہور ہیں۔ دولت عثمانیہ کے خلیفہ عبدالحمید اول اور صدر اعظم علامہ راغب پاشا رحمہ اللہ نے آپ سے خصوصی اجازت نامے حاصل کیے آپ نے ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء میں وفات پائی۔ (شیخ محمد اکرام: رودِ کوثر، تذکرہ سید مرتضی زبیدی رحمہ اللہ)

(۲) زبیدی، سید مرتضی: شرح احیاء علوم الدین، اتحاف السادۃ المتقین، مطبوعہ دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، قاهرة: ۲۱۷/۵

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کا اسوہ حسنہ (Good Model) کما کر کھانے اور دیگر محتاج بندوں کی کفالت کرنے کے لیے ہمارے لیے رہنما اصول ہے، جو ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ محنت و مشقت کر کے غیرت مندانہ کھانا —— اگرچہ کتنا سادہ اور سستا ہو دستِ سوال دراز کرنے سے بہتر ہے خواہ سوال کر کے سونا اور موتی ہی حاصل کیے جائیں وہ بھیک ہی ہیں۔ آیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشاد =

ترجمہ: یعنی ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جائز اسبابِ معیشت میں سے کسی سبب اور وسیلہ کو ضرور اختیار کرے کہ جس سے وہ رزق کو حاصل کر سکے۔

کسبِ معاش کے اساسی اصول

(Basic Prenciples of Earning)

ان آیات و احادیث اور احکامِ اسلامی کے پیشِ نظر جب ایک شخص کسبِ معاش

گرامی پڑھ لیں:

❶ عن أبي هريرة رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: ما بعث الله نبيا إلا رعى الغنم. فقال اصحابه رضى الله عنهم: وأنت؟ فقال: نعم، كنت أرعَهَا على قراريط لأهل مكة. (صحيح الامام البخاري: كتاب البيوع، باب اثم من باع حرا)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کریم نے کوئی نبی ایسا مبعوث نہیں فرمایا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ (یہ ارشاد سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا: کیا آپ نے بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، میں چند قراریط کی اجرت پر اہلِ مکہ مکرمہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

قراریط کے معنی میں اگرچہ محدثین کرام کا اختلاف ہے۔ بعض نے قراریط ایک پہاڑی کا نام بتایا ہے اور بعض نے سکے کا نام بتایا ہے۔ غالبا یہ اختلاف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور اجرت کو ذہن میں رکھ کر کیا گیا ہے۔ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں ــــــ جن میں بکریوں کے چرواہے بھی شامل ہیں ــــــ کے نبی ہیں۔ آپ کا اسوہ حسنہ بکریاں چرا کر روزی کمانے والوں کے لیے بھی ہے لہذا بکریاں چرا کر حلال کما کر کھانے اور محتاجوں کو کھلانے میں عار کیا ہے؟ (کچھ تفصیل کے لیے دیکھئے: ڈاکٹر نور محمد غفاری: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی، باب: ۲ عنوان گلہ بانی کا حاشیہ

❷ عن عتبة بن المنذر رضى الله عنه قال: كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقراء طٰسٓمٓ حتى بلغ قصة موسى (عليه السلام) قال: ان موسى عليه السلام اجر نفسه ثمان سنين أو عشرا على عفة فرجه وطعام بطنه. (ابن ماجه، كتاب الرهون، باب اجارة الاجير على طعام بطنه)

ترجمہ: حضرت عتبہ بن منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے آپ نے سورۃ طسم تلاوت فرمائی، جب آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو آپ نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کے لیے اور پیٹ کی پرورش کے لیے اپنے آپ کو سات سال یا دس سال تک ملازمت میں دیئے رکھا۔

کے لیے قدم اٹھائے تو کیا اس کو یہ آزادی حاصل ہے کہ اپنی معیشت کے حصول میں جو طریقہ بھی چاہے اختیار کرے؟ نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ اس انفرادی جد وجہد میں اس کو چند ایسے اصول کا پابند بنایا گیا ہے جو ''نظامِ معیشت'' کو فاسد ہونے سے بچاتے اور صاحبِ معیشت کی زندگی کو معاشی رفاہیت کے ساتھ دینی اور اخلاقی رفعت عطا کرتے ہیں، چنانچہ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی انفرادی معیشت میں ہمیشہ دو اصول پیشِ نظر رکھے۔ ایک یہ کہ جو حاصل کیا جائے وہ ''حلال'' ہو اور دوسرے یہ کہ جن طریقوں سے حاصل کیا جائے وہ ''طیب'' ہوں۔

قرآنی تعلیمات:

❶ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ كُلُواْ مِمَّا فِي ٱلْأَرْضِ حَلَٰلًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَٰنِۚ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بلاشبہ وہ تمہارے لیے کھلا ہوا دشمن ہے۔

❷ ﴿وَكُلُواْ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ حَلَٰلًا طَيِّبًاۚ﴾ (۲)

ترجمہ: پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ۔

❸ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُواْ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُواْ صَٰلِحًاۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾﴾ (۳)

ترجمہ: اے پیغمبرو! تم کھاؤ پاک چیزوں سے اور عمل کرو نیک! بلاشبہ جو

---

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۱۶۸

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۸۸

(۳) سورۃ المومنون (۲۳): ۵۱

تم عمل کرتے ہو میں اس کا جاننے والا ہوں۔

۲ ﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾[1]

ترجمہ: اور (نبی امی) حلال رکھتے ہیں تمہارے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتے ہیں خبیث چیزیں۔

حلال اور طیب:

ان آیات میں حلال اور طیب ہر دو اصول کا ذکر کرتے ہوئے سخت تاکید کی گئی ہے کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔

حلال:

مراد یہ ہے کہ کھانے پینے، پہننے اور اشیاء کے استعمال میں نیز تمام وسائل آمدنی میں ''اسلامی نظامِ معیشت'' کی روح یہ ہے کہ ایک ''مسلم'' کو ایسی تمام اشیاء سے بچنا چاہیے جن کی ترکیب ان عناصر سے کی گئی جو جسمانی امراض کا مبدا بننے اور اس کو فاسد کرنے میں ''سمیت'' (Poisoner) کا کام کرتے ہوں، یا قوائے حیوانی (Anima! Spitits) کو برانگیختہ کر کے اور ان کو اعتدال طبعی (Natural Balance) سے نکال کر امراضِ روحانی اور اخلاقی کا باعث ہوتے ہوں اور ان اشیاء سے بھی احتراز ضروری ہے جو غرور، خود نمائی، بیجا تعیش اور جابرانہ نخوت کا سبب بن کر مساوات، اخوت اور مواساتِ باہمی کے رشتوں کو قطع کرتے اور خود غرضی، ظلم اور بد اخلاقی کی جانب دعوت دیتے ہوں۔ پس اگر ہمارا کسب و اکتساب ان نجس اوصاف (Impure Characteristics) سے پاک ہے تو وہ حلال ہے۔

طیب:

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو شے اپنی معیشت کے لیے حاصل کی گئی ہے وہ اپنی ذات میں بھی اور حصول کے طریقوں میں بھی نفس کو پاک رکھتی اور خبائثِ

---

(۱) سورۃ الاعراف (۷): ۱۵۷

نفس (Imparities of Soul) سے بچاتی ہو، نیز اس سے دوسرے افرادِ امت کے لیے معاشی ضیق (تنگی) نہ پیدا ہوتی ہو اور ظلم و سرکشی اور معاشی دستبرد کے وہ جراثیم نہ پھیلتے ہوں کہ جن سے مذموم سرمایہ داری فروغ پاتی اور عام انسانی دنیا کو فلاکت و مسکنت (Poverty & Want) کے قعر ہلاکت (Cave of Death) میں ڈالتی ہو۔

پس اگر آمدنی اور وسائلِ آمدنی میں ان امور کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے تو اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے "طیب" کہا جاتا ہے۔

علامہ رشید رضا رحمہ اللہ کی رائے میں طیب:

چنانچہ سلف و خلف نے "حلالاً طیّبًا" میں طیب کی جو تفسیریں کی ہیں، علامہ رشید[1] رضا نے تفسیر المنار میں ان کا یہ قدرِ مشترک نکالا ہے۔

> "طیب سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے ساتھ غیر کا حق متعلق نہ ہو اس لیے کہ نصِ قرآنی نے جن اشیاء کو حرام کیا ہے ان کی حرمت تو ذاتی ہے

---

(۱) علامہ رشید رضا مصر کے نامور عالم دین تھے۔ آپ ایک مفسر، مؤرخ، صحافی اور ایک تحریکی انسان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ نے "المنار" رسالہ اور اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے "المنار پریس" شروع کیا۔ آپ شیخ عبدہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے اور ان کی حیات پر ایک کتاب "تاریخ الاستاد الامام شیخ محمد عبدہ" لکھی "یسر الاسلام واصول التشریع العام فی نھی اللہ ورسولہ عن کثرۃ السوال" کی تصنیف ہے آپ نے "تفسیر المنار" کے نام سے قرآن کریم کی تفسیر لکھنا شروع کی مگر سورۃ یوسف کی آیت ﴿تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ (اے اللہ کریم! مجھے مسلمان کی موت عطا فرما کر اپنے صالحین بندوں میں شامل فرمادے) تک لکھ سکے کہ داعی اجل نے ۱۳۵۴ کو پکارا اور آپ نے رخت سفر باندھ لیا (عبد الصمد صارم، تاریخ التفسیر، مطبوعہ لاہور: ص ۱۲۹)

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کی رائے اجماع امت کے خلاف تھی۔ بعض علماء اسلام نے آپ کو منکرین حدیث کے باب میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ شیخ عبدہ، ڈاکٹر توفیق صدقی مصری اور اسماعیل آدہم مصری ایسے لوگوں کے ہم خیال تھے۔ برائے تفصیل دیکھئے: محمد مصطفی الاعظمی: درسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، مطبوعہ ریاض، باب اول، عنوان: السنۃ و منکروھا حدیثا: ص ۲۶، ۲۷ البتہ استاد مصطفی السباعی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رشید رضا نے عمر کے آخری حصہ میں اس انکار حدیث کے عقیدہ سے رجوع کر لیا تھا (اللہ کریم کرے ایسا ہی ہوا ہو)۔ (دیکھئے استاد مصطفی السباعی رحمہ اللہ کی کتاب: (السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی مطبوعہ قاھرۃ، ۱۳۸۰ھ، ص: ۴۲)

اور اس لیے مضطر کے علاوہ کسی حالت میں کسی کے لیے ان کا استعمال درست نہیں اور ان کے علاوہ جن اشیاء کی حرمت اس شے کی حقیقت اور ذات میں نہیں پائی جاتی، بلکہ باہر کے اسباب سے حرمت آتی ہے، ان کی ممانعت ''طیب'' کہہ کر کر دی گئی۔''

پس جو شے ناحق لی گئی اور صحیح طریق کار سے حاصل نہیں کی گئی، بلکہ ربوا، رشوت جوا، ظلم، غصب، دھوکہ، خیانت اور چوری جیسے ناپاک ذرائع سے حاصل کی گئی وہ بھی حرام ہے اس لیے کہ ''طیب'' نہیں ہے، پس ہر خبیث شے حرام ہے خواہ وہ خبث باہر کے اسباب و ذرائع سے اس میں آیا ہو اور خواہ اس کے اندر موجود ہو، جیسا کہ کھانے پینے کی چیزوں میں سڑ کر بو آنا (اور امراض جسمانی کا سبب بننا)۔ [1]

حرام کمائی اور خرچ کی تفصیل

قرآن عزیز اور احادیث نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) نے حلال اور طیب کے خلاف ''حرام'' کی بعض اصناف بھی تفصیل کے ساتھ شمار کرائی ہیں اور بعض کو صرف اصولی طور پر بیان کیا ہے:

قرآنی ہدایات:

چنانچہ ارشاد ہے:

❶ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَن تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾ [2]

ترجمہ: تم پر حرام کر دیا گیا، مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جس

---

(۱) علامہ رشید رضا: المنار، ج ۱ طبع القاهرة: ص ۸۷

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۳

پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کے نام پر چھوڑا گیا ہو) اور گلا مروڑا ہوا اور دوسرے جانور کے سینگ سے زخم کھا کر مرا ہوا اور درندے کا پھاڑا ہوا، مگر یہ کہ تم نے اس کو زندگی ہی میں ذبح کر لیا ہو اور جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور تم پر حرام کر دیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعے حصے بانٹو، یہ سب تمہارے لیے فسق (گناہ) ہیں۔

۱ ﴿إِنَّمَا ٱلۡخَمۡرُ وَٱلۡمَيۡسِرُ وَٱلۡأَنصَابُ وَٱلۡأَزۡلَٰمُ رِجۡسٞ مِّنۡ عَمَلِ ٱلشَّيۡطَٰنِ فَٱجۡتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ۝٩٠﴾[۱]

ترجمہ: بلاشبہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاکی ہیں کارِ شیطان سے ہیں، پس ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

۱ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن لبس الحرير والديباج وعن لبس القسيّ والمياثر والارجوان الخ.[۲]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (مردوں کو) منع فرمایا ریشمی لباس سے اور دیبا اور اور قز (موٹے ریشم) کے لباس سے اور ریشمی گدوں پر بیٹھنے سے اور ارغوانی رنگ سے۔

۲ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من لبس ثوب شهرة في الدنيا البسه الله ثوب مذلة يوم القيامة.[۳]

---

(۱) سورۃ المائدہ (۵): ۹۰

(۲) صحیح الامام البخاری: ج ۲، کتاب اللباس - نسائی: السنن، ج ۲، کتاب الزینة، باب الرخصة فی خاتم الذهب للرجال

(۳) زرین وابوداؤد، ابن ماجه: السنن، ج ۲، باب من لبس شهرة من الثیاب - مشکوة المصابیح، کتاب اللباس، الفصل الثانی

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے دنیا میں فخر وغرور کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں ذلت کا لباس پہنائیں گے۔

❸ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تشربوا في انية الذهب والفضة الخ.[1]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مسلمانوں (مردوں اور عورتوں) کو جائز نہیں ہے کہ سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال کرو۔

❹ عن حذيفة رضى الله عنه قال: نهانا النبى صلى الله عليه وسلم أن نشرب في انية الذهب والفضة وأن نأكل فيها وعن لبس الحرير والديباج وأن يجلس عليه.[2]

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[3] فرماتے ہیں: ہم کو نبی اکرم

---

(۱) صحيح الامام البخارى: ج ۲، كتاب الاوانى- نسائى، حواله بالا، باب ذكر النهى عن لبس الديباج

(۲) صحيح الامام البخارى: ج ۲، كتاب الاوانى، نسائى: حواله بالا

اسی طرح حضرت ابو عمارۃ براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ بھی پڑھئے:

نهانا عن خواتيم أو تَخَتُّم بالذهب، وعن شرب بالفضة، وعن المياثر الحمر، وعن القسي، وعن لبس الحرير والاستبرق والديباج . (متفق عليه، مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم استعمال اناء الذهب والفضة. رياض الصالحين، باب تعظيم حرمات المسلمين)

ترجمہ: (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے) ہمیں منع فرمادیا کہ ہم (سونے کی) انگوٹھیاں یا سونا پہنیں، چاندی (کے برتنوں) میں پانی پئیں، سرخ ریشمی پالانوں (کو اونٹ پر ڈال کر ان) پر بیٹھیں، قسی (ریشم اور کتان کا بنا ہوا کپڑا) استعمال کریں، خالص ریشم زیب تن کریں اور استبراق اور دیباج (ریشمی کپڑے) استعمال میں لائیں۔

(۳) حذیفہ، حضرت حذیفہ بن الیمان (حِسْل) بن جابر العبسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، الیمان ان کے والد محترم حسل لقب تھا جنہیں غزوہ احد میں افراتفری میں مسلمانوں نے ہی قتل کر دیا مگر اس بردباری اور امت کی خیر خواہی کے پہاڑ نے صرف اتنا ہی کہا مسلمانو! اللہ کریم تمہاری خطا سے درگذر فرمائے۔ سوائے غزوہ بدر کے تمام =

صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ہم سونے اور چاندی کے برتن میں پئیں یا کھائیں اور منع فرمایا ریشم اور دیباج پہننے اور اس کے بچھونوں پر بیٹھنے سے۔

❺ ایما عبد نبت لحمہ من السحت والربا فالنار أولی بہ۔[1]

ترجمہ: جس انسان کا گوشت پوست ظلم اور سود سے بنا ہے تو اس جسم کے لیے جہنم کی آگ زیادہ بہتر ہے۔

بہرحال "کسبِ معاش" میں اسلامی نظامِ معیشت یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ حاصل کردہ شے "حلال" ہو "حرام" نہ ہو اور "طیب" ہو "خبیث" نہ ہو اور حلال و

غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں فتوحات عراق میں ان کا بڑا دخل تھا۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدان (صاحب سر) تھے، منافقین کی تمام خبریں آپ کے پاس تھیں۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان سے دریافت کیا کہ کوئی منافق ان کے کلیدی عہداران یا گورنروں میں ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ کریم کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی بصیرت کھوٹی نہیں ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں مدائن کا گورنر بنایا۔ اپنی گورنری کے دور میں انہوں نے دینور، ماہ سبندان، ہمدان اور ریّ میں جہاد کیا اور انہیں فتح کیا۔ آپ نے ۳۶ھ میں مدائن میں وفات پائی۔ (دیکھئے: ابن اثیر جزری رحمہ اللہ: اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ۱/۳۹۰، ۳۹۲۔ علامہ ولی الدین خطیب رحمہ اللہ، مشکاۃ المصابیح کے ذیل میں الکمال فی اسماء الرجال)

(۱) ولی الدین، مشکوۃ المصابیح، جلد ۲ مطبوعہ قرآن محل، کراچی، کتاب البیوع، باب طلب کسب الحلال، فصل دوم، حدیث نمبر ۲۶۵۲

اس ضمن میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یدخل الجنۃ لحم بنت من السحت، وکل لحم بنت من السحت کانت النار اولی بہ۔ (رواہ احمد والدارمی والبیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: جس گوشت نے حرام سے پرورش پائی ہو جنت میں داخل نہیں ہو گا۔ اور جو گوشت (یعنی جسم) حرام مال سے نشوونما پائے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہی مناسب ہے۔

اسی طرح کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے:

لا یدخل الجنۃ جسد غذی بالحرام۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: جس بدن کو حرام کی غذا کھلا کر پالا گیا، وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

طیب اور حرام و خبیث کے معنی و مفہوم کی توضیح و تشریح بھی بیان کر دی گئی تاکہ ان اصول کے سمجھنے اور پیش نظر رکھنے میں کسی قسم کی دقت اور گنجلک پیدا نہ ہو۔

پس اگر ایک شخص ان تمام اساسی امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی معاشی زندگی میں جدو جہد کر کے "وسائلِ معاش" بہم پہنچاتا ہے تو بلاشبہ اسلامی نظامِ معیشت میں اس کی یہ کمائی "معیشتِ صالحہ" کے نام سے موسوم ہے۔

مصارف کے بنیادی اصول

(Basic Principles of Consuption)

بنیادی سوالات:

کسبِ معاش کے بعد دوسرا مسئلہ صرف و خرچ کا ہے اور اس باب میں تین مسائل[1] زیر بحث ہیں ایک یہ کہ کیا خرچ کیا جائے؟

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے صرف اور خرچ —— جو دراصل دونوں اپنے لغوی اور مرادی معنی میں ایک ہی ہیں، صرف عربی زبان کا لفظ ہے اور خرچ اس کا اردو ترجمہ ہے —— کے بنیادی مسائل (سوالات) تین فرمائے ہیں جو اپنی جامعیت میں فرد کے مصارف (Empenditures) کے تمام موضوعات کو شامل ہیں، مگر میری ناقص رائے میں یہ سوالات چار حصوں پر تقسیم ہوں مثلاً:

❶ کیوں خرچ کیا جائے؟

❷ کیا خرچ کیا جائے؟

❸ کن مدات (Individuals Or Items) پر خرچ کیا جائے؟

❹ کتنا یا کس قدر خرچ کیا جائے؟

حضرت مصنف رحمہ اللہ نے تین سوالات —— کیا خرچ کیا جائے؟ کس قدر خرچ کیا جائے؟ اور کن پر خرچ کیا جائے؟ —— پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں بحث فرمائی ہے، مگر پہلا سوال کہ خرچ کیا ہی کیوں جائے؟ اس مقام پر کچھ نہیں لکھا غالباً یہ خیال فرما کر کہ خرچ کرنے والا جانتا ہے کہ کیوں خرچ کرے، مگر معیار خرچ، مقدار خرچ اور مدات خرچ اس کو سمجھانا مطلوب ہیں ان پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔

میری ناقص رائے میں کیوں خرچ کیا جائے، بڑا اہم سوال ہے کیونکہ جب تک ایک فرد اپنی ذاتی، (اس پر) اجتماعی اور ریاستی مالی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہوگا یا دوسرے الفاظ میں جب تک وہ اپنی ذات پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مالی حصہ کا علم اور نتیجۃً ان کی ادائیگی کا احساس ہی نہ رکھتا ہوگا وہ کیونکر خرچ کرنے کے لیے آمادہ ہوگا؟

=

اسلام کے معاشی نظام نے اس ضمن میں فرد کو واضح انداز میں وافر تعلیمات دی ہیں، فرد اپنی ذات، اپنے اہل و عیال، بوڑھے والدین، خاندان اور قبیلہ کے محتاج افراد، معاشرہ میں معاشی دکھوں کے ماروں کی اپنی استعداد کے مطابق معاشی کفالت کا ذمہ دار ہے، پھر اگر وہ صاحب غناء ہے تو اس پر اجتماعی اور ریاستی مالی حقوق بھی ہیں، جن کی ادائیگی کا اسے پابند بنایا گیا ہے لہذا وہ کیوں خرچ کرے گا؟ اس کا جواب اسے یہاں اس کتاب میں مختلف مقامات پر اور قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقہاء کرام اور مسلم معیشت دانوں کی کتب میں ملے گا۔ یہاں اس کی رہنمائی کے لیے چند حوالہ جات درج کیے جا رہے ہیں مثلاً قرآن کریم میں جب یہ فرمارہا ہوتا ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا﴾ (البقرہ: ٦٠) کھاؤ پیو، تو فرد کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ جب قرآن کہے ﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ﴾ (الاعراف: ٣١) اے اولاد آدم! ہر نماز کے وقت (لباس سے) اپنی زینت حاصل کیا کرو تو اُسے اپنی ستر پوشی کا حکم مل رہا ہوتا ہے اور جب ﴿وَأَتِمُّواْ ٱلۡحَجَّ وَٱلۡعُمۡرَةَ لِلَّهِ﴾ (البقرہ: ١٩٦) اور اللہ کریم کے لیے حج اور عمرہ مکمل کرو۔ کا حکم ہو تو صاحب استطاعت کو فریضہ حج کے لیے اپنی ذات پر خرچ کرنے کا ارشاد ہو رہا ہوتا ہے۔ جب ﴿وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ﴾ (سورۃ البقرہ: ١١٠) اور زکاۃ دیا کرو کی تلاوت ہو رہی ہو تو غنی کو زکاۃ کی ادائیگی کے لیے خرچ کا حکم ہو رہا ہوتا ہے، پھر جب حکم ہو ﴿يَسۡـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَۖ قُلۡ مَآ أَنفَقۡتُم مِّنۡ خَيۡرٖ فَلِلۡوَٰلِدَيۡنِ وَٱلۡأَقۡرَبِينَ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱبۡنِ ٱلسَّبِيلِۗ﴾ (البقرہ: ٢١٥) وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرو، وہ والدین کے لیے، اور قرابت داروں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے، ہو۔ تو پھر فرد کو خاندان اور معاشرہ کی معاشی ذمہ داریاں یاد دلائی جا رہی ہوتی ہیں۔ پھر جب ﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ ٱلۡعَفۡوَۗ﴾ (البقرہ: ٢١٩) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، تو آپ کہہ دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو، کا حکم سنایا جا رہا ہو تو فرد پر اجتماعی اور ریاستی معاشی ذمہ داریوں پر خرچ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہوتا ہے۔

اس طرح ہادی امت صلی اللہ علیہ وسلم فرد کو خرچ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے جب فرماتے ہیں "لجسدك عليك حق" (تجھ پر تیرے جسم کا حق ہے) (علی المتقی: کنز العمال، ج ٢ مطبوعہ دہلی، پانچواں ایڈیشن، حدیث نمبر ٢٧٧) پھر یہ ارشاد فرمایا کہ "اذا اتاك الله مالا فليرا اثر نعمته عليك وكرامته" (ابوداؤد، کتاب اللباس) جب اللہ کریم تجھے مال کی نعمت سے نوازیں تو اس کریم کی نعمت اور کرامت کا اثر تم پر ظاہر ہونا چاہیے۔ کا ارشاد فرما کر فرد کو اپنی ذات پر مناسب حد پر خرچ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے: تجھ پر تیری ذات کا حق ہے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ان الله يوصيكم بأمهاتكم (ثلاثا) ان الله يوصيكم بابائكم، ان الله يوصيكم بالاقرب فالاقرب" (ابن ماجه، کتاب الاداب) یقیناً اللہ کریم تمہیں تمہاری ماؤں پر خرچ کرنے کا حکم دیتے ہیں (تین بار فرمایا) یقیناً اللہ کریم تمہیں تمہارے باپوں پر خرچ کرنے کا حکم فرماتے ہیں پھر اللہ کریم تمہیں تمہارے قریب کے پھر ان کے بعد قریب کے رشتہ داروں پر خرچ کا حکم دیتے ہیں۔ اور "ابدا بمن تعول" (بخاری، کتاب النفقات، باب وجوب النفقة على اهل والعيال) "اس سے خرچ کرنا شروع کرو، جس کا نان نفقہ

دوسرا کس قدر خرچ کیا جائے؟

تیسرا کن پر خرچ کیا جائے؟

(ان کا مختصر جواب یوں ہے):

کیا خرچ کیا جائے؟

کیا خرچ کیا جائے؟ اس کا جواب تو ابھی کسبِ معاش کی بحث میں دیا جا چکا ہے یعنی ایک شخص نے حلال اور طیب سے جو کچھ کمایا ہے وہی اس کا سرمایۂ معیشت ہے اور وہی اس قابل ہے کہ زندگی کی نشوونما میں کام آئے۔

کس قدر خرچ کیا جائے؟

اور کس قدر خرچ کیا جائے؟ اس دوسرے سوال کا جواب قرآن عزیز نے جو کچھ دیا ہے وہ دو حصوں پر تقسیم ہے ایک کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے اور اس کے متعلق ارشاد ہے:

فرد کے لیے تعلیمات

❶ ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ (۱)

ترجمہ: کھاؤ اور پیو اور اعتدال سے تجاوز نہ کرو۔

(یعنی کفالت) تمہارے ذمہ ہو" یعنی بیوی اور اولاد سے شروع کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور "الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل الله او القائم اللیل والصائم النهار" (صحیح بخاری، حوالہ بالا، باب اول) بیوہ اور مسکین (کی کفالت) کے لیے کوشاں ثواب میں اس مجاہد کی طرح ہے، جو اللہ کریم کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے یا اس شخص کی مانند ہے جو رات بھر کھڑا رہ کر اپنے پروردگار کی عبادت کرے یا دن بھر روزہ رکھے" کا ارشاد فرمایا جا رہا ہو تو فرد کو معاشرہ کی معاشی ذمہ داریوں کا درس دیا جا رہا ہوتا ہے اور "ان فی المال حق سوی الزکاة" (ترمذی، کتاب الزکاۃ) یقیناً مال میں زکاۃ کے علاوہ بھی حق ہے کا ذکر کر کے فرد کو اجتماعی اور ریاستی معاشی ذمہ داریوں پر خرچ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

غرض قرآن کریم اور حدیث شریف میں فرد کیوں خرچ کرے کی واضح اور وافر تعلیمات ہیں۔

(۱) سورۃ الاعراف (۷): ۳۱

❷ ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾[1]

ترجمہ: بے شبہ اخراجات میں حد سے تجاوز کرنے والے شیطانوں کے بھائی (ہم پلہ) ہیں۔

خرچ میں اسراف و تبذیر نہ ہو:

ان ہر دو آیات میں اپنی جائز اور حلال کمائی کے صرف کرنے کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، ایک یہ کہ "اسراف" نہ ہو اور دوسری یہ کہ "تبذیر" (Extravagence) نہ ہو علامہ ماوردی اسراف اور تبذیر کے باہمی فرق پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کمیت یعنی مقدار خرچ میں حد سے تجاوز کرنا اسراف ہے اور یہ ثبوت ہے ان عائد شدہ حقوق کی مقدار سے جہالت کا جو اس کے ذمہ ہیں اور کیفیت یعنی مواقع صرف و خرچ میں حد سے تجاوز کا نام "تبذیر" ہے اور یہ شہادت ہے ان مواقع صرف سے نادان بننے کی جو صحیح اور حق مواقع ہیں۔"[2]

اور علامہ شبیر احمد عثمانی[3] فوائد القرآن میں "تبذیر" کی تفسیر کرتے ہوئے

(۱) سورة بنی اسرائیل (۱۷): ۲۶، ۲۷

(۲) علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی: ۵۹/۱۵ تفسیر سورة بنی اسرائیل (۱۷) آیت نمبر ۲۶

(۳) علامہ شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے فضلاء میں سے ہیں اور دار العلوم کے اساتذہ کرام میں بھی شامل ہیں۔ آپ کے اساتذہ کرام میں شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ اسیر مالٹا، حکیم محمد حسن رحمہ اللہ، مولانا محمد یٰسین رحمہ اللہ شیر کوٹی نمایاں ہیں۔ آپ کی ذات میں اللہ کریم نے بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ اور مؤرخ کی خصوصیات ودیعت کر دی تھیں۔ آپ نے نہایت مفید تصانیف چھوڑی ہیں جن کی افادیت کے معترف عرب و عجم کے علماء کرام ہیں۔ مشہور تصانیف میں تفسیر قرآن کریم، مسلم شریف کی شرح فتح الملہم مشہور ہیں آپ کی تفسیر فوائد القرآن کا افغانستان حکومت نے فارسی ترجمہ کرایا۔ مرکز ملک فہد برائے اشاعت قرآن کریم مدینہ منورہ نے آپ کی تفسیر (اردو) کو شائع کرایا۔ آپ نے عملی سیاست میں بھی

تحریر فرماتے ہیں:

"اور خدا کا دیا ہوا مال فضول بے موقع مت اڑاؤ، فضول خرچی یہ ہے کہ معاصی اور لغویات میں خرچ کیا جائے یا مباحات میں بے سوچے سمجھے اتنا خرچ کر دے جو آگے چل کر تفویت حقوق (حقوق کا پورا نہ کرنا) اور ارتکابِ حرام کا سبب بنے۔"(۱)

اور صاحبِ روح المعانی آیت ﴿كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقۡنَٰكُمۡ وَلَا تَطۡغَوۡاْ فِيهِ﴾ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَلَا تَطۡغَوۡاْ فِيهِ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو رزق عطا فرمایا ہے، اس میں سرکشی نہ کرو، یعنی ناشکری نہ کرو، اور مال کو اسراف، غرور اور خدا کے احکام کی خلاف ورزی اور حقوق واجبہ کے تلف کا ذریعہ نہ بناؤ۔(۲)

خرچ میں میانہ روی اختیار کی جائے:

الحاصل صرف و خرچ میں اسراف اور تبذیر معیشت فاسدہ کی علامات ہیں اس لیے "اقتصاد" اور میانہ روی اختیار کرنا ضروری ہے۔ مثلاً عام حالات میں یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ خرچ آمدنی سے بڑھ جائے اور پھر حاجت کے وقت دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے بلکہ حتی الامکان اس کی سعی کرنی چاہیے کہ ان تمام اجتماعی حقوق کی ادا کے ساتھ ساتھ جو غنی ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کیے ہیں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حاجات و ضروریات کے لیے کچھ پس انداز ہو، نیز یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ بخل اور تقتیر (Niggardliness) کو کام میں لائے اور خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے عطاء الٰہی کے باوجود معیشت کو تنگ کرے، چنانچہ نبی اکرم

حصہ لیا اور متحدہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے لیے بنگال سے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو وفات پائی۔

(۱) علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ: فوائد القرآن، تفسیر سورہ بنی اسرائیل (۱): آیت ۲۶

(۲) روح المعانی، سورۃ طٰہٰ (۲۰): آیت ۸۱

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(عن ابن عمر رضی اللہ عنهما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم): الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة۔ [1]

ترجمہ: (حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) (آمد و صرف میں) میانہ روی معاشی زندگی کی خوشگواری کا نصف حصہ ہے۔

عن کعب رضی اللہ عنه: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: امسك علیك بعض مالك فهو خیر لك قلت: امسك سهمي الذی بخیبر۔ [2]

ترجمہ: حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ [3] فرماتے ہیں: (جب میں نے اپنے کل مال کو صدقہ کر دینے کا ارادہ کیا تو) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مال میں سے کچھ بچا لو یہ تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔ تب میں نے عرض کیا: خیبر کی زمین میں جو میرا حصہ ہے وہ میں نے بچا لیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ان تدع ورثتك اغنیاء

---

(۱) البیهقی فی شعب الایمان. مشکوة المصابیح، باب الحد والتانی. علی المتقی: کنز العمال، جلد دوم، محولہ بالا ایڈیشن، حدیث نمبر ۳۰۸

(۲) صحیح الامام البخاری جلد ۱، کتاب الزکاة، باب لا صدقة الا عن ظهر غنی، صحیح مسلم کذا فی المشکوة، باب النذور، الفصل الاول

(۳) حضرت کعب بن مالک انصاری خزرجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت عقبہ ثانیہ میں شامل ہو کر سعادت ایمان پائی۔ تمام غزوات میں شرکت کی سعادت پائی۔ صرف غزوہ تبوک میں کسی وجہ سے رہ گئے تو اس پر اللہ کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی بھی ہوئی۔ آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر بھی تھے۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے، زیادہ اتفاق اس پر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں ستتر (۷۷) سال کی عمر وفات پائی۔ (مشکاۃ المصابیح کے ذیل میں الکمال فی اسماء الرجال، تذکرۃ کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

خیر من أن تدعھم عالة یتکففون الناس فی ایدیھم.[۱]

ترجمہ: (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس سوال پر کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں بذریعہ وصیت دے ڈالتا ہوں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے ورثاء کو صاحبِ مال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ وہ محتاج رہ جائیں اور بھیک مانگتے پھریں۔

میانہ روی پر نامور مفسرین وفقہاء کے تبصرے:

(الف) حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ کا مُحقّقانہ تبصرہ:

اور حافظ عماد الدین بن کثیر[۲] اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جب "انفاق" (خرچ کرنے) کا حکم دیا تو "اسراف" سے منع فرما دیا اور میانہ روی کی تلقین فرمائی جیسا کہ دوسری آیت میں بہت صراحت کے ساتھ اس کا حکم فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُوا۟ لَمْ يُسْرِفُوا۟ وَلَمْ يَقْتُرُوا۟ ﴾[۳]

ترجمہ: اور ایمان والے وہ لوگ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل اختیار کرتے ہیں۔

---

(۱) حوالہ بالا، کتاب الوصایا، باب ان یترك ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکفّفوا الناس

(۲) ابن کثیر رحمہ اللہ، حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی البصروی الدمشقی رحمہ اللہ آپ ۷۰۱ھ کو مجدل (بصریٰ ضلع کا گاؤں) میں پیدا ہوئے۔ آپ نجیب الطرفین تھے۔ آپ نے اس دور کے تمام علوم دینیہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ کرم میں اسحاق بن یحییٰ بن اسحاق الآمدی رحمہ اللہ، عبد الوہاب بن ذوئب معروف بابن قاضی شہبۃ رحمہ اللہ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن تیمیہ الحرانی رحمہ اللہ، ابراہیم بن عبد الرحمٰن الفزاری رحمہ اللہ (ابن الفرکاح) رحمہ اللہ، محمد بن شرف الدین البعلبکی رحمہ اللہ، احمد بن ابی طالب رحمہ اللہ (ابن شحنۃ رحمہ اللہ)، عبد اللہ بن محمد المقدسی رحمہ اللہ وغیرہم جیسے اساطین علم تھے۔ آپ کی مشہور تصنیفات میں تفسیر القرآن العظیم، البدایۃ والنہایۃ، الطبقات الشافعیۃ، الکواکب الدراری فی التاریخ، الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، سیرۃ ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیرۃ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہا ہیں۔ آپ نے ۲۶/ شعبان ۷۷۴ھ کو وفات پائی۔ (رحمہ اللہ)

(۳) الفرقان: ٦٧

پھر تبذیر سے نفرت دلاتے ہوئے مبذر (Extravagent) کو شیطان کا ہمسر بنایا اور اسی قسم کی اور بھی آیات ممانعت تبذیر میں نازل ہوئی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۱] اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۲] فرماتے ہیں کہ حق کے خلاف ہر قسم کے صرف و خرچ کا نام "تبذیر" ہے اور مجاہد رحمہ اللہ [۳] کہتے

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود الہذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (متوفی ۳۲ھ) نبی کریم کے شان والے صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ آپ سابقین اولین (The earliest Muslim) میں سے تھے، بدر کے سعادت مند شرکاء میں شامل تھے۔ آپ فقیہہ، محدث، مفسر اور قاری قرآن تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں علم کی کپی قرار دیا ہوا یوں کہ ایک دن انہیں کھجور اتار کر کھانے کا شوق آیا۔ درخت پر چڑھ گئے ان کی پتلی پتلی ٹانگیں بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ضبط نہ کر سکے انہیں ہنسی آگئی، پاس ہی قدردان کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، فرمایا: ان کی پتلی ٹانگوں کو نہ دیکھو ان کے علم و فضل کو دیکھو۔ یہ علم کی کپی ہیں۔ اور ایک بار آپ نے فرمایا: میں بلا مشاورت کسی کو حاکم یا امیر بناتا تو ام عبد (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو بناتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے کوفہ کا استاد اور وزیر بنا کر بھیجا اور ساتھ کوفہ والوں کو ایک گرامی نامہ بھیجا، جس میں تحریر تھا: کوفہ والو! میں تم پر حضرت عمار (ابن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو امیر اور عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو استاد اور وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ ترین ساتھیوں میں سے ہیں۔ ان کا ارشاد سننا اور اس پر عمل کرنا۔ یاد رکھو! میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تمہارے پاس بھیج کر تمہیں اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔

یہ اسلامی فقہ کے کوفہ مرکز کے بانی تھے، جن کے علم کو حضرت ابراہیم نخعی، حضرت علقمہ اور حضرت حماد نے امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ تک پہنچایا اور یوں فقہ حنفی کی بنیاد پڑ گئی۔ (برائے تفصیل دیکھئے: علامہ ذہبی: تذکرۃ الحفاظ۔ علامہ خضری: تاریخ التشریع الاسلامی، ترجمہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ استاد مصطفی اعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی تذکرہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۳ قبل ہجرۃ ۶۸ھ) حبر الامۃ (امت کے عالم)، فقیہ العصر، امام المفسرین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ ہجرت نبوی سے تین سال قبل شعب بنی ہاشم میں پیدا ہوئے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو لکھا بھی اور زبانی بھی یاد کیا۔ آپ سے تابعین کی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا۔ جن میں ابن ابی ملیکۃ، الحکم بن مقسم، سعید بن جبیر، علی بن عبداللہ بن عباس، عکرمہ، مجاہد، عمرو بن دینار، کریب اور نجدۃ الحروری رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ تفسیر قرآن میں آپ بلند مقام رکھتے تھے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن عبدالبر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب رقم ۱۵۸۸۔ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۴۷۸۱ (۲/۳۳۴)۔ ابن سعد طبقات، ۲/۱۲۱

(۳) مجاہد بن جبر المکی (۲۱ھ - ۱۰۲ھ) قاری، حافظ، مفسر اور محدث تھے۔ السائب بن ابی السائب المخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد تھے۔ آپ نے

ہیں کہ ایک شخص نے حق کی طرف سب کچھ خرچ کر ڈالا تو یہ اسراف نہیں اور اگر اپنا تھوڑا سا مال بھی ناحق صرف کر دیا تو یہ تبذیر ہے اور قتادہ رحمہ اللہ [۱] کہتے ہیں تبذیر نام ہے مال کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ناحق اور فساد کے مواقع میں صرف کرنے کا اور امام احمد رحمہ اللہ [۲] بروایت ہاشم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۳] سے روایت

قرآن کریم کی تفسیر میں ایک کتاب لکھی۔ آپ سے تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا جن میں ابن ابی نجیح، ابن جریج، ابن عیینہ، القاسم بن ابی بزہ، لیث بن ابی سلیم رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم شامل ہیں (پروفیسر مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، تذکرہ مجاہد بن جبر رحمہ اللہ)

(۱) قتادہ بن دعامۃ السدوسی (۶۱ھ -۱۱۷ھ) حدیث کے ممتاز ترین علماء میں سے ایک تھے۔ آپ نے قرآن کریم کی تفسیر کے علاوہ الناسخ والمنسوخ فی القرآن اور عواشر فی القرآن لکھیں۔ آپ سے حدیث سیکھنے اور روایت کرنے والے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت ہے، جن میں ابو عوانہ، الاوزاعی، جریر، حماد بن سلمہ، سلام بن مسکن، ہشام رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اساطین علم بھی شامل ہیں۔

(۲) امام ابو عبد اللہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ مذہب اہل سنت میں چوتھے مذہب کے بانی ہیں، آپ ۱۶۴ھ (مطابق ۷۸۰ء) بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں ۲۴۱ھ (مطابق ۸۵۵ء) وفات پائی۔ آپ نے طلب علم میں شام، یمن، حجاز، کوفہ اور بصرہ کا سفر کیا۔ آپ نے حدیث میں "مسند امام احمد" ایک نہایت مفید اور مقبول تصنیف چھوڑی ہے۔ جو چھ جلدوں میں ہے اور اس میں چالیس ہزار احادیث سے زیادہ ہیں۔ دیگر آئمہ کرام کی طرح آپ نے بھی ثابت قدمی کی پاداش قید و ضرب کی سزائیں پائیں۔ آپ کی فقہ کی اہم کتاب "المغنی" ہے جسے اس بار گورنمنٹ سعودی عرب نے شائع کیا ہے۔ (رحمہ اللہ) (دیکھئے: ابن جوزی: مناقب امام احمد بن حنبل، مطبوعہ مصر، شطی کی کتاب "مختصر طبقات الحنابلۃ" مطبوعہ شام)

(۳) انس بن مالک ابو حمزہ انصاری (۱۰ قبل ہجرۃ۔ ۹۳ھ) امام، مفتی، قاری، محدث، راوی اسلام تھے۔ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم خاص ہونے کا شرف حاصل ہے، آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے خاص کر دیا تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی، آپ نے مجھے نہ مارا نہ جھڑکا نہ میرے سامنے آپ کے ماتھا مبارک پر شکن آئی۔ آپ لکھنے پڑھنے میں بڑے ماہر تھے لہذا حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو بحرین کا کلکٹر بنا کر بھیجا۔ آپ بہت زمانہ تک زندہ رہے جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بہت قلیل جماعت باقی تھی۔ اس لیے آپ کے شاگردوں اور رواۃ کی تعداد بہت بڑی تھی جن میں انس بن سیرین، حمید الطویل، ثمامہ بن عبد اللہ بن انس، سلیمان التیمی، عبد الملک بن عمیر، کثیر بن سلیم الراوی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین شامل ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: امام ذہبی: تذکرۃ الحفاظ اور التفسیر والمفسرون۔ المزی: تہذیب الکمال، دار الکتب المصریۃ۔ محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، ج، ا ریاض، تذکرہ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بنی تمیم کا ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بہت مالدار ہوں اور میرے اہل و عیال بھی ہیں اور مہمانداری بھی خاصی ہوتی رہتی ہے تو آپ مجھے یہ بتائیے کہ میں کس طرح خرچ کروں اور اس معاملے میں کیا کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے مال سے پہلے زکوٰۃ نکال اگر وہ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ مال کو خباثت سے پاک کر دیتی ہے، اور پھر اقرباء کے ساتھ مالی صلہ رحمی کر اور سائل، پردیسی اور مسکین کے حقوق کی نگہداشت کر، اس شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس تمام تفصیل کو جامع اور مختصر الفاظ میں فرما دیجئے (کہ میں اس کو دستورِ زندگی بنا لوں) تب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ آیت پڑھ کر سنادی:

﴿ وَءَاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ ﴾[1]

ترجمہ: پس ادا کرو قرابت والوں کو ان کا حق اور مساکین کا اور مسافر کا اور ناحق ہرگز خرچ نہ کرو۔

سائل نے یہ سن کر عرض کیا کہ بس یہ میرے لیے کافی ہے۔[2]

(ب) امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کا تبصرہ:

اور امام رازی[3] آیت ﴿ وَٱلَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُوا۟ لَمْ يُسْرِفُوا۟ وَلَمْ يَقْتُرُوا۟ وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ ﴾ کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

---

(۱) بنی اسرائیل: (۱۷): ۲٦

(۲) ابن کثیر، عماد الدین حافظ: ابن کثیر، تفسیر سورۃ الفرقان (۲۵): آیت نمبر ٦٧

(۳) امام رازی، ابو عبد اللہ محمد بن عمر فخر الدین رازی رحمہ اللہ (۵۴٦ھ ـــــ ٦٠٦ھ) مطابق ۱۱۴۱م ـــــ ۱۲۰۹م) بہت بلند پایہ مفسر، محدث، محقق اور علم الکلام کے نامور عالم تھے۔ قرآن کریم کی تفسیر "مفاتیح الغیب المعروف بتفسیر کبیر" ۸ جلدوں میں تحریر کی۔ ان کی تصانیف میں ایک اور اہم تصنیف "المحصول فی الاصول" ہے۔

اسراف اور تقتیر کے متعلق مفسرین نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں ان میں سے قوی تر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ معیشت کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں نہ بے جا غلو کرتے ہیں نہ بے محل بخل برتتے ہیں، اسی لیے قرآن عزیز میں دوسری جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ﴾ [1]

ترجمہ: اور اپنے ہاتھ کو نہ اپنی گردن کے ساتھ ہی باندھ لو (یعنی بخل نہ کرو) اور نہ بالکل ہی کھول دو (یعنی اسراف نہ کرو)۔

اور آیۃ "وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا" میں قوام سے اعتدال اور درمیانی راہ مراد ہے یعنی میانہ روی ان کا شعار ہے۔ [2]

(ج) سید محمود آلوسی رحمہ اللہ کا تبصرہ:

اور سید محمود آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

والظاهر ان المراد بالانفاق ما يعم انفاقهم على انفسهم وانفاقهم على غيرها والقوام في كل ذلك خير وقد أخرج احمد والطبراني عن ابي الدرداء رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: من فقه الرجل رفقه في معيشة. [3]

ترجمہ: اور ظاہر یہ ہے کہ "انفاق" سے مراد اس جگہ عام (انفاق) ہے خواہ وہ ان کی اپنی ذات پر ہو اور خواہ دوسروں پر اور قوام (توسط) ان سب

---

(۱) بنی اسرائیل (۱۷): ۲۹

(۲) رازی، فخر الدین، تفسیر کبیر، سورۃ الفرقان (۲۵): آیت نمبر ٦٧

(۳) تفسیر روح المعانی، تفسیر سورۃ الفرقان (۲۵) آیت نمبر ٦٧. برائے حوالہ حدیث دیکھیں: علی المتقی: کنز العمال، ج ۲، حدیث نمبر ۳۱۲

صورتوں میں خیر ہے۔ اور امام احمد اور طبرانی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کی دانائی و فرزانگی میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنی معیشت میں نرمی (اعتدال) اختیار کرے۔

مذکورہ مباحث کا مفید خلاصہ

ان تمام حوالہ جات کا حاصل یہ ہے کہ نصوصِ قرآنی اور حدیث ''معیشت'' میں صرف و خرچ کے متعلق یہ چند باتیں بنیادی طور پر ضرور قرار دیتی ہیں:

❶ صرفِ مال میں نہ ''اسراف'' درست ہے نہ ''تبذیر'' اور نہ تقتیر (Niggardliness) اور تینوں الفاظ کا مفہوم اسلامی اصطلاح کے مطابق مراد ہے نہ کہ صرف لغوی معنی کے مطابق۔

❷ میانہ روی (اقتصاد) ہی معیشت کی عادلانہ راہ ہے اور صالح اجتماعی نظامِ معیشت کے لیے ایک ذریعہ ہے۔

❸ ''فرد'' چونکہ جسمِ جماعت کا ایک عضو ہے اس لیے اس کی انفرادی آمدنی پر اجتماعی معیشت کے حقوق بھی عائد ہیں اور جس قدر وہ کماتا ہے اسی نسبت سے یہ حقوق اس پر زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں اس کا نام ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔

❹ انفرادی معیشت میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی قوت لا یموت اور ساتر عورت (ستر پوش) لباس اور ضرورتِ رہائش کے مطابق مکان تمام حقوق سے مقدم اور فرضِ اولین ہے اور اس کے بعد وہ تفاصیل ہیں جو گذشتہ صفحات میں زیر بحث آچکی ہیں اور جن کی اجمال فہرست یہ ہے:

(الف) اگر وہ صاحبِ نصاب ہے تو سب سے پہلے صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ وغیرہ) کا ادا کرنا اس کے ذمے فرض ہے، گویا اس صورت میں اجتماعی حق انفرادی حق پر مقدم

ہے۔

(ب) صدقاتِ واجبہ (Obligatory Charities) کی ادا کے باوجود "انفرادی" مال پر کچھ اور بھی اجتماعی حقوق عائد ہیں اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما[1] کا ارشاد ہے "وفی المال حق سوی الزکوٰۃ" (اور مال میں فرض زکاۃ کے علاوہ بھی (فقراء اور اسلامی ریاست کا) حق ہے) مثلاً اگر بیت المال کا خزانہ ہر شخص کی انفرادی معیشت کے لیے پورا نہ ہو سکے تو خلیفہ بہ جبر اہلِ دولت سے مال حاصل کر کے اس کی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اربابِ دولت صدقاتِ واجبہ کی ادا سے سبکدوش ہو چکے ہوں۔

(ج) عام انسانی حالات میں صدقات نافلہ (Optional Charities) یعنی "حقوق ثانوی" (Secondry Rights) ایسی حالت میں ادا کیے جائیں کہ اپنے اور اہل و عیال کے لیے مال کا ایک حصہ محفوظ رہے تاکہ وہ مفلس و قلاش ہو کر نہ رہ جائیں، اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس کو مستقبل کے لیے اپنے اور اہل و عیال کے لیے کچھ پس انداز رکھنا مناسب ہے چنانچہ حدیث "خير الصدقة عن ظهر غني"[2]

---

(۱) عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما (۱۰ قبل ہجرۃ تا ۷۴ھ) علم اور فضل دونوں کے ممتاز فقیہہ، زاہد، عابد اور اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دیوانہ تھے، آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن اور عادات کا اتباع کرتا دیکھا تو کئی بار مجھے وہم ہوتا کہ شاید آپ مجنون ہیں۔ لوگ آپ کی پیروی کرنا گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا خیال کرتے تھے۔ آپ حق کے معاملہ کسی سے خائف یا متاثر نہیں ہوتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت کرنے والے سے قطع تعلق فرما لیا کرتے تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھی اور لکھوائیں بھی۔ آپ سے فیض یافتہ افراد میں جمیل بن زید طائی، سعید بن جبیر، عبدالعزیز بن مروان، عبدالملک بن مروان، عبیداللہ بن عمر، عمر بن عبید اللہ نافع مولی ابن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے علم کے روشن ستارے شامل تھے۔ (ابن سعد طبقات: ۲/٤، ۱۳۷. علامہ ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۳۹. محمد مصطفی اعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، تذکرہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما)

(۲) ابوداؤد، السنن: ج ۱ کتاب الزکاۃ، باب الرجل یخرج من مالہ

(بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کے ہوتے ہوئے دیا جائے) اسی جانب مشیر ہے۔

(د) خاص حالاتِ انسانی میں "ایثار علی النفس" (اپنی ذات پر دوسرے حاجت مندوں کو ترجیح دینا) اولیٰ اور افضل ہے یعنی اگر انسانی نفوس ضبطِ نفس اور صبر کے درجۂ کمال پر فائز ہیں تو "انفاق فی سبیل اللہ" میں تمام مال کو صرف کر دینا محبوب ہے، چنانچہ آیت ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (۱) (ترجمہ: اور وہ (سچے مومن ایسے ہیں کہ) اپنی ذات پر (دوسروں کی ضروریاتِ کفالت کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان پر افلاس طاری ہو) ان کو اگر ذاتی حاجت بھی ہوتی تب بھی وہ (صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے، اور حدیث ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ "افضل الصدقة جهد من مقل" (۲) (سب سے بہترین صدقہ اس شخص کا ہے جو قلیل المال ہو کر مال کو خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالتا ہے) اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک موقعہ پر تمام مال کو خدا کی راہ میں پیش کر

---

(۱) سورۃ الحشر: ۹

(۲) ابوداؤد، حوالہ بالا باب الرخصة فی ذلك

(۳) پورے واقعہ کے راوی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ سنئے:

أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن تصدق فوافق ذلك مالا عندى، فقلت: اليوم أسبق أبابكر (رضى الله عنه) إن سبقته يوما، فجئت بنصف مالى. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أبقيت لأهلك؟ قلت: مثله. قال: وأتى ابو بكر رضى الله عنه بكل ما عنده. فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أبقيت لأهلك؟ قال: أبقيت لهم الله ورسوله. قلت: لا أسابقك إلى شئ ابدا. (ابوداؤد: السنن، ج ۱ كتاب الزكاة، باب الرخصة فى ذلك)

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا کہ ہم (اللہ کریم کی راہ میں جہاد کے لیے) صدقہ کریں۔ آپ کا یہ حکم میرے پاس موجودہ مال کے وقت آیا میں نے سوچا کہ اگر میں (اللہ کریم کی راہ میں خرچ کرنے میں) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سبقت لے سکتا ہوں تو آج یہ ممکن ہے۔ لہذا میں (سارے گھر کا) آدھا مال لے کر (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں) حاضر ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: گھر والوں کے لیے کتنا چھوڑ آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس کے برابر۔ (تھوڑی دیر بعد) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کچھ ان کے پاس تھا سارے کا سارا لے کر حاضر ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ =

اس ہی مسئلہ کی جانب راہنمائی کرتے ہیں۔[۱]

اور اگر اس شرح کے دائرہ کو زیادہ تنگ کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی معیشت میں "اقتصاد" (میان روی) مطلوب ہے اور "اکتناز" (اجتماعی حقوق کو نظر انداز کر کے دولت کو خزانہ کرنا) اور "احتکار" (ناجائز وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا) حرام اور مردود ہے اور انفرادی دولت، جماعتی دولت کے لیے ایک ذریعہ ہے نہ کہ اس کے لیے سنگِ راہ۔

کتنا خرچ کیا جائے کا دوسرا حصہ: اجتماعی معیشت کے لیے تعلیمات:

صرف مال اور اجتماعی معیشت:

"صرفِ مال" کا دوسرا حصہ اجتماعی معیشت سے متعلق ہے جس کی تفصیل عنقریب آنے والی ہے اور اس بحث کا بہت کچھ تعلق حکومت اور فرائضِ حکومت سے وابستہ ہے تاہم فرد چونکہ جماعت ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے بلا تکلّف یہ مسئلہ انفرادی معیشت میں بھی زیر بحث آیا اور اجمالی صورت میں مذکور ہوا، قرآن عزیز نے افراد ملت کو جگہ جگہ اس جانب توجہ دلائی ہے اور نظامِ معیشت میں اس کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور زکوٰۃ و وراثت کے احکام کے علاوہ "انفاق" کے نام سے بہت زیادہ اس کو نمایاں کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: انکے لئے اللہ کریم اور اس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر آیا ہوں۔ (یہ سن کر) میں نے (حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے) عرض کیا: میں کبھی بھی کسی (دینی خدمت اور بھلائی کے) معاملہ میں آپ سے نہیں بڑھ سکتا۔

(۱) مالی انفرادی حقوق اور اجتماعی حقوق کے بارہ میں جو آیات اور احادیث صحیحہ وارد ہیں ان سب کے درمیان تعارض وتناقض (Contradiction) کو رفع کر کے بہترین تطبیق (Application) کی شکل وہی نکلتی ہے، جو ان دفعات میں مذکور ہے۔ تفصیل کے لیے (علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی) فتح الباری: ۲۳۰/۳ قابل مراجعت ہے۔

﴿ وَءَاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور قرابت والوں اور مساکین اور مسافروں کو ان کا حق دو۔

﴿وَءَاتُوا۟ حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِۦ ﴾ (۲)

ترجمہ: اور کھیتی کٹنے کے وقت اُس کا حق ادا کرو۔

امام شعبی رحمہ اللہ (۳) کہتے ہیں کہ یہ "حق" زکوٰۃ مفروضہ (عشر) کے علاوہ ہے۔

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ ٱلْعَفْوَ ﴾ (۴)

ترجمہ: (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے کہ حاجت سے زائد مال۔

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَآ أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا۟ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ (۲۱۵) ﴾ (۵)

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل (۱۷): ۲٦

(۲) سورۃ الانعام (٦): ۱٤۱

(۳) امام شعبی رحمہ اللہ، عامر بن شراحیل بن عمرو الشعبی الھمدانی رحمہ اللہ (۱۹ھ - ۱۰۳ھ) امام، حافظ، فقیہہ، محدث اور مفسر تھے۔ آپ متقی، ثابت قدم اور نہایت قوی الحافظہ بزرگ تھے۔ جن دنوں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی طرف سے عبد الحمید بن عبد الرحمٰن بن زید بن خطاب رحمہ اللہ عراق کے گورنر تھے امام شعبی رحمہ اللہ کوفہ کے قاضی تھے۔ چونکہ نہایت قوی حافظہ والے تھے لہذا ان کے بارے میں مشہور ہے کہ لکھتے نہیں تھے صرف یاد داشت پر بھروسہ کرتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں کتاب الجراحات، کتاب فی الفرائض، کتاب فی المغازی، مجموعہ فقہیہ من الاحادیث، کتاب فی الصدقات ایسی مشہور کتب شامل ہیں (برائے تفصیل دیکھئے: امام ذہبی: تذکرۃ الحفاظ۔ الاستاذ محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی، تذکرہ عامر بن شعبی رحمہ اللہ)

(۴) سورۃ البقرہ (۲): ۲۱۹

(۵) سورۃ البقرہ (۲): ۲۱۵

ترجمہ: وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرو پس والدین کے لیے ہو اور قرابت والوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے اور جو نیکی بھی تم کرو بے شبہ اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

عفو اور رأس المال:

❶ (دونوں مختلف نوعیت کے مال ہیں اور ان میں واضح فرق کے چند دلائل ہیں مثلاً): پہلی آیت میں ''عفو'' کے معنی بعض معاصر اہل علم نے یہ لیے ہیں کہ راس المال (Capital) خرچ نہ کرو بلکہ اس کا منافع خرچ کرو مگر یہ معنی کسی طرح صحیح نہیں ہیں اس لیے کہ یہاں سوال میں اس خرچ کا ذکر ہے جو انفاق فی سبیل اللہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری آیت میں مقدار خرچ بتانے کی بجائے کن پر خرچ کیا جائے؟ اس کی تفصیل دی گئی ہے، پس یہ دونوں آیات یہی راہنمائی کرتی ہیں کہ یہاں نہ سوال کا منشا ہے کہ جو معاصر (Contemporary) موصوف نے سمجھا ہے اور نہ جواب سے یہ منشاء مستنبط ہوتا ہے بلکہ اس کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سائل پوچھتا ہے کہ ہم کو انفاق فی سبیل اللہ کی جو ترغیب دی جارہی ہے تو اس سلسلے میں کس قدر خرچ کریں؟ جواب دیا جاتا ہے کہ ضروری حاجات سے زائد اگر ہے تو اس پر انفاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور دوسری آیت میں اسی سوال کا ذکر کرتے ہوئے یہ تعلیم دی گئی کہ بار بار خرچ کی نوعیت کا سوال غیر ضروری ہے کیونکہ تم کو ابھی بتایا جاچکا ہے، اب سوال یہ کرنا چاہیے کہ کن پر خرچ کریں اور اس کا جواب یہ ہے کہ والدین اقرباء مساکین وغیرہ پر خرچ کرو۔

❷ جمہور مفسرین کا یہی مسلک ہے، پس معاصر موصوف نے جو معنی بیان فرمائے ہیں وہ نہ منصوص [۱] اور منطوق [۲] ہیں اور نہ مستنبط [۱] و مستخرج [۲]، کیونکہ

(۱) منصوص: نص (Text) یعنی (قرآن وحدیث کے صریح حکم سے ثابت ہونا)۔

(۲) منطوق: منطق (شرعی دلیل Argument) سے حکم ثابت ہونا، دلیل بھی وہ جو نص کے خلاف نہ ہو۔

یہاں اس کے استنباط کی گنجائش ہی نہیں ہے اور کیسے ہو سکتی ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عملی زندگی اس کے خلاف نظر آتی ہے اور وہ اس حکم کے قطعاً پابند نظر نہیں آتے، بلکہ بڑے بڑے متمول صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مصارف کا معمول اس تحدید (Restriction) کے دائرے سے خارج ثابت ہوتا ہے کہ وہ راس المال کو محفوظ رکھتے اور صرف اس کے نفع ہی پر مصارف کا بار ڈالتے ہوں۔ البتہ بعض وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ جو تجارت پیشہ تھے ان کا یہ معمول اسی طرح رہا ہوگا جس طرح دوسرے تاجروں کا رہتا ہے، یعنی ان کا یہ عمل تجارت کے طبعی اصول کے مطابق ہوگا نہ اس لیے کہ وہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیت کے معنی یہ سمجھتے اور اس کو منصوص یا مستنبط (Textual or Inferred) حکم کی حیثیت میں یقین کرتے تھے۔

۳ علاوہ ازیں راس المال (Capital) کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف نفع پر مصارف کا بار ڈالنا اگرچہ ''اقتصاد'' کی ایک بہتر عملی شکل ہے لیکن وہ ملازمت، صنعت و حرفت، اجارہ (Hiring)، کاشتکاری اور زمین داری ہر ایک شعبہ معیشت میں عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا، پھر ایسا حکم کس طرح عام ہو سکتا ہے اور معیشت کے تمام شعبوں میں کیسے نافذ العمل قرار پا سکتا ہے۔[۳]

---

(۱) مستنبط: نص (Text) یعنی قرآن حکیم اور حدیث کے رہنما اصولوں کی روشنی میں نئے مسائل کا استنباط کرنا (یعنی حل کرنا، نکالنا) ایسا کرنے والا مسلمہ فقیہہ ہو۔

(۲) متخرج (Deduced) مستنبط اور متخرج ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔

(۳) دراصل مال فرد کا ہو یا جماعت کا اسلام کے حکیمانہ معاشی نظام میں اس کی حیثیت قوام حیاۃ (Sustenance of Life) کی ہے۔ اسلام فرد اور جماعت کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اسلام کی ترویج و اشاعت اور بقاءِ امت محمد علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے لیے بے شک سارا مال ایک دم خرچ کر دیں یہ نہ صرف ضروری بلکہ کار خیر اور قابل اجر عمل ہوگا۔ نہ اسے فضول خرچی کہا جائے گا، نہ قابل مذمت نہ قیامت کے دن اس پر کوئی حساب ہوگا نہ موجب رسوائی، البتہ فرد اور قوم دونوں اپنے اخراجات کو اعتدال پر رکھیں تو یہ احسن طریقہ ہوگا اور اگر فضول خرچی اور بے جا خرچ کریں گے تو دنیا میں موجب معاشی پریشانی اور آخرت میں ذریعہ پشیمانی بنے گا۔

اسلام کا معاشی نظام مال کی قدر کرنا سکھاتا ہے کیونکہ اللہ کریم نے اسے زندگی کا سہارا بنایا ہے، فرد اور معاشرہ

دونوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس کی نمو کے لیے کوشش کریں تاکہ یہ بڑھتا رہے اور امت کی فلاح کے کام آتا رہے، مفلس فرد یا قوم کا معاشرہ اور قوموں کی نگاہ میں مقام نہیں رہتا۔ غیرت مند فرد ہو یا قوم) وہ دوسرے پر بار بننے کی بجائے دوسروں کا بار اٹھانے والے ہوتے ہیں مفلس اور مقروض فرد اور قوم ہمیشہ دوسروں کے نظریات کو جلد قبول کرنے اور اپنے قیمتی نظریات اور طریقہ زندگی کو جلد تبدیل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور یہ تمام کارروائی ان کی محتاجی اور عزم کی کمزوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان رہ رہ کر یاد آجاتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑے فتنہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

لیاتین علی الناس زمان لا ینفع فیه الا الدینار والدرهم. (رواه احمد بحواله مشکوة، کتاب البیوع، باب الکسب وطلب الحلال)

ترجمہ: لوگوں پر ایسا زمانہ آکر رہے گا کہ دینار و درہم (یعنی مال) کے علاوہ اس میں انہیں کوئی چیز نفع نہ دے گی دیکھئے مال کو سنبھال کر رکھنے اور بے جانہ اڑانے کی تلقین کس انداز میں فرمائی جارہی ہے اور سچی خبر دینے صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خبر آج سو فیصد صحیح ہے کہ دنیا مال والوں کے ساتھ ہے امیر افراد ہوں یا اقوام وہ غریب افراد اور اقوام کو اپنا ماتحت بنا کر نہ صرف ان پر اپنا اقتدار قائم کیے ہوئے ہیں بلکہ ان غریبوں —— افراد ہوں یا اقوام کے معاشی وسائل پر بھی قابض ہیں اور ان کا ہر طرح کا استحصال کر رہی ہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو بار بار تنبیہ کرتا ہے کہ مال —— اللہ کریم کا انعام ہے —— کو فضول خرچی میں اڑا کر اور محتاج ہو کر بے وقعت نہ ہو جاؤ اس موقع پر مجھے اس دانائے راز فقیہہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا ارشاد امت مسلمہ کے ہر فرد تک پہنچانے کو دل چاہ رہا ہے، جس میں انہوں نے افادیت مال، اس کی حفاظت و نمو اور استعمال کی نہایت عمدہ بات راز دارانہ انداز میں کہی ہے۔ لیجئے آپ بھی پڑھ لیں:

عن سفیان الثوری رحمه الله تعالیٰ قال: کان المال فیما مضی یکره، فأمّا الیوم فهو ترس المومن، وقال: لولا هذه الدنانیر لتمندل بنا هؤلاء ملوك. وقال: من کان فی یده من هذه شئ فلیصلحه، فانه زمان إن أحتاج کان أوّل من یبذل دینه، وقال: الحلال لا یحتمل السرف. (رواه فی شرح السنة، بحواله مشکوة المصابیح، باب المال والعمر للطاعته، فصل سوم)

ترجمہ: حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگلے وقتوں میں مال کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج تو یہ مومن بندہ کی لاج رکھنے والا ہے۔ اگر یہ (دنانیر ہمارے پاس نہ ہوتے تو یہ بادشاہ (اور بڑے لوگ) ہمیں (ناک کا) رومال بنا لیتے۔ لہٰذا جس کسی کے پاس ان (دیناروں) میں سے کچھ ہو تو اس کو اچھی طرح) افزائش دولت اور خرچ کے لیے) استعمال کرے، کیونکہ یہ تو ایسا زمانہ ہے کہ جب کوئی شخص (یا قوم یا ملک) محتاج ہوتا ہے تو وہ جس چیز کو سب سے پہلے (قرض یا بھیک لینے کے لیے) چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس کا دین ہوتا ہے۔ پھر آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: حلال (طریقہ سے کمایا یا ملا ہوا) مال تو فضول خرچی کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اور جو فرد، معاشرہ، قوم یا ملک اپنے مال اور ذرائع معاش کو بے جا اور فضول خرچ کرتے ہیں انہیں سفیہہ (پاگل،

۴ بہر حال ان آیات کے علاوہ وہ آیات بھی قابلِ لحاظ ہیں جن میں قرآن عزیز نے "مومنین" کی امتیازی خصوصیات شمار کراتے ہوئے ان کی عبادت گزاری اور پرہیز گاری کے اوصاف کے ساتھ ساتھ "انفاق فی سبیل اللّٰہ" کا بھی ذکر کیا ہے اور تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان مقامات میں "زکوٰۃ مفروضہ" مراد نہیں مثلاً سورۃ الذاریات میں ارشاد ہے:

﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿١٨﴾ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿١٩﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور صبح کے وقت وہ (مومن) اللہ سے معافی طلب کرتے ہیں اور ان کے مالوں میں حق ہے، مانگنے والوں کا اور معاشی زندگی سے ہارے ہوؤں کا۔

اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾﴾ (۲)

ترجمہ: اور وہ جو اپنی نمازوں پر قائم ہیں اور وہ جن کے مال میں حصہ مقرر ہے سائل اور (معاشی زندگی سے) ہارے ہوئے کے لیے۔

دیوانہ بے وقوف) (Foolish` Mad) کہا ہے اور داناؤں کو تلقین کی ہے ان بے وقوفوں (حاکم ہوں یا محکوم) کے ہاتھوں اپنا مال نہ لگنے دو، یہ فضول اڑا کر تمہیں معاشی طور پر کمزور کریں گے اور نتیجۃً مقروض اور محکوم کر کے چھوڑیں گے۔ قرآن کریم نے اعجاز کے ساتھ نہایت بلیغ اشارہ فرمایا ہے پڑھئے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾ (سورة النساء (٤):٥)

ترجمہ: اور ان کے عاقبت نااندیشوں کے ہاتھوں میں اپنے اموال ـــــ جنہیں اللہ کریم نے تمہارے لیے سہارا بنایا ہے ـــــ مت دو۔

(۱) سورۃ الذاریات (۵۱):۱۸، ۱۹

(۲) سورۃ المعارج (۷۰):۲۳، ۲۵

باب — ④

اجتماعی نظامِ معیشت

(بنیادی اصول)

حیاتِ اجتماعی

اجتماعی حیات (Social Life) کی قدر و قیمت تو ایک امر مسلم ہے مگر اسلام اس کی اہمیت کا راز یہ بتاتا ہے کہ صالح نظامِ اجتماعی (Righteous Social System) اس لیے ضروری ہے کہ وہ افراد امت کی صلاح و خیر (Welfare & Good) کا بہترین ذریعہ ہے اور "فرد" کی انفرادیت کا صحیح نشو و نما اور اس کے شعبہ ہائے زندگی کی تکمیل اجتماعی نظام کے بغیر نامکمل ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انسان اس وقت تک معراج انسانیت کو نہیں حاصل کر سکتا جب تک وہ اپنے ان حقوق و فرائض کو ٹھیک ٹھیک نہ ادا کر دے جو خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہونے اور جماعت کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور یہ حقوق و فرائض اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا، جب تک کوئی صحیح نظام اجتماعی موجود نہ ہو، اس لیے قرآن عزیز میں جگہ جگہ انفرادی تخاطب (Address) کی بجائے اجتماعی خطاب کو ترجیح دی گئی ہے، مثلاً وہ جب عمومی خطاب کرتا ہے تو کہتا ہے "اَيُّهَا النَّاسُ" (اے لوگو) اور اگر مسلمانوں کو خصوصی خطاب سے مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" (اے ایمان والو!) اور اسی طرح "اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" (تم سب نماز قائم کرو)، "اٰتُوا الزَّكٰوةَ" (تم سب مالدار زکوٰۃ ادا کرو) ﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ [1] (اور

---

(۱) القرآن الکریم، آل عمران (۳): ۹۷

لوگوں پر حق ہے بیت اللہ کا حج کرنا) ﴿فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ ﴾[1] (پس تم سب میں سے جو بھی اس مہینہ میں موجود ہو وہ رمضان کا روزہ رکھے) ﴿وَلَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم بَيۡنَكُم بِٱلۡبَٰطِلِ﴾[2] (اور اپنے اموال کو آپس میں باطل طریقہ سے مت کھاؤ) ﴿لَا تَأۡكُلُواْ ٱلرِّبَوٰٓاْ﴾[3] (تم سود نہ کھاؤ) ان تمام مقامات میں جمع کا صیغہ بول کر جماعتی خطاب ہی کو اختیار کیا گیا اور ان تمام آیات سے بھی زیادہ واضح اور اس حقیقت کی آئینہ دار یہ آیات ہیں:

❶ ﴿كُنتُمۡ خَيۡرَ أُمَّةٍ أُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَأۡمُرُونَ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ ٱلۡمُنكَرِ﴾[4]

ترجمہ: تم جو انسانوں کی فلاح کے لیے عالم وجود میں لائے گئے ہو بہترین امت ہو تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

❷ ﴿أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡ﴾[5]

ترجمہ: تم سب اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور تم میں سے جو صاحبِ امر ہو اس کی اطاعت کرو۔

❸ ﴿وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْ﴾[6]

ترجمہ: اور تم سب ایک ساتھ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔

ان تمام آیات کی روح یہی ہے کہ فرد کی انفرادی ندگی کی تکمیل بغیر اجتماعی نظم

(۱)سورۃ البقرہ (۲): ۱۸۵
(۲)سورۃ البقرہ (۲): ۱۸۸
(۳)سورۃ آل عمران (۳): ۱۳۰
(۴)سورۃ آل عمران (۳): ۱۱۰
(۵)سورۃ النساء (٤): ۵۹
(٦)سورۃ آل عمران (۳): ۱۰۳

کے ناممکن ہے اور اس کی سعادت و فلاح کا انحصار نظمِ اجتماعی کی سعادت و فلاح پر موقوف ہے یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ صراحت یہ فرمادیا"لا رهبانية في الاسلام"(اسلام میں جوگیانہ زندگی کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے)۔

اجتماعی معاشی نظام:

پھر جبکہ نظامِ اجتماعی کے مختلف شعبوں میں وہ شعبہ کہ "بہ اسباب ظاہر" (By Apparent Sources) جس پر انسان کی جسمانی حیات اور اس کی بقا کا انحصار ہے، معاشیات کا شعبہ ہے اور جب یہ شعبہ بھی مثل دیگر شعبہ ہائے زندگی کے انسان کی دینی اور دنیوی دونوں قسم کی عملی جدوجہد میں بڑی حد تک دخیل ہے تو بے شبہ یہ شعبہ بھی اجتماعی زندگی کا ایک اہم جزو ہے اور اس لیے عقل و فطرت بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں کے اجتماعی نظام کی سعادت و فلاح کا بہت کچھ مدار اس کے صالح اور بہتر ہونے پر ہے۔

اجتماعی معاشی نظام اور نظامِ حکومت:

نیز یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ "اجتماعی نظامِ معاشی" اور "نظامِ حکومت" کے درمیان چولی دامن کا سا تعلق ہے کیونکہ کسی بھی اقتصادی نظام کے صالح اور فاسد ہونے کا حال اس سے وابستہ سوسائٹی کے نظام اور نظام حکومت سے بخوبی آشکارا ہوسکتا ہے: مثلاً:

1. اگر کسی جماعت یا سوسائٹی میں مذموم سرمایہ دارانہ روح کارفرما ہے تو اس کے نظام حکومت میں ایسا معاشی نظام عالم وجود میں آئے گا جس کے ذریعہ سرمایہ دارانہ اصولوں کی سربلندی حوصلہ افزائی اور قانونی ذرائع سے ان اصولوں کے لیے ہمہ قسم کی سہولت کار وجود پذیر ہوسکے۔

2. اور اگر جماعتی زندگی میں اشتراک عمومی (Marxism) کا نظریہ جاری و ساری ہے تو بلاشبہ اس نظامِ حکومت میں وہ معاشی نظام منصہ شہود پر آئے گا، جس میں آمدنی و

ذرائع آمدنی میں انفرادی ملکیت کا سد باب کیا گیا ہو یا اور اگر کسی سوسائٹی کے نظامِ اجتماعی میں صرف حیاتِ دنیا اور حصولِ لذات دنیا ہی زندگی کا مقصدِ وحید قرار پا گیا ہو تو اس کے نظامِ حکومت میں "معاشی نظام" کا سنگ بنیاد ایسے فلسفہ پر مبنی ہو گا جس میں خدا "مذہب" اور معاد [1] کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی، [2] اور بلاشبہ اس معاشی نظام میں طبقاتی جنگ ایک ضروری شے قرار پائے گی۔

۳ اور اگر جماعت کے نظمِ اجتماعی کی نہاد (Base) معاش و معاد دونوں سے وابستہ ہے بلکہ صالح معاشی نظام کی ضرورت ہے وہ اس نظریہ کے ماتحت سمجھتی ہے کہ اس کے بغیر انسان نہ خدا کا سچا فرمانبردار بن سکتا ہے اور نہ مخلوقِ خدا کا ہمدرد اور نہ ایسی حالت میں وحدت عام (Universal Unity) کا داعی ہو سکتا ہے تو یقیناً اس کے نظامِ حکومت میں ایسا معاشی نظام بروئے کار آئے گا جو فلسفیانہ موشگافیوں، خوبصورت معاشی نظریوں اور عملی نظام میں بڑے بڑے دفاتر اور محکموں اور بجٹ اور اعداد شمار کی فراوانیوں کی بجائے اپنے اندر مخلوقِ خدا کی عام خوشحالی باہمی اخوت و ہمدردی، طبقاتی کشمکش سے گلو خلاصی اور اخلاقِ کریمانہ کی سر بلندی رکھتا اور ان کا کفیل و

---

(۱) (معاد لوٹ جانے کی جگہ یعنی آخرت کی زندگی)

(۲) اس قسم کا نظام معاش اپی قیوری فلسفہ (Philosophy Epicurian) کی کوکھ ہی سے جنم لے سکتا ہے، جہاں صرف دنیوی نعمتوں سے لذت یاب ہونے اور عیب و طرب کو ہی مقصد حیات قرار دینا نظام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، یہ نظام صرف "بائیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" زندگی کے دن مزے سے گزارو، یہ دنیا مرنے کے بعد پھر دوبارہ نصیب نہ ہوگی —— کے محور پر گردش کر رہا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے قبل روم، ایران اور آس پاس کے علاقوں میں یہی نظام چلتا تھا، اس خطہ ارضی کے کمزور باسیوں پر قہر بن کر ایک لمبے عرصہ تک محیط رہا ہے اور اس کی بیخ کنی کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "صالح معاشی نظام" لے کر مبعوث ہوئے، جیسا کہ باب اول میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔

اس معاشی نظام کے فلسفہ کا بانی مشہور یونانی فلسفی اپی قیور (Epicurces) تھا جو ۲۷۰ ق م سے ۳۴۱ ق م تک زندہ رہا، گو آج کل معاشی دکھوں (Economic Worries) سے بھرپور دنیا میں ایسے نظام کا چلن نہیں، مگر خدا فراموش اور خود فراموش سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار اور دوسروں کی کمائی پر پلنے والے آج بلکہ آئندہ بھی ایسے نظام کے خواہاں رہیں گے۔

ضامن بنتا ہے۔

اسلامی نظام اجتماعی کے بنیادی اصول اور ان کے معاشی اثرات:

❶ پس اسلام نے جس اجتماعی نظام کی بنیاد ڈالی ہے وہ ایسے اصولوں پر مبنی ہے جس میں حکومت، سیاست اور معیشت کو ایک طرف خدا پرستی اور مذہب کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو اور دوسری جانب معاشیات میں اس روح کو داخل کیا جس سے عام خوشحالی، عام اخوت و ہمدردی اور مساوات و مواساۃ باہمی کارفرما ہو جائے، اس نے کہا کہ تمام کائنات ذی روح حقِ معیشت میں مساوی ہے اور وہ تمام معاشی طریقے ناجائز و مردود ہیں جن کی بدولت مذموم سرمایہ داری نشو و نما پاتی ہے، یعنی ایسے طریقے جو دولت کو مخصوص طبقوں میں سمیٹ کر جمع کر دیتے اور عام مخلوقِ خدا کے افلاس اور فقر و فاقہ کا موجب بنتے ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ اس نے اکتناز و احتکار (Concentration & Hoarding) کو حرام قرار دے کر ان تمام ذرائع کا سدباب کر دیا جو حقِ معیشت کی مساوات میں رخنہ (Hindrance) انداز ہو سکتے تھے۔

❷ نیز اس نے اعلان کیا کہ درجات معیشت میں فطری تفاوت اور انفرادی ملکیت کا انکار بھی غلط اصول پر مبنی ہے کیونکہ ایسا کرنے میں قوائے عمل (Working Froces) کو معطل اور ان میں جمود و خمود (Stagnancy) پیدا کر دینا ہے اور اس طرح کارخانۂ زندگی میں جد و جہد کو بے کار بنانے کی ناکام سعی کرنا ہے۔

❸ اور احتکار و اکتناز کی حرمت اور حقِ معیشت کی مساوات تسلیم کر لینے کے بعد یہ خطرہ بھی بے معنی ہے کہ درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت کا اعتراف مذموم سرمایہ داری کی راہ کھولنے کے مترادف ہے، اس اجمال کی تفصیل اور اس حقیقت کی وضاحت انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد آئندہ صفحات میں معاشی نظام کی شرح سے معلوم ہو جائے گی۔

خلاصہ:

بہرحال اسلام نے عام خوشحالی اور حقِ معیشت کی عام مساوات کو اپنے نظامِ معاشی میں ''ریڑھ کی ہڈی'' (Back Bone) تسلیم کیا ہے اور ایک صالح معاشی نظام کو بروئے کار لانے میں جماعتی نظام اور نظامِ حکومت (خلافت) کو ایسے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے جو متذکرہ صدر اصولوں کی بنیادیں استوار کرتا اور عالم انسانی کو باہم معاشی دستبر دار اور رقابت (Retaliation) کے فتنہ سے بچاتا اور عالمگیر اخوت و ہمدردی کو قائم کرتا ہے، یہی وہ نظام ہے جو خلافتِ راشدہ کے دور میں کار فرما رہا اور تاریخ ماضی شاہد ہے کہ تجرباتی زندگی میں اس دور کا اسلامی معاشی نظام کائنات کے جدید و قدیم نظامہائے معاشی کے مقابلہ میں مرفہ الحالی (Well- Being) اور عام اخوت و ہمدردی کے لیے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

اور اگر روم و ایران کے اختلاط نے خود مسلم حکمرانوں کو شہنشاہیت اور قیصریت [1] اور کسروانیت [2] کی حرص و آز میں مبتلا کر دیا ہوتا اور اس طرح صحیح اسلام کا نظامِ حکومت (خلافت) کو خود اپنے ہاتھوں تباہ و برباد نہ کیا ہوتا تو یقیناً دنیا کی تاریخ کا رخ آج دوسرا ہوتا اور مادیین (Materialists) کو یہ الزام لگانے کا حوصلہ نہ ہوگا کہ اگر اسلام کا معاشی نظام ممکن العمل ہوتا تو اس کا دور حیات اس قدر قلیل نہ ہوتا، انہیں کیا معلوم کہ اسلام کے ''نظریاتِ معاشی'' عملی اور تجرباتی زندگی میں تمام معاشی

---

(۱) قیصریت (Caesarism) قیصر کی صفت یا نظم حکومت ہے۔ قیصر غایوس یولیوس (Caesar, Galus Julius) (۱۰۰-۴۴ق م قبل مسیح) روم (بیز نطی ریاستوں) کا (۴۹ق م ــــ ۴۴ق م) مطلق العنان حاکم رہا۔ قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہونے والے روم کے ہر حکمران کا لقب قیصر ہی رہا۔ (منیر بعلبکی، المورد، جزء الاعلام، حصہ)

(۲) کسروانیت (Kisraism) کسریٰ کی صفت یا نظم حکومت ہے۔ کسریٰ ایرانی بادشاہوں کا لقب تھا اور ان کے طرز حکمرانی کو کسروانی یا کسروانیت کہہ سکتے ہیں۔

دراصل یہ دونوں استبداری شہنشاہیت (Tyrranic Imperialism) کی مکروہ جابرانہ اشکال تھیں۔ جنہیں مٹا کر اسلام نے فطرتی نظام شورائیت (Consultation) دیا، مگر مسلمان حکمرانوں نے شہنشاہیت کے عشق میں اپنا سرمایہ افتخار ہی بھلا دیا۔

نظریات سے بلند اور کامیاب ثابت ہوئے۔ لیکن بمصداق

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مسلمانوں نے اپنی ذاتی حکمرانی کے لالچ میں اس بہترین نظام کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالا کیونکہ وہ یہ برداشت نہ کر سکے کہ خلافت فقط نیابتِ قانون الٰہی ہو اور وہ ذاتی حکمرانی اور شخصی صولت و حکومت نہ بنے، چنانچہ انہوں نے ایک عرصہ تک اگرچہ نام خلافت ہی کا استعمال کیا مگر ہمیشہ اس کے پردے میں شہنشاہی اور سلطانی کو مسند آراء بنائے رکھا۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)

نظامِ حکومت

الحاصل، جب اسلام نے حریت انسانی کا علم بلند کیا تو سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اس کے اجتماعی نظام میں حکومت، کار فرمائی اور وضع قانون اساسی کا معاملہ دنیا کے کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس کا حقیقی مؤسس صرف خدائے واحد ہے اور وہی واضع قوانین (Laws Giver) ہے اور "خلیفہ" اس کے اساسی قانون کی روشنی میں "نیابت" (Viceroyship) اور "تنفیذ" (Implementation) کی خدمت انجام دیتا ہے۔[1]

چند آیات ملاحظہ ہوں:

❶ ﴿إِنِ ٱلْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾[2]

ترجمہ: حکم خدا کے سوا کسی کا حق نہیں ہے۔

❷ ﴿مَٰلِكَ ٱلْمُلْكِ تُؤْتِي ٱلْمُلْكَ مَن تَشَآءُ وَتَنزِعُ ٱلْمُلْكَ مِمَّن

---

(۱) حدیث "السلطان ظل اللہ فی الارض" کی تسلیم صحت کے بعد اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر سلطان اسلام "خلیفہ" کا طرزِ فکر منہاج نبوت کے عین مطابق اور نیابتِ فقہ کا صحیح نمونہ ہے تو بلاشبہ وہ "اللہ کا سایہ" ہے ورنہ سلطان العنان شخصی حکمران کے لیے اسلامی نظام حکومت میں قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔

(۲) سورۃ یوسف (۱۲): ٦٧

تَشَآءُ﴾[1]

ترجمہ: وہ (خدا) ملک کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

۳ ﴿إِنَّ ٱلْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۖ وَٱلْعَٰقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾﴾[2]

ترجمہ: بلاشبہ زمین اللہ ہی کے لیے ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اسی کو وارث کر دیتا ہے اور انجام متقیوں کے لیے ہی ہے۔

۴ ﴿مَلِكِ ٱلنَّاسِ ﴿٢﴾ إِلَٰهِ ٱلنَّاسِ ﴿٣﴾﴾[3]

ترجمہ: وہ (خدا) انسانوں کا بادشاہ (ہے) اور انسانوں کا خدا ہے۔

۵ ﴿أَلَا لَهُ ٱلْحُكْمُ﴾[4]

ترجمہ: خبردار رہو "حکم" اسی خدا کا ہے۔

حیثیتِ امیر:

اسی لیے اس نے حکومت الٰہی کے نائب کے لیے شہنشاہ، ڈکٹیٹر اور صدر جمہوریہ اور نیابت کے لیے شہنشاہیت، ڈکٹیٹر شپ اور جمہوریت[5] کی تعبیر نہیں بلکہ خلیفہ اور خلافت کے عنوان کو اختیار کیا تاکہ ابتدائی تخیل میں ہی یہ واضح رہے کہ یہاں "نیابت الٰہی" اور "خدمت خلق" کے علاوہ شخصی اور پارٹی اقتدار کا کوئی مقام نہیں بن سکتا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے ارشاد ربانی ہے:

---

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۲٦

(۲) سورۃ الاعراف (۷): ۱۲۸

(۳) سورۃ الناس (۱۱٤۸): ۲

(۴) سورۃ الانعام (٦): ٦۲

(۵) اس جگہ جمہوریت کی نفی اس معنی میں ہے جس کا مظاہرہ آج کل امریکہ، انگلستان اور بعض دوسرے ممالک یورپ میں نظر آتا ہے۔

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (۱)

ترجمہ: میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔

اور حضرت داوٗد علیہ السلام کے لیے ارشاد ہے:

﴿يَٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِي ٱلْأَرْضِ﴾ (۲)

ترجمہ: اے داوٗد! ہم نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلیفہ کا اور اس کی طاعت کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں):

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء، كلما هلك نبی خلفه نبی وانه لا نبی بعدی، وسيكون بعدی خلفاء، فيكثرون. قالوا: فما تامرنا؟ قال: اوفوا بيعة الأول فالأول (اعطوهم حقهم فان الله سائلهم عما استرعاهم). (۳)

---

(۱) سورة البقره (۲): ۳۰

(۲) سورة ص (۳۸): ۲۶

(۳) صحيح الامام البخاری، كتاب الامارة، باب ما ذكر عن بنی اسرائيل. صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب الوفا، اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتحاد امت کو برقرار رکھنے اور پہلے جس امیر پر امت متفق ہو جائے اس کی اطاعت اور کسی اور دعویدارِ امارت کو قتل کر دینے تک کا حکم دیا ہے آئیے آپ کا ارشاد پڑھ لیں:

عن عرفجة رضی الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من اتاكم، وامركم جميع على رجل واحد، يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوا. (صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب حكم من فرّق أمر المسلمين)

ترجمہ: حضرت عرفجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جو شخص (امام وقت) سے بغاوت کر کے اور اپنی خلافت و امارت کا اعلان کر کے تمہارے پاس آئے اس حال میں کہ تم سب (پہلے سے) ایک شخص (امیر) پر متفق و متحد ہو ـــــ اور وہ تمہاری لاٹھی (اتحاد و قوت) کو توڑنا چاہے یا تمہارے (تنظیمی) اکٹھ کو منتشر کرنا چاہے اسے قتل کر دو۔

ترجمہ: (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست (تدابیر امور) ان کے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی جب کسی نبی کا انتقال ہو تا تو اس کی جگہ دوسرے نبی جانشین ہو جاتے اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور عنقریب میرے بعد خلفاء (خلیفہ ہائے رحمت) ہوں گے اور زیادہ ہوں گے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا: آپ ان کے متعلق ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جمہور نے جس کو اول چن لیا ہے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو (ان کے حقوق ادا کرو اور اللہ کریم نے ان کو اپنی مخلوق کی نگہداشت و نگرانی کی جو ذمہ داری سونپی ہے، اس کے بارے میں وہ خود ان سے پوچھ لے گا)۔

بے شک اسلام کے نظامِ حکومت میں خلیفہ کی شخصیت نمایاں ہے مگر ذاتی اور پارٹی کے اقتدار کی خاطر نہیں، بلکہ قلمرو خلافت کے ہر فرد کی خدمت کے لیے۔ بلاشبہ اس میں جمہوریت کا عنصر روشن ہے لیکن جمہور کے حقوق کی حفاظت کے لیے نہ کہ وضع قوانین و طرزِ حکومت میں مخالف اور موافق جماعت قائم کرنے اور اقلیت و اکثریت کی بحث جاری رکھنے کے لیے۔ اس لیے اسلام کا طرزِ حکومت (خلافت) قدیم و جدید طریقہ ہائے حکومت میں سے کسی کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ ان سب سے الگ ایک ایسا روشن نظام ہے جس میں عدل و انصاف کی یکسانیت اور افراد امت کی خدمت اصل بنیاد و اساس ہے، وہ ایک ایسا ''شوروی نظام'' (Consultative System) ہے جس میں خلیفہ راہ حق کا راہنما بھی ہے اور خدمت کا خادم بھی، وہ نیابت الٰہی کے منصب سے اگرچہ تمام افراد امت کا والی ہے لیکن اس کے عزل و نصب (Deposition & Position) میں افراد امت دخیل و سہیم و (شریک) ہیں اور وہ مہمات امور میں ''شوریٰ'' کا پابند ہے اور اہل الرائے (Consultants) کے مشاورت ہی اس کا عزم (Decision) ہے، غرض اسلام نے ''خلافت کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا

ہے جس میں امیر و مامور اور خلیفہ اور جماعت کے درمیان ایک لمحہ کے لیے بھی حاکم و محکوم کا علاقہ قائم نہیں ہونے پاتا اور عدل و انصاف میں مساواتِ علم کو اساس بنا کر جماعتی اور شخصی اقتدار کی جنگ کا خاتمہ کر دیتا ہے، چنانچہ حسب ذیل آثار سے امیر اسلام کی حیثیت کے متعلق ایک جھلک معلوم ہو سکتی ہے۔

اطاعتِ امیر احادیث و آثار کی روشنی میں:

❶ عن الحسن قال: كتب عمر الى ابي موسى ان الاعمال مو ادة إلى الأمير ما ادى الأمير الى الله عز و جل.[1]

ترجمہ: حضرت حسن رحمہ اللہ[2] کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں مذکور تھا: بلاشبہ رعایا کے اعمال اس وقت تک "امیر" کی طرف رجوع رہیں گے جب تک امیر خدا کی طرف رجوع رہے گا اور نیابت الٰہی کی ذمہ داری کو ادا کرتا رہے گا۔

❷ قال انس بن مالك رضي الله عنه عن معاذ بن جبل رضي

---

(۱) ابو عبیده قاسم بن سلام: كتاب الاموال، طبع قاهرة: ۱۳۵۲ھ، ص ٥

(۲) حسن بن یسار البصری (۲۱-۱۱۰) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا دودھ پیا۔ دراصل آپ کی والدہ محترمہ ام المومنین کی خادمہ تھیں۔ جب وہ کام پر چلی جاتیں اور آپ رونے لگ جاتے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہیں بہلانے کے اپنا دودھ ان کے منہ میں دے دیتیں۔ اس طرح یہ سعادت انہیں اللہ کریم نے بخشی۔ عالم، فقیہہ، فاضل اور قاری تھے۔ ان کی بیان کردہ روایات کی صداقت پر فقہاء اور محدثین کی غالب اکثریت کو اعتبار ہے۔ البتہ ان کی روایت کردہ بہت سی احادیث متصل نہیں مرسل ہیں۔ متصل وہ حدیث ہے جس کے راویوں کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے، مرسل وہ حدیث ہوتی ہے جس کے سلسلہ روایت میں سے کوئی راوی چھوٹ جائے۔ آپ روایات احادیث میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ آپ کی روایت کردہ احادیث حسین ابو سفیان بن حسین الواسطی، حفص المنقری، حمید بن ابی حمید الطویل، حوشب بن عقیل، سہل بن حسن رحمہم اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ تھیں (تفصیل کے لیے دیکھیں: علامہ ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ مولف مشکوۃ المصابیح، اکمال فی الرجال، تذکرہ حسن البصری رحمہ اللہ۔ ابن سعد: طبقات، ۷/۱۱۶، ۷/۱۲۷۔ مزی: تہذیب، ۲/۲۲۶۶۔ مصطفی اعظمی (دراسات فی الحدیث)

الله عنه قال: يا رسول الله! أرايت أن كان علينا امراء لا يستنون سنتك ولا يأخذون بأمرك، فما تأمرنا في أمرهم؟ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا طاعة لمن لم يطع الله.[۱]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۲] فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ یہ فرمائیں کہ اگر ہم پر ایسے (امیر) مسلط ہو جائیں جو نہ آپ کی سنت پر عمل کرتے ہوں اور نہ آپ کے ارشادات کی پرواہ کرتے ہوں تو ان کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتا تو مخلوق پر اس امیر کی اطاعت باقی نہیں رہتی۔

۳ قال علي بن ابي طالب رضي الله عنه: كلمات أصاب فيهن الحق، قال: بحق الإمام أن يحكم بما أنزل الله وأن يؤدّي الأمانة. فإذا فعل ذلك فحق على الناس ان يسمعوا له وأطيعوا ويجيبوه اذا دعا.[۳]

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: چند کلمات ہیں جن میں حق کہا گیا ہے، فرمانے لگے امام پر واجب ہے کہ قرآن عزیز کے مطابق فیصلے دے اور امانت کو شعار بنائے۔ پس اگر اس نے ایسا کر لیا تو لوگوں پر واجب ہے کہ اس کی سنیں اور اطاعت کریں اور اگر وہ کسی امر کے متعلق بلائے تو اس کو قبول کریں ورنہ نہیں۔

---

(۱) الهيثمي رحمه الله تعالى، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ج ٥، طبع قاهرة، ١٣٥٢ھ، ص ٣٢٥

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف باب نمبر ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۳) ابو عبيد: حوالا بالا: ص ٦،٥

❹ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من أمتی أحد ولی عن أمر الناس شیئا لا یحفظهم بما حفظه به نفسه وأهله إلا لم یجد رائحة الجنة۔[1]

---

(۱) الهیثمی، حوالا بالا: ص ۳۲۵ اس موضوع پر بخاری کی روایت ہے: "فلم یحطها بنصحه لم یجد رائحة الجنة" (پھر اگر وہ امیر امت کے کمزوروں کی خیر خواہی کے لیے کوشاں نہ ہو گا تو جنت کی خوشبو نہ پا سکے گا) بحوالہ امام نووری: ریاض الصالحین، باب أمر ولاة الأمور بالرفق برعایاهم۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اسوہ حسنہ اس ضمن میں کیا تھا؟ اس بارہ میں مشہور صحابی حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے یہود کے بہت بڑے عالم اور بہت مالدار تھے۔ وہ اپنے دولت اسلام پانے سے قبل کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ چل رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیہاتی ملا، جس نے اطلاع دی کہ فلاں قبیلہ کے لوگوں نے اسلام اس امید پر قائم کیا تھا کہ اللہ کریم ان کا افلاس ختم فرمادیں گے۔ ان کے ہاں تو قحط کے آثار ہیں، ڈر ہے کہ کہیں ان کا فقر انہیں کفر تک لے جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت فکر مند ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ کچھ مال ہے؟ جب جواب نفی میں ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی (۸۰) مثقال سونا قرض حسنہ لے کر ایک قابل اعتماد آدمی کے ذریعہ امت کے ان مفلوک الحال افراد کے پاس بھیجا اور تاکید کی کہ ان میں برابر تقسیم کر کے آئیں (تاکہ کوئی محروم المعیشت نہ رہے) آگے لمبی حدیث ہے جس میں حضرت زید بن حسنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان لانے کا ذکر بھی ہے۔ (ابن سعد: طبقات، تذکرہ زید بن سعنه رضي الله تعالیٰ عنه. ابونعیم: دلائل النبوة، ص ۲۳. الاصابة: ۱/۵۶۶)

رعایا کی خبر گیری، ان سے ہمدردی اور وفاجن کی بجاآوری کا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے اس کا اثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم —— جو اپنے اپنے دور خلافت میں سیاسی اور دنیوی اعتبار سے بہت طاقت ور حکمران تھے —— پر کیا ہوا؟ ان ستودہ صفات اشخاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے ہادی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "خدمت خلق" سے متعلق ارشادات پر کس طرح عمل کر کے دکھایا اور رہتی دنیا تک اعلیٰ نمونہ چھوڑ کر گئے، اس لیے ان کے دو تین واقعات بطور نمونہ درج کیے جا رہے ہیں لیجئے آپ بھی پڑھ لیں۔

❶ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک کام محلہ کی غریب اور بے کس بیواؤں کی بکریاں دوہنے (Milking) کا بھی تھا۔ جب بار خلافت قبول کر کے گھر تشریف لا رہے تھے تو ایک یتیم لڑکی نے ہاتھ تھام کر کہا: اب ہماری بکریاں کون دوہے گا؟ فرمایا: میں ہی، خلیفہ بن کر بھی۔ (ابن سعد: طبقات، ج ۳، اصحاب بدر، تذکرة ابی بکر الصدیق رضی الله عنه. مولانا محمد یوسف: حکایات

صحابہ رضی اللّٰہ عنہم، ج ۱، تذکرۃ ابی بکر صدیق رضی اللّٰہ عنہ)

❷ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے محلہ میں ایک بے کس نابینا بڑھیا رہتی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز تہجد کے بعد رات کے اندھیرے میں اس کے گھر جھاڑو لگا کر اور پانی برتن میں بھر کر چپکے واپس آجاتے، شاید ان مائی صاحبہ کو بھی خبر نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اس بڑھیا کی بے کسی پر ترس آیا، ایک بار انہوں نے ارادہ کیا کہ پچھلی رات تہجد کے بعد اس کے گھر جا کر صفائی اور پانی بھرنے کی خدمت کر آیا کریں گے۔ جب یہ اس نیک ارادہ سے اس کے گھر تشریف لے گئے تو کیا دیکھا کہ خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کار خیر میں ان پر سبقت لے گئے ہیں۔ (ابن اثیر، امام فخر الدین بن الاثیر الجزری رحمہ اللّٰہ: الکامل فی التاریخ، مطبوعہ مصر، ۲/۲۹۰)

❸ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول تھا کہ جہاد پر گئے ہوئے مجاہدین کے گھروں پر تشریف لے جا کر مستورات سے دریافت فرماتے کہ انہوں نے بازار سے کچھ (سودا سلف) منگوانا ہو تو یہ لا کر دیں۔ وہ باحیا پردہ نشین اپنی خاداؤں کو ساتھ بھیج دیتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ مطلوبہ اشیاء خریدتے اور ان خاداؤں کے حوالے کرتے۔ مقام جنگ سے قاصد مجاہدین اور غزاۃ اسلام (Worriers of Islam) کے خطوط لاتا تو آپ خود ان کے گھر پر جا کر تقسیم کر کے آتے، ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے: فلاں تاریخ کو قاصد واپس جائے گا، آپ جواب تحریر کر کے رکھیں یا لکھوا رکھیں، وہ لیتے جائے گا (سامان کتابت) کاغذ، قلم دوات، خود مہیا کرتے۔ جس مجاہد کے گھر کوئی خط لکھنے والا نہ ہوتا، خود چوکھٹ پر بیٹھ جاتے، گھر والے جو کہتے یہ تحریر فرماتے جاتے۔ (علی المتقی: کنزالعمال، ج ۲، فضائل الفاروق رضی اللّٰہ عنہ) ص، ۲۳۰.شبلی نعمانی رحمہ اللّٰہ، الفاروق، حصہ دوم، باب سیاست و تدبیر، عدل و انصاف، ضمنی عنوان جزئیات پر توجہ)

❹ امام اوزاعی رحمہ اللہ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رات کی تاریکی میں ایک گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ تحقیق احوال کے لیے ایک دن راہ میں کہیں لگ کر بیٹھ گئے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پھر اس گھر سے اپنا کام کر کے نکل رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا نابینا خاوند اور اپاہج بیوی کے جوڑے کا گھر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر رات ان کی چپکے سے خبر گیری کر کے نکل جاتے ہیں کہ اس جوڑے کو بھی خبر نہیں کہ آنے والا کون ہے؟ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ جان کر رونے بیٹھ گئے کہتے جاتے تھے: طلحہ کی ماں اسے روئے، یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے بدگمان ہوتا ہے۔ (ابونعیم: حلیۃ الاولیاء، ۱/۴۸)

❺ حضرت شرحبیل بن مسلم رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود نہایت سادہ زندگی گزارتے اور لوگوں کو گھر بلا کر امارت (یعنی امیرانہ شان و شوکت) والا کھانا کھلاتے، لوگ (بلا خوفِ دربان) ان کے گھر سرکہ اور گھی (جو عربوں میں اس وقت عالی شان سامان طعام سمجھا جاتا تھا) تناول کرتے۔ (ملاحظہ ہو ابونعیم: حلیۃ الاولیاء، ۱/۶۰. سید ابوالحسن علی ندوی:

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں سے اگر کوئی شخص لوگوں کے معاملات کا والی بنا اور اس نے ان کے معاملات کی اس طرح حفاظت نہ کی جس طرح اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے تو جنت کی خوشبو نہ پاسکے گا۔

التزامِ جماعت واطاعتِ امیر

پس اگر خلیفہ، امیر یا امام نیابت الٰہی کے بنیادی اصولوں کا پابند ہے تو پھر اسلام نے جمہور کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ نیابت الٰہی کے حامل ''خلیفہ'' کی پیروی کریں کیونکہ یہ پیروی اس کی شخصیت کی پیروی نہیں ہے بلکہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے نیز ان کو جماعتی نظم کے ایک عنصر بننے اور روزمرہ کی زندگی میں بھی ''امارت'' کے اس تخیل کو داخل کرنے کو ضروری اور اہم قرار دیا، چنانچہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ان حقائق کے لیے شاہد عادل ہیں۔

الرسول الاعظم صلی اللہ علیہ وسلم، مجمع اسلامی علمی لکھنو، ہند، ص ۴۲)

❻ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک بڑھیا کے کھیت کو پانی لگانے اور اس بیوہ کا خوش ہو کر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چند کھجوریں دینے کا واقعہ تاریخ اسلام کے ماتھا کا جھومر بنا نظر آتا ہے، جسے بعض سیرت نگاروں نے اجرت پر کام کرنے کا عنوان دیا ہے، مگر خلیفہ وقت کا بیوہ بڑھیا کے کھیت کو سینچ کر چند کھجوریں لینا سیرۃ مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جوڑ نہیں ملاتا۔

❼ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابتداء سن ہی سے ناز و نعمت سے پلے بڑھے تھے۔ اللہ کریم نے ہر قسم کی فراوانی عطا کر رکھی تھی مگر اپنے خدام کے حصہ کا کام خود کر لیتے گویا ان کی خدمت کرتے۔ انہیں راتوں کو ذاتی کاموں (مثلاً وضو کے لیے پانی وغیرہ منگوانا) کے لیے نہیں جگاتے تھے۔ عبداللہ رومی رحمہ اللہ کہتے ہیں جب ایک بار آپ سے عرض کیا گیا کہ خدام کو کیوں نہیں جگاتے۔

لو أمرت بعض الخدم فكفوك فقال: لا. الليل لهم يستريحون فيه. (ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعه بيروت، ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء: ص ۴۴)

ترجمہ: اگر آپ نے خدام میں سے کسی کو حکم دیا ہوتا تو وہ آپ کی خدمت کر دیتا۔ فرمایا: نہیں۔ رات ان کے لیے ہے، وہ اس میں آرام کرتے ہیں۔

کتاب اللہ سے دلائل:

❶ ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (۱)

ترجمہ: اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور صاحبِ امر (امیر) کی اطاعت کرو۔

❷ ﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (۲)

ترجمہ: اور اللہ کی پیروی کرو اور اس کے رسول کی اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ایسا کروگے تو تمہاری قوت سست پڑ جائے گی اور ہوا اکھڑ جائے گی۔

❸ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ (۳)

ترجمہ: اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کا یہ حال ہے کہ ان کے پاس خدا کی بینات آئیں مگر ان کے بعد بھی وہ ٹکڑے ٹکڑے ہی رہے۔

احادیث کی روشنی میں:

❶ عن أبي هريرة رضي الله عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كانت بنو اسرائيل تسوسهم الانبياء كلما هلك نبي خلفه نبي وانه لا نبي بعدي وسيكون بعدي خلفاء. (۴)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۵) سے روایت ہے کہ نبی اکرم

(۱) سورة النساء (٤): ٥٩

(۲) سورة الانفال (٨): ٤٦

(۳) سورة آل عمران (٣): ١٠٥

(۴) صحيح الامام البخاري، كتاب الامارة، باب ما ذكر عن بني اسرائيل، صحيح مسلم، كتاب الامارة باب وجوب الوفا.

(۵) ابوہریرہ، عبدالرحمٰن ابوہریرہ الدوسی الیمنی (۱۹ قبل ہجرت ۵۹ھ) اصل نام عبدالرحمٰن تھا۔ انہوں نے ایک

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء انجام دیتے تھے، جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرا نبی پہلے کا قائم مقام آجاتا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور قریب ہے کہ میرے بعد مسلمانوں کی سیاست خلفاء انجام دیں گے۔

❷ لا يحل لثلاثة يكون فى الفلاة من الأرض إلاّ مرّوا عليهم أحدهم.(۱)

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی اگر چٹیل میدان میں بھی موجود ہوں تو ان کے لیے بغیر اس بات کے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں زندگی گزارنا جائز نہیں ہے۔

❸ لا اسلام إلا بجماعة ولا جماعة إلا بأمارة ولا امارة الا بطاعة.(۲)

بلی پال رکھی تھی۔ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا: اے بلی والے، بس پھر ہمیشہ کے لیے تاریخ حدیث اور کتب حدیث میں یہی نام بن گیا۔ دوس قبیلہ سے تھے جس کا یمن سے تعلق تھا۔ آپ امام، فقیہہ، مجتہد، حافظ، محدث بلکہ حفاظ حدیث کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں زکاۃ کلکٹر بھی بنایا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حفظِ حدیث کے لیے دعا بھی دی تھی کیونکہ آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، حافظہ کی بنا پر ہزاروں احادیث یاد تھیں۔ البتہ اپنے طلبہ سے لکھوا کر محفوظ بھی کرتے تھے۔ آپ سے بہت بڑے بڑے اساطین علم و عرفان نے احادیث نقل کی ہیں، جن میں ابو صالح السمان، بشیر بن نہیک، سعید المقبری، عبد العزیز بن مروان، عبد اللہ بن ہرمز، محمد بن سیرین، مروان بن الحکم، ہمام بن منبہ رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ ان میں سے حضرت ہمام بن منبہ رحمہ اللہ کا صحیفہ حدیث (Collection of Hadith) کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ نے تحریر (Edit) کر کے بار بار شائع کر دیا ہے آپ نے ۷۸ سال کی عمر میں ۵۷ھ (۵۸ھ یا ۵۹ھ) میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (برائے تفصیل دیکھیں: محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه، تذکرہ ابی ہریرۃ الدوسی رضی اللہ عنہ۔ مولانا محمد یوسف: حکایات صحابہ رضی اللہ عنہم، تذکرہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ ولی الدین: مشکوۃ المصابیح کا ذیل "الکمال فی اسماء الرجال" ترجمہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)

۱) احمد بن حنبل: مسند - ولی الدین: مشکوۃ المصابیح، باب الامارۃ

۲) ابن عبد البر: الجامع، طبع قاهرة: ص ٦٢

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسلام بغیر جماعت کے اور جماعت بغیر امارت کے نہیں اور امارت بغیر طاعت و پیروی کے نہیں۔

❹ عن ابي هريرة رضى الله عنه سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة جاهلية.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے: جو شخص اطاعت (امیر) سے باہر ہو گیا اور جماعت سے علیحدہ ہو گیا اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

❺ عن عروة قال: خطب أبو بكر رضى الله عنه، فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: أمّا بعد، فاني وليت امركم ولستُ بخيركم ولكنه نزل القران سنّ النبى صلى الله عليه وسلم وعلمنا فعملنا، و إنّ أقوا كم عندى الضعيف حتى أخذله بحقه، وانّ

---

(۱) صحيح امام مسلم، كتاب الامارة، باب الامر بلزوم الجماعة الخ. مشكوة المصابح، باب الامارة والقضاء، الفصل الاول.

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعتِ امیر اور اتحاد امت پر اس قدر زور دیا کہ امت میں تفرقہ ڈالنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

❶ عن عرفجة رضى الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: انه سيكون هنات وهنات. فمن أراد أن يفرّق أمرهذه الأمة، وهى جميع، فاضربوا بالسيف، كائنا من كان. (صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب حكم من فرق امر المسلمين)

ترجمہ: حضرت عرفجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: عنقریب تخریب و انتشار رونما ہوں گے، لہٰذا جو شخص اس امت میں انتشار کا ارادہ کرے جبکہ وہ متحد و متفق ہو تو اس شخص کو تلوار سے قتل کر دو خواہ کوئی بھی ہو۔

أضعفكم عندى القوى حتى اخذ منه الحق. ايها الناس! إنما أنا متّبع ولست بمتبدع. فإن أنا أحسنت فأعينونى، وان انا زغت فقوّمونى، اقول قولى هذا واستغفر الله لى ولكم۔[1]

ترجمہ: حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا، اول اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، پھر فرمایا: بعد حمد و صلوٰۃ: میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن قرآن عزیز نازل ہوا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت (حدیث) کو بیان فرمایا، ہم نے ان کو سیکھا اور ان پر عمل کیا۔ بلاشبہ تمہارے زبردست (طاقت ور) میرے لیے اس وقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ان پر واجب شدہ حق کو نہ لے لوں اور بلاشبہ تمہارے زیر دست (کمزور) میرے پاس اس وقت تک زبردست ہیں جب تک کہ میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ لے لوں، اے لوگو! میں تو (احکام اسلام) کا پیرو ہوں کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں پس اگر میں نیکی کی زندگی کو اختیار کروں تو میری مدد کرو اگر کجی اختیار

---

(۱) ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعه بيروت، ١٤١٨ھ، ١٩٩٧ء ص ١٣٦. ابوعبيد: كتاب الاموال، طبع قاهرة، ١٣٥٢ھ، ص ٥٧٤

(۲) عروۃ، عروۃ بن الزبیر بن العوام (۲۲ھ - ۹۳ھ) امام، محدث، فقیہ اور عالم مدینہ تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کی خالہ محترمہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمائی۔ آپ —— حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جو ایک عرصہ تک مکہ مکرمہ میں امویوں کے مخالف خلیفہ بن کر بھی رہے پھر شہید ہو گئے —— کے بھائی تھے، انہیں اللہ کریم نے بہت زیادہ ذوق علمی عطا فرمایا تھا۔ ابتداء عمر سے ہی آپ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حفظ و کتابت میں لگ گئے۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ پر ایک کتاب "سیرۃ النبویۃ" کے عنوان سے لکھی، جس کے اقتباسات امام زہری، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور طبری رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل کیے ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں عبد الملک بن مروان، ہبیرۃ، ہشام بن عروۃ رحمہم اللہ وغیرہم شامل ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: ذهبى: تذكرة الحفاظ. ابن طولون: اعلام السائلين عن كتب سيد المرسلين)

کروں تو مجھے سیدھا کر دو میں یہی باتیں کہتا ہوں اور اپنے اور تمہارے لیے خدا سے مغفرت چاہتا ہوں۔

❻ عن سلمان رضی اللّٰه عنه قال: أن الخليفة هو الذی يقضی بكتاب اللّٰه و يشفق علی الرعية شفقة الرجل علی اهله. فقال كعب رضی اللّٰه تعالیٰ عنه الأحبار: صدق.[1]

ترجمہ: حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] فرماتے ہیں: صحیح معنی میں

---

(۱) كرد علی محمد رحمه اللّٰه: الاسلام والحضارة العربية، مطبوعه قاهرة، ۱۳۴۹ھ، ۱۳۱/۲.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ کا اپنی رعایا پر شفقت اور ان کی معاشی کفالت کی تاکید کا موضوع اپنی متعدد احادیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ دو ارشاد نقل کر رہا ہوں پڑھ لیں:

① عن معقل بن يسار رضی اللّٰه عنه قال: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم يقول: ما من عبد يسترعيه اللّٰه رعية، فلم يحطها بنصيحة الا لم يجد رائحة الجنة. (صحيح بخاری، كتاب الاحكام، باب من استرعی رعيته. صحيح مسلم، كتاب الامارة باب ۵)

ترجمہ: حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ کریم نے اپنے جس بندہ سے رعایا کی نگرانی (و خدمت) کا کام لیا، مگر وہ بھلائی و خیر خواہی کے (جذبہ) سے یہ کام نہ کرے وہ جنت کی خوشبو تک نہ پا سکے گا۔

② عن عائشة رضی اللّٰه عنها عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم: اللهم من ولی من أمر أمتی شيئا، فشق عليهم فاشق عليه، ومن ولی من أمر أمتی شيئا فرفق بهم فأرفق به. (صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب فضيلة الامام العادل)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے (اللہ کریم کے دربار میں عرض کرتے ہوئے) فرمایا: اے اللہ کریم! جس شخص کو میری امت کے (حکومتی و معاشی) امور میں سے کسی امر کا نگران بنایا گیا، پھر اُس نے (اپنے اختیارات و تدابیر کے سبب) میری امت کے افراد پر سختی و تنگی مسلط کر دی، تُو بھی اس پر (اپنی) تنگی و مشقت مسلط فرما دے۔ اور جس شخص کو میرے امت کے (معاملات میں سے کسی) امر کا نگران ٹھہرایا گیا اور اس نے میری امت کے افراد کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ تُو بھی اس شخص کے ساتھ نرمی و شفقت کا رویہ اختیار فرما۔

(۲) سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبل از اسلام نام مابہ بن بود خشان تھا۔ اسلام لانے پر سلمان نام، ابو عبد اللہ کنیت اور سلمان خیر لقب ہوا۔ اصل فارسی تھے، پہلے عیسائی تھے۔ وہاں سے ایک راہب کی وصیت کے مطابق موصل سے نصیبین، پھر نصیبین سے عموریہ اور یہاں عموریہ کے راہب ـــــ جس نے آپ کو خبر دی کہ

"خلیفہ" وہی ہے جو کتاب اللہ (قرآن) کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور رعیت پر اس طرح شفقت کرے جس طرح ایک شخص اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے۔ کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سنا تو کہا: سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سچ کہا۔

۷ عن سلمان رضی اللّٰہ عنه ان عمر رضی اللّٰہ عنه قال: أملك أنا أم خليفة؟ فقال له سلمان: أن أنت جَبَيْتَ من أرض المسلمين درهما أو قل أو اكثر، ثم وضعته فی غير حقه فانت ملك غير خليفة، فاستعبر عمر رضی اللّٰہ عنه۔[1]

عنقریب ایک آخری نبی علیہ السلام کا ظہور ہونے والا ہے۔ شہر یثرب (مدینہ منورہ) کے نشانات بھی بتائے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ہو گا ——— کی ہدایت پر آپ عربوں کے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ——— جنہوں نے آپ کو غلام بنایا اور یثرب لا کر فروخت کیا ——— آپ مدینہ منورہ آئے اور بنو قریظہ نے خرید کر غلام بنالیا۔ ان راہب نے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات نبوت بھی بتائیں کہ صدقہ نہیں کھائیں گے، ہدیہ (تحفہ) قبول کر لیا کریں گے، دونوں مبارک شانوں کے درمیان مہر نبوت ہو گی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی علاماتِ نبوت دیکھ کر مشرف باسلام ہوئے۔ غزوہ خندق میں دفاعی خندق کی کھدائی آپ ہی کے مشورہ سے ہوئی تھی۔ اسلام لانے کے بعد آپ نے اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و وفا کی ایک تاریخ رقم کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی بے کسی کو دیکھ کر آپ کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنا لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بے کس سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے یہ شادی مرگ کا مرحلہ ہوتا ہو گا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ پیارے بھرے الفاظ نکلتے ہوں گے۔ "سلمان منا، اهل البيت"، سلمان ہم سے ہیں، گھر والوں کی طرح ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں عراق کی فتوحات میں اسلامی فوج کے افسر رسد و خوارک تھے۔ بعد میں مدائن کے گورنر بنائے گئے۔ اپنی تنخواہ صدقہ کر دیتے اور محنت کر کے معاش کماتے۔ ٹوکریاں بناتے اور لوگوں کو فروخت کرتے۔ ایک روایت کے مطابق ۳۶ھ (دوسری روایت میں ۳۲ھ) میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: امام احمد بن حنبل رحمه الله: مسند، تذکرہ سلمان الفارسی رضی الله. ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمه الله: ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، باب اول، العصر الجاهلی، الفصل الاول. ابن الاثیر الجزری رحمه الله: اسد الغابة فی معرفة الصحابة، ج ۲. شبلی نعمانی: الفاروق، عنوان فتوحات عراق)

(۱) علامہ سیوطی رحمه اللّٰہ: تاریخ الخلفاء، تذکرہ عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه، ص ۴۰

ترجمہ: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے دریافت کیا: میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن سے کہا: اگر آپ مسلمانوں کی زمین پر ایک درہم یا کم و بیش ٹیکس لگائیں، پھر اسے جائز مصرف کے علاوہ خرچ کریں تو آپ پھر بادشاہ ہوں تو ہوں خلیفہ نہیں بن سکتے، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

❽ عن سفيان بن أبي العرجاء رضي اللّٰه عنه قال: قال عمر بن الخطاب رضي اللّٰه عنه: واللّٰه ما أدري خليفه أنا أم ملك؟ فان كنت ملكا فهذا أمر عظيم. قال قائل: يا أمير المؤمنين! إنّ بينهما فرقا. قال: ما هو؟ قال: الخليفة لا يأخذ إلاّ حقاً، ولا يضعه إلا في حق. وأنت بحمداللّٰه كذلك، والملك يعسف الناس. فيأخذ من هذا ويعطي هذا. فسكت عمر رضي اللّٰه عنه.(۱)

ترجمہ: حضرت سفیان بن ابی العرجاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (ایک دن اصحاب رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں) فرمایا: واللہ! میں خود نہیں جانتا کہ میں خلیفہ (کی طرح برتاؤ کرتا) ہوں یا بادشاہ (کی طرح)۔ اگر میں بادشاہ (کا طرز اختیار کیے ہوئے) ہوں تو پھر بہت خطرناک معاملہ ہے۔ حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان (خلیفہ اور بادشاہ) کے درمیان فرق ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ کیا؟ جواب میں عرض کیا گیا: خلیفہ تو حق کے ساتھ کوئی چیز یا مال لیتا ہے اور اسے حق کے ساتھ خرچ کرتا ہے اور الحمد للہ آپ کا طرز عمل ایسا ہی ہے، جبکہ بادشاہ لوگوں پر ظلم اور جبر کرتا ہے کہ

(۱) حوالا بالا

اس سے ظلماً لے لینا اور اس کو (بغیر حق کے) دے دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔)

شوریٰ (AdvisoryCouncil)

اور جس طرح "امت مسلمہ" پر لزوم جماعت اور اطاعت امیر کو ضروری قرار دیا اسی طرح امیر (خلیفہ) پر یہ واجب کیا کہ وہ مہمات امور (Performance of Matters) میں اہل حل و عقد (Consultative Council) سے مشورہ کرے اور حسب اقتضاء معاملات (Requirement of Affairs) جمہور سے بھی مشورہ کرنا اپنے اہم فرائض میں سمجھے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ (۱)

ترجمہ: اور ان (صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے معاملات میں مشورہ کرو اور جب کسی بات پر تمہارا عزم قائم ہو جائے تو پھر صرف اللہ پر بھروسہ رکھو۔

علماء اسلام کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم پیغمبر کے لیے کہ جن پر شب و روز وحی نازل ہوتی رہتی تھی اور اس لیے مشورہ کے محتاج نہیں تھے مشورہ حاصل کرنے کا حکم نازل ہوا تو خلفاءِ اسلام کے لیے تو یہ امر بلاشبہ وجوب کا درجہ رکھتا ہے اور اسی لیے حکومتِ اسلامی کو "شوروی طرز حکومت" (Consultative Form of Government) کہا جاسکتا ہے، چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (۲) فرماتے ہیں:

---

(۱) آل عمران (۳): ۱۵۹

(۲) ابن تیمیہ، حافظ تقی الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ (۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ تا ۲۰ ذوالقعدۃ ۷۲۸ھ) فقہ حنبلی کے ایک نامور امام، حافظ، محدث اور مصنف تھے۔ اپنے موقف پر ڈٹ جانے اور قید و بند کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والے انسان تھے۔ حق گوئی اور بے باکی کے صلہ میں دمشق کے قلعہ میں قید ہو =

لا غنی الولی الأمر عن المشاورة. فأن اللہ أمر بها نبیه صلی اللہ علیه وسلم فغیره صلی اللہ علیه وسلم أولی بالمشورة.[۱]

ترجمہ: امیر (خلیفہ) کو مشورہ کے بغیر چارہ نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے تو پھر آپ کی ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرے تو بہت زیادہ مشورہ کے محتاج ہیں۔

اور جب امیر مشورہ کر لے تو پھر وہ اہل الرائے کے مشورہ کا پابند ہے اس لیے کہ وہ مشورہ ہی دار صل اس کا وہ عزم ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ میں یہ نص صریح قطعی (Explicit Definite Text) اور فیصلہ کن (Decisive) ہے۔

عن علی رضی اللہ عنه قال: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن العزم. فقال: مشاورة أهل الرای ثم إتباعهم.[۲]

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آیات قرآنی میں "عزم" سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امیر کا اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر اس مشورہ کا پابند ہونا ہی عزم ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾[۳]

گئے، آپ کی تصنیفات میں مجموعۃ الرسائل الکبری، منہاج السنۃ، رسالۃ معارج الاصول، الصارم المسلول علی شاتم الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) الفتاویٰ اور السیاسۃ الشرعیۃ مشہور ہیں۔ (ڈاکٹر صبحی محمصانی: فلسفۃ التشریع فی الاسلام، بیان المذہب الحنبلی)

(۱) امام ابن تیمیة، تقی الدین ابوالعباس احمد: السیاسیة الشرعیة فی اصلاح الراعی والرعیة، مطبع خیریة، قاهرة: ۱۳۲۲ھ.

(۲) ابن کثیر: تفسیر، سورة الشوری (۴۲، آیت نمبر ۳۸ کی تفسیر میں دیکھیں۔)

(۳) سورة الشوری (۴۲): ۳۸

ترجمہ: اور ان کے (مسلمانوں کے) معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

اور ان آیات کی وضاحت جس طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ہو چکی ہے اسی طرح حسبِ ذیل کے آثار (Reports) اور احادیث بھی اس حقیقت کو بخوبی روشن کرتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں "خلافت" اور "شوری" کے درمیان کیا نسبت ہے؟

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لو كنت مستخلفا أحدا عن غير مشورة لاستخلفت إبن أم عبد.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر میں کسی شخص کو بغیر مشورہ کے خلیفہ بناتا تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] کو بناتا۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه قال: لا خلافة إلاّ عن مشورة.[3]

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خلافت بغیر مشورہ کے "خلافت" نہیں ہے۔

اہمیت شوری پر چند تاریخی نظائر:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ:

غزوہ احد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور معمر و جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ منورہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے مگر حضرت

---

(۱) حاکم نیشاپوری، ابوعبداللہ بن محمد بن عبداللہ: المستدرك

(۲) عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۳) علی المتقی: کنز العمال بحوالہ مصنف ابن ابی شیبۃ رحمہ اللہ تعالیٰ، ۱۳۹/۳

حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] اور نوجوانوں کی رائے یہ ہوئی کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے۔ آپ نے یہ دیکھا کہ اکثریت باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں ہے تو اسی کے مطابق "عزم جنگ" کیا اور مسلح ہونے کے لیے حجرہ مبارک میں تشریف لے گئے۔ اس دوران میں معمر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے نوجوانوں کو عار دلائی کہ تم نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عندیہ کا لحاظ کیے بغیر ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف میں ڈالا، یہ سن کر نوجوان متاثر ہوئے اور معذرت کے لیے حجرہ کے سامنے جمع ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر تشریف لائے اور نوجوانوں کی معذرت کو سنا تو فرمایا کہ عزم کے بعد اب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان نہیں ہے کہ مقصد حاصل کیے بغیر غیر مسلح ہو جائے، چلو اب مدینہ سے باہر ہی میدان جنگ قائم ہو گا۔ [2]

خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل:

عراق و شام کی فتح پر خلیفۃ المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ ہوئی کہ ان ملکوں کی زمین کو مجاہدین و غانمین میں تقسیم نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ

(۱) حضرت سیدنا سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب ابو عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا، پیارے خالہ زاد اور دودھ شریک بھائی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ محترمہ حضرت زینب یا سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپس میں بہنیں تھی۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں رشتہ کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین تھے۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے اسلام لائے۔ نہایت بہادر اور جری انسان تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اسد اللہ و اسد رسولہ (اللہ کریم اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شیر) کا خطاب دیا۔ غزوہ احد میں جام شہادت نوش فرمایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بے اختیار روئے۔ بہتر (۷۲) بار آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ آپ سے صحاح ستہ کے مصنفین نے روایت کیا ہے۔ (دیکھئے علامہ ابن عبد البر المالکی الاندلسی رحمہ اللہ: الاستیعاب فی معرفۃ الصحاب رضی اللّٰہ عنھم، ترجمہ سیدنا حمزہ رضی اللّٰہ عنہ — ولی الدین خطیب رحمہ اللّٰہ: مشکاۃ المصابیح کے ذیل میں الکمال فی اسماء الرجال، تذکرہ سیدنا حمزہ رضی اللّٰہ عنہ)

(۲) ابن حجر عسقلانی (علامہ حافظ احمد بن علی بن محمد رحمہ اللّٰہ): فتح الباری (شرح صحیح بخاری)، ج ۷، بیان غزوہ احد. ابن ھشام: السیرۃ النبویۃ، ج ۲، بیان غزوہ أحد

خلافت (اسٹیٹ) کی ملک (Ownership) رہے تاکہ ہمیشہ تک کے لیے مسلمانوں کی ضروریات اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں اس کی آمدنی خرچ ہوتی رہے، مگر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جب اس سے اختلاف کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ حل وعقد سے مشورہ کیا مگر ان میں بھی بات طے نہ ہو سکی اور اختلاف ہنوز باقی رہا، تب آپ نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں "اجلاس عام" طلب فرمایا اور جمہور کے جمع ہونے پر حمد و ثنا کے بعد خطبہ دیا جس کے حسبِ ذیل جملے قابل غور ہیں اور ان سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام کے نظامِ حکومت میں "امیر" کی امارت اور خلیفہ کی خلافت کی کیا حیثیت ہے؟

أنی لم أزعجکم إلا لأن تشرکوا فی أمانتی فیما حملت من أمورکم، فأنی واحد کأحدکم، وأنتم الیوم تقرّون بالحق. خالفنی من خالفنی وأوفقنی من وافقنی. ولست أرید أن تبتغوا هذا الذی هو أی، معکم من اللّٰه کتاب ینطق بالحق. فواللّٰه لئن کنت نطقت بأمر أریده ما أرید به إلّا الحق.(۱)

ترجمہ: میں نے تم کو خواہ مخواہ تکلیف نہیں دی بلکہ اس لیے جمع کیا ہے کہ آپ بھی میری اس امانت میں شرکت کریں جو ان امور سے متعلق ہے جس کا بوجھ آپ نے میرے کاندھوں پر ڈالا ہے، بلاشبہ میں بھی تمہاری ہی طرح کا ایک فرد ہوں اور تم آج حق کا اعلان کرو گے جس کو مجھ سے اختلاف ہے وہ صاف صاف اپنی رائے ظاہر کرے اور جس کو واقعی اتفاق ہے وہ اتفاق ظاہر کرے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری رائے اور خواہش کی پیروی کریں۔ اس لیے کہ تمہارے پاس خدائے تعالیٰ کی دی ہوئی کتاب (قرآن) ہے جو حق کے لیے ناطق ہے۔ بخدا میں اگر کوئی بات کہتا ہوں تو میرا ارادہ اس گفتار میں حق کے

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، دار الاصلاح، قاهرة، باب فی الفئ والخراج

سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

خلیفہ یا حاکم قانون میں رعایا کے برابر:

نیز اسلام کے نظامِ حکومت میں "خلیفہ" کا مقام "خلافت" کے ادائے فرض کے علاوہ ہر ایک شعبہ ہائے زندگی میں "قانون اسلام" یعنی عدل و آئین کی نظر میں دوسروں کے مقابلہ میں کوئی برتری نہیں رکھتا اور اس حیثیت میں امیر و مامور اور راعی و رعایا سب برابر ہیں، چنانچہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] کے بیٹے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما [2] نے ایک مصری کو کوڑے

---

(۱) حضرت عمرو بن العاص السہمی القرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۸ھ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مل کر مدینہ منورہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ عرب کے زیرک اور تجربہ کار سیاست دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عمان کا گورنر مقرر فرمایا اور آخر وقت تک مامور رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے بھی گورنر رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں مصر کے فاتح اور پھر گورنر رہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت تک رہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی آپ کو چار سال تک مصر کا گورنر باقی رکھا پھر معزول ہو گئے، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں مصر پر بحال کر دیا۔ آپ کی احادیث صحاح ستہ میں مذکور ہیں۔ ۴۳ھ میں نوے (۹۰) سال کی عمر میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: الاستیعاب، ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ۔ عنہ علامہ ولی الدین خطیب: مشکوۃ المصابیح کے ذیل میں الکمال فی اسماء الرجال، ترجمہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما ۲۷ سال قبل ہجرت مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، بہت بڑے عابد، عالم، فقیہ اور محدث تھے، اپنے والد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ سات سال بعد مدینہ منورہ ہجرت کی۔ مدینہ منورہ میں ہی تعلیم پائی، بعض غزوات میں شرکت کی سعادت بھی پائی۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث "الصادقہ" کے عنوان سے اکٹھا کیا اور فرمایا کرتے تھے: یہ مجھے دنیا کی ہر شے سے عزیز ہے۔ آپ نے سریانی زبان بھی سیکھ رکھی تھی تاکہ بوقت ضرورت کام کر سکیں۔ آپ نے "مغازی" پر ایک صحیفہ بھی تحریر کیا آپ نے ۶۳ھ میں وفات پائی۔ (ابن اثیر رحمہ اللہ: اسد الغابۃ، ۳/۲۳۵. ذھبی: سیر النبلاء، ۳/۵٤، ٦٠. ابن سعد: طبقات، ٤/٢، ٨، ٩ ص ١٨٩)

سے پیٹا، اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے بیٹے سمیت مدینہ بلوایا اور ان کی موجودگی میں مصری کو حکم دیا کہ وہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنا بدلہ لے، عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیکھ رہے تھے اور ان کا بیٹا مصری کے ہاتھ سے پٹ رہا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

مذکم تعبد تم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا۔ [۱]

ترجمہ: تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا:

یاامیر المؤمنین لم اعلم ولم یأتینی۔ [۲]

ترجمہ: اے امیر المؤمنین! اس واقعہ کی مجھے مطلق خبر نہیں ہوئی اور نہ یہ مصری میرے پاس آیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تمام عمال (گورنروں) کو موسم حج میں بلایا اور پھر تمام لوگوں کو جمع کر کے تقریر فرمائی کہ میں نے ان "عمال" کو اس لیے بلایا ہے کہ یہ تمہاری جان، تمہارے مال اور تمہاری آبرو کے محافظ ہیں نہ کہ مصیبت و تکلیف پہنچانے کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے ان میں سے اگر کسی نے بھی کوئی ظلم کیا ہو اور کوئی داد رسی کا خواہاں ہے تو کھڑا ہو کر کہے تاکہ داد رسی کی جائے یہ سن کر صرف ایک شخص کھڑا ہوا کہ فلاں عامل (گورنر) نے بلاوجہ میرے سو کوڑے مارے اور مجھ کو ستایا، تحقیقِ حال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے شخص! تو بر سر عام اس گورنر کے کوڑے لگا اور اس سے

---

(۱) سیوطی، حافظ جلال الدین: حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاھرۃ، مطبوعہ مصر، ۱/۲

(۲) حوالہ بالا

اپنا انتقام لے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر مصر نے یہ دیکھا تو کہا کہ آپ ایسا نہ کریں ورنہ عاملین میں عام بد دلی پیدا ہو جائے گی اور آئندہ کے لیے یہ دستور بن جائے گا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ألا أقيده منه؟ وقد رأيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقيد من نفسه. قم فاستقد.[1]

ترجمہ: میں کس لیے اس سے بدلہ دلا کر انصاف نہ کروں جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی ذات اقدس کو بھی بدلہ کے لیے پیش فرما دیتے تھے، اے شخص کھڑا ہو اور اپنا بدلہ لے۔

تب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا آپ اجازت دیں تو میں اس مظلوم سے بات کر لوں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت دے دی تو عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص کو اس بات پر راضی کر لیا کہ ایک کوڑے کے بدلے میں دو دینار قبول کر لے اور اس طرح دو سو دینار دیت دے کر عامل کو چھٹکارا دلایا۔[2]

اس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غزوہ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک تیر سے مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے۔ سواد بن غزیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[3] صف سے کچھ الگ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوکا دے کر فرمایا سواد! برابر کھڑے

---

(۱) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب فى تقبيل السواد واختيار الولاة لهم والتقدم اليهم

(۲) ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعه بيروت، ۱۴۱۸ھ، ص ۲۲۳.

(۳) حضرت سواد بن غزیہ بن وہب بن بلیّ بن عمرو بن الحاف بن قضاعۃ انصاری بدری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ آپ نے بدر کے علاوہ بھی تمام غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ آپ کے خاندان کے افراد ایلیاء (شام) میں آباد تھے۔ (ابن هشام: السيرة النبوية. طبقات ابن سعد: ج ۳، اصحاب بدر، تذکرہ سواد بن غزیہ رضی اللّٰہ عنہ)

ہو۔

فقال: یا رسول اللّٰہ! أوجعتنی وقد بعثك اللّٰہ بالحق والعدل، فاقدنی. فکشف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن بطنه فقال: استقد. قال: فاعتنقه فقبل بطنه الخ.[1]

ترجمہ: سواد نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے مجھ کو تکلیف دی حالانکہ اللہ نے آپ کو حق و انصاف کے لیے مبعوث کیا ہے۔ پس آپ اجازت دیجئے کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلہ لوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اپنا بطن مبارک کھول دیا اور فرمایا: سواد اپنا بدلہ ضرور لو، فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے سے چمٹ گئے اور بطن مبارک کو چوم لیا۔

خلیفہ اور رعایا حقِ معیشت میں برابر:

عدل و انصاف میں مساوات سے متعلق اسلامی خلافت کے سینکڑوں واقعات میں سے نمونہ کے طور پر صرف یہ دو واقعے نقل کیے ہیں، اب معاشی شعبۂ حیات کے چند واقعات بھی ملاحظہ ہوں۔

(۱) عن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها قالت: لما استخلف ابو بکر رضی اللّٰہ عنه قال: لقد علم قومی ان حرفتی لم تکن تعجز عن مؤنة اهلی وشغلت بأمر المسلمین فیأکل آل ابی

---

(۱) ابن کثیر، عماد الدین: البدایة والنهایة، جلد ۳، تذکرہ غزوہ بدر. ابن هشام: السیرة النبویة، جلد ۱ مکتبة الکلیات الازهریة، غزوة بدر الکبری، بیان ضرب الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم لابن غزیة رضی اللّٰہ عنه..ابن سعد رحمہ اللہ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت سواد رضی اللہ عنہ نے کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلہ کا مطالبہ کیا تو انصار باوفا رضی اللہ عنہم سے نہ رہا گیا، انہوں نے کہا: سواد! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلہ؟ حضرت سواد رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں پھر جب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کو انہوں نے فرطِ محبت سے چوم لیا تو عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ سے بھلا کیا بدلہ؟ بس قیامت کو میری سفارش فرمادیں۔

بکر عن هذا المال و يحترف للمسلمين فيه.[1]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا[2] فرماتی ہیں کہ جب حضرت

---

(۱) صحيح بخاری، كتاب البيوع، باب كسب الرجل- ابوعبيد: كتاب الاموال، (۱۳۵۲ھ) ص ۲٦٦.

بعض مؤرخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ پہلے پہل تو وہ بیت المال سے کچھ لینے ہی کے روادار نہ تھے جب بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ——جو ان کے رفقاء کار ہی تھے—— کے کہنے سننے پر آمادہ ہوئے تو سوال اٹھایا کہ خلیفہ کو مسلمانوں کے بیت المال سے کس قدر لینا چاہیے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جس تجویز پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے صاد فرمایا وہ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ کے الفاظ میں یہ تھی:

فقال عمر رضى الله عنه: انا والله اخبرك مالك منه. إمّا ما كان لك من ولد قد بان عنك وملك امره فسهمه كرجل من المسلمين. و إمّا ما كان عيالك وضعفة اهلك فتقوت منه بالمعروف قوت اهلك. فقال: يا عمر! انى لأخشى أن لا يحل لى ان اطعم عيالى من فئ المسلمين، فقال عمر رضى الله عنه: يا خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم: انك قد شغلت بهذا الامر عن ان تكسب لعيالك. (ابن قتيبه: الامامة والسياسة، ج ۱، مطبع مصطفى محمد، قاهرة)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ بیت المال سے کس قدر لے سکتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں سے جو کوئی آپ سے الگ ہو کر اپنے معاملات کا خود نگہبان بن چکا ہے، اس کے لیے تو بیت المال سے اتنا ہی حصہ ہو گا، جتنا مسلمانوں کے ایک عام شخص کا۔ البتہ جو آپ کے کنبہ کا حصہ ہیں اور جو اپنی کفالت کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے تو آپ ان کمزوروں سمیت اپنے کنبہ کی کفالت دستور کے مطابق بیت المال سے کر سکتے ہیں۔ (یہ سن کر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اے عمر! مجھے ڈر ہے کہ میرے لیے مسلمانوں کے مال فئ سے اپنے اہل و عیال کی کفالت کرنا جائز نہ ہو گا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! آپ کا سارا وقت اس خلافت کے کام میں مشغول ہو کر رہ گیا ہے اب آپ اپنے اہل و عیال (کی کفالت) کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۲ سال کچھ ماہ بیت المال سے کفالتی وظیفہ (Maintenance Allowance) لیتے رہے، مگر دل مطمئن نہ تھا تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے بیت المال سے کل آٹھ ہزار درہم لیے ہیں۔ مرتے وقت وصیت فرمادی کہ یہ رقم میرے مرنے کے بعد بیت المال میں داخل کرادی جائے۔ (حوالہ بالا: ص ۱۹)

(۲) عائشہ ام المؤمنین عائشہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہما (۵۸ھ) اپنے والدین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئیں، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل ہی ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بعد آپ کو شرف زوجیت سے نوازا۔ نبی کریم

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے خطبہ میں کہا: یہ بات میری قوم بخوبی جانتی ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل و عیال کی کفالت سے عاجز نہیں ہے، مگر اب میں مسلمانوں کے معاملات (خلافت) میں مشغول کر دیا گیا ہوں۔ لہٰذا اب ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے اہل و عیال کی "قوت لا یموت" بیت المال سے ملے گی اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کی خدمت انجام دے گا۔

❷ وكان عمر يرزق العامل بحسب حاجته و بلده.[1]

ترجمہ: اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ہر گورنر کو) اس کی ضروریات اور مقیم شہر کے پیشِ نظر مشاہرہ دیا کرتے تھے۔

❸ جمع عمر رضی اللّٰه عنه المسلمين لأوّل عهده وقال: ما يحل للوالى من هذا المال؟ فقالوا جميعا: امّا الخاصة فقوته وقوت عياله، لاوكس ولا شطط، وكسوتهم وكسوته للشتاء

صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی اور اہلی زندگی سے متعلق اکثر روایات آپ سے مروی ہیں۔ آپ کی مسند دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) احادیث پر مشتمل ہے جن میں سے ۱۷۴ متفق علیہ، ۱۵۴ کو امام بخاری رحمہ اللہ اور ۱۶۸ کو امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا۔ احکام شریعت کا بڑا حصہ آپ سے مروی ہے۔ ہشام رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بڑھ کر آیات قرآنیہ کے شان نزول، فرائض، سنن، شعر، ایام عرب، قضاء، طب کے مسائل میں عالم نہیں دیکھا۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بڑھ کر امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کوئی خاتون بلکہ امم سابقہ میں کوئی خاتون علم و فضل میں نہیں ہوگی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ لکھنا بھی جانتی تھیں۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اپنے مشکل مسائل کے حل کے لیے آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کی سخاوت اور بخشش ضرب المثل تھی۔ جوڑ جوڑ کر رکھنا ان کے معاشی مسلک کے خلاف تھا، اکثر فاقوں سے نبھاہو تا تھا آپ کے راویوں میں زیاد بن ابی سفیان، عروۃ ابن زبیر اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: اسد الغابة: ٥/٥٠٤. الاصابة: ٤/٣٦١. محمد مصطفى الاعظمى: دراسات فى الحديث النبوى و تاريخ تدوينه، تذكرة ام المؤمنين عائشه رضى الله عنها)

(۱) كرد على محمد: الاسلام والحضارة العربية، ۱۳۱/۲

والصيف ودابتان إلى جهاده وحوائجه وصلوته وحجه وعمرته. والقسم بالسوية.[1]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا خلیفہ کے لیے اس (بیت المال) سے کس قدر لینا

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۲۸

ایک دوسرے مقام پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے لیے بیت المال سے جو حصہ ہو سکتا تھا اس کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا:

انا اخبركم بما استحل منه. يحل لي حلتان، حلة في الشتاء وحلة في القيظ، وما أحجّ عليه واعتمر من الظهر، وقوتي وقوت اهلي كقوت رجل قريش، ليس بأغناهم ولا بأفقرهم. ثم انا بعد رجل من المسلمين يصيبني واصابهم. (ابن سعد: طبقات ج ۳، مطبوع بيروت، ١٤١٨ھ، ١٩٩٧ء، تذكرة عمر بن الخطاب رضي الله عنه. ابوعبيد: كتاب الاموال، مطبوعة قاهرة ۲، ۱۳۵ھ، باب ١٤. محمد حسين هيكل: الفاروق عمر (رضي الله عنه) ج ۲ مطبوعه قاهرة)

ترجمہ: میں آپ حضرات کو اس حصہ یا مقدار سے آگاہ کرتا ہوں جو میرے لیے اس (بیت المال) سے لینا جائز ہو گا، کپڑوں کا ایک جوڑا گرمیوں کے لیے اور ایک سردیوں کے لیے، ایک سواری حج اور عمرہ کے لیے، اور میری اور میرے اہل و عیال کی روزی جو ایک متوسط درجہ کے قریشی ـــــ جو نہ ان کا سب سے امیر اور نہ سب سے فقیر ـــــ کے برابر ہو۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کی جماعت کا ایک فرد ہی تو ہوں جیسا (اموال فئ سے حصہ) انہیں ملے گا، ویسا مجھے

خلیفہ سوئم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کریم نے دنیوی مال و دولت اور ثروت و صولت سے مالا مال کر رکھا تھا لہٰذا انہیں مسلمانوں کے بیت المال سے کسی تنخواہ یا الاؤنس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (محمد بن يحيى: التمهيد والبيان في مقتل الشهيد عثمان (رضي الله عنه) بيروت ١٩٦٤ء، ص ٩٨، ٩٩)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ صرف اپنے عام مسلمانوں کی طرح مقررہ وظیفہ سے معاش چلاتے تھے اور مسلمانوں کے بیت المال سے کوئی تنخواہ نہیں لیا کرتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق انہوں نے بیت المال سے سوتی جبہ اور ایک جوڑا کپڑوں کا لیا اور بس۔ (ابوعبيد قاسم بن سلام هروي رحمه الله: كتاب الاموال، مطبوعه قاهره، ١٩٣٥ء، ١٣٥٣ھ، ص ٦٦٨، ٦٦٩)

اسی طرح اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی بیت المال سے کوئی تنخواہ نہیں لیا کرتے تھے۔ (ابن عبدالحكيم: سيرة عمر بن عبدالعزيز رحمه الله، مطبوعه دمشق: ١٩٦٦ء، ص ٤٦)

حلال ہے؟ سب نے بالاتفاق کہا: اس کو صرف اپنی ضروریات اور اپنے عیال کی ضروریات کے لیے قوت لایموت لینا چاہیے جس میں کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے۔ اور اپنے لیے اور اپنے عیال کے لیے سردی اور گرمی کے کپڑے اور جہاد، روزانہ کی ضرورت نماز، حج اور عمرہ کے لیے دو سواری کے جانور اور مال غنیمت وغیرہ میں سب مسلمانوں کے برابر اس کا حصہ اور بس۔

۴ قال عمر رضی اللّٰہ عنہ: انما أنا ومالكم كولى اليتيم إن استغنت استغففت و إن افتقرت أكلت بالمعروف.[۱]

(۱) حوالہ بالا: ۱۲۸/۲. ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعہ بیروت، ۱٤۱۸ھ/۱۹۹۷ء: ص ۲۰۹

آپ مسلمانوں کے مال کے بارے میں کتنے فکر مند تھے اور کس درجہ امین تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ بیمار پڑ گئے تو سمجھداروں نے شہد استعمال کرنے کا مشورہ دیا، گھر میں تھا نہیں البتہ بیت المال میں موجود تھا، مگر مسلمانوں سے اجازت لیے بغیر استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ نماز کے وقت مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام گئے، حاضرین سے کہا: اگر اجازت دیں تو تھوڑا سا شہد استعمال کر لوں۔ (علي المتقي: كنز العمال، ٣٥٤/٦. ابن سعد: طبقات، ج ٣، اصحاب بدر، تذکرۃ عمرؓ رضی اللّٰہ عنہ)

ایک دفعہ مال غنیمت آیا۔ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا —— جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی بھی تھیں —— نے حاضر ہو کر کہا: امیر المؤمنین! اس میں سے میرا حصہ بھی دیجیے۔ میں ذوالقربی میں سے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بیٹی! تمہارا حق تو میرے خاص مال میں ہے جبکہ یہ غنیمت (تو مسلمانوں) کا مال ہے۔ بے چاری چپ سادھے واپس تشریف لے گئیں۔ (احمد بن حنبل رحمہ اللہ: مسند، ترجمہ (وروایات) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ترجمہ و روایات حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا)

علامہ شبلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: شام کی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قیصر روم سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے اور خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک دفعہ قیصر روم کی اہلیہ کو چند شیشیاں عطر کی روانہ فرمائیں۔ اس خاتون نے انہی شیشیوں میں جواہرات بھر کر اسی قاصد کے ہاتھ واپس کر دیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: میں نے مانا کہ عطر اور شیشیاں تمہاری تھیں، مگر لے کر تو سرکاری ہرکارہ گیا تھا، جس (کی تنخواہ وغیرہ) کے اخراجات (مسلمانوں کی) عام آمدن سے کیے جاتے ہیں۔ بس اہلیہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے وہ جواہرات لے کر =

بیت المال میں داخل کر دیئے، اور انہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ معاوضہ (اپنے پاس سے دے کر) راضی کر دیا۔ (شبلی نعمانی: الفاروق، ج ۲ عنوان: بیت المال کا خیال)

غالباً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اس عمل سے رہتی دنیا تک کے حکمرانوں کے لیے یہ قاعدہ چھوڑنا چاہتے تھے کہ اصحاب اقتدار اور ان قریبی لواحقین کو ان کے دور اقتدار میں ملنے والے تحائف ان کے ذاتی نہیں سرکاری عہدہ اور اقتداری شان کی وجہ سے ہوتے ہیں، لہٰذا یہ تحائف ان کے نہیں بلکہ اس ملک کے خزانہ کی ملکیت ہوں گے جس پر وہ اقتدار میں ہیں۔ (واللہ اعلم)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس طرز عمل کا آغاز اپنی ذات سے کیا تھا وہ اس طرز عمل کو اپنے تمام ساتھیوں اور مسلمانوں پر لاگو کرنا چاہتے تھے۔ اس طرز عمل کا مقصد مسلمانوں کے مال کی حفاظت اور اسے اس کے صحیح حقداروں تک پہنچانا تھا۔ اس مقصد کی راہ میں آپ کسی بڑی سے بڑی قدر آور شخصیت (Towering Personality) سے بھی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار بیت المال سے ایسے قبائلی سرداروں کو وظائف دینا تھے جن کے قبائلی لوگ بھوک اور افلاس کا شکار تھے، ایسے قبائلی سرداروں کا ایک گروہ یمن سے آیا جن کے ساتھ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں وظیفہ میں رقم نہ دی غالباً وہ معاشی طور پر خوشحال تھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں بیت المال سے مدد کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ پورا واقعہ اپنی زبانی سنایا ہے، آپ بھی سنئے۔

أتيت عمر في أناس من قومي فجعل عمر يفرض الرجل من طيء في الفين و يعرض عني. قال: فاستقبلته فأعرض عني، ثم أتيت من حيال وجهه فأعرض عني. قال: فاستقبلته فأعرض عني. قال: قلت: يا امير المؤمنين! أتعرفني؟ قال: فضحك ثم قال: والله أني أعرفك. آمنت اذا كفروا، وأقبلت إذا أدبروا، ووفيت إذا غدروا وان اول صدقة بيضت وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم ووجوه اصحابه صدقة طيء حيث جئت بها رسول الله صلى الله عليه وسلم. ثم اخذ يعتذر له، ثم قال: أنما أعطيته لأقوام أجحفت بهم الفاقة وهم سادات عشائر هم لما ينوب من الحتوف. قال عدي: فلا ابالي اذاً. (اماماحمد بن حنبل رحمه الله: مسند، مرويات عدي بن حاتم رضي الله عنه)

ترجمہ: میں اپنی قوم کے لوگوں کے ہمراہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبیلہ طیٔ کے بعض افراد کے لیے دو ہزار (۲۰۰۰) تک وظیفہ مقرر فرمایا مگر مجھے نظر انداز کر دیا۔ میں سیدھا آپ کے سامنے آکر کھڑا ہوا مگر آپ نے توجہ نہ کی، میں دوبارہ آپ کے سامنے آیا مگر آپ نے نگاہ پھیر لی۔ (جب میں تمام حیلے آزما چکا تو) بالآخر میں نے عرض کیا: امیرالمؤمنین! کیا مجھے آپ پہچانتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے تو (خوب کھلکھلا کر) ہنسے (پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اٹھ بیٹھے اور) فرمایا: اللہ کریم کی قسم! اے عدی! میں تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تم اس وقت ایمان لائے، جب اوروں نے انکار کر دیا، تم (آزمائش اور مشکل کے وقت) آگے بڑھے، جب کہ اوروں کے پاؤں ڈگمگا گئے تم نے اپنی وفا کو نبھایا

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھ کو تمہارے مال (بیت المال) میں اتنا ہی حق ہے جس قدر کہ یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں رفاہیت میں ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق کھانے کے لیے لوں گا۔

اور یہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام خوشحالی کے لیے یہ جذبات رکھتے اور ان کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔

۵ إمّا واللّٰه لئن بقيت لأرامل أهل العراق لأدَعَنّهُنّ لا يفتقرن الى امير بعدی.[۱]

ترجمہ: قسم بخدا اگر میں زندہ رہا تو اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسا کر جاؤں گا کہ میرے بعد پھر وہ کسی امیر کے پاس حاجت مند بن کر پیش نہ ہوں۔

جبکہ اوروں نے دھوکہ دیا۔ عدی! مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ زکاۃ کی پہلی رقم جسے دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے (مفلوک الحال) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے تھے، وہ (تمہارے قبیلے) بنو طائی کی زکاۃ تھی جسے لے کر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پھر آپ نے (حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے) اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: یہ وظائف میں ان لوگوں کے لیے مقرر کر رہا ہوں جو فاقہ زدہ ہیں گو وہ اپنے قبائل کے سردار ہیں مگر ہلاکت زدہ ہیں۔ سن کر (کریم النفس) عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا مکالمہ دوبارہ بلکہ بار بار پڑھیے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امانت داری، احتیاط پسندی اور امت مسلمہ کے مال سے ہمدردی کا اندازہ کرتے جائیے جس حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرایا ایسے عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آدمی اپنا سارا گھر بھی دے دے بلکہ خود ان کا خادم بن جائے تب بھی ان کی اسلام کی خاطر قربانیوں کا صلہ نہیں دیا جا سکتا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر بیت المال کو ذاتی خزانہ سمجھتے تو شاید سارا حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیتے مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے مال کے امین تھے اور جس قسم کے افراد کو یہ مال دینا تھا، حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس قسم (Category) میں نہیں آتے تھے۔

(۱) ابو یوسف: كتاب الخراج، مطبع سلفية، قاهرة، ١٣٤٦ھ، ص ٣٧

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ [۱] خلیفہ ہونے سے پہلے بڑے شاہانہ انداز میں رہتے تھے لیکن جب خلیفہ بنائے گئے تو یہ حالت تھی:

❻ ثم رأيته بعد أن ولي الخلافة يمشي مشية الرهبان. [۲]

---

(۱) عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ حضرت عمر بن عبد العزیز بن مروان بن حکم —— رحمہ اللہ۔ ۶۱ھ میں حضرت ام عاصم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوتی کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے، بچپن اور جوانی شاہانہ گزری مگر خلیفہ بنے تو بروایت امام ابو یوسف رحمہ اللہ: پھر میں نے انہیں دیکھا کہ ان کی حالت درویشوں جیسی ہو گئی۔ تعلیم مشہور محدث امام صالح بن کیسان رحمہ اللہ سے حاصل کی۔ تبحر علمی اور تقوی کا یہ عالم کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کہا کرتے تھے میں تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے صرف عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے قول کو حجت مانتا ہوں۔ آپ نہایت زاہد، عبادت گزار، خادم خلق اور اسلام اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اور سچے خیر خواہ تھے۔ آپ کا دور خلافت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) امن، خوشحالی اور انصاف کا دور تھا۔ غریب رعایا کی غصب شدہ جائیدادیں واپس کرائیں، اس پر ناجائز محصولات ختم کر دیئے، شرائع اسلام کو مضبوط کیا۔ تدوین حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک کام آپ نے حضرت سعد بن ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ایک روایت کے مطابق حضرت ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جمہور علماء اسلام کی رائے کے مطابق حضرت امام زہری محمد بن شہاب رحمہ اللہ، کو ترغیب دے کر شروع کرایا۔ رجب ۱۰۱ھ کو اپنے انتقال فرمایا۔ ایک روایت کے مطابق آپ کو کسی کم قسمت نے زہر دیا، مگر پتہ چلنے پر آپ نے اسے معاف فرمایا۔ اللہ کریم ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ (برائے تفصیل دیکھیں: شبلی نعمانی: سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ج ۱ مقدمہ. کتب تاریخ اسلام)

(۲) حوالہ بالا. مقدمہ

خلیفہ کا منصب قبول کرنے کے بعد گھر تشریف لے گئے تو اپنی اہلیہ جو خلیفہ عبد الملک کی بیٹی تھیں —— سے فرمایا: یا میرے ساتھ رہو یا اس قیمتی جوڑا کے ساتھ جو تمہارے والد رحمہ اللہ نے کئی دینار خرچ کر کے بنوایا تھا۔ اس سعادت مند خاتون نے کہا: آپ کو چھوڑ کر میں نے اس جوڑے کا کرنا ہی کیا؟ آپ نے اسے مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کرا دیا۔ آپ کی بیعت کرنے والوں نے آپ پر بہت زیادہ رش کیا اور لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے۔ اسی بیچ بچاؤ میں آپ کے صاحبزادہ کی قمیض پھٹ گئی فرمایا: بچہ! اس میں پیوند لگوا لو۔ اب سے زیادہ تم کبھی محتاج نہ تھے۔ (ابن قتیبہ: الامامۃ والسیاسۃ: ۲/۹۵)

مسلمہ بن عبد الملک کہتے ہیں: میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کی قمیض نہایت بوسیدہ اور میلی تھی۔ میں نے ان کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبد الملک رحمہ اللہ سے عرض کیا: آپ ان کی قمیض دھو کیوں نہیں دیتیں؟ محترمہ خاتون رحمہا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: اللہ کریم کی قسم! ان کے پاس اس کے علاوہ قمیض ہے ہی نہیں۔ (علامہ سیوطی رحمہ اللہ: تاریخ الخلفاء، عہد بنی امیہ، تذکرہ عمر بن عبد العزیز بن مروان رحمہ اللہ)

=

ترجمہ: پھر میں نے خلافت کے بعد ان (عمر بن عبدالعزیز) کو دیکھا تو ان کی حالت راہبوں کی سی ہو گئی۔

یعنی موٹا پہنتے اور موٹا کھاتے تھے اور یہ طبعاً نہ تھا بلکہ خلافتِ راشدہ کے خصوصی امتیاز کے پیشِ نظر تھا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے یہ کہا:

إن أردت أن تلحق صاحبك فأرقع القميص ونكس الازار واخصف النعل وارقع الخف وقصر الأمل وكل دون الشبع.[1]

ابو امیہ الخصی ـــــ جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے غلام تھے ـــــ کہتے ہیں: میں ایک دن اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوا تو میری دال کے ساتھ تواضع کی گئی۔ میں نے آپ کی اہلیہ محترمہ رحمہا اللہ تعالیٰ سے بے تکلف عرض کیا: ہر روز دال؟ تو کہنے لگیں! بیٹے! یہی دال آپ کے آقا حضرت امیر المؤمنین رحمہ اللہ کا کھانا بھی ہے۔ (حوالا بالا)

حضرت عمرو بن مہاجر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

كانت نفقة عمر بن عبدالعزيز كل يوم درهمين. (حوالا بالا)

ترجمہ: حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا روزانہ کا خرچ صرف دو درہم تھا۔

(۱) حواله بالا. مقدمه

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اس مخلصانہ اور بصیرت افروز نصیحت پر کیا اور کیسے عمل کیا؟ اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کس سادگی سے گزری، اس کا ایک اندازہ آپ کے اس سفر میں آپ کے لباس، خوراک اور سواری سے کیا جا سکتا ہے جو آپ نے بیت المقدس کی فتح کے لیے کیا۔ یہ ایسا موقع تھا جب فاتح کا شاہانہ کروفر کے ساتھ چلنا، زرق برق لباس زیب تن کرنا، بہترین سواری پر اتراتے ہوئے داخل ہونا گویا حق سمجھا جاتا ہے خواہ اپنے مقام پر اور عام حالات میں وہ کتنا ہی سادہ ہو مگر شہر یا ملک کو فتح کرنے یا کر کے داخل ہونا اس شان و بان کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــــ جنہوں نے عظمت اور ذریعہ عظمت اور کامرانی اور وسیلہ کامرانی کا صحیح ادراک کر لیا تھا ـــــ کے لیے یہ تقاضا غیر ضروری بلکہ فضول تھا۔ مؤرخین اسلام نے فاتح عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فاتحانہ سفر کو مفصل بیان کیا ہے۔ آئیے میرے ساتھ مل کر آپ بھی پڑھ لیں۔ اور اگر پڑھنے کی عادت نہیں رہی تو چلیے آپ سنیں میں پڑھ رہا ہوں۔

علامہ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ نے آپ کے اس فاتحانہ سفر کی روئیداد اس طرح بیان کی ہے:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ براستہ ایلیا جابیہ تشریف لائے آپ ایک سفید اونٹ پر سوار تھے۔ دھوپ ان کی پیشانی پر پڑ رہی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی نہ پگڑی۔ (اونٹ پر اس طرح سوار تھے کہ) آپ کے پاؤں بغیر رکاب کے کجاوہ (ہودج) کے دونوں طرف لٹک رہے تھے۔ بس اونٹ پر صرف ایک کمبل ڈال رکھا تھا۔ جب اترتے اسے بستر بناتے اور جب سوار ہوتے تو ہودج پر ڈال (کر پلان کا کام) لیتے۔ موٹے کھدر کی قمیص زیب تن تھی، جو بوسیدہ ہونے کی وجہ سے دونوں بازوؤں سے پھٹ گئی تھی۔ (جابیہ) پہنچتے ہی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: قوم کے بڑے کو بلاؤ۔ لوگوں نے پادری کو بلایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے کہا: میری یہ قمیص دھو دھلوا کر سلوا دو اور کوئی کپڑا یا کرتہ مجھے (اتنی دیر کے لیے) مستعار دے دو۔ وہ پادری اک کتان کا کرتہ لایا۔ آپ نے پوچھا: یہ کونسا کپڑا ہے؟ پادری نے اس کپڑے کی نوعیت بتائی، آپ نے اسے اپنی قمیص اتار کر دی، وہ دھو کر اور سی کر لایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی قمیص پہن لی اور اس کا (کتان کا) کرتہ اتار دیا۔ پادری نے (سمجھدار اور خیر خواہ بن کر نصیحت کے انداز میں) عرض کیا: آپ عرب کے حکمران ہیں۔ آپ کے لیے اونٹ اس ملک میں سواری کے شایان شان نہیں۔ اگر آپ (یہ گھسا پھٹا) لباس بدل لیں اور (اونٹ کی بجائے) گھوڑے پر سوار ہو جائیں تو رومیوں کے دلوں میں آپ کی قدر و منزلت (زیادہ) ہو جاتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس (کا خیر خواہانہ مشورہ سن کر اس) کو (عاجزانہ مگر غیرت مندانہ) جواب دیا: ہم وہ قوم ہیں جن کے لیے اللہ کریم نے (صرف اور صرف) اسلام (ہی) کو ذریعہ عزت بنایا ہے، لہٰذا ہم اسلام کے سوا کسی اور وسیلہ کو ذریعہ عزت نہیں بنانا چاہتے۔ پھر ایک عمدہ قسم کا گھوڑا لایا گیا، جس پر بغیر پلان (کاٹھی اور زین) کے معمولی سا کپڑا تھا۔ مگر اس پر سوار ہوتے ہی (جب وہ اتراتا ہو چلا ہو گا) آپ نے فرمایا: اس کو روکو! میں نے کبھی پہلے شیطان پر سوار ہوتے کسی کو نہیں دیکھا تھا، اترے آپ کا اونٹ لایا گیا اور آپ اس پر سوار ہوئے۔ (ابن کثیر: البدایة والنهایة، مکتبة المعارف، قاهرة، ۱۹۶۶ء: ۷/۵۹، ۶۰)

اس سفر میں ایک مقام پر کمانڈر اسلامی فوج حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! یہاں کے لوگ آپ کی اس سادہ حالت کو دیکھ کر تعجب کریں گے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مخلصانہ مشورہ سنا تو رنجیدہ ہو کر) فرمایا: کاش! ابو عبیدہ یہ بات تمہارے سوا کسی اور نے کہی ہوتی۔ تمہیں معلوم نہیں ہم سے زیادہ ذلیل، حقیر اور کم تر قوم کوئی نہ تھی مگر اللہ کریم نے ہمیں اسلام کے ذریعہ عزت سے نوازا۔ سن لو (ابو عبیدہ!) اگر تم اسلام کے سوا کسی اور ذریعہ کو وسیلہ عزت بناؤ گے تو اللہ کریم (ناراض ہو کر) تمہیں رسوا کر دیں گے۔ (حوالا بالا)

علامہ طبری رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس سفر کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سنئے! حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ سے جابیہ کے لیے ایک اونٹ پر روانہ ہوئے۔ (اونٹ کے کجاوہ کے ساتھ) دو تھیلے (لٹک رہے تھے) ایک میں ستو اور دوسرے میں کھجوریں تھیں۔ (کجاوے کے) سامنے پانی کا مشکیزہ تھا اور پیچھے توشہ دان (بندھا ہوا) تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک جماعت آپ کے ہمراہ تھی، جب کھانے کا وقت ہوتا آپ توشہ دان کھول دیتے اور تمام حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم مل کر کھانا تناول

ترجمہ: اگر تم چاہتے ہو کہ تم کو اپنے صاحب (ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی رفاقت نصیب ہو تو کرتے پر پیوند ہوں، آزار خستہ ہو، جوتیوں پر پیوند ہوں، موزے پھٹے پرانے ہوں، امیدیں کوتاہ ہو جائیں اور کھانا پیٹ بھر کر نہ کھایا جائے۔

❽ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ میں تاخیر سے تشریف لائے اور آکر یہ عذر پیش کیا کہ میرے پاس ایک جوڑا کپڑوں کا ہے اس کو دھو کر خشک

فرماتے۔ سفر میں درس و تدریس (تعلیم و تبلیغ) کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کو جہاں ایسے مسلمان ملے جو (مبادیات) دین سے ناواقف ہوتے آپ انہیں دین کی باتیں بتاتے۔

جب شام قریب آیا تو آپ کو چند سوار نظر آئے جنہیں حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ خبر گیری کے لیے بھیجا تھا۔ جب بیت المقدس میں داخلہ کا وقت آیا تو آپ نے جو کرتہ پہن رکھا تھا اس میں چودہ پیوند تھے جن میں بعض چمڑا کے بھی تھے ـــــ سواری کے لیے ایک عمدہ گھوڑا لایا، جب آپ سوار ہوئے اور وہ اٹھکیلیاں کرتا چلا تو آپ فوراً اترے اور ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا: مسلمانو! مجھے معاف کر دینا قریب تھا کہ تمہارا امیر اس متکبرانہ انداز سے ہلاک ہو جاتا، اس نے میرے دل میں عجب پیدا کر دیا تھا، اس کے بعد (مسلمانوں کے اصرار پر جو نیا جوڑا پہنا تھا اتار دیا) پیوند زدہ کرتہ پہنا (اور بیت المقدس داخل ہوئے)۔ (طبری: تاریخ الامم والملوك، ٤/٢٠٣، ٢٠٤)

حضرت علامہ شبلی رحمہ اللہ کے مطابق سواری کے جانور کے سم گھس کر بیکار ہو گئے، وہ رک رک کر چلنے لگا۔ آپ اترے اور ایک ترکی نسل کے عمدہ گھوڑا پر سوار ہوئے۔ وہ ایل کرنے لگا تو فرمایا: کم بخت یہ غرور کی چال تو نے کہاں سے سیکھی؟ یہ کہہ کر اترے اور پیدل چلنے لگے۔ بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابوعبیدہ (بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور سرداران فوج استقبال کے لیے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لباس اور ساز و سامان جس معمولی نوعیت کا تھا اسے دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی کیا کہیں گے؟ چنانچہ ترکی گھوڑا اور قیمتی پوشاک حاضر کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لیے بس وہی کافی ہے۔ الفاروق، حصہ اول، بیان (فتح) بیت المقدس ١٦ھ، ٦٣٧ء)

الغرض یہ اس خلیفہ کے سفر کی شان ہے جس کے اقتدار کا پھریرا بحیرا بیط متوسط (Mediterranean Sea) سے لے کر مشرق میں چین، افغانستان تک، مغرب میں تیونس تک، شمال میں بحر قزوین (Caspian Sea) تک اور جنوب میں حبشہ کی حدود پار تک لہراتا تھا۔ جس کے رعب سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں لرزہ طاری رہتا تھا۔ مؤرخین کے مطابق جب اس خلیفہ نے اس سفر کا آغاز کیا اور جہاں جہاں یہ خبر پہنچتی زمین دہل دہل جاتی تھی۔

کرنے میں دیر ہو گئی، حضرت قتادہ اور حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حالت کو دیکھا کہ ان کے قمیص میں بارہ پیوند تھے اور اکثر پیوند چمڑے کے تھے۔[1]

(۱) علی المتقی: کنز العمال، باب فضائل الفاروق رضی اللّٰہ عنه. ابن کثیر: البدایة والنهایة، ۷/۱۳٤.

یہ وہ عظمت کردار ہے جس کا اعتراف غیر مسلم مؤرخین نے بھی کیا ہے۔ مثلاً مشہور مؤرخ مستشرق (Orientalist) ڈاکٹر فلپ ہٹی (Dr Philp Hitti) نے اپنی کتاب (A Short History of the Arabs) (مختصر تاریخ العرب) میں کیا ہے۔ اس مشہور کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ "تاریخ العرب الموجز" کے عنوان سے دار العلم للملائین بیروت سے ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوا اس کے صفحات ۷۲، ۷۳ پر یہ حقائق درج ہیں۔ اور اصلی کتاب کا حوالہ ہے۔

(A Short History of the Arabs, London. 1965, PP 175- 76) اسی طرح دوسرے نہایت مشہور مستشرق سر ولیم میور (Sir William Muir) نے اس حقیقت کا اعتراف اپنی کتاب (Annals of the Early Caliphate) کے صفحہ ۲۸۳ پر کیا ہے۔

خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ــــ اور بالخصوص صدیق و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ــــ نے اپنے دور خلافت میں جس سادگی اور ایثار کو اپنا شعار بنایا اس کی تلقین اپنے ریاستی اور صوبائی گورنروں اور دیگر عہدہ داران کو بھی کی۔ اس ضمن میں حضرت خذیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت قابل توجہ ہے، جسے علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (۸۴۹ھ - ۹۱۱ء) نے نقل کیا ہے۔ آیئے ہم بھی پڑھ لیں۔

قال خذيمة بن ثابت: كان عمر إذا استعمل عاملا كتب له واشترط عليه أن: لا يركب برذونا، ولا يأكل نقيا، ولا يلبس رقيقا، ولا يغلق بابه دون ذوي الحاجات. فإن فعل فقد حلت عليه العقوبة. (سيوطی: تاريخ الخلفا، مطبوعه نور محمد كارخانه تجارت كتب، آرام باغ کراچی، تذکرہ عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه: ص ۱۲۸)

ترجمہ: حضرت خذیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی گورنر کا تقرر کرتے تو اس کو یہ حکم کر دیتے اور شرط لگا دیتے کہ وہ:

1. ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو گا۔
2. چھنے ہوئے آٹا کی روٹی نہ کھائے گا۔
3. باریک لباس نہیں پہنے گا۔
4. حاجت مندوں کے لیے اپنا دروازہ بند نہیں کرے گا۔

اور اگر وہ (ان ممنوعات میں سے کسی کو) اختیار کرے گا تو اسے سزا دی جائے گی۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی کوفہ کی بیٹھک جلوا کر اور عیاض بن

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے بعد حمد و ثنا ارشاد فرمایا:

ایها الناس! فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم. فإن أحسنت فاعینونی، وإن أسأتُ فقوّمونی. اَلصّدق أمانة والکذب خیانة. والضعیف فیکم قوی عندی حتی أرجع علیه حقه انشاء اللّٰه والقوی فیکم الضعیف حتی اخذ الحق منه انشاء اللّٰه. ولا یدع قوم جهاد فی سبیل اللّٰه إلا خذلهم اللّٰه بالزل. ولا تشیع الفاحشة فی قوم الا عمهم اللّٰه بالبلاء. اطیعونی ما اطعت اللّٰه ورسوله: فاذا عصیت اللّٰه ورسوله لا طاعة لی علیکم. قوموا الی صلوتکم رحمکم اللّٰه.(۱)

ترجمہ: لوگو! میں تم پر والی مقرر کیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرنا اور اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ (دیکھو) سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ انشاء اللہ تمہارا کمزور بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق دلا دوں، اور تمہارا قوی بھی ضعیف ہے یہاں تک کہ اس سے دوسروں کا حق واپس دلاؤں۔ (یاد رکھو) جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے اسے اللہ کریم خوار کر دیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری عام ہو جاتی ہے۔ اللہ کریم اس کی مصیبت کو بھی عام کر دیتا ہے۔

(دیکھو) اگر میں اللہ کریم اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں تو تم بھی میری اطاعت کرنا، لیکن جب اللہ کریم اور اس

غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی مصر کو اون کا موٹا لباس پہنا کر مذکورہ شرائط میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں بھی دیں۔

(۱) ابن کثیر، عماد الدین: البدایة والنهایة، ۳۰۲/۶، ۱۳۴/۷

کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں تو تم بھی میری اطاعت نہ کرنا۔ اچھا اب نماز (کی ادائیگی) کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اللہ کریم تم پر رحمت نازل فرمائے۔

اور بعض روایات میں اس طرح منقول ہے۔)

أما بعد: فأنّي قد وليت هذا الأمر، وأنا له كارهٌ، والله لوددتُ أن بعضكم كفانيه ألا وانكم إن كلفتموني أن أعمل فيكم بمثل عمل رسول الله صلى الله عليه وسلم، لم اقم به ألا و إنما انا بشر ولبست بخير من أحدكم، فراعواني فاذا رايتموني أستقمت فاتّبِعُوني، واذا رأيتموني زغت فقوّموني الخ.[1]

ترجمہ: بعد حمد و صلوٰۃ میں اس امر (امارت) کا والی ایسی حالت میں بنا دیا گیا کہ میری طبیعت اس ذمہ داری کو قبول کرنا ناپسند کرتی تھی، قسم بخدا! میری خواہش یہ ہے کہ اے کاش! تم میں سے کوئی بھی میرے بجائے اس امارت کا بوجھ اٹھالیتا اور مجھے اس ذمہ داری سے بچالیتا، واضح ہو کہ اگر تم مجھے اس پر مجبور کرو کہ میں تمہارے معاملات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح انجام دوں تو میں اس قابل نہیں کہ آپ کی مثلیت کا حق ادا کر سکوں اس لیے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں اور تم میں سے ایک معمولی فرد سے بھی بہتر نہیں ہوں، پس تم میری نگہبانی کرو۔ اگر میں راستی اختیار کروں تو میری پیروی کرو اور اگر مجھے کج رو پاؤ تو سیدھا کر دو۔

ابو رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمال کو ایک مرتبہ یہ تحریر فرمایا:

”تمام لوگوں کو اپنے نزدیک برابر سمجھو، ان میں قریب اور بعید انصاف

---

(۱) حوالہ بالا: ۳۰۱/٦

اور حق کے معاملہ میں سب یکساں ہیں، رشوت لینے اور اپنی خواہش کے تابع احکام دینے سے بچو اور اگر غصہ میں کسی سے جائز مواخذہ کرو تو حق پر قائم رہو اور دن کی ایک ساعت میں بھی حق کے خلاف نہ ہونے پائے۔"(۱)

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اہم معاملہ کو صرف زبانی پند و نصائح ہی تک محدود نہیں رکھا تھا، جب آپ کسی کو کسی صوبہ کا گورنر بناتے تو باقاعدہ اس کے تقرری نامہ (Appointment Order) پر یہ شرائط تحریر کر دی جاتی تھیں کہ وہ ترکی گھوڑا پر سوار ہوں گے نہ باریک کپڑا پہنیں گے، نہ چھنے ہوئے آٹا کی روٹی کھائیں گے، نہ دربان رکھیں گے اور اہل حاجت کے لیے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں گے، نیز تقرری کے وقت نامزد گورنر کے مالی اثاثہ جات (Financial Assets) کی فہرست تیار کی جاتی اور دوران گورنری یا سبکدوشی (Retirement) یا معزولی (Deposition) کے وقت اگر اس کے اثاثہ جات بڑھ گئے ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کا آدھا مال بیت المال میں داخل کرا دیتے۔ اور اس مقصد کے لیے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آفیسر تفتیش و تنفیذ (Investigation & Implementation) مقرر کیا۔ (علامہ بلاذری: فتوح البلدان، ص ۲۱۹. شبلی نعمانی: الفاروق، حصہ دوم، عاملوں کے مال و اسباب کی فہرست)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے شان کے صحابی تھے۔ کوفہ کے گورنر تھے، انہوں نے کوئی ڈھنگ کا مکان تعمیر کرایا، مشہور ہوا کہ انہوں نے محل (جدید اصطلاح میں بنگلہ) تعمیر کرایا ہے۔ جس میں ایک ڈیوڑھی / بیٹھک (Drawing Room) بھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سوچ کر کہ اس سے اہل حاجت کو ان (حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے ملنے میں رکاوٹ اور انتظار کی تکلیف ہوتی ہوگی، اور یوں بھی ان کے تقرر نامہ میں یہ درج تھا کہ اہل حاجت کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھیں گے مگر ڈیوڑھی کی تعمیر سے اس شرط کی خلاف ورزی ہوگئی۔ آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا کہ ڈیوڑھی (Drawing Room) میں آگ لگا دیں۔ چنانچہ اس حکم کی پوری تعمیل ہوئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فیصلہ بخوشی قبول کر لیا۔ (حوالہ بالا)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار اغنیاء صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ہوتا تھا۔ اللہ کریم نے انہیں دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ خاکم بدہن ان کی امانت و دیانت میں شک و شبہ نہ تھا۔ رشتہ میں کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے، یہ واحد عالی مرتبت انسان تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں فرمایا تھا: إرم فداك أبي و أمي۔ تیر چلائیے! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ حالانکہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق یہ ڈیوڑھی انہوں نے کوفہ کی منڈی کے کاروباری حضرات اور بیوپاریوں کے شور و شعب سے بچنے کے لیے بنائی تھی ذوق تعمیر کی تسکین کے لیے نہیں، مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغیر وجہ تعمیر دریافت کیے صرف محتاجوں کی ضرورت میں رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اسے آگ لگوا دی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعایا کی زندگی کو خوش حال بنانے اور ان کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کرنے کی انتہائی خواہش کے سلسلہ میں راتوں کو تفتیش حالات کے لیے گشت کرنا ایک مشہور تاریخی حقیقت ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو بھی کافی نہیں سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ شب کا گشت تمام قلمرو میں پورے سال کیا کروں گا، کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ ہر قسم کی کوشش کے باوجود لوگوں کی بعض حاجات یقیناً پوری ہونے سے رہ جاتی ہوں گی کیونکہ عمال شاید ان کو مجھ تک نہ پہنچاتے ہوں (اور وہ (تمام محتاج لوگ) شاید مجھ تک نہیں پہنچ سکتے ہوں اس لیے میں شام کا سفر کروں گا اور وہاں دو ماہ قیام کروں گا، پھر الجزیرہ جاؤں گا اور وہاں دو ماہ ٹھہروں گا، پھر مصر کا سفر کروں گا اور ادھر بھی دو ماہ رکوں گا، پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر کوفہ کا سفر اختیار کروں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا۔ اس کے بعد بصرہ کا رخ کروں گا اور وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔

اللہ کریم کی قسم! یہ سال کتنا اچھا ہو گا مگر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے اور نہایت مدبرانہ سیاسی فیصلہ پورا نہ ہو سکا۔ [۱]

ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا:

أيها الناس! أن الله قد كلفني أن أصرف عنه الدعا. [۲]

(ابن كثير: البداية والنهاية: ۷۵/۷)

(۱) طبری، محمد بن جریر: تاريخ الامم والملوك، ج ٥، مطبعة الحسينية المصرية، على نفقة السيد محمد عبداللطيف الخطيب و شركاه، ص ۱۸

اصل عربی متن یوں ہے:

لئن عشت إن شاء الله لأسيّرن فى الرعية حولا. فأنى أعلم أن حوائج الناس تقطع دونى. أما عُمّالهم فلا يرفعونها الىّ وأمّا هم فلا يصلون إليّ. فأسير إلى الشام فاقم بها شهرين، ثم أسير إلى الجزيرة فاقم بها شهرين، ثم أسير إلى مصر فأقيم بها شهرين، ثم أسير إلى البحرين فأقيم بها شهرين، ثم أسير إلى البصرة فأقيم بها شهرين والله لنعم الحول هذا.

(۲) قواعد الأحكام فى مصالح الأنام: ۱۴۸/۱

ترجمہ: لوگو! اللہ کریم نے مجھے ذمہ دار بنادیا ہے کہ میں اس کریم کے دربار میں کی جانے والی پکاروں کو روکوں۔

ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام رحمہ اللہ شافعی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

اللہ کریم کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ سربراہ ریاست ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کو انصاف مہیا کرے اور انہیں اس بات کی ضرورت ہی نہ پڑے کہ وہ اللہ کریم سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی معاشی ضروریات و حاجات پوری کرے کہ انہیں مجبوری ہی نہ پڑے کہ وہ ایسی ضروریات کی تکمیل کے لیے اللہ پروردگار سے التجا کریں۔ (حکمرانوں کے لیے) مسلمان رعایا کے جملہ حقوق کی تکمیل کے بیان میں (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا) یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے۔[1]

اسلامی ریاست کے شہریوں ـــــ بالخصوص معاشی دکھوں کے ماروں کی معاشی پریشانیاں ختم کرنے ـــــ کا کس قدر خیال تھا؟ اس کا اندازہ آپ اس تقریر سے لگائیں جو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سن کر مدینہ منورہ میں موجود مسلمانوں کے سامنے کی۔ فتح کی خوشخبری کے بعد حاکم اور فاتح کو مزید فاتحانہ دعوؤں اور اپنی حیثیت منوانے کی باتیں کرنے کا موقع ملتا ہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں کہ عوام کے معاشی دکھوں کے مداوا اور ان کی خوشحالی کی باتیں کرتے ہیں۔ آپ بھی سن لیں:

أنّي حريص على أن لا أرى حاجة إلّاسددتها. ما أتسع بعضنا لبعض، فاذا عجز ذلك عنا تأسَّينَا فى عيشنا حتى نستوى فى الكفاف. ولو وددت أنكم علمتم من نفسى مثل الذى وقع فيها لكم، ولست معلمكم إلّا بالعمل. انى واللّٰه نست بملك

(۱) حوالہ بالا

فاستعبدکم، ولکني عبدالله، عرض علی الامانة، فإن أبیتها ورددتها علیکم و إتبعتکم حتیٰ تشبعوا فی بیوتکم وترووا سعدت بکم، و إن أنا حملتها واستعتبکم الی بیتی شقیت بکم. ففرحت قلیلا وحزنت طویلا. فبقیت لا أقال ولا أرد فاستعتب.(۱)

ترجمہ: میری یہ تمنا رہی ہے کہ کسی کی کوئی حاجت دیکھوں تو فوراً پوری کروں۔ جہاں تک ہو سکے ہم ایک دوسرے کی ضروریات کی کفالت کریں۔ جب ہم تنہا ایسا کرنے سے عاجز آجائیں تو پھر مل کر کریں۔ یہاں تک کہ ہم اپنے معیار زندگی میں برابر ہو جائیں۔ کاش! تمہیں معلوم ہو جاتا کہ تمہارے بارے میں میرے دل میں کیا ارمان مچلتے ہیں؟ مگر میں تو انہیں صرف عمل کے ذریعے ہی تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ اللہ کریم کی قسم! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنائے رکھوں۔ بلکہ میں تو محض اللہ کریم کا بندہ (غلام) ہوں جس پر خلافت کی امانت مسلط کر دی گئی ہے۔ مجھے چاہیے کہ میں اسے پورا کروں پھر اسے تمہارے واپس سپرد کر دوں، اس طرح کہ میں تمہاری ضروریات کے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم سیر ہو کر اپنے گھروں میں سو جاؤ، اس طرح میں تمہارے معاملہ میں سعادت مند ہو جاؤں، اور اگر تم اپنی ضروریات لیے میرے دروازہ پر آؤ تو میں تمہارے معاملہ میں بدبخت ہو جاؤں گا۔ پھر کیا ہو گا؟ چندے عیش کر لوں گا، مگر ایک (نہ ختم ہونے والی) مدت تک غم اور افسوس کرتا رہوں گا۔ اور میرا یہ حال ہو گا کہ نہ کچھ سنا سکوں گا نہ مجھے جواب دیا جائے گا۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

---

(۱)علامه ابن کثیر رحمه الله: البدایة والنهایة، ٤٦/٧

لو ماتت شاة على شط الفرات ضائعة ظننت ان الله سائلنی عنها یوم القیامة.[۱]

ترجمہ: اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بغیر چارہ کے مر گئی تو مجھے ڈر ہے کہ کریم قیامت کے دن مجھ سے اس بارے میں سوال کریں گے۔

کبھی فرماتے:

لو تُركت عنز جرباء إلى جانب ساقية لم تدهن لخشيت أن أسال الله عنها یوم القیامة.[۲]

ترجمہ: اگر کوئی خارش میں مبتلا بکری بھی نہر کے کنارے بغیر (علاج کے لیے تیل کی) مالش کر مر گئی تو مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن اللہ کریم مجھ سے پوچھیں گے۔)

ایک مرتبہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کسی شیریں چیز کے کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میرے پاس اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ تمہاری یہ خواہش پوری کی جا سکے، زوجہ محترمہ نے عرض کیا: اجازت دیجئے کہ بیت المال سے جو وظیفہ ہم کو ملتا ہے اس میں چند روز تک کچھ پس انداز کر کے خود کو "حلوا" کی خریداری کے قابل بنا لیں، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت دے دی جب ایک عرصۂ دراز تک پس انداز کرتے رہنے کے بعد ایک حقیر رقم زوجہ محترمہ نے پس انداز کر کے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر دی تو آپ نے وہ رقم ان سے منگائی اور بیت المال میں داخل کر دی اور فرمایا:

(۱) ابن جوزی: سیرة عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، مطبعة السعادة، قاهرة، ۱۳۴۲ھ، ص ۱۶۱

(۲) امام غزالی: التبر المسبوك: ص ۱۷

هذا يفضل عن قوتنا وأسقط نفقته بمقدار ما نقصت كل يوم وغرمه لبيت المال من ملك كان له.[1]

ترجمہ: معلوم ہوا کہ ہم اپنی قوت لایموت سے اس قدر زائد لے رہے ہیں اور یہ کہہ کر اس روز سے بقدر اس کے آذوقہ (Maintenance Allowance) میں سے کم کر دیا اور گذشتہ کے ہر دن کا حساب لگا کر مقدار زائد کو اپنی ذاتی ملکیت میں سے بطور تاوان بیت المال کو ادا کر دیا۔

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفہ بنائے گئے تو ایک روز وہ اپنے ہاتھ پر چادریں ڈالے ہوئے بازار جا رہے تھے، راہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے انہوں نے کہا: "اولی الامر" بننے کے بعد یہ تجارتی کاروبار کیسا؟ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آخر میں اہل و عیال کی معاش کیا سبیل کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آپ چلیے ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی ضروریات دیکھ کر بیت المال سے وظیفہ کی مقدار متعین کر دیں گے، چنانچہ دونوں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے، انہوں نے فرمایا: میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ آپ کو ایک عام مہاجر کو جو وظیفہ ملتا ہے وہی دیا جائے نہ زیادہ نہ کم اور گرمی جاڑے کے کپڑے۔

ففرضا له كل يوم نصف شاة وما كساه في الراس والبطن.[2]

ترجمہ: پس دونوں (عمر و ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے روزانہ خوراک میں آدھی بکری اور اس قدر لباس کہ سر اور پیٹ کو ڈھک سکے مقرر کر دیا۔

ابن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ[3] کہتے ہیں: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ

---

(۱) ابن الأثير: الكامل في التاريخ، ۲/۴۲۳، طبع دار صادر، بيروت

(۲) ابن سعد: طبقات: ج ۳ مطبوعه دار الكتب العلمية، بيروت

(۳) ابن سعید، شیخ الاسلام ابو سعید یحییٰ بن سعید بن قیس بن عمرو انصاری المدنی رحمہ اللہ، مدینہ منورہ کے قاضی =

عنہ کو اس حالت میں دیکھا کہ دوپہر کے وقت مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام کے صحن میں کچی اینٹ کا تکیہ سر کے نیچے رکھے ہوئے آرام فرمارہے تھے، میں نے گھر جا کر اپنے والد سے دریافت کیا کہ ایسا حسین وجمیل شخص اس حالت میں کون تھا، جو مسجد میں لیٹا ہوا تھا؟ والد نے کہا: یہ امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ (۱)

ابو الفرات کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی بات

تھے۔ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ، قاسم بن محمد رحمہ اللہ وغیرہم سے احادیث نقل کی ہیں۔ اور ان سے امام شعبہ، امام مالک، امام سفیان ثوری، امام حماد، ابن مبارک رحمہم اللہ تعالیٰ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو سختیانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے مدینہ منورہ میں ان سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔ یحییٰ بن قطان رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ امام زہری رحمہ اللہ سے بھی بڑے فقیہہ تھے، ہاشمیہ میں ۱۴۳ھ میں وفات پائی۔ (دیکھئے: امام ذهبی رحمه الله: تذكرة الحفاظ، تذكره ابن سعيد رحمه الله —— مولانا عبدالحی لکھنوی رحمه الله: التعليق الممجد على موطا امام محمد رحمه الله تعالىٰ، مطبوعه پاکستان، ١٤٠٥ھ. ص ٥٩)

(۱) ابن کثیر رحمه الله: البداية والنهاية، ٢١٣/٧. ابونعيم: حلية الاولياء، ٦٠/١.

انہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ان کی اہلیہ محترمہ —— حضرت نائلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا —— جو کہ راوی حدیث کی دادی اماں ہیں، کی گواہی —— جو انہوں نے ان بلوائیوں کے سامنے (جو آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے آئے تھے) واسطہ دے دے کر دی —— کا درج کرنا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زہد وتقوی، امانت و دیانت امت اور رعایا کی خیر خواہی اور بھلائی پر نہایت مستند اور عمدہ دلیل ہوگی کیونکہ خاتون خانہ خاوند کی محرم راز اور کردار کا اولین مخبر (First Hand Reporter) ہوتا ہے۔ لیجئے آپ بھی سن لیں۔

عن الزبير بن عبدالله عن جدته قالت: بابي (وامي) هو يحي الليل فى ركعته، ويصل الرحم، ويطعم الملهوف ويحمل الكل . (بحواله مولانا محمد يوسف كاندهلوى، حيات الصحابه، تذكره شهادت عثمان رضى الله عنه)

ترجمہ: (حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے) حضرت زبیر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی دادی جان (حضرت نائلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: میرے (ماں) باپ ان پر فدا ہوں، (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ساری رات ایک رکعت نماز میں کھڑے ہو کر گزارتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، فاقہ زدگان محتاجوں کو کھانا کھلاتے ہیں، (ناتواں) لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

پر غصہ میں اپنے غلام کا کان پکڑ کر مروڑ دیا مگر فوراً ہی بعد غلام سے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تو بھی میرا کان پکڑ کر مروڑ تاکہ بدلہ پورا ہو جائے باصرار کہنے پر غلام نے معمولی طور پر کان کو ہاتھ لگا دیا فرمایا نہیں خوب زور کے ساتھ مروڑ اور پھر فرمایا:

یا حبّذا قصاص فی الدنیا لا قصاص فی الاخرۃ۔[1]

ترجمہ: وہ بدلہ کس قدر اچھا ہے کہ دنیا میں ہی لے لیا جائے اور آخرت میں اس کا وبال (بدلہ) نہ بھگتنا پڑے۔

ایک مرتبہ اپنے عمال (گورنروں) کو تحریر فرمایا:

اما بعد، فان اللہ أمر الائمۃ ان یکونوا رعاۃ ولم یتقدم إلیھم أن یکونوا جباۃ الخ۔[2]

ترجمہ: بعد حمد و صلوٰۃ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے امام یا امیر کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ قوم کے نگہبان اور چرواہے ہوں اور ان کو اس نے اس لیے امیر نہیں بنایا کہ وہ قوم کو ٹیکسوں کے بوجھ سے دبادیں۔

اور ابن عبد البر[3] نے استیعاب میں نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی ہذیل رحمہ

(۱) محب طبری: الریاض النضرۃ فی فضائل العشرۃ، فضائل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اخرجہ ابن السّمان فی الموافقۃ عن ابی الفرات ورقۃ ۲۰۵ب رقم المخطوط ۱۷۸٤ مکتبۃ ندوۃ العلماء، لکھنو (ھند)

(۲) ابن جریر طبری رحمہ اللہ: تاریخ الامم والملوك، اولین مصری ایدیشن، ٤٤/٥

(۳) عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمری رحمہ اللہ قرطبہ (اندلس) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم رحمہ اللہ کا قرطبہ کے بڑے فقہاء اور محدثین میں شمار تھا۔ لہذا آپ نے ابتدائی تعلیم والد محترم رحمہ اللہ سے پائی۔ آپ ابتداء ہی سے دینی علوم کی تحصیل میں لگ گئے، حتیٰ کہ علوم شریعۃ اور حدیث میں اندلس کے امام بن گئے۔ آپ نے بہت ہی مفید تصنیفات چھوڑی ہیں۔ جن میں زیادہ مشہور "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، الدرر فی اختصار المغازی والسیر، جامع بیان العلم وفضلہ، الانباہ بمعرفۃ قبائل الرواۃ، القصد والامم، البیان فی تفسیر القرآن وغیرہا ہیں آپ نے ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔ (ابن کثیر: الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، مطبوعہ دمشق بیروت، ۱۳۹۹ھ صفحہ، ۱٤۰۰ھ، ۷۳ کا حاشیہ. مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدمہ. زرکلی: الاعلام، ۳۱٦/۹)

اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں دیکھا کہ ان کے بدن پر ایک موٹا کرتا تھا، جو پرانا بھی تھا، اور ایک روایت میں یہی کہتے ہیں کہ میں نے کوفہ کی مسجد میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ وہ موٹی چادروں میں لپٹے ہوئے تھے، ایک کو باندھ رکھا تھا اور دوسری کو اوڑھے ہوئے تھے، اور بازاروں میں تقوی، صدق گفتاری، حسن معاملہ وغیرہ کی تلقین فرماتے پھرتے تھے۔(۱)

اور ابو نعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بیت المال میں سونا چاندی بہت زیادہ آیا اور بیت المال پر ہو گیا تب آپ نے اس کو مستحقین میں تقسیم کر دیا اور جب کچھ نہ رہا تو جھاڑو دلا کر وہاں دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا: یہ اس لیے کہ یہ زمین قیامت میں میری شہادت دے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگو! میں نے تمہارے مال فے میں سے کچھ نہیں لیا، صرف یہ ایک شیشی ضرور لی ہے جو دراصل میرے آزاد شدہ غلام دہقان کے حصہ میں آئی تھی اور اس نے مجھ کو ہدیہ کر دی ہے۔(۲)

---

(۱) ابن جوزی، حافظ عبدالرحمٰن بن علی بن محمد رحمہ اللہ: صفة الصفوة، ص ۱۲۲، عن ضرار بن ضمرة رضی اللہ عنہ.

(۲) علامہ سیوطی: تاریخ الخلفاء، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، تذکرہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ص ۱۸۰. اصبہانی، علامہ ابونعیم: حلیة الاولیاء، حیاة ابی طالب رضی اللہ عنہ: ص ۱۱۰

معاشیات (Economics) کا مضمون —— جیسا کہ معاشیات کی مقبول عام تعریف جو پروفیسر رابنز (Robens) نے کی ہے کہ یہ قلیل ذرائع کے ساتھ بے شمار ضروریات کو پورا کرنے کا نام ہے —— ہی معاشیات پر لکھنے والے کو احتیاط پسندی کا درس دیتا ہے کہ کم از کم لکھا جائے کیونکہ بسا اوقات لکھنے والے ایک قلم کے سامنے بے شمار موضوعات معاش ہوتے ہیں، لہذا معاشیات کا یہ تقاضہ قلم کو بھی بخیل بنا دیتا ہے یہی صورت حال میرے سامنے ہے کہ میں نے اس کتاب کی تہذیب و تبویب میں بہت کچھ لکھنا ہے، مگر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے اپنے قلم کو بخیل کی تہمت سے بچانے کے لیے ایک سبیل نکالی ہے کہ میں یہاں اسلام میں حیثیتِ خلیفہ و امیر کے ضمن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خوبیوں کا وہ خاکہ پیش کروں، جو حضرت ضرار بن ضمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھینچا، جب ان سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ =

تعالیٰ عنہ کا حال بطور خلیفہ دریافت کیا، لیجئے آپ بھی میرے ساتھ مل کر پڑھ لیں: حضرت ضرار بن ضمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں:

يستوحش من الدنيا وزهرتها، يستأنس بالليل وظلمته، كان —— والله —— غزير الدمعة، طويل الفكرة، يقلب كفه ويخاطب نفسه. يعجبه من اللباس ما خشن، ومن الطعام ما جشب. كان والله كأحدنا، يجيبنا إذا سألناه ويبتدئنا إذا أتيناه، ويأتينا إذا دعوناه. ونحن والله —— مع تقريبه لنا وقربه منا —— لا نكلمه هيبة ولا نبتدئه لعظمه. فان تبسم فعن مثل اللؤلؤ المنظوم، يعظّم أهل الدين ويحب المساكين. لا يطمع القوى فى باطله، ولا ييأس الضعيف من عدله. واشهد بالله، لقد رأيته فى بعض مواقفه، وقد أرخى الليل سجوفه، وغارت نجومه، وقد مثل فى محرابه قابضا على لحيته، يتململ تملل السليم ويبكى بكاء الحزين، وكأنى اسمعه وهو يقول: يا دنيا! يا دنيا! ابى تعرضت ام لى تشوفت؟ هيهات، هيهات، غرّى غيرى، قد بتتّك ثلاثا لارجعة لى فيك، فعمرك قصير وعيشك حقير، وخطرك كبير. آه من قلة الزاد، وبُعد السفر، ووحشة الطريق. (ابن جوزى، حافظ عبدالرحمٰن بن على بن محمد الجوزى رحمه الله: صفة الصفوة، دائرة المعارف، حيدر آباد (هند) ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء: ص ۱۲۲)

ترجمہ: وہ دنیا اور اس کی رنگینی سے گریزاں رہتے جبکہ رات اور اس کے اندھیرا سے انس رکھتے تھے (غالباً اس لیے کہ رات کی تاریکی اور تنہائی میں رو رو کر اپنے کریم کو منالیں) اللہ کریم کی قسم! وہ بہت زیادہ رونے والے اور لمبی فکر والے انسان تھے۔ وہ (گاہے) اپنے ہاتھ کو پلٹتے (جیسے پریشان حال انسان کرتا ہے) اور اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے، انہیں کھردرا لباس اور موٹا جھوٹا کھانا پسند تھا، کریم رب کی قسم! وہ بالکل ہماری طرح کے ایک انسان تھے۔ جب کبھی ہم ان سے (علم و عمل کی بابت) سوال کرتے وہ ہمیں جواب دیتے، جب کبھی ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ خود ہماری طرف پیش قدمی فرماتے اور جب ہم انہیں (کسی ضرورت یا مسئلہ کے لیے) پکارتے تو وہ ہمارے پاس چلے آتے۔ اللہ کریم کی قسم! ان کی ہم سے قربت اور ہماری ان سے قربت کے باوجود ہم ان کے رعب کی وجہ سے ان سے بات کرتے تھے نہ ان کی بزرگی کے سبب ان سے پیش قدمی کرتے تھے۔ اگر وہ مسکراتے تو (ان کے حسین و جمیل دندان مبارک) پروئے ہوئے موتیوں کی لڑی معلوم ہوتے۔ وہ دینداروں کی تعظیم کرتے اور بے کسوں سے محبت کرتے۔ ان (کی عظمت) کے سامنے کوئی طاقتور باطل (خلاف حق امور) میں امید نہیں کر سکتا تھا، نہ کمزور ان کے انصاف سے ناامید ہوتا تھا۔ اللہ کریم کی قسم! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے کئی مواقع پر دیکھا کہ رات نے اپنے (اندھیرے کے) پردے گرا دیئے ہیں (یعنی ڈھلنے لگی ہے) اس کے ستارے ماند پڑنا لگ گئے ہیں۔ مگر وہ اپنی محراب (سجدہ گاہ) میں اپنی داڑھی ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں، مارگزیدہ کی طرح لرزاں ہیں اور دکھیاروں کی طرح رو رہے ہیں۔ میرے کانوں میں اب بھی ان کی آواز آرہی ہے کہ وہ اس حال میں کہہ رہے ہیں: اے دنیا! اے دنیا! تو مجھ سے لڑائی چاہتی ہے یا مجھ سے بھلائی؟ ہائے افسوس! جا میرے سوا کسی اور کو بہلا پھسلا۔ میں نے تو تجھے تین طلاق دے دی

پھر اقتدار کس لیے؟

"امارت" و "خلافت" کا یہی تصور اور اس کی عملی ذمہ داریوں کا یہی نقشہ ہے کہ جس کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاداتِ عالیہ میں یہ واضح فرما دیا کہ جو شخص اس ذمہ داری کا اہل نہ ہو اور وہ اپنی زندگی کو تج کر پبلک کی خدمت کے لیے وقف نہ ہو سکے وہ محض اقتدار کی خاطر اس کو قبول نہ کرے ورنہ خدا کے سامنے ذلیل و رسوا ہونا پڑے گا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات قابل توجہ ہیں:)

❶ عن ابی ذر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قلت: یا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم! ألّا تستعملني؟ قال: إنك ضعيف، وأنّها أمانة، وأنها يوم القيامة خزی وندامة، إلّا من أخذها بحقها وأدّی الذی علیه فیها.[1]

ہیں اور اب تجھ سے میرا رجوع کا ارادہ نہیں۔ جا جا تیری عمر مختصر ہے، تیرا عیش بڑا حقیر اور گھٹیا ہے مگر تیرا خطرہ بہت بڑا ہے۔ ہائے (آخرت کے لیے) سامانِ سفر کی کمی، ہائے سفر کی دوری اور راستہ کی وحشت!۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت ضرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی یہ کیفیات سنیں تو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور وہ کہتے جاتے تھے: اللہ کریم کی حضرت ابوالحسن (علی) رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رحمت ہو۔ عظیم و جلیل پروردگار کی قسم! وہ ایسے ہی تھے، وہ ایسے ہی تھے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بیت المال کے رویہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ولم یکن یستأثر من الفیٔ بشیٔ لا یحض به حمیما ولا قریبا. (عبدالبر: الاستیعاب: ج ۲ مطبوعه مصر: ص ٤٦٤)

ترجمہ: فیٔ کے مال میں سے بغیر استحقاق نہ خود کچھ لیتے تھے نہ کسی دوست (مددگار) اور نہ قریبی رشتہ دار کو دیتے تھے

ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ آپ نے اپنی وفات کے بعد وراثت میں صرف سات ہزار (۷۰۰۰) درہم چھوڑے وہ بھی انہوں نے ایک خادم خریدنے کے لیے اپنے وظیفہ سے پس انداز کر کے رکھے تھے۔ (ابن قتیبه: الامامة والسیاسة، ١٣٦/٢. ابن سعد: طبقات، ج ٣، مطبوعه بیروت، ١٤١٨ھ / ١٩٩٧ء، ص ٢٨)

(۱) صحیح مسلم، ج ۱، کتاب الامارة، باب کراهة الامارة

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: مجھے آپ عامل (گورنر) کیوں نہیں بنا دیتے؟ فرمایا: تم کمزور ہو اور یہ "امانت" ہے اور بلاشبہ یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث ہوگی مگر یہ کہ کوئی اس کے حقوق و فرائض کے ساتھ اس کو لے اور ٹھیک ان حقوق و فرائض کو انجام دے۔

❷ عن عبدالرحمٰن بن سمرة رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: یا عبدالرحمٰن بن سمرة! لا تسأل الأمارة فإنّك إن أعطیتها عن غیر مسئلة أعنت علیها و إن أعطیتها عن مسئلة وکلّت إلیها.[1]

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] فرماتے ہیں: مجھ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عبدالرحمٰن! تم کبھی "امارت" کی خواہش نہ کرنا اس لیے کہ اگر تم کو بغیر خواہش اور طلب کے "امیر" بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہاری مدد اور اعانت کی جائے گی اور اگر تمہارے سوال پر تم کو امارت دی گئی تو اس کا سارا بوجھ تم ہی پر ڈال دیا جائے گا۔ (یعنی خدا کی مدد سے محروم ہو جاؤ گے)۔

---

(۱) صحیح الامام البخاری، باب الاحکام، باب من لم یسأل الأمارة. صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب النهی عن طلب الامارة، ریاض الصالحین، باب النهی عن سؤال الأمارة الخ

(۲) حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ عبشمی قرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فتح مکہ مکرمہ کے دن اسلام لائے، غزوہ تبوک اور فتح عراق میں شریک تھے بلکہ جیش اسلام کے قائد بھی رہے۔ سجستان (زرنج)، ہند کے علاقہ رخج اور دوار، اور موجودہ افغانستان کا غزنی سے کابل تک کے علاقے اللہ کریم نے آپ کے ہاتھوں فتح کرائے۔ سجستان کے گورنر بھی رہے، آخر میں بصرہ میں رہائش اختیار کرلی اور وہیں ۵۰ھ میں وفات پائی۔ (مشکاة المصابیح کا ذیل الکمال فی اسماء الرجال، تذکرہ عبدالرحمٰن بن سمرة رضی اللّٰہ عنه)

❸ عن أبي هريرة رضي الله عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنكم ستحرصون على الأمارة وستكون ندامة يوم القيامة.[۱]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ وقت قریب ہے کہ بلاشبہ تم امارت (خلافت) پر متمکن ہونے کے لالچی بن جاؤ گے اور یقیناً وہ قیامت کے دن تمہارے لیے ندامت کا باعث ہوگی۔

اور اسی مقدس تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ "خلفائے راشدین" خلافت کے حقوق و فرائض کو بدرجۂ اتم انجام دینے کے باوجود بھی یہی محسوس کرتے رہے کہ ہم اس اہم خدمت سے پوری طرح عہدہ برآ نہ ہوسکے اور اس لیے خدائے تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کے خوف سے لرزہ براندام نظر آیا کیے۔[۲]

---

(۱) صحيح الامام البخاري، كتاب الاحكام، باب من لم يسأل الأمارة. رياض الصالحين، باب النهي عن سوال الامارة الخ. نسائي: السنن، ج ۲، كتاب البيعة، باب ما يكره من الحرص على الأمارة

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن خلافت کی ذمہ داریوں کے دکھوں کا احساس کرتے ہوئے فرمایا: لوگو! میں تمہارا خلیفہ بنایا گیا ہوں...... اللہ کریم کی قسم! میں نے اس منصب کے لیے کبھی آرزو نہیں کی، نہ رات میں نہ دن میں نہ میں نے اس کے لیے کبھی دعا کی، نہ پوشیدہ نہ علانیہ (مگر پھر بھی) مجھ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی ہے، جس کے اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں، مگر اس سے اب مفر بھی نہیں ہے، حالانکہ میری دلی تمنا تھی کہ میری جگہ اس ذمہ داری کو کوئی ایسا شخص اٹھاتا جو ہم میں سے زیادہ قوی ہوتا۔ میں جب تک اللہ کریم کی اطاعت کروں تم بھی میری اطاعت کرنا، جب میں اللہ کریم کی نافرمانی کروں تو تم پر بھی میری اطاعت ضروری نہیں۔

اس کے بعد روتے ہوئے فرمایا:

لوگو! میں خلیفہ اس لیے نہیں بنایا گیا کہ تم سب سے برتر بن کے رہوں، میری تو تمنا یہ تھی کہ کوئی اور اس جگہ کو سنبھالتا۔ دیکھو! اگر تم مجھے بھی وحی کے اس پیمانے سے ناپو گے جس سے اللہ کریم اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپتا تھا، تو تم مجھے کسی طرح اس کا اہل نہ پاؤ گے۔ کیونکہ میں تو تمہارے ہی جیسا انسان ہوں، جب دیکھو کہ میں سیدھے راستہ پر چل رہا ہوں تو میری پیروی کرنا، جب دیکھو میں کج روی اختیار کر رہا ہوں تو

سیوطی رحمہ اللہ [1] نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن عامر کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فریضۂ خلافت کی اہمیت اور ذمہ داری کو جب زیادہ محسوس فرماتے تو زمین سے مٹی اٹھا لیتے اور فرماتے:

(یلیتنی! کنت هذه التبنة، لیتنی لم أخلق، لیت أمی لم تلدنی.) [2]

ترجمہ: اے کاش! میں مٹی ہوتا بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا اور میری ماں مجھ کو نہ جنتی۔

اور آخر وقت میں جب لوگوں نے آپ کی خلافت کے زمانہ کے مناقب بیان کر کے ان کو آخرت کے اجر کی بشارتیں سنائیں تو فرمانے لگے:

ولو ددت انی نجوت من هذا الأمر کفافا لا لی ولا علیّ. [3]

مجھے سیدھا کر دینا۔ (ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم: الامامۃ السیاسۃ، ۱۷/۱)

(۱) سیوطی، عبد الرحمٰن بن کمال بن محمد معروف بہ جلال الدین سیوطی یا اسیوطی مصر کے شہر اسیوط میں ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے، ۹۱۱ھ میں وفات پائی۔ بہت بڑے عالم، فقیہہ، محدث، مفسر اور مؤرخ تھے۔ مسلکاً شافعی تھے آپ نے بہت سی مفید کتب تحریر کی ہیں، جن میں مشہور الاشباہ والنظائر، الاتقان فی علوم القرآن، تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک رحمہ اللہ، شرح سنن ابی داود اور ابن ماجہ، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر و القاهرۃ، لباب النقول فی اسباب النزول ہیں۔ آپ نے قرآن کریم کی تفسیر "جلالین" لکھی ہے جس کا تکملہ علامہ جلال الدین محلی رحمہ اللہ نے لکھا، چونکہ دونوں مصنفین کے اسماء گرامی "جلال" تھا، لہٰذا تفسیر کا نام "جلالین" رکھا گیا۔
جلال الدین محلی رحمہ اللہ (متوفی ۸۶۴ھ/۱۴۵۹ء) مفسر، محدث اور فقیہہ تھے۔ آپ کی مشہور کتاب "تفسیر جلالین" اور شرح علی متن جامع الجوامع ہیں۔ مؤخر الذکر شرح قاہرہ مصر سے شائع ہوئی۔

(۲) سبوطی، جلال الدین: حسن المحاضرہ. علی المتقی: کنز العمال، ج ٦، باب فضائل. ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعہ بیروت، ۱٤۱۸ھ / ۱۹۹۷ء ص ۲۷٤

(۳) ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعہ بیروت، ۱٤۱۸ھ / ۱۹۹۷ء، تذکرہ عمر رضی اللہ عنہ: ص ٦٧

جس دن آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امت کا بارِ خلافت اٹھایا۔ اس دن جو خطبہ آپ نے دیا اس کا ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک لفظ اس حقیقت کا غماز ہے کہ آپ نے یہ عہدہ کسی بڑھائی اور دنیوی فوائد کے لیے نہیں بلکہ مجبوراً امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی بھلائی اور یک جہتی قائم رکھنے کے لیے قبول کیا۔ اس خطبہ کا یہ حصہ پڑھیں اور اس عظیم انسان کی وارداتِ قلبی کا اندازہ کریں:

=

ترجمہ: اور میں تو یہی محبوب رکھتا ہوں کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں اس امر خلافت کے مواخذہ سے برابر سرابر نجات پا جاؤں نہ مجھ سے مواخذہ ہو اور نہ انعام ملے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ساری رات مصلی پر بیٹھے روتے رہے صبح کو زوجۂ محترمہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے اس غیر معمولی رنج وغم کا حال دریافت کیا تو فرمایا:

"میرا حال یہ ہے کہ اسود واحمر تمام امت مسلمہ کا میں والی ہوں تو میں سوچتا ہوں کہ دور دور اقطاع وامصار میں ایسے ناتواں مسافر ہوں گے جو قناعت اور تنگ حالی کی وجہ سے برباد ہو رہے ہوں گے، بہت سے محتاج فقیر، بہت سے مجبور قیدی اور اسی طرح بہت سے کمزور ناتواں ہوں گے۔"

فعلمت أن الله تعالى سائلني عنهم وأن محمدا حجيجي منهم فخفت أن لا يثبت لي عند الله عذر ولا يقوم لي مع محمد صلى الله عليه وسلم حجة، فخفت على نفسي الخ.[1]

لولا رجائي أن أكون خيركم لكم، وأقوى كم عليكم، وأشدكم اطلاعاً بما ينوب من مهم امركم ما توليت ذلك منكم. (علامه بلاذری: کتاب الاشراف، مطبع مصطفائی، ص ١٢٤)

ترجمہ: اگر مجھے (اللہ کریم کی ذات کریم سے) یہ امید نہ ہوتی کہ میں تمہارے (خلافتی کار میں تمہارے) لیے بہتر ہوں، تم سے (تمہارے امور کو سنبھالنے میں) زیادہ طاقت ور ہوں، اور تمہارے (معاملہ خلافت کو قائم رکھنے کے) اہم کام کو سمجھنے اور اس کو کامیابی سے چلانے میں تم سب سے زیادہ سخت جان ہوں تو تمہاری طرف سے اس ذمہ داری کو قبول نہ کرتا۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

لو علمت أن أحدا أقوى على هذا الامر مني، لكان أن أقدّم، فيضرب عنقي أهون عليّ. (امام محمد رحمه الله تعالى، مؤطا، كتاب النوادر)

ترجمہ: اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ کوئی ایسا فرد ہے جو اس بار (خلافت) کو اٹھانے میں مجھ سے زیادہ طاقت والا ہے تو میں خلافت (کا منصب) قبول کرنے سے زیادہ آسان یہ سمجھتا کہ میری گردن ماردی جائے۔

(۱) ابو یوسف کتاب الخراج، مقدمہ

=

ترجمہ: پس مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں مجھ سے ضرور سوال کرے گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جانب سے ضرور مجھ سے جھگڑیں گے سو میں ڈر رہا ہوں کہ اس وقت اللہ کے حضور میں کوئی عذر پیش نہ کر سکوں گا اور نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی حجت لا سکوں گا تو یہ رنج و غم اسی خوف کی وجہ سے ہے۔

مباحث کا خلاصہ:

الحاصل یہ ہے ''اسلامی حکومت'' کا وہ مختصر خاکہ جو خلافت اور نیابت الٰہیہ کے نام سے قائم ہوتی اور جماعت کے نظام اجتماعی کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد تمام مسلمانوں کے نام ایک گشتید مراسلہ (Circular Order) جاری فرمایا جس میں کتاب و سنت کی پابندی کے ساتھ ساتھ امور سلطنت (State Crafts) کا ذکر تھا۔ اس مراسلہ میں آپ نے خلافت کے بوجھ اور اس کے دکھ کا بالخصوص ذکر فرمایا، لکھتے ہیں:

اللہ کریم کی قسم! حکومت و سلطنت (کے امور) کا جس قدر مجھے علم ہوتا گیا اتنا ہی مجھے اس (کے سنبھالنے اور کرنے) سے اندیشہ لاحق ہوتا رہا، اور اس بھاری بوجھ کے سنبھالنے سے گریزاں تھا، مگر اللہ کریم کی قدرت سے قرعہ فال میرے ہی نام آیا۔ بس جو کچھ اس کریم آقا کی تقدیر میں ہونا تھا وہ تو ہو کر رہا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ جتنا اس کی گرانی اور سختی کا علم مجھے اس کے تجربہ سے گزرنے کے بعد ہوا اتنا کبھی (پہلے) نہ تھا۔ اللہ کریم میرے، میرے مددگاروں اور جنہوں نے یہ کام (کا بھاری بوجھ اٹھانا) میرے ذمہ لگایا ہے کا معاملہ خیر سے فرمائے، مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح فرمائے، ان کے شیرازہ کو مجتمع رکھے، ان پر اور مجھ پر اپنی وہ رحمتیں نازل فرمائے، جن تک میری دعا پہنچ سکتی ہے نہ ان کی۔ اگر عام رعایا کی حالت اچھی رہے ان کے حقوق ادا ہوتے رہیں، ان کے خطا کاروں (کی خطاؤں اور لغزشوں) سے درگزر اور چشم پوشی ہوتی رہے، تو اس کار خیر میں میری جزا اور ثواب اللہ کریم ہی کے پاس ہے۔

اللہ کریم کا بے حد شکر ہے کہ اس کریم نے اپنا کرم کر کے یہ دولت مجھے دنیا ہی عطا فرما دی ہے۔ (میں دیکھ رہا ہوں کہ) مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع ہے، ان کے آپس کے معاملات درست ہیں، رزق وافر ہے، دشمنان (اسلام، ملت اسلامیہ) کے مقابلہ میں (اللہ کریم کی) نصرت و مدد حاصل ہے، اور عمدہ کفایت بھی ہے، اللہ کریم نے ہر ہر علاقہ کے مسلمانوں کو (اپنے کرم سے) اپنے اپنے علاقوں میں خوشحال کر دیا ہے ان کا رزق کشادہ کر دیا ہے۔ اللہ کریم کے رزق و انعام کے سبب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہر علاقہ کے مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا علاقہ ہی تمام دیگر (سلطنت کے) علاقوں سے زیادہ خوش نصیب اور خوشحال ہے۔ (ابن الحاکم، ابو محمد عبداللہ: سیرۃ عمر بن عبدالعزیز)

معاشی حقوق و فرائض میں راعی اور رعیت یا امیر اور مامور غرض جماعت کے ہر فرد کو "مساوات عدلی" (Equality In Justice) کی ترازو میں وزن کرتی ہے اور اسی ماحول میں ایسے "اقتصادی اور معاشی نظام" کو بروئے کار لاتی ہے جس کے "صالح" ہونے اور اس کی بدولت جماعت کے ہر فرد کے خوش حال ہونے اور مطمئن زندگی بسر کرنے میں کسی قسم کے ریب و شک کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتی۔

اور اس کے برعکس اس نظامِ حکومت کو اسلام "ملعون" قرار دیتا ہے جو انسانوں کے درمیان اس لیے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ اس سے کسی شخصِ واحد کی یا کسی پارٹی اور جماعت کی اغراض کو پورا کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے انسانوں کے درمیان اور خدا کی مخلوق کے مابین اخوت و مواسات اور باہمی ہمدردی کے بجائے ظالم اور مظلوم کا تعلق قائم ہوتا اور ایک دوسرے کے خلاف معاشی دستبرد یا جماعتی رقابت اور یا طبقاتی جنگ کے نمایاں کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہو۔ چنانچہ اسی قسم کے نظامِ حکومت کے متعلق قرآنِ عزیز نے اس طرح ذکر کیا ہے۔

﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٤﴾ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ﴿٥﴾﴾[1]

ترجمہ: بلاشبہ فرعون نے (خدا کی) زمین میں اودھم مچا یا رکھا ہے اور اس کے (مصر کے) باشندوں میں پھوٹ ڈال کر اس نے پارٹیاں بنا دی ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو کمزور کرتا رہتا ہے ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا اور ان کی لڑکیوں کو (باندیاں) بنانے کے لیے زندہ رکھتا ہے، بے شک وہ مفسدوں میں سے ہے اور ہم نے ارادہ کر لیا ہے

(۱) سورۃ القصص (۲۸): ٤، ٥

کہ جو (زمین مصر) میں کمزور ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو (قوموں کا) پیشوا بنائیں اور (اپنی زمین) کا ان کو وارث بنائیں۔

فرعونی اور طاغوتی طریقِ حکومت کا یہی سب سے بڑا نمایاں امتیاز ہے جو "حکومت ربانی" (Divine Government) کے مقابلہ میں اپنے اسلحۂ شر و فساد سے مسلح ہو کر سامنے آتا ہے کہ وہ بادشاہ، ڈکٹیٹر یا صدر جمہوریہ اور یا کسی پارٹی اور جماعت کے ذاتی اقتدار کی ترقی کے لیے ایسے قوانین بناتا ہے کہ جس سے قلمرو حکومت کے مختلف عناصر میں پھوٹ ڈالی جائے اور کسی کو کمزور اور کسی کو قوی بنا کر جماعتی رقابت پیدا کی جائے تاکہ اخوت عام (General Brotherhood) اور ہمہ گیر مواسات (Universal Benefacation) کبھی بروئے کار نہ آسکیں اور خدا کی یہ تمام مخلوق ایک کنبہ اور ایک برادری نہ بن سکے اسی لیے نائبین خلافت ہمیشہ عمالِ خلافت کو تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ حکومتِ حقہ (خلافت) حکومت طاغوتی کی شکل اختیار کر لے۔

وكتب عمر بن الخطاب رضي الله عنه إلى ابي موسى الاشعرى رضي الله عنه أما بعد: فإن أسعد الرعاة عند الله من سعدت به رعيته و إن أشقى الرعاة من شقيت به رعيته. و إيّاكَ أن تزيغ فتزيغ عمالك.(۱)

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، مقدمہ.

انہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن خلافت کا بار اٹھانے والے کی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: خلافت کی صلاحیت صرف وہی شخص رکھ سکتا ہے جو:

1. مضبوط ہو مگر سخت اور درشت نہ ہو۔
2. نرم ہو مگر کمزور اور بزدل نہ ہو۔
3. سخی ہو مگر فضول خرچ نہ ہو۔
4. احتیاط پسند ہو مگر کنجوس نہ ہو۔ (عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما، ابن سعد: طبقات، ترجمه عمر بن الخطاب رضي الله عنه. كنز العمال: ۱۵۸/۳، ۱۵۹)

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ[1] کو لکھا: بعد حمد و صلوٰۃ: یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر والی (گورنر) وہ ہے جس کی رعایا خوشحال اور امن کے ساتھ ہو اور سب سے بدبخت والی وہ ہے جس کی رعایا بدحال اور پریشان حال ہو۔ تجھ کو کجی سے بچنا چاہیے تاکہ تیرے کارندے (ماتحت افسر) بھی ظلم و کجی نہ کر سکیں۔

اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اس قسم کے ارشاداتِ گرامی سے متذکرہ بالا حقیقت کو واضح فرماتے رہے:

❶ الا کلکم بنی ادم وادم من تراب.[2]

ترجمہ: آگاہ ہو کہ تم سب انسان اولادِ آدم علیہ السلام ہو اور آدم علیہ السلام کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

❷ الخلق کلهم عیال الله فاحبهم الی الله انفعهم لعیاله.[3]

ترجمہ: تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے حق میں مفید ہو۔

بہرحال اسلام نے نظامِ حکومت کا جو نقشہ تیار کیا ہے ان میں نہ مذموم سرمایہ داری کا گذر ہو سکتا ہے اور نہ طبقاتی جنگ کا امکان ہے۔ اس کا معاشی نظام نہ افراد کے انفرادی حقوق کو سلب (Forfeit) کر کے تعطل و جمود (Stagnation) پیدا کرتا ہے اور نہ افراد کو جماعتی زندگی سے کاٹ کر بالکل آزاد چھوڑتا ہے اور بلاشبہ اس کا معاشی نظام نفع بازی (Profiteering) کی بنیادوں پر نہیں بلکہ انسانوں کی حاجت روائی

---

(۱) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف باب ۱۱ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) ابن کثیر: تفسیر، سورة الحجرات (٤٩) آیت نمبر ١٣. الهیثمی: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، باب البر والصلة

(۳) رواه البیهقی فی شعب الایمان کذا فی مشکوة المصابیح، باب الشفقة والرحمة علی الخلق، الفصل الثالث

(Fulfillment of Need) کی اساس پر قائم ہے۔

اس کی معیشت کا دستر خوان فاتح و مفتوح، آزاد و غلام، اسود و احمر اور مسلم و کافر سب کے لیے وسیع ہے۔ وہ زیر دستوں پر ارباب قوت کو مسلط نہیں ہونے دیتا اور بابِ دولت کو حصولِ دولت میں اس طرح آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ غریبوں کو اپنا آلۂ کار بنالیں وہ سب کو بخشتا ہے اور کسی کو محروم نہیں کرتا اور مزدور کاشت کار ہی نہیں بلکہ ہر زیردست کو بلند کرتا اور جماعت کے ہر فرد کے درمیان اخوت عام اور عالمگیری مواسات کا رشتہ قائم کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام[1] نے کیا خوب لکھا ہے:

> ”اسلام نے سوسائٹی کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں، بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں گے نہ مفلس و محتاج طبقے ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔“[2]



(۱) مولانا احمد ابوالکلام آزاد کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) آزاد مولانا احمد ابوالکلام: ترجمان القرآن، جلد ۲ مطبوعہ مقبول اکیڈمی لاہور، سن طباعت درج نہیں۔ ص ۱۳۲

شاعر مشرق محمد اقبال رحمہ اللہ نے اسی حقیقت کا اعتراف ایک اور انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں: شریعۃ اسلام کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر قانون الٰہی کے مضمرات کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر صحیح عمل کیا جائے تو پھر ہر شخص کے لیے حق روزی (Right To Livelihood) محفوظ ہو جاتا ہے۔ (مکتوب علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ بنام قائد اعظم محمد علی جناح)

باب ــــ ⑤

اجتماعی معاشی نظام

(تفاصیل)

شعبہ جاتی تقسیم

اسلام نے ''اجتماعی معاشی نظام'' کا جو خاکہ پیش کیا ہے اگرچہ اس کا تعلق بہر صورت حکومت (خلافت) کے ساتھ ہے اور خلافت ہی کا اس پر کنٹرول ہے تاہم اپنی تفصیلات کے اعتبار سے اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ حصہ جس کا تعلق براہ راست ''خلافت'' کے ساتھ ہے اور دوسرا وہ حصہ جو پبلک اور جماعت کے اعمال کے واسطہ سے ''خلافت'' سے متعلق ہیں۔

(الف) اسلامی ریاست کا شعبہ:

جس حصہ کا تعلق براہ راست خلافت سے ہے اس کے عنوان یہ ہیں:

(❶ بیت المال کا قیام
❷ زمین سے متعلق احکام
❸ جملہ شعبہ ہائے مال پر کنٹرول
ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:)

❶ ''بیت المال کا قیام'' یعنی ایک ایسے مالی مرکز کا قیام جو حکومت کے معاشی نظام اور نظامِ حکومت کی مالی ضروریات کا کفیل ہو۔ چنانچہ معاشی نظام کے سلسلہ میں اعداد و شمار کا نظم، وظائف، وسائلِ معیشت کی توسیع و استحکام اور ہر فرد کے حقِ معیشت کی کفالت اسی شعبہ سے متعلق ہے۔

۲ ”زمین سے متعلق احکام“ یعنی مفتوحہ علاقوں میں زمین کو ”خلافت کی ملک“ رکھنے یا افراد امت میں تقسیم کر دینے نیز زمین کی ملکیت انفرادی میں حکومت کی مداخلت و عدمِ مداخلت کے اختیارات کی تفصیل۔ چنانچہ زمینداری سسٹم کے متعلق اسلامی رجحانات اور زمیندار و کاشتکار کے حقوق و فرائض کی تقسیم جیسے مسائل اسی شعبہ کے متعلق ہیں۔

۳ ”جملہ شعبہ ہائے مال پر کنٹرول“ یعنی انفرادی ملکیت کو صحیح تسلیم کر لینے کے باوجود حکومت ”خلافت“ کے اختیاراتِ امتیازی کے معاملات۔ چنانچہ انفرادی ملکیت کی تحدید اور مالی شعبوں میں حکومت کی مداخلت و عامِ مداخلت کے مسائل اسی شعبہ سے وابستہ ہیں۔

(ب) معاشرہ اور ریاست کا مشترکہ شعبہ:

اور جس حصہ کا تعلق جماعت اور پبلک کے واسطہ سے حکومت (خلافت) سے ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱ انفاق کا وجوب

۲ ممنوع اور مضر معاشی سرگرمیوں کا خاتمہ

۳ حلال و طیب وسائل معاش و آمدن

ان کا مختصر تعارف اس طرح ہے:)

۱ ”انفاق کا وجوب“ زکوٰۃ و صدقات (یعنی ذاتی ملکیت پر ٹیکس) وراثت (یعنی تقسیم دولت کا قانون) اور وقف اسی شعبہ سے متعلق ہیں۔

۲ ”اکتناز و احتکار (Concentration & Hoarding) کی حرمت“ سود، قمار اور مذموم سرمایہ کاری کا انسداد، تجارتی بدعنوانیوں کی بندش اور عقود و اجارات فاسدہ کا انکار اسی شعبہ کی شاخیں ہیں۔

۳ ”حلال و طیب کسبِ معیشت“ یعنی جائز تجارت اور صنعت و حرفت کی ترغیب، جائز وسائل و ذرائع معاشی میں افراد امت کے لیے سہولتیں اور زمین سے متعلق

انفرادی ملکیت کی خاص صورتیں اسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

معاشی نظام کے بیان کردہ ہر دو حصص (Parts) اور ان کے متعلقات (Related Subjects) کو ایک سلک میں منسلک کرنے اور مسائل معاشی کو مناسب طریقہ پر بیان کرنے کے لیے اس طرح مرتب فہرست کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے:

حصہ اول کے شعبے	حصہ دوم کے شعبے
① بیت المال کا قیام	① صدقاتِ نافلہ
② اعداد و شمار کا انتظام	② اوقاف
③ وظائف کا تقرر	③ ہبہ
④ وسائلِ معیشت کی توسیع	④ وصیت
⑤ انفرادی ملکیت کی تحدید	⑤ قرضِ حسنہ
⑥ سرمایہ و محنت میں توازن کے اصول	⑥ عاریت
⑦ زمین سے متعلق خصوصی احکام	⑦ امانت

حصہ اول کے شعبے

بیت المال:(۱)

(۱) بیت المال اپنے جامع مفہوم میں وہ ادارہ ہے جو اسلامی ریاست کی مالیاتی پالیسی کو بروئے کار لانے اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیا جاتا ہے، البتہ اپنے سادہ اور عام فہم مفہوم میں بیت المال اس عمارت کو بھی کہتے ہیں جو سرکاری خزانہ کا محفوظ مقام ہوتا ہے۔ اپنے جامع مفہوم کے اعتبار سے تو بیت المال کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں ہی پڑ چکی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین، یمن اور عمان سے آنے والی خراج اور جزیہ کی رقم کو فقراء اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں تقسیم فرما کر یہ واضح فرمادیا کہ اسلام کی مالیاتی پالیسی کا مقصد غربت اور افلاس کے خاتمہ کے ساتھ معاشی خوش حالی کا حصول بھی ہے۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق ان دنوں جزیہ، خراج اور دیگر ذرائع سے ہونے والی آمدنیوں کو مسجد نبوی کے صحن میں رکھ دیا جاتا اور فوراً مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اگر کوئی بڑی رقم آئی تو وہ بحرین کا آٹھ لاکھ درہم کا خراج تھا، مگر اسے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی جگہ تقسیم فرما دیا۔ (شبلی: الفاروق ج ۲ عنوان: بیت المال)

اس رقم کی آمد اور تقسیم کا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بڑا انتظار تھا، اور اس کی آمد پر انہیں بڑی خوشی ہوئی، =

محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کتب احادیث میں اس رقم کی آمد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے انتظار اور خوشی کے واقعات نقل کیے ہیں۔ آئیے آپ بھی حضرت عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وہ الفاظ پڑھ لیں:

عن عمرو بن عوف الانصاری رضی اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعث أبا عبیدۃ ابن الجراح رضی اللّٰہ عنہ الی البحرین یاتی بجزیتھا. فقدم بمال من البحرین. فسمعت الانصار رضی اللّٰہ عنھم بقدوم ابی عبیدۃ رضی اللّٰہ عنہ، فوافوا صلاۃ الفجر مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم. فلما صلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انصرف، فتعرضوا لہ، فتبسم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حین رآھم. ثم قال: أظنکم سمعتم أن أبا عبیدۃ رضی اللّٰہ عنہ قدم بشئ من البحرین. فقالوا: اجل یا رسول اللّٰہ! فقال: ابشروا واملوا ما یسّرکم الخ. (متفق علیہ، ریاض الصالحین، باب فضل الزھد فی الدنیا)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بحرین سے (اہل کتاب کے) جزیہ کی وصولی کے لیے روانہ فرمایا۔ وہ (کچھ دنوں بعد) جزیہ کی رقم لے کر واپس تشریف لائے، جب انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد کا سنا تو نماز فجر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے (غالباً کئی حضرات اپنے محلہ کی مساجد میں بھی نماز ادا کر لیتے ہوں گے مگر آج خصوصاً ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد کا سن کر اکٹھے نماز فجر ادا کرنے گئے ہوں) جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرمانے کے بعد چلنے لگے۔ تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہونے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا (یوں اکٹھا ہو کر) سامنے آنا دیکھا تو تبسم فرمایا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: میرا خیال ہے تم نے یہ سن لیا ہے کہ ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحرین سے مال لے کر آئے ہیں؟ انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: ہاں اے اللہ کریم کے رسول کریم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں خوشخبری ہو امید رکھو تمہیں وہ کچھ ملے گا جو تمہیں خوش کر دے۔

البتہ بیت المال بحیثیت سرکاری خزانہ کے محفوظ مقام کا قیام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں ہوا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے نگران مقرر ہوئے لیکن جو مال آتا وہ فوراً تقسیم کر دیا جاتا۔ لہٰذا آپ کی وفات کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ بیت المال کا معائنہ کرنے گئے تو اسے خالی پایا۔ (ابن سعد: الطبقات الکبری، مطبع بریل، لیدن ۱۳۲۱ھ ج ۳ تذکرہ ابوبکر الصدیق. جلال الدین سیوطی: تاریخ الخلفاء: ص ۳۰)

صرف ایک درہم نکلا اس مبارک زمانے میں بیت المال میں زر محفوظ (Reserved Fund) کی کوئی مد نہ تھی جسے ناگہانی حالات اور مستقبل کی حاجات کے لیے رکھا جاتا۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایام خیر میں تو بچا رکھنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ بیت المال میں اتنا بھی نہیں ہوتا تھا جتنا ضرورت کے لیے درکار تھا۔

=

ایک تحقیق کے مطابق بیت المال کا باقاعدہ قیام حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ۱۵ھ میں ہوا۔ اس کی وجہ بحرین کا پندرہ لاکھ درہم کا مال غنیمت تھا۔ ایک بیت المال مدینہ منورہ میں قائم کیا گیا۔ یہ مرکزی بیت المال تھا اس کے ناظم حضرت عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کے ماتحت نہایت لائق افسران مقرر کیے جن میں حضرت معیقیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری برداری کا شرف حاصل تھا۔ دوسرے حضرت عبد اللہ بن عبید قاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ملاحظہ ہو رجال کی کتب ان دونوں بزرگوں کے اسماء گرامی) اس مرکزی بیت المال کے تحت کئی بیوت المال مختلف صوبوں کے مراکز میں قائم کیے گئے، ہر ہر صوبہ کے بیت المال کا افسر الگ الگ تھا۔ مثلاً کوفہ کے افسر خزانہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور اصفہان کے افسر حضرت خالد بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ (شبلی: الفاروق، عنوان بیت المال)

ان بیوت المال کے نگران حضرت عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے باقاعدہ اس امت مسلمہ کے وزیر مالیات تھے۔ (الذهبی، شمس الدین: کتاب دول الاسلام فی التاریخ، دائرة المعارف النظامیه، حیدر آباد (هند) ۱۳۳۷ھ: ۸۰/۱ —— ابن الوری، زین الدین عمر؛ تتمة المختصر فی اخبار البشر، مطبع وهبه قاهرة، ۱۳۵/۱)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب قیصر و کسریٰ کے خزینے اور دفینے مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے بیت المال میں منتقل ہو گئے تو اس دور میں بھی آپ کو بچا اور سنبھال کر رکھنے کی فکر لاحق نہ ہوئی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی پرواہ بھی نہ کی کہ بچا اور گن گن کر رکھنا طول اقتدار کا ذریعہ اور دیگر اقوام سے لڑائیوں میں فتح مندی کی وجہ ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک اسلام کی ترویج اسلامی ریاست کا پھیلاؤ اور غلبہ اخلاص عمل، اتحاد امت اور اللہ کریم کی راہ میں مر مٹنے کے جذبہ سے ممکن ہے۔ ان کے جذبہ صادق ہی کا کرشمہ تھا کہ گو سرکاری خزانہ سرخ و سفید (سونا چاندی) سے خالی رہتا تھا مگر اسلام جزیرہ عرب سے نکل کر شام، عراق، ایران اور مصر کی حدود میں داخل ہو گیا، بڑے بڑے جابرہ کی گردنیں عظمت اسلام کے سامنے جھک گئیں، اللہ کریم کا بول بالا ہوا اور کفار و مشرکین اطاعت کی گردن ڈالنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک مرتبہ کسی دور اندیش نے بچا کر رکھنے کی طرف ترغیب دلائی تو فرمایا:

أنی لا أعدّ للحادث الذی یحدث سوی طاعة اللّٰه ورسوله، وهی عدتنا التی بلغنا بها ما بلغنا. (عوض، بدوی عبداللطیف: النظام المالی الاسلامی المقارن، قاهرة ۱۳۹۲ھ، ۱۹۷۲م ص ۷۹)

ترجمہ: میں مستقبل کے حادثات کے لیے تو بچا اور تیار کر کے نہیں رکھتا۔ البتہ (بچانے یا نہ بچانے میں) اللہ کریم اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری ضرور کرتا ہوں اور دراصل یہی وہ ہماری جمع جتھا ہے جس نے ہمیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

البتہ تنخواہوں اور مقررہ وظائف کے لیے رقم محفوظ رکھی جاتی تھی۔ مؤرخین کے مطابق مدینہ منورہ کے مرکزی

سرکاری خزانہ یا مالی مرکز:

اسلام کے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کے لیے حکومتِ ربانی (خلافت اسلامی) کے لیے خزانۂ سرکاری کا وجود ضروری ہے اور اس خزانہ کے محفوظ مقام کو ”بیت المال“ کہتے ہیں اور اگرچہ کبھی کبھی بیت المال کا اطلاق وسعت کے ساتھ پورے مالی نظام پر بھی کر دیا جاتا ہے تاہم عام اصطلاح کے مطابق مرکزی خزانہ کے محفوظ مقام ہی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

مرکزی بیت المال کی صوبہ دار اور ضلع دار شاخیں بھی ہوتی ہیں اور ان سے مقامی ضروریات کی کفالت مرکز کے احکام کے مطابق انجام پاتی ہے ”بیت المال“ قلمرو خلافت کی ان تمام آمدنیوں کا حامل ہوتا ہے جو اسلامی احکام کے مطابق خزانۂ سرکاری میں داخل ہونی چاہئیں اور اسی طرح وہ ان تمام مصارف کا بھی کفیل ہے جو حاجات و ضروریات اجتماعی و انفرادی کے پورا کرنے کے لیے ضروری قرار دیئے جائیں۔ اسی لیے بیت المال کی آمدنی اور اس کے ”مصارف“ کے اصولوں کو اسلامی نظامِ حکومت میں متعین کر دیا گیا ہے البتہ ان کی تفصیلات اور اصول کے ماتحت جزئیات کا انطباق (Application) خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اصولی طور پر ان مدات کی فہرست اس طرح سے دی جا سکتی ہے:

بیت المال میں اس مقصد کے لیے مجموعی رقم تین کروڑ درہم سالانہ رکھی جاتی تھی۔ (یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب بن واضح الکاتب: تاریخ البلدان، ۱۷۵/۲) آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیت المال کے باقاعدہ رجسٹرز اور دیوان مرتب کرائے۔

اس زمانہ میں بیت المال سرکاری خزانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کا مرکزی بنک بھی تھا جو سوائے سود پر قرض دینے، تجارتی کاروبار کے لیے قرضوں کا اجراء کرنے اور نوٹ جاری کرنے کے باقی تمام وہ فرائض (Functions) پورے کرتا تھا جو آج کل کے مرکزی بنک کرتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اپنی مزاجا سادگی اور کفایت شعاری کے بخلاف بیت المال کی عمارتیں مضبوط اور شاندار بنوائیں۔ کوفہ میں بیت المال کے لیے ایک محل تعمیر کرایا۔ ایک بار وہاں چوری کا خطرہ محسوس کیا گیا تو اس عمارت کو آپ کے حکم سے مسجد سے ملا دیا کہ وہ نمازیوں کی وجہ سے آباد رہے گی اور چوری کا خطرہ نہیں ہو گا۔ (طبری: تاریخ، تذکرہ آبادکاری کوفہ)

مداتِ آمدنی	مداتِ صرف
① عشر	① رفاہِ عامہ
② خراج	② وظائف تعلیمی و فوجی و انفرادی
③ جزیہ	③ مصارف ثمانیہ
④ زکاۃ	④ شعبہ ہائے حکومت کے مصارف
⑤ صدقات	
⑥ فیٔ	
⑦ خمس	
⑧ ضرائب	
⑨ کراء الارض	
⑩ عشور	
⑪ وقف	
⑫ اموالِ فاضلہ	

مثلاً مسلمانوں کی مملوکہ آراضی کے ایک بڑے حصہ کی سالانہ مالگذاری ''عشر'' کہلاتی ہے اور ذمیوں کی آراضی کی سالانہ مالگذاری کا نام ''خراج'' ہے۔ اسی طرح سرکاری اراضی کی آمدنی ''کراء الارض'' (لگان) کے نام سے موسوم ہے اور مسلمانوں کے اموالِ نقود، اموالِ تجارت اور بہائم کے ریوڑ پر عائد شدہ سالانہ مقررہ ٹیکس کو ''زکوٰۃ'' اور غیر مقررہ کو ''صدقات'' کہا جاتا ہے اور ذمیوں پر سالانہ مقررہ ٹیکس کو ''جزیہ'' کہتے ہیں اور بغیر جنگ کیے حاصل شدہ مالِ غنیمت کو ''فیٔ'' (Fay) کہا جاتا ہے اور جنگ کے ذریعہ حاصل شدہ مالِ غنیمت (Spoils of War) کا مقرر حصہ اور معدنیات اور پوشیدہ خزانہ (رکاز) کی مقررہ رقم ''خمس'' (5th) کے عنوان سے معنون ہے، اور مستامن حربی یا ذمی یا مسلمان کے اموالِ تجارت کی درآمد برآمد کے محصول (ڈیوٹی) کو ''عشور'' (Customs) کہتے ہیں اور رفاہِ عامہ اور وقتی ضروریات

کے لیے عائد شدہ ٹیکسوں کا نام "ضرائب" (Extra Taxes) ہے، اور سرکاری معدنیات اور متفرق آمدنی کو "اموال فاضلہ" کہا جاتا ہے اور مذہبی اوقاف کی آمدنی "اموال وقف" (Properties of Endowments) سے موسوم ہے۔

اور یہ تمام مدات بیت المال کی آمدنی شمار ہوتی ہے اور بیان کردہ انواع مصارف پر خرچ کی جاتی ہیں اور اس طرح اسلام کے معاشی نظام کا اہم جزء قرار پاتی ہیں۔ لہذا ان مدات کی مختصر مگر ضروری تفاصیل محتاج بیان ہیں تاکہ بیت المال کے آمد و صرف کی تشریح میں مدد مل سکے۔

سوسائٹی (معاشرہ) کے افراد اور بیت المال:

بیت المال سے متعلق مدات کی تشریح سے قبل اس حقیقت کا جاننا ضروری ہے کہ اسلام کا "نظام اجتماعی" سوسائٹی کے جن افراد پر حاوی ہے ان کی تفصیلات کیا ہیں؟

معاشرہ کے لیے اسلامی تعلیمات کی نمایاں خصوصیات:

❶ اسلام کی بنیادی تعلیم پر اگر دور رس نظر ڈالیے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ وہ ایک ایسا مذہب نہیں ہے جو صرف چند روحانی اور اخلاقی عبادات کی تعلیم دے کر کسی شخص یا جماعت کو مرتاض (Sickish) اور زاہد شب زندہ دار بنا دینا چاہتا ہے، نہیں بلکہ وہ ایک ایسے انقلاب کا داعی ہے جو عبادات و اخلاق کی برتری کے ساتھ ساتھ نظامِ اجتماعی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور اس لیے اس نے حکومت، سیاست، معیشت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئے قسم کا انقلاب برپا کر دیا ہے۔

❷ وہ کہتا ہے کہ مذہب، سوسائٹی اور سماج کے بنائے ہوئے چند قوانین کا نام نہیں ہے کہ وہ حالات اور رجحانات کی تبدیل کے ساتھ بدلتے رہیں، بلکہ وہ ایسے چند بنیادی اصول کے مجموعہ کا نام ہے جو خالقِ کائنات کے فرمودہ ہیں اور جن میں تبدیلی

کا مطلق امکان نہیں ہے۔ مثلاً خدا کی ہستی اور توحیدِ خالص کا اقرار، رسالت، کتبِ سماوی، ملائکۃ اللہ، آخرت، حشر و نشر اور جزاء و سزا پر اس کے بتائے ہوئے نظریہ کے مطابق ایمان و اعتقاد۔

❸ اسی طرح وہ حکومت کے متعلق یہ اعلان کرتا ہے کہ کائنات انسانی میں کسی انسان یا انسانی جماعت کو براہِ راست یہ منصب حاصل نہیں کہ وہ حاکمیت کا دعویٰ کرے بلکہ خدا تعالیٰ جس طرح خالقِ کائنات ہے اسی طرح حاکم علی الاطلاق (Absolute Ruler) بھی ہے اور حکومت بلا شرکت صرف اسی کے لیے ہے ''اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ،،[1] البتہ خلیفہ، امیر یا امام خدا کی زمین میں اس کی حکومت کی نیابت انجام دیتا اور خدائے تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب کہلاتا ہے، اور اسی لیے وضع قوانین کا مسئلہ اس کے اور جمہور کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ صرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔[2]

---

(۱) (اقتدار صرف اللہ کریم ہی کے لیے ہے) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امیر یا خلیفہ ''حاکم'' نہیں ہوتا اور اس کا ''حکم''، حکم نہیں ہے کیونکہ یہ عقیدہ غلط اور خوارج کی پیداوار ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اساسی اور بنیادی ''وضع قوانین'' صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں جن میں تغیر ناممکن، اور خلیفہ و حاکم ان کی تنفیذ پر مامور ہے۔ اور ان اساسی قوانین کی معرفت کا ذریعہ ''قرآن'' (اور اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) ہے)

(۲) یہ جو کہا گیا ہے کہ وضع قانون کا مسئلہ خلافتِ الٰہیہ میں صرف خدائے بزرگ و برتر اور اس کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی انسان کو اس میں دخل نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قوانین مذہب و سیاست و معیشت کے اساسی اصول کا منبع قرآن عزیز اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خلیفہ کو اس بارہ میں قوت تنفیذ (Power of Implementation) کے علاوہ واضع قانون کی حیثیت کسی طرح حاصل نہیں ہے چہ جائیکہ دوسرے کسی شخص کو۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زمانہ کے نت نئے مقتضیات (Requirements) اور تغیر کوائف و حالات (Change of Conditions & Situations) کے باوجود خلیفہ یا ارباب حل و عقد (Counsellors) ان کے لیے کوئی اقدام نہیں کر سکتے، ضرور کر سکتے ہیں ورنہ تو ''اجتہاد'' اور استنباط کا دروازہ مسدود ہو جاتا حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اسلام میں قیاس صحیح (Right Analogy) اور اجتہاد کو بہت اہم جگہ حاصل ہے۔

اور اس کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اصول اور اساسی قوانین میں ادنی سا

۴ البتہ نیابت کے منصب کے پیش نظر اس کو اور اہل حل و عقد (مجلس شوری) کو مخصوص بنیادی قوانین کے ماتحت حالات و حوادثات کے پیش نظر استنباط (Inference) و اجتہاد کا حق ہے اس لیے کہ دراصل یہ قانون کی "وضع" نہیں ہے بلکہ اصول پر جزئیات و واقعات کا انطباق (Elicitation) ہے قرآن عزیز میں ایسے ہی مواقع کے لیے ارشاد ہے:

۱ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾﴾ [1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور جو تم میں سے صاحب حکم و اختیار ہوں ان کی پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو (یعنی اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے) تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول (قرآن و حدیث) کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔

بھی تغیر نہیں ہو سکتا۔ ان ہی قوانین کی روشنی میں ایسی جزئیات و تفصیلات اور ایسے احکام استخراج و استنباط (Derivation & Induction) کیے جائیں جو ایک جانب تو ان اساسی اصول کے ماتحت ہوں اور دوسری جانب مقتضیاتِ وقت اور حادثات (Exigencie of Time & Incidents) کا بہترین حل کرتے ہوں۔

چنانچہ اسلامی علوم میں "علم الفقہ" اسی نظریہ کا عملی نشان ہے اور اگر اسلام کے بیان کردہ شرائط کے مطابق "خلیفہ" کا انتخاب ہوا ہے تو اس کو اس کے اہل حل عقد (مجلس شوری) کو یہ حق "اجتہاد" و "استنباط" (Interpretation & Inference) ہر وقت حاصل ہے بشرطیکہ وہ اس حکم ربانی کو پیشِ نظر رکھیں۔

﴿فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ﴾ (سورة النساء (٤): ٥٩)

ترجمہ: اور اگر تم جھگڑ بیٹھو کسی معاملے میں تو پھر اس کو رجوع کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب (یعنی قرآن و حدیث کو حکم بناؤ)۔

(۱) سورة النساء (٤): ٥٩

❹ ﴿ وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ ٱلْأَمْنِ أَوِ ٱلْخَوْفِ أَذَاعُواْ بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى ٱلرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُوْلِى ٱلْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ ٱلَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور جب ان لوگوں کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے تو یہ اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں اگر یہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے اور لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحبِ حکم و اختیار ہیں پیش کرتے تو جو (اصحاب علم و نظر) بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے۔

❺ اور اسی طرح وہ معاشرت و معیشت کے اساسی اصول بیان کرتا ہے اور اعتقادیات عبادات، معاملات، سیاسیات، عمرانیات اور معاشیات سے متعلق ان مجموعی اساسی اور بنیادی اصول کے نظامِ اجتماعی کا ہی نام "دین اسلام" ہے ﴿ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَـٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ ﴾ (۲) جو فرد اور جماعت دونوں کی انفرادی اور اجتماعی راہنمائی کا تنہا کفیل ہے اور دنیا کے تمام نظام ہائے اجتماعی سے الگ اپنی شاہراہِ مستقیم اور ایک انقلابِ عظیم کا داعی اور مناد (Declarator) ہے۔

مسلم معاشرہ (سوسائٹی) کے افراد:

سو جب یہ اسلام اپنے نقشہ کے تمام خانوں کو پورا کرتا ہوا دنیا کے سامنے آتا ہے تو بلاشبہ مذہب، حکومت، سیاست، معاشرت، غرض ہر شعبۂ زندگی میں انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں سے الگ ایک نظام پیش کرتا ہے اور اگرچہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ "خدائے تعالیٰ کا یہ پسندیدہ نظام اسلام" کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے کوئی انوکھا اور اجنبی نظام نہیں ہے بلکہ اس کی صداقت کی یہ آواز آدم علیہ

---

(۱) سورۃ النساء (٤): ۸۳

(۲) اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین (طریقہ) پسند کرے گا وہ اس کی طرف سے (اللہ کریم کے ہاں ہرگز قبول نہیں ہوگا)۔ (سورۃ آل عمران (۳): ۸۵)

السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک برابر کسی نہ کسی پیغمبر و رسول کے ذریعے کائنات کو سنائی جاتی رہی ہے اور آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچ کر تمہارے سامنے موجود ہے، تاہم اس کے قبول و انکار میں دنیائے انسانی دو حصوں پر تقسیم ہو جاتی ہے۔

مسلم:

ایک جماعت اس نظام "اسلام" کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سپرد کر دیتی ہے اور اس کے انقیاد و اطاعت ہی میں اپنی فلاح و نجاح (نجات) یقین کرتی ہے۔ اس جماعت کے افراد کو اسلام کی اصطلاح میں "مسلم"[1] کہتے ہیں۔

کافر:

اور دوسری جماعت اس سے انحراف (Deviates) کرتی اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کر دیتی ہے اور اس جماعت کے افراد "کافر"[2] کہلاتے ہیں۔

پھر اسلام کا اجتماعی نظام جب اپنے اقتدار اعلیٰ (حکومت و خلافت) کی شکل میں کائنات کی راہنمائی کے لیے سامنے آتا ہے تو بے تعلقی کے باوجود "جماعت کافرین" کا تعلق اسی نظام کے ساتھ ان دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ضرور قائم ہو جاتا ہے۔

یا یہ گروہ اسلام کے اقتدارِ اعلیٰ (حکومت الٰہیہ) کا مقابل ہو جاتا اور متوازی اقتدار قائم کر لیتا ہے اور یا پھر مذہبی نظام کے علاوہ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو قبول کرتے ہوئے اس کے اقتدار اعلیٰ کے زیر نگیں آجاتا ہے اور اس کی سرپرستی کو تسلیم کر لیتا ہے۔

---

(۱) لفظ مسلم "سلم" سے ماخوذ ہے جس کے معنی سپردگی اور اطاعت کے بھی ہیں اور صلح و آشتی کے بھی۔

(۲) لفظ کافر "کفر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی انکار کے ہیں یعنی "منکر" اور چونکہ منکر ہر قسم کے انکار پر کہا جا سکتا ہے اس لیے اسلام کے نظام کے منکر کے لیے کافر کی اصطلاح قرار پائی۔

پس ان میں سے جو جماعت خلافت کے متوازی نظام قائم کر لیتی ہے وہ اگر اسلامی اقتدار اعلیٰ (خلافت سے) ٹکراتی رہتی ہے تو وہ "حربی" (Foe) کہلاتی ہے اور اس کے دائرۂ اقتدار کو "دارالاسلام" (Land of the Muslims) کے مقابلہ میں "دارالحرب" (Land of the Foes) کہا جاتا ہے۔

معاہد اور مسالم:

اور ان میں سے جس جماعت نے اپنے متوازی نظام کے باوجود اسلام کے اقتدارِ اعلیٰ سے مقہور و مغلوب ہو کر کوئی معاہدہ یا صلح کا معاملہ کر لیا ہے تو وہ کافر ہونے کے باوجود "معاہد" (Ally) اور "مسالم"[1] کہلاتی ہے۔

مستامن:

اور دارالحرب کی ان دونوں جماعتوں کے اگر بعض افراد تجارت یا بعض وقتی ضروریات کے لیے خلیفہ یا اس کے عمال کی اجازت سے "دارالاسلام" میں آتے اور چند روز قیام کرتے ہیں تو ان کو "مستامن"[2] کہتے ہیں۔

اور جو جماعت اسلام کے اقتدار اعلیٰ سے شکست کھا کر یا بعض دوسرے عوارض کی بناء پر اپنے متوازی نظام کو چھوڑ کر اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو قبول کر لیتی اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کی سرپرستی منظور کر لیتی ہے وہ "ذمی"[3] کہلاتی ہے۔

منکرین اسلام اور مسلمانوں کے تعلقات کے بنیادی اصول

منکرین اسلام کی ان جماعتوں کے متعلق قرآن عزیز میں مستقل احکام ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق زیادہ تر "نظام حکومت" کی بحث سے متعلق ہے اس لیے یہاں

(۱) مسالم، سلم بمعنی صلح سے ماخوذ ہے اور صلح رکھنے والے کو (مسالم یا معاہد- معاہدہ صلح کرنے والا) کہتے ہیں۔

(۲) مستامن: امن چاہنے والا۔

(۳) ذمی: مسلمانوں کی ذمہ داری میں آجانے والا۔

صرف چند امتیازی اصول نقل کر دینا ہی کافی ہیں تاکہ ان جماعت کفار کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔

(الف) حربی کافر:

کافر جماعت اگر "حربی" ہے اور اسلامی اقتدار اعلیٰ کے لیے مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے یا اس کے ساتھ برسر جنگ ہے تو اس کے خلاف "جہاد" فرض ہے اور اس کے مفسدانہ اقتدار کو شکست وریخت کر دینا ضروری ہے۔ اس جماعت کے لیے سورۃ توبہ میں یہ حکم ہے:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾ (۱)

ترجمہ: پس مارو (حربی) مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ، اور پکڑو اور گھیرو، اور ان کی تاک میں ہر جگہ بیٹھو۔

(ب) حربی مستامن:

اور حربی مستامن کے لیے یہ ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ﴾ (۲)

ترجمہ: اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دے دے تاآنکہ وہ سن لیں اللہ کے کلام کو پھر پہنچادو اس کو اس کے امن کی جگہ۔

(ج) معاہد و مسالم:

اور "معاہد و مسالم" کے متعلق یہ حکم ہے:

﴿وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ

---

(۱) سورۃ التوبۃ (۹):۵

(۲) سورۃ التوبۃ (۹):۶

ٱلْعَلِيمُ ﴿٦١﴾ [1]

ترجمہ: اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں تو اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بھی صلح کے لیے جھک جا، پھر خدا پر بھروسہ رکھ بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

﴿ إِلَّا ٱلَّذِينَ عَـٰهَدتُّم مِّنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْـًٔا وَلَمْ يُظَـٰهِرُوا۟ عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوٓا۟ إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ﴾ [2]

ترجمہ: مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا اور جنہوں نے وفاءِ عہد میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی۔ ان کے ساتھ مدتِ معاہدہ کے ختم ہونے تک تم اپنے عہد پر قائم رہو۔

(د) ذمی:

اور "ذمی" کے لیے یہ کہا گیا ہے:

﴿حَتَّىٰ يُعْطُوا۟ ٱلْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَـٰغِرُونَ ﴿٢٩﴾﴾ [3]

ترجمہ: ان سے برابر لڑتے رہو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ دینے پر آجائیں (یعنی اگر ذمی ہونا قبول کرلیں تو پھر ان پر تلوار نہ اٹھائی جائے۔)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے:

لهم ذمة الله وذمة رسوله [4]

---

(۱) سورۃ الانفال (۸): ٦١

(۲) سورۃ التوبۃ (۹): ٤

(۳) سورۃ التوبۃ (۹): ٢٩

(۴) ابو عبید: کتاب الاموال، طبع ١٣٥٢ھ، باب الذمی

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور پُر فتوح میں جتنے بھی غیر مسلموں کے علاقہ جات فتح کیے ان سب کے تمام باسیوں ـــــ جو اسلامی ریاست کے ذمی بن گئے ـــــ کو بقاعدہ تحریری معاہدہ امان لکھ کر دیا

ترجمہ: ذمی ہو جانے کے بعد وہ (کافرین) اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں آ گئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا:

انما قبلوا عهد الزمة لتكون أموالهم كأموالنا و دمائهم كدمائنا الخ.[1]

ترجمہ: انہوں نے ذمی ہونا قبول ہی اس لیے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح محفوظ ہو جائیں۔

ان آیات کے علاوہ کفار کے ساتھ تعاون و مواسات اور عدم تعاون و عدم مساوات (Non – CO- Operation & Un equality) کے لیے فیصلہ کن سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت ہے۔

﴿لَا يَنْهَىٰكُمُ ٱللَّهُ عَنِ ٱلَّذِينَ لَمْ يُقَٰتِلُوكُمْ فِى ٱلدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوٓا۟ إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُقْسِطِينَ ﴿٨﴾

کرتے تھے۔ مثلاً طبری رحمہ اللہ نے آپ کے ان معاہدات جو آپ نے جورجان آذربائجان، موقان وغیرہا کے باشندوں کے ساتھ کیے ان کی مشترکہ عبارت نقل کی ہے:

لهم الامان على انفسهم واموالهم وشرائعهم. (تاریخ: صفحہ ۲۶۲۳، ۲۶۶۲، ۲۶۵۸)

ترجمہ: ان کے لیے اُن کی جانوں، اُن کے اموال اور اُن کے عقائد کے لیے امان ہے۔

(۱) برهان شرح مواهب الرحمٰن: ۳۷۸/۲ قلمی —— زیلعی، جلال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف: نصب الرایة لاحادیث الهدایة، دار النشر الکتب الاسلامیة لاهور، ۳۸۱/۳.

اسی مقام پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک دوسرا قول درج ہے۔ فرماتے ہیں:

من كانت زمتنا فذمته كذمتنا وديته كديتنا. (رواه دار قطنی کما فی نصب الرایة، حواله مذکور)

ترجمہ: جو غیر مسلم ہمارا ذمی بن جائے تو اس کا خون ہمارے خون کی مانند ہو جاتا ہے اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح۔

إِنَّمَا يَنْهَىٰكُمُ ٱللَّهُ عَنِ ٱلَّذِينَ قَـٰتَلُوكُمْ فِى ٱلدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَـٰرِكُمْ وَظَـٰهَرُوا۟ عَلَىٰٓ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٩﴾ [۱]

ترجمہ: اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں، صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم میں سے دین کے بارے میں لڑتے ہوں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہارے نکالنے میں مدد کی ہو اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ گنہگار ہوں گے۔

حضرت مولانا اشرف علی [۲] صاحب تھانوی رحمہ اللہ "بیان القرآن" میں آیت "لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ" کے تحت میں فرماتے ہیں:

"کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں ① موالات یعنی دوستی ② مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی ہو ③ مواساۃ یعنی احسان و نفع رسانی۔ ان معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ موالاۃ (دلی دوستی) تو کسی حال میں

(۱) سورۃ الممتحنۃ (۶۰):۸، ۹

(۲) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ حکیم الامت مشہور محدث، عارف باللہ، فقیہہ اور بزرگ تھے۔ آپ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر ہند میں ایک مقتدر رئیس شیخ عبدالحق رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے تھے۔ آپ کے اساتذہ کرام میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ اور مولانا محمد یعقوب رحمہ اللہ قابل ذکر ہیں۔ آپ نے فن تجوید وقرأت حرم مکی کے استاد قاری محمد عبداللہ رحمہ اللہ سے سیکھا۔ آپ نے ۸۰۰ (آٹھ سو) کے لگ بھگ تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں سے بعض دو صفحات پر مشتمل ہیں تو بعض کئی مجلدات پر۔ مشہور تصانیف میں تفسیر بیان القرآن، احکام القرآن، جمال القرآن، بہشتی زیور (بہشتی گوہر) تکمل امداد الفتاوی، حیاۃ المسلمین وغیرہا ہیں۔ آپ نے ۱۶، ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ بمطابق ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب وفات پائی۔ آپ کے طلبہ اور مریدین کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کرتی ہے۔

جائز نہیں اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے: ایک دفعِ ضرر کے واسطے، دوسرے اس کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے تیسرے اکرامِ ضیف کے لیے اور مواساۃ (تعاون) کا حکم یہ ہے کہ اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز سورۃ ممتحنہ کی آیت ﴿لَا يَنْهَىٰكُمُ ٱللَّهُ ...... هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ۝٩﴾ میں اس کی تصریح ہے۔[1]

الحاصل اسلام کے معاشی نظام اور اس کے سرکاری خزانہ "بیت المال" کا کسی نہ کسی صورت میں ان تمام جماعتوں کے افراد کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور اس کی آمدنی اور خرچ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ان کی وابستگی ہے اور اسی لیے بیت المال کی مداتِ آمد و صرف کی تشریح سے قبل ان کا تذکرہ ضروری ہوا۔

بیت المال کی مداتِ آمدن کی تشریح

دراصل پیشِ نظر مسئلہ مداتِ آمدنی کی تشریح تھا اور مسطورہ بالا مبحث اسی تقریب سے ذکر کیا گیا، لہٰذا اب اصل مسئلہ قابلِ توجہ ہے۔

عشر (Ushr - Tithe):

اگر کوئی قوم مسلمان ہو جائے تو ان کی زراعتی زمین، عرب کی زمین، مجاہدین اور غانمین کے حصہ میں آئی ہوئی زمین، وہ افتادہ زمین جو کسی مسلمان نے آباد کی ہو اور کسی لاوارث ذمی کی موت پر مسلمان کے قبضہ میں آئی ہوئی زمین عشری زمین کہلاتی ہے، اور عشر اس حصہ مقررہ کا نام ہے جو زکوٰۃ کی طرح زمین کی پیداوار پر واجب ہوتا اور پیداوار ہی میں سے لیا جاتا ہے۔ پس اگر عشری زمین ندی، تالاب یا دریا سے سیراب شدہ ہے یا بارانی ہے یعنی صرف بارش کے ذریعہ پیداوار ہوئی ہے تو اس زمین کی

---

(۱) تھانوی، مولانا اشرف علی، بیان القرآن، ۱۱/۲، ۱۲ تفسیر سورۃ آل عمران (۳): آیت نمبر ۲۸

پیداوار سے دسواں حصہ لیا جاتا ہے اور اگر چاہی ہے یعنی کنوئیں کھود کر پانی دیا گیا ہے تو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جاتا ہے۔[۱]

''عشر'' کے وجوب کے لیے قرآن عزیز میں نص صریح وارد ہے ''وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ''[۲] اور تم ادا کرو (پیداوار) زمین کا حق اس کے کٹ جانے کے وقت اور حدیث صحیح میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔

عن عبداللّٰہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنہ قال: فیما سقت السماء والعیون لو کان عشریا العشر، وما سقی بالنضج نصف العشر.[۳]

ترجمہ: حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس زمین کی آبپاشی بارش، چشموں یا ندیوں سے ہو اس کی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جائے گا اور جس کی پانی کھینچ کر (یعنی

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب حد ارض العشر من ارض الخراج.

فقہاء اسلام نے اس فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

لان المؤنة تکثر فیه وتقلّ فیما یسقی بالسماء او سیماً. (برهان الدین مرغینانی رحمه الله: الهدایة، ج ۱، کتاب الزکاة، زکاة الزروع والثمار)

ترجمہ: کیونکہ اس (چاہی یا ٹیوب ویل سے یا قیمتاً پانی لے کر سیراب کی جانے والی زمین) میں محنت زیادہ ہوتی ہے بخلاف اس زمین کے جو باراں (رحمت) یا نہر (کے مفت پانی) سے سیراب ہوتی ہے۔

(۲) امام قرطبی رحمہ اللہ (عبداللہ بن محمد بن احمد) کے مطابق ''وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ'' (اور کٹائی کے دن اس (زمین کی پیداوار کا حق ادا کیا کرو) سے مراد زمین کی پیداوار کی زکاۃ (عشر) مراد ہے۔ (قرطبی، عبدالله محمد بن احمد انصاری رحمه الله تعالیٰ: الجامع لاحکام القرآن، تفسیر سورة الانعام (٦)، آیت نمبر ١٤٣)

ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت سے مراد زمین کی پیداوار کی زکاۃ ہے۔ یہی رائے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اس آیت میں ''حَقَّهٗ'' سے مراد زمینی پیداوار کا عشر (1/10) اور نصف عشر (1/20) مراد ہے۔ (تفسیر طبری: ج ۱۲، تفسیر آیة مذکورہ)

(۳) صحیح الامام البخاری، کتاب الزکاة

کنوئیں کھود کر) آبپاشی کی گئی ہو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جائے گا۔

حدیث میں بیان کردہ فرق کی بنیاد یہ ہے کہ اگر زمین کی آبپاشی میں خارجی محنت و اجرت کو دخل نہیں ہے بلکہ پانی کا حصول بغیر محنت و اجرت کے ہوا ہے تو اس پیداوار پر اجتماعی ٹیکس (Collective Tax) زیادہ عائد ہونا چاہیے اور اگر زمین میں ہمہ قسم کی محنت ور بیج کے خرچ کے علاوہ آبپاشی میں بھی سخت محنت کرنی پڑے جیسا کہ مثلاً کنوئیں کھود کر پانی دینا، نہر کے پانی پر ٹیکس ادا کر کے پانی دینا، کنوئیں کھود کر چرس وغیرہ سے کھینچ کر پانی دینا یا ٹیوب ویل پر محصول ادا کر کے آبپاشی کرنا۔ تو ان صورتوں میں اجتماعی ٹیکس (Collective Tax) کی مقدار نصف رہ جاتی ہے۔ اور دسویں حصہ پیداوار کی بجائے اس کو بیسواں حصہ دینا پڑے گا۔[1]

---

(۱) جیسا کہ عنقریب ذکر آئے گا اسلامی نظام معاشی میں نہروں کے پانی پر موجودہ طریقہ کے مطابق محصول نہیں لیا جاتا تھا اس لیے عام کتب فقہ میں میں نہری زمین پر بھی دسواں حصہ عشر بیان کیا گیا ہے لیکن آج کے زمانہ میں نہری اور چاہی زمینوں کا ایک ہی حکم ہے پس ابو داؤد کی روایت میں جو فی السماء والعیون والانہار ہے اس نہر سے ندیاں نالے مراد ہیں اور یا ایسی نہریں جن کے پانی پر محصول نہیں ہے۔

عشر کا نصاب: فاضل مصنف رحمہ اللہ نے یہاں مینی پیداوار کے نصاب پر بحث نہیں کی، غالباً اس لیے کہ احناف کے نزدیک ہر قسم کی زمینی پیداوار قلیل و کثیر پر عشر ہے۔ یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک (Virdict) ہے۔ البتہ صاحبین (امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ) دونوں کا مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کے ساتھ ہے کہ زمینی پیداوار پر اس وقت عشر واجب ہوگا، جب ان کی مقدار پانچ وسق ہو۔ ایک تحقیق کے مطابق ایک وسق آٹھ صاع کے برابر، ایک صاع آٹھ رطل کے برابر، جبکہ ایک رطل چونتیس تولے ڈیڑھ ماشہ کے برابر ہوتا ہے، لہٰذا پانچ وسق اسی تولہ کے سیر کے حساب سے پچیس من ساڑھے بارہ (۱۲/۱/۲) سیر کے برابر ہوتے ہیں گویا جب زمینی پیداوار کی مقدار ۲۵ من ۱۲/۱/۲ (ساڑھے بارہ) سیر (تقریباً ۵۰ء ۶۷۳ کیلو گرام) ہوگی تب اس پر عشر لاگو ہوگا۔

مگر حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے کہ زمین کی ہر قسم کی پیداوار قلیل ہو یا کثیر پر عشر ہوگا۔ اگر صرف معاشی نقطہ نظر (Economic Point of View) سے دیکھا جائے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک غریبوں کی کفالت (Maintenance)، گردش دولت اور منصفانہ تقسیم کی راہیں ہموار کرتا ہے، اور معاشرتی زاویہ نظر سے دیکھیں تو یہ غیر فطری اونچ نیچ کے خاتمہ اور احسان و مروت کے قریب ترین ہے۔ غالباً اسی لیے تمام متاخرین فقہاء احناف کا فتوی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہے کہ ہر زمینی پیداوار قلیل ہو یا کثیر سے عشر =

خراج:

اور جن ممالک پر اسلام کا غلبہ ہو گیا اور خلیفہ نے وہاں کی زمینیں مفتوحین کفار ہی کے قبضہ میں باقی رہنے دیں اور جن ممالک کفار سے صلح ہو گئی اور وہ حکومت اسلامی کے ذمہ اور عہد میں داخل ہو کر ذمی بن گئے۔ ان کی زمین ''خراجی'' کہلاتی ہے اور خلیفہ ان زمینوں پر جو محصول (مالگزاری) مقرر کر دیتا ہے اس کو خراج کہا جاتا ہے۔(۱)

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''خراج'' دراصل ''فئ'' کی ہی ایک قسم ہے (۲) کیونکہ اگر معمولی جنگ کے بعد کفار مغلوب ہو کر صلح کر لیں تو وہ مال بھی فئ میں ہی شمار ہوتا ہے تو گویا جب غلبہ اسلام کے بعد خلیفہ نے صلح کے ساتھ کفار کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم کرنے کی بجائے ان پر لگان (ٹیکس) مقرر کر کے ان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا تو یہ ٹیکس بھی ''فئ'' ہی میں شمار ہو گا۔ پس اس صورت میں ''خراج'' کا وجود بھی قرآن عزیز کی اس نص کے تحت میں آجاتا ہے۔

﴿مَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنْ أَهْلِ ٱلْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ كَىْ لَا يَكُونَ دُولَةًۢ بَيْنَ ٱلْأَغْنِيَآءِ مِنكُمْ﴾ (۳)

ترجمہ: جو مال لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں (کفار) سے سو وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور قرابت والوں کے لیے اور یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کے لیے تاکہ وہ تم میں

لیا جائے گا۔ اسی لیے فاضل مصنف رحمہ اللہ نے یہاں ''نصاب عشر'' کی بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔ (واللہ اعلم)

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الفئ والخراج. خراج کی کچھ تفاصیل باب نمبر ۷ میں آرہی ہے۔ وہاں ملاحظہ کریں۔

(۲) حوالہ بالا

(۳) سورۃ الحشر (۵۹):۷

سے دولت مندوں کے درمیان ہی دائر اور محصور نہ رہے۔

جزیہ (Jizia- Poll Tax):

اہل کتاب اور مشرکین عجم [۱] اگر مغلوب و مقہور ہو کر اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیں اور سالانہ تھوڑا سا ٹیکس ادا کر کے اس شرط پر اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آجائیں کہ حکومت ان کے جان مال اور آبرو کی محافظ ہے تو ایسے ٹیکس کو "جزیہ" [۲]

---

(۱) مشرکین عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے یا اسلامی جہاد کے مقابلہ میں مارے جاچکے تھے اور بعد ازاں جزیرۃ العرب میں اسلام کے علاوہ کسی مذہب کو روا نہیں رکھا گیا۔

(۲) جزیہ کی یہ رقم صرف تندرست، کمانے والے خوشحال، عاقل، بالغ اور آزاد مردوں سے لی جاتی رہی ہے۔ اور یہ جزیہ ان کی جان، مال اور عقیدہ کی حفاظت کے لیے لیا جاتا ہے۔ ذمی اسلامی ریاست کی دفاع کے لیے فوجی ذمہ داریوں سے مُستثنیٰ رہے ہیں، البتہ جن ذمیوں نے فوجی خدمات انجام دیں ان سے جزیہ نہیں لیا گیا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ حکم نامہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو انہوں نے ۱۷ھ میں اپنے افسران کو لکھا:

يَسْتَعِينُوا بمن احتاجوا اليه من الاساورة و يرفعوا عنهم الجزاء. (تاریخ طبری: ۲۴۹۷)

ترجمہ: فوجی سواروں میں سے جن سے مدد لینے کی ضرورت ہو ان سے مدد لو اور ان کا جزیہ چھوڑ دو۔

حتی کہ کسی ذمی نے انفرادی یا بحیثیت قوم کسی سال مسلمانوں کے ساتھ دفاعی جنگ لڑی یا جہاد میں ان کی مدد کی تو ان کا اس سال کا جزیہ معاف کر دیا گیا۔ ۲۲ھ میں آذربائیجان فتح ہوا تو اہل شہر کو جو معاہدہ لکھ کر دیا اس میں یہ شرط بھی تھی۔

ومن حشر منهم فى سنة وضع عنه جزاء تلك السنة. (تاریخ طبری: ۲۲۶۵)

ترجمہ: جو لوگ کسی سال فوج کے ساتھ خدمت (یا تعاون) دیں گے، اس مال کا جزیہ ان سے نہیں لیا جائے گا۔

اسی طرح رعایت کا معاہدہ آرمینیہ اور جورجان کے باسیوں کو لکھ کر دی گئی۔ (تاریخ طبری: ص ۲۲۶۵)

جزیہ کی مقدار ذمیوں کی معاشی حالت کے پیش نظر گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ مثلاً جن ذمیوں کے پاس سونا ہوتا تھا ان پر سالانہ چار دینار اور جن کے پاس چاندی تھی اور خوش حال ہوتے تھے ان سے چالیس درہم لیے جاتے تھے۔ مگر بعد میں جب ان کی معاشی حالت اور اچھی ہو گئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے امیروں پر ۴۸ درہم فی کس، متوسط لوگوں پر ۲۴ درہم فی کس اور غریب مگر کمانے والے افراد پر ۱۲ درہم فی کس مقرر کیے۔ (ابو عبید، قاسم بن سلام: كتاب الاموال، طبع قاهرة، ۱۳۵۳ھ، ص ۳۹)

چونکہ جزیہ ذمیوں سے ان کی جان، مال اور عقیدہ کی حفاظت کا معاوضہ کے طور پر لیا جاتا تھا، یعنی اگر کبھی کسی موقع پر مسلمان حکومت ایسا نہ کر سکی یا اسے وہ مقبوضہ علاقہ چھوڑنا پڑتا تو جزیہ کی رقم واپس کر دی جاتی مثلاً =

کہتے ہیں۔

قرآن عزیز میں "جزیہ" کے متعلق یہ قانونی دفع بیان کی گئی ہے:

﴿ قَٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ ٱلْحَقِّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ حَتَّىٰ يُعْطُوا۟ ٱلْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَٰغِرُونَ ﴿٢٩﴾ ﴾[1]

ترجمہ: ان لوگوں سے جنگ کرو جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اس کو جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ قبول کرتے ہیں دینِ حق کو۔ ان لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر۔

زکوٰۃ (Zakat):

ساڑھے باون تولہ چاندی، ساڑھے سات تولہ سونا، مالِ تجارت اور مکانوں کے تجارتی کاروبار پر اگر ایک سال پورا گزر جائے تو اس مال میں سے چالیسواں حصہ نکال کر خدا کی راہ میں دینا "زکوٰۃ" کہلاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں پر یہ "ٹیکس" بہت اہم فریضہ ہے۔ اور ارکان اسلام میں سے اہم رکن، چنانچہ قرآن عزیز میں اداءِ زکوٰۃ اور فریضۂ زکوٰۃ کے احکام کو بار بار دہرایا گیا ہے کہیں ایمان باللہ کے ساتھ اس کا ذکر ہے کہیں آخرت کے ذکر کے ساتھ اور کہیں اقامت صلوٰۃ کے ساتھ

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کے دیہاتی عیسائیوں کو جزیہ کی رقم اس لیے واپس کر دی کہ ان کی فوج کو جنگی مصلحت سے اس علاقہ کو خالی کرنا پڑا اور اب مسلمان ان کی حفاظت کے قابل نہیں تھے۔ (امام مالك: المؤطا، كتاب الزكاة، باب الجزية)

جب ان ذمیوں میں سے کوئی اسلام کی دولت پر سرفراز ہو جاتا، اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا۔

(۱) سورة التوبة (۹): ۲۹

اور کہیں مستقل اسی کو قانونی دفعہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً:

❶ ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٦﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے تو میں (اس کو) ان لوگوں کے لیے لکھ لوں گا جو خدا سے ڈرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

❷ ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ (۲)

ترجمہ: اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔

❸ ﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴿٦﴾ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٧﴾﴾ (۳)

ترجمہ: اور خرابی ہے مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے (بھی) منکر ہیں۔

❹ ﴿وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ﴿٣٩﴾﴾ (۴)

ترجمہ: اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو تو ایسے ہی لوگ اپنے مال کو دگنا کرنے والے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الاعراف (۷) ۱۵٦

(۲) سورۃ البقرہ (۲): ٤٣

(۳) سورۃ حم سجدہ (٤١): ٦، ٧

(۴) سورۃ الروم (۳۰): ۳۹ زکاۃ کی بعض تفاصیل بالخصوص سونا چاندی کے نصاب کی جدید اور ان ان میں تعیین پر باب ۱۱ میں آرہی ہیں وہاں ملاحظہ کرلیں۔

اگر چوپایوں کے ریوڑ چراگاہوں میں چر رہے ہوں تو ان چوپایوں پر بھی زکاۃ واجب ہوتی ہے اور اسلامی شریعت نے ان کا نصاب جدا جدا مقرر کیا ہے جس کی تفصیل بخاری، کتاب الزکوٰۃ کے اس مکتوب گرامی میں درج ہے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ عامل بحرین کے نام تحریر فرمایا ہے۔(۱)

---

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. ھذہ فریضۃ الصدقۃ التی فرضھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین، والتی امر اللہ بھا رسولہ. فمن سئلھا من المسلمین علی وجھھا فلیعطھا ومن سئل فوقھا فلا یعط! فی اربع وعشرین من الابل فما دونھا من الغنم فی کل خمس شاۃ، فاذا بلغت خمسا وعشرین الی خمس وثلاثین ففیھا بنت مخاض انثی، فاذا بلغت ستا و ثلاثین الی خمس واربعین ففیھا بنت لبون انثی، فاذا بغت ستا واربعین الی ستین فیھا حقۃ طروقۃ الجمل، فاذا بلغت واحدۃ وستین الی خمس وسبعین ففیھا جذعۃ، فاذا بلغت ستا وسبعین الی تسعین ففیھا بنتا لبون فاذا بلغت احدی وتسعین الی عشرین ومائۃ ففیھا حقتان طروقتا الجمل، فاذا زادت علی عشرین ومائۃ، ففی کل اربعین بنت لبون وفی کل خمسین حقۃ، ومن لم یکن معہ الا اربع من الابل فلیس فیھا صدقۃ الا ان یشاء ربھا، فاذا بلغت خمسا من الابل ففیھا شاہ.

وفی صدقۃ الغنم فی سائمتھا اذا کانت اربعین الی عشرین ومائۃ شاۃ، فاذا زادت علی عشرین ومائۃ الی مائتین ففیھا شاتان، فاذا زادت علی مائتین الی ثلاثمائۃ ففیھا ثلاث شیاہ، فاذا زادت علی ثلاثمائۃ ففی کل مائۃ شاۃ، فاذا کانت سائمۃ الرجل ناقصۃ من اربعین شاۃ واحدۃ فلیس فیھا صدقۃ الا ان یشاء ربھا.

ولا تخرج فی الصدقۃ ھرمۃ ولا ذات عوار ولا تیس الا ماشاء المصدق. ولا یجمع بین متفرق ولا یفرق بین مجتمع خشیۃ الصدقۃ. وما کان من خلیطین فانھما یتراجعان بینھما بالسویۃ.

وفی الرقۃ ربع العشر فان لم یکن الا تسعین ومائۃ، فلیس فیھا شئ الا ان یشاء ربھا.

ترجمہ: اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے یہ فریضۂ زکوٰۃ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کریم کے حکم سے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔ جس مسلمان سے اس طریقہ کے مطابق زکوٰۃ طلب کی جائے اسے چاہیے کہ ادا کرے اور اگر اس سے زیادہ طلب کی جائے تو وہ نہ دے۔

اونٹ اگر چوبیس یا اس سے کم تعداد میں ہوں تو ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری دینا ہوگی۔ اور پچیس سے پینتیس اونٹوں تک اونٹ کا ایک سالہ مادہ بچہ اور چھتیس سے پینتالیس تک اونٹ کا دو سالہ مادہ بچہ اور چھیالیس سے =

یعنی ریوڑ کی زکوٰۃ میں اونٹوں کے ریوڑ میں پانچ سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے اور گائے بھینس کے ریوڑ میں تیس سے کم پر اور بھیڑ بکری کے گلہ میں چالیس سے کم پر زکوٰۃ

ساٹھ تک اونٹ کا سہ سالہ مادہ بچہ اور اکسٹھ سے پچھتر تک چہار سالہ اونٹنی اور چھہتر سے نوے تک اونٹ کے دو سالہ مادہ بچے اور اکیانوے سے ایک سو بیس سے زیادہ ہونے پر ہر چالیس اونٹوں پر اونٹ کا ایک دو سالہ مادہ بچہ اور ہر پچاس پر اونٹ کا ایک سہ سالہ مادہ بچہ اور جس کے پاس صرف چار اونٹ ہوں تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ الا یہ کہ ان کا مالک دینا چاہے۔ لیکن جب پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری دینا ہوگی۔

اور بکریوں کی زکوٰۃ یہ ہے کہ چرنے والی بکریوں میں اگر تعداد چالیس سے ایک سو بیس تک ہو تو ایک بکری دینا ہوگی اور ایک سو بیس سے دو سو تک دو بکریاں دینا ہوں گی اور دو سو سے تین سو تک تین بکریاں اور تین سو سے زائد ہونے کی صورت میں ہر سو بکریوں پر ایک بکری دینا ہوگی۔ اگر چرنے والی بکریاں چالیس نہ ہوں یعنی ایک بھی کم ہو تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے الا یہ کہ ان کا مالک دینا چاہے۔

صدقہ (زکاۃ) میں نہ تو بوڑھا جانور لیا جائے گا نہ عیب دار اور نہ ہی سانڈ لیا جائے گا ہاں محصل زکاۃ (Collector) چاہے تو لے سکتا ہے۔ زکاۃ کو واجب بنانے کے لیے نہ تو متفرق جانوروں کو (مجتمع اکٹھا) کیا جائے نہ زکاۃ سے بچنے کے لیے مجتمع جانوروں کو متفرق (الگ الگ) کیا جائے۔ جس مال میں دو (یا دو سے زائد بھی) شریک ہوں وہ اپنے اپنے حصہ کی زکاۃ انصاف کے ساتھ ادا کریں گے۔

چاندی میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے لیکن اگر کسی کے پاس صرف ایک سو نوے درہم ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ ہاں ان کا مالک اپنی مرضی سے دے سکتا ہے۔" (اسی امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے)

اسے احمد، ابو داؤد، نسائی اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی روایت کیا ہے دار قطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی اسناد صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں اور شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسے امام شافعی، بیہقی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی روایت کیا ہے، اور ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تحریر بالکل صحیح ہے اور ابن حبان رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ (نبیل الاوطار: ۱۰۷/٤)

رہی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث تو وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے لیے ایک تحریر تیار کی تھی جس میں درج تھا۔

فی خمس من الابل شاۃ و فی عشر شاتان. (الحدیث)

ترجمہ: پانچ اونٹوں پر ایک بکری اور دس پر دو بکریاں واجب ہیں۔"

اس حدیث میں بھی وہی مضمون ہے جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے۔ اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔ (المجموع: ۳۸۳/۵)

جمہور علمائے امت نے ان دونوں تحریروں کو قبول کیا ہے اور ان کے مقتضیات پر عملدرآمد کرتے رہے ہیں۔

نہیں ہے۔ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کو انفرادی طور پر صرف نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا بیت المال میں داخل کرنا ضروری ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ اس بارے میں ناطق ہے۔ (۱)

---

(۱) فاضل مؤلف رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جس فیصلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ زکاۃ و صدقات واجبہ اسلامی ریاست کے بیت المال کا حق ہے۔ آئمہ محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ اور مسلم مؤرخین نے اس فیصلہ کو اپنے اپنے انداز میں بڑے اہتمام سے نقل کیا ہے۔ آئیے شیخین حدیث ـــــ امام بخاری اور امام مسلم رحمہا اللہ تعالیٰ ـــــ کے الفاظ میں وہ بصیرت افروز جرأت مندانہ فیصلہ پڑھائے دیتا ہوں۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال: لما توفِی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، وکان ابو بکر رضی اللّٰہ عنہ، وکفر من کفر من العرب. فقال عمر رضی اللّٰہ عنہ: کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: أمرت أن أقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ، فمن قالھا فقد عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ، وحسابہ علی اللّٰہ؟

فقال ابو بکر رضی اللّٰہ عنہ: واللّٰہ لاقاتلن من فرق بین الصلٰوۃ والزکاۃ، فإن الزکاۃ حق المالِ. واللّٰہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ. فقال عمر رضی اللّٰہ عنہ: فو اللّٰہ ما ھو الا ان رأیت اللّٰہ قد شرح صدر ابی بکر رضی اللّٰہ عنہ للقتال، فعرفت أنہ الحق. (صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ. ریاض الصاحین، باب تاکید وجوب الزکاۃ. مسلم، صحیح ج ۱ کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کے خلافت کے منصب پر سرفراز) تھے، تو عربوں میں بعض (زکاۃ کا) انکار کر (کے مرتد بن) گئے (حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے خلاف اعلان جہاد کیا تو) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: آپ ان (منکرین زکاۃ) سے کیونکر قتال کریں گے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں: مجھے لوگوں سے (اس وقت تک) جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب تک وہ "لا الہ الا اللّٰہ" ـــــ اللہ کریم کے سوا کوئی معبود نہ ہونے ـــــ کا اقرار کر لیں۔ پھر جو کوئی بھی یہ اقرار کر لے، اس نے مجھ (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلامی خلیفہ) سے اپنا مال اور اپنی جان کو بچا لیا۔ البتہ اس پر کوئی (شریعت کا مقرر کردہ) حق ہو گا (تو لیا جائے گا) اور (آخرت میں) اس کا معاملہ اللہ کریم کے سپرد ہو گا؟ (یہ سن کر) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (غصہ میں آ گئے، حالانکہ وہ حلیم الطبع اور عمر کے اس حصہ میں تھے جب جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں) نے فرمایا: عظیم و جلیل اللہ کی قسم! میں ہر اس شخص سے قتال کروں گا جو نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا (کہ نماز تو فرض سمجھ کر ادائیگی کے لیے تیار ہو مگر زکاۃ کی فرضیت کا منکر ہو) زکاۃ مال

صدقات (Sadaqat- Charities):

"زکوٰۃ" کے علاوہ بھی کچھ اجتماعی حقوق ہیں اسلام جن کے متعلق غنی اور متمول کو مالی امداد کرنے کی ترغیب دیتا اور بعض حالات میں ان کو واجب قرار دیتا اور بعض حالات میں مستحسن اور مستحب بتلاتا ہے سو اس قسم کی مالی اعانت کا نام "صدقہ" ہے اور اپنی مختلف انواع کے اعتبار سے وہ "صدقات" (Optional Charities) کہلاتے ہیں۔

قرآن عزیز میں جگہ جگہ صدقات کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کو اسلام کی نمایاں علامت بتایا ہے:

❶ ﴿وَأَنفِقُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا تُلْقُوا۟ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى ٱلتَّهْلُكَةِ﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی بخل اختیار کر کے انفاق فی سبیل اللہ سے ہاتھ نہ کھینچو اور مال و زر کی محبت میں جہاد فی سبیل اللہ کو ترک نہ کرو۔)

❷ ﴿وَفِىٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَٱلْمَحْرُومِ ﴿١٩﴾﴾ (۲)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور تنگ دستوں کا حق ہے۔

❸ ﴿فَـَٔاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ﴾ (۳)

ترجمہ: پس تو رشتہ دار کو اس کا حق دے اور محتاج اور مسافر کو۔

کا حق ہے (جسے میں خود بطور خلیفہ اسلامی ریاست وصول کروں گا) اللہ کریم کی قسم! اگر وہ (منکرین زکاۃ) مجھے (اونٹ کی) رسی بھی دینے سے انکار کریں گے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو (زکاۃ میں) دیا کرتے تھے، تو اس (رسی) کے نہ دینے پر بھی میں ان سے قتال کروں گا۔

(یہ سن کر) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ کریم کی قسم! میں نے تو یہی دیکھا کہ اللہ کریم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سینہ قتال کے لیے کھول دیا اور میں بھی سمجھ گیا کہ حق یہی ہے۔

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۱۹۵

(۲) سورۃ الذاریات (۵۱): ۱۹

(۳) سورۃ الروم (۳۰): ۳۸

❹ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم ﴾[۱]

ترجمہ: مسلمانو! جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

❺ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ ﴾[۲]

ترجمہ: مسلمانو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں خرچ کرو۔

ادائیگی صدقات کے طریقے:

"صدقات" کے اداء کی دو شکلیں ہیں ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔ انفرادی یہ کہ خیرات کرنے والا خود اپنے ہاتھ سے صدقہ کرے اور اجتماعی یہ کہ "مال صدقہ" کو خلیفہ یا نائب خلیفہ کے سپرد کرے اور وہ بیت المال میں داخل کر کے مستحقین پر صرف کرے۔ نفلی صدقات کی اداء تو انفرادی بھی درست ہے مگر "صدقاتِ واجبہ" بیت المال کا حق ہے۔

فَیْ (Fay):

اگر مسلمانوں کے لشکر سے کفار مغلوب و مرعوب ہو کر بغیر جنگ کیے مال چھوڑ بھاگیں یا جنگ کے بعد ان کی زمینوں کو مقررہ ٹیکس پر ان ہی کی مقبوضہ رہنے دیا جائے یا ان پر خراج اور جزیہ مقرر کیا جائے تو ان سب صورتوں میں اس حاصل شدہ مال کو "فَیْ" کہا جاتا ہے اور اس لحاظ سے خراج اور جزیہ بھی "فَیْ" کی اقسام بن جاتے ہیں۔ قرآن عزیز کی گذشتہ آیات میں "فَیْ" کا مال "بیت المال" کا حق بتایا گیا ہے اور اس کو غانمین اور مجاہدین کے درمیان نہیں تقسیم کیا جاتا اس لیے کہ اس کے حصول میں مجاہدین کو جہاد نہیں کرنا پڑا۔

﴿ وَمَآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ مِنۡهُمۡ فَمَآ أَوۡجَفۡتُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ خَيۡلٖ وَلَا

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۵۵

(۲) سورۃ البقرہ (۲): ۲۶۸

رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُۥ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾ ﴾[1]

ترجمہ: اور جو مال اللہ نے ان سے اپنے رسول کے ہاتھ لگوا دیا تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔ لیکن اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے رسولوں کو غالب کر دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

خمس (Khums-1\5th):

مال غنیمت کی تقسیم اور "رکاز" (دفعینہ اور کانوں سے نکلے ہوئے سونے چاندی) سے نفع حاصل کرنے سے پہلے ان میں سے پانچواں حصہ نکالنا ضروری ہے اور یہ حکومت کے بیت المال (سرکاری خزانہ) کا حق ہے اس کو خمس کہتے ہیں۔

قرآن عزیز میں غنیمت کے ذکر میں اس حق کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے:

﴿وَاعْلَمُوٓا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَىْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُۥ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَٰمَىٰ وَالْمَسَٰكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ﴾[2]

ترجمہ: اور معلوم رہے کہ تم کو کسی چیز سے بھی جو کچھ مال غنیمت ملے سو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کے واسطے ہے اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں کے واسطے۔

اور بخاری کتاب الزکوٰۃ اور بعض دوسری کتبِ حدیث کی ایک صحیح روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ "رکاز" میں بھی خمس ہے۔

وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُس.

ترجمہ: (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) "رکاز" میں خمس واجب ہے۔

---

(۱) سورۃ الحشر (۵۹):۶

(۲) سورۃ الانفال (۸):۴۱

اہل عرب کے یہاں لغوی معنی کے اعتبار سے ''رکاز'' کا اطلاق ''دفینہ'' پر ہوتا ہے لیکن امام ابو یوسف [۱] نے ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رکاز کی تفسیر یہ بھی فرمائی ہے:

فقیل له ما الرکاز یا رسول اللّٰه؟ فقال: الذهب والفضة الذی خلقه اللّٰه فی الأرض یوم خلقت. [۲]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ ''رکاز'' کیا شے ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ سونا اور چاندی جو اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر زمین کے اندر ودیعت کر دیا ہے (یعنی کانیں)۔

ضرائب (Extra Taxes – Emergency Contributions):

زمانہ جنگ، قحط سالی، رفاہ عام اور عوام کی بے روزگاری دور کرنے کے لیے ''زکوٰۃ'' اور ''صدقات'' کے علاوہ جو ٹیکس (مالی امداد) اغنیاء اور اہلِ ثروت پر حکومت کی جانب سے عائد کیے جاتے ہیں ان کا نام ''ضرائب'' ہے۔ ٹیکسوں کا وہ مفہوم جو زمانہ موجودہ کے طریقۂ حکومت میں رائج ہے اسلامی نظامِ حکومت میں ناپید ہے۔ اس لیے کہ آج کل جو ٹیکس پبلک (عوام) پر لگائے جاتے ہیں وہ عموماً عدل و انصاف کے خلاف اور حکومت یا ارکانِ حکومت کے ان مفادات کی خاطر لگائے جاتے ہیں جن کا پبلک مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسلام کے دستوری نظام میں خراج، جزیہ، عشور، عشر، زکوٰۃ، فئ، خمس، وقف

---

(۱) امام ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم انصاری رحمہ اللہ (۱۱۳ھ ـــــ ۱۸۲ھ) حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بڑے شاگرد تھے۔ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے تعلیم فقہ حاصل کی۔ پہلے بغداد میں قاضی اور پھر ہارون الرشید عباسی خلیفہ کے عہد میں قاضی القضاۃ (Chief Justice) کے منصب جلیلہ پر متمکن رہے۔ فقہ حنفی کے پھیلاؤ میں آپ کے مقام و مرتبہ اور کاوشوں کو بہت دخل ہے۔ آپ نے خلیفہ ہارون الرشید رحمہ اللہ کی درخواست پر ان کی رہنمائی کے لیے ''کتاب الخراج'' لکھی جو اسلام کے نظام مالیات پر سند کا درجہ رکھتی ہے۔

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب خمس المعادن

اور اسی قسم کے محاصل اسی غرض سے مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ پبلک کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات کے کام آئیں اس لیے وہ عام طور پر مزید ٹیکس عائد کرنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ البتہ اگر بیت المال کے یہ مسطورہ بالا محاصل ان ضروریات کو کافی نہ ہوں یا ہنگامی اہم ضروریات ان محاصل سے فاضل آمدنی کے بغیر پوری نہ ہو سکیں تو عدل و انصاف کے ساتھ اہم ہنگامی محاصل (Emergency Taxes) اغنیاء اور اہل ثروت پر عائد کیے جاسکتے ہیں۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی رائے:

چنانچہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے محلّٰی میں فقراء کی اعانت پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ اگر بیت المال کا خزانہ اور مالی فیٔ فقراء اور اہل ضرورت کی معاشی ضروریات کو پورا نہ کر سکیں تو خلیفہ "اہل ثروت" پر مزید ٹیکس عائد کر کے ان کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اور اگر اہل دول اس کے مانع ہوں تو بہ جبر ان سے وصول کر سکتا ہے "ویجبرھم سلطان علی ذالك"[1] وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اپنی عمومیت کے ساتھ اس ٹیکس کی دلیل بن سکتی ہے۔

﴿ فَـَٔاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ ۚ ﴾[2]

ترجمہ: اور قرابت والوں اور مساکین اور مسافر کے جو حق تم پر واجب ہیں وہ ادا کرو۔

اور حسب ذیل آثار اس کی تائید میں پیش کیے جاسکتے ہیں:

❶ عن علی بن أبی طالب یقول: أن اللّٰه تعالٰی فرض علی الاغنیاء فی أموالھم بقدر ما یکفی فقراءھم فان جاعوا وعروا وجھد وافبمنع الاغنیاء.[3]

---

(۱) ابن حزم: المحلی: جلد ٦ مطبوعہ قاھرۃ: ص ۱۵٦

(۲) سورۃ الروم (۳۰): ۳۸

(۳) ابن حزم: حوالا بالا: ص ۱۵٦

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دولت مندوں کے مال میں سے اس قدر حق فرض کر دیا ہے جس قدر کہ ان کے فقراء کو کفایت کر سکے پس اگر فقراء بھوکے ہیں ننگے ہیں، اور خستہ حال ہیں تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اغنیاء اس فرض کی اداء میں مانع ہیں۔

❷ وعن ابن عمر رضی اللّٰہ عنه انه قال: فی مالك حق سوی الزکوة.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما[2] فرماتے ہیں کہ تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (جماعتی) حقوق ہیں۔

پس جس طرح غرباء کی ضرورت پورا کرنے کے لیے خصوصی ٹیکس ادا ہو سکتا ہے، اسی طرح جہاد اور دوسری ضروریات کے لیے بھی عائد ہو سکتا ہے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ یرموک میں اسی قسم کی اعانت کی ترغیب دی تھی جس پر پُرجوش طریقہ سے لبیک کہا گیا۔[3]

---

(۱) حواله بالا: ص ۱۵٦. مشكوة المصابيح، كتاب الزكاة، باب فضل الصدقة، فصل دوم

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۳) ضرائب ـــــ جنہیں بعض مسلم معیشت دانوں نے ہنگامی چندہ (Emergency Contribution)، بعض نے شرعی ٹیکسوں (مثلاً زکاۃ، عشر، صدقات واجبہ) کے علاوہ ٹیکس (Extra Sharia Taxes) جبکہ بعض نے انہیں لادینی ٹیکس (Secular Taxes) کہا ہے ـــــ کے بارے میں قرآن کریم اور حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں مفصل تعلیمات نہیں، جن سے ان ضرائب کے اموال (Properties) مقدار (Rates) اور نصاب اور ان کے مصارف کی مدات (Heads of Expenitures) کی تعیین کی جا سکے۔ یہ تمام ٹیکس خلیفہ یا سربراہ مملکت ـــــ جو مجلس شوریٰ کی آراء کا پابند ہو گا ـــــ کی صوابدید (Discretion) پر ہیں کہ وہ ملکی حالات اور مفاد عامہ کے پیش ان ٹیکسوں کا نفاذ اور ان کے اخراجات متعین کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی خاموشی دراصل اسلامی ریاست کو واضح اختیار دینا ہے کہ وہ اپنی آمد (و خرچ) کے اصولی حالات و واقعات اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے مد نظر تبدیل کر سکے۔ (ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ: Introduction To Islam پیراگراف نمبر ۳۴۸)

فلاحی ٹیکس کے مشروط جواز کے مجوزین (Proposers) اور مؤیدین (Supporters) تقریباً تمام مسلمہ مکاتب فکر =

کے فقہاء کرام ہیں۔ فقہاء کرام کے اس موقف کے لیے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب الخراج، امام ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ کی کتاب الاموال، حمید بن زنجویہ رحمہ اللہ کی کتاب الاموال، یحییٰ بن آدم قرشی رحمہ اللہ کی کتاب الخراج کا مطالعہ نہایت مفید ہو گا۔ امام شاطبی رحمہ اللہ فلاحی ٹیکسوں کی تائید میں لکھتے ہیں: اسلامی ریاست کے سربراہ کو اختیار ہو گا کہ وہ واقعی ضرورت کی حد تک ٹیکس عائد کرے۔ بشرطیکہ ایسا کرنے والا سربراہ عادل ہو ظالم بن کر ٹیکس وصول کرنے والا نہ ہو۔ وہ اغنیاء پر اس قدر ٹیکس عائد کر سکتا ہے جو (وقتی فلاحی) ضروریات کو پورا کر سکے۔ (شاطبی رحمہ اللہ: الاعتصام، مطبع المنار، قاہرۃ، ۱۹۱۴ء، ۲/۲۹۵، ۲۹۸) فقہاء مالکیہ کا موقف محمد بن ایاس رحمہ اللہ کی کتاب تاریخ مصر، مطبوعہ بولاق، قاہرۃ ۱۳۱۱ھ، ۱/۹۴، ۹۵ مدوّنۃ الکبریٰ، کتاب الزکاۃ، قرطبی رحمہ اللہ کی ''احکام القرآن'' ۲/۳۰۳، ۳۰۴ وغیرہ کا مطالعہ مفید ہو گا۔

ہاں اس سے یہ جواز ہرگز تلاش نہ کیا جائے جو آج کل کی حکومتوں کے ظالمانہ ٹیکسوں کی وصولی سند بن جائے۔ کیونکہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اقوال ائمہ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ، فقہاء اور مسلم معیشت دانوں کی تحریروں سے ظالمانہ ٹیکسوں کے بارے میں جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کا خلاصہ اس طرح ہو سکتا ہے:

❶ زمانہ جاہلیت کے ٹیکسوں کو بالکل منسوخ کر دیا۔ (دیکھئیے: کتاب ابوعبید: کتاب الاموال، ترجمہ طاھر سورتی: ۱/۹۳، ۳٤۸)

❷ مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا کہ زکاۃ کے علاوہ ان سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ (حوالہ بالا: ۲/۳۹٤)

❸ مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ اللہ کریم کا شکریہ ادا کریں کہ انہیں ٹیکسوں کے عذاب سے نجات ملی۔ (الھیثمی: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۳/۸۷)

❹ ٹیکس وصول کرنے والے کو زانیہ سے بدتر بتایا گیا یہاں اشارہ اس غامدیہ خاتون رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خود کو سنگساری کے لیے پیش کرنے تاکہ اللہ کریم قیامت کے دن ناراض نہ ہوں، دوران سنگساری حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پتھر مارتے ہوئے اس خاتون رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا خون لگنے اور حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انہیں برا کہنے اور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ برا کہنا سن کر یہ فرمانے کی طرف ہے: ''مهلا يا خالد! أنها قد تابت توبة لو تابها صاحب مكس غفرله'' (صحیح مسلم، ج ۲، باب حد الزنا) خالد! سنبھل کر بولو! اس (اللہ کریم سے ڈرنے والی) نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ ناجائز ٹیکس وصول کرنے والا کرتا تو وہ بھی بخش دیا جاتا۔ دراصل اس ارشاد میں واقعہ حقوق العباد کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے کیونکہ ناجائز ٹیکس وصول کرنا کسی کے مال پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے لہٰذا اسے جنت سے محروم اور دوزخ کا سزاوار ٹھہرایا گیا ہے۔ (کتاب الاموال: ۲/۲۹۱)

❺ ناجائز ٹیکس وصول کرنے والا قابل قتل ہے۔ (الھیثمی، حوالہ بالا، ص ۸۷)

❻ رحمت کریمانہ کے مخصوص اوقات میں اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور وہ اللہ کریم ایسے مہربان کی رحمت سے محروم رہتا ہے۔ (الھیثمی رحمہ اللہ: حوالا بالا: ص ۸۸)

=

کرء الارض (Rent of Land):

امام یا خلیفہ (حکومت کی) جن زمینوں کو سالانہ اجرت (لگان) مقرر کر کے کاشت کے لیے دے دیتا ہے ان سے وصول شدہ محاصل کا نام (کراء الارض) ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ایسی سرکاری زمینوں کو جن سے نہ عشر لیا جاتا ہے اور نہ خراج بلکہ ان کو اجرت پر کاشت کے لیے دیا جاتا ہے ''ارض المملکۃ'' یا ''ارض الحوز'' (Public Domain) کہتے ہیں اور یہ زمین یا وہ ہوتی ہے جو لاوارث ہو کر بیت المال کی جانب منتقل ہو جاتی ہیں اور یا لشکر کشی سے فتح کرنے کے بعد وقف للمسلمین بن کر اجیروں (Cultivaters) کو اجرت مقررہ پر دے دی جاتی ہیں۔[1]

''کرہ الارض'' کا یہ معاملہ ان ہی آیات و احادیث کے تحت میں آتا ہے جو عشر و خراج کی بحث میں ذکر کی جا چکی ہیں۔

عشور (Custom Duties):

ایران اور روم کی سلطنتوں کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی مسلمان تاجر ان کی سرحد

ٹیکسوں کا رواج بنو امیہ کے دور میں شروع ہوا۔ مگر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے انہیں ختم کر دیا، حتی کہ چنگی خانوں کو مسمار کرادیا۔ (کتاب الاموال ترجمہ اردو: ۲/ ۲۹۱) خاندان بنو عباس میں ٹیکسوں کا چلن رہا، مگر سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے حجاج پر ٹیکسوں کو ختم کر دیا۔ ابن خلدون رحمہ اللہ ٹیکسوں کو قوم و ملک کے تنزل اور زوال کا موجب بتاتے ہیں۔ زیادہ ٹیکس لگانے والی حکومت جلد زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ (ابن خلدون، مقدمہ، فصل ۳۸ تا ۴۳ دیکھیں)

الغرض، اسلام نے ظالمانہ اور حکمرانوں کے مسرفانہ عیش اور مفرطانہ عشرت کے سامان پورا کرنے کے لیے ٹیکسوں کا کوئی جواز و گنجائش نہیں۔ (واللہ اعلم) مگر اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی کے لیے فلاحی ٹیکس (Welfare Tax) لگانے اور وصول کرنے کی اجازت ہو گی۔

(۱) علامہ ابن عابدین: شامی، ۳/ ۳۵۳

کراء الارض اسلامی ریاست کے بیت المال کی آمدن کا ایک قابل توجہ ذریعہ رہا ہے۔ اس کی آمدنی مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے جس کی وجہ غالباً خلفاء اور والیان صوبہ جات کی شرح میں کمی بیشی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں یہ آمدن ۹۰۰۰۰۰۰ (نوے لاکھ) درہم تھی۔ جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں چونکہ فتوحات زیادہ ہو گئی تھیں، یہ آمدن بڑھ کر ۵۰۰۰۰۰۰۰ (پانچ کروڑ) درہم ہو گئی۔ (علامہ مقریزی: الخطط والاثار، مطبع نیل، ۱۳۲۴ھ، ص ۱۵۵)

میں مالِ تجارت لے کر داخل ہوتا تو وہ اس سے مقررہ محصول (ڈیوٹی) لیا کرتے تھے اور اگر وہ سال میں متعدد مرتبہ آمد و رفت رکھتا تو ہر دفعہ اسی قدر محصول ادا کرنا پڑتا تھا لیکن جب غیر مسلم اسباب تجارت لے کر اسلامی ممالک میں آتے تو وہ اس قسم کے محصول سے بری رہتے اس طرح گویا مسلمانوں کو تجارتی خسارہ تھا اور غیر مسلم اس خسارہ سے محفوظ تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ آپ نے مفصل روئداد سن کر صوبوں کے عاملوں (گورنروں) کو تحریر فرمایا کہ تم بھی اموالِ تجارت پر اسی قسم کا ٹیکس لیا کرو۔ (۱) اور نہ صرف غیر مسلموں سے بلکہ جو مسلمان ذمی بھی دارالحرب اور دارالسلام کے درمیان تجارتی کاروبار کو جاری رکھتے ہیں ان سے یہ بھی محصول لیا جائے مگر جس شخص سے ایک مرتبہ وصول کر لیا جائے اندرون سال وہ کتنی ہی مرتبہ آمد و رفت کا سلسلہ کیوں نہ

---

(۱) تاریخ معاشیات اسلام میں عشور کا آغاز کب اور کیونکر ہوا؟ اس بارے تمام فقہاء کرام، مسلم معیشت دان اور مؤرخین متفق ہیں کہ اس کا آغاز، اس کے قوانین وضع کرنے والے اور اسے بیت المال کی آمدن کا باقاعدہ بنانے والے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ آپ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بصرہ کے گورنر تھے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا:

ان تجارا من قبلنا من المسلمین یأتون أرض الحرب فیأخذون منهم العشر. فکتب إلیه عمر رضی اللّٰه عنه: فخذ أنت منهم کما یأخذون من تجار المسلمین. (ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی العشور)

ترجمہ: ہماری طرف سے مسلمان تاجر ارض حرب (Foes Land) آتے (جاتے) ہیں تو وہاں (کے حکمران) ان سے کسٹم لیتے ہیں (بھلا اب ہم کیا کریں؟) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں حکم لکھا: تم بھی ان سے (اتنا) لو جیسے وہ مسلمان تاجروں سے لیتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق منبج کے عیسائیوں —— جو اس وقت تک اسلامی ریاست کے محکوم نہیں ہوئے تھے —— نے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخواست کی کہ انہیں عشر کی ادائیگی کی شرط پر عرب میں تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپ نے ان کی اس درخواست کو منظور فرمالیا اور وہ اسلامی ریاست میں تجارتی کاروبار کے لیے آنے جانے لگے۔ بعد میں ذمیوں اور مسلمانوں پر بھی یہ قاعدہ لاگو کر دیا گیا اور یوں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں عشور بطور ذریعہ آمدن کی طرح ڈالی گئی۔ (علامہ شبلی رحمہ اللہ: الفاروق، ج ۲ عنوان: اور قسم کی آمدنیاں، عشور)

جاری رکھے دوبارہ اس سے نہ لیا جائے۔[1] نیز مسلمان ذمی اور کافر حربی کے درمیان

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے محصّلوں (Collectors) کو یہ بھی تاکید کر دی تھی کہ کھلے ہوئے سامان تجارت سے کسٹم لیا جائے البتہ اسباب (Goods) کی تلاشی نہ لی جائے۔ (حوالہ بالا) اس ضمن میں آپ کے کلکٹر حضرت زیاد بن حُدیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان قابل توجہ ہے۔

فأمرني أن لا أفتش أحدا. (ابو یوسف: کتاب الخراج، باب العشور)

ترجمہ: مجھے حکم دیا کہ میں کسی کی تلاشی نہ لوں۔

نیز عشور کے نظام میں ذمی اور مستامن سے جو انصاف کیا جاتا تھا، اس کی مثال کسٹم کی تاریخ میں شاید ڈھونڈنے سے ملے۔ اسلام کے نظام عشور کے دو اصول بڑے اہم تھے:

❶ درآمدات پر انصاف سے ان کی صحیح قیمت پر ٹیکس لگایا جائے۔

❷ سال میں ایک تاجر یا درآمد کنندہ پر صرف ایک بار محصول لگایا جائے،

بین الاقوامی تجارت کی ترویج میں ان دونوں اصولوں کا جو کردار ہے وہ تجارت اور تعلقات خارجہ سے ادنی واقفیت رکھنے والوں کی نگاہ سے اوجھل نہیں۔ اسلامی معاشیات کی تاریخ میں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے ادوار میں بھی ان اصولوں پر عمل کیا جاتا رہا ہے اور ان سے روگردانی کرنے والے کسٹم افسران کو سخت تنبیہ اور سزا تک دی گئی ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق ''کتاب الخراج'' میں اس ضمن میں کئی واقعات درج کیے ہیں، یہاں آپ کے لیے میں نے دو واقعات کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے۔

❶ حضرت زیاد بن حدیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عراق اور شام کے کسٹم آفیسر تھے، ان کے پاس سے بنو تَغلُب کا عیسائی گھوڑا لے کر گزرا، آپ نے اس گھوڑا کی قیمت ۲۰ ہزار درہم لگا کر ایک ہزار کسٹم لگایا۔ عیسائی نے کہا: گھوڑا آپ رکھ لیجئے ۱۹ ہزار درہم بقیہ مجھے دے دیجئے۔ الغرض وہ تَغلِبی عیسائی ایک ہزار درہم دے کر چلا گیا، وہ دوبارہ آیا تو حضرت زیاد بن حدیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر اس سے ایک ہزار درہم طلب کیے، تَغلِبی نے کہا: کیا میں جب بھی آیا کروں گا آپ ہزار درہم لیا کریں گے؟ حضرت زیاد بن حدیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ ہاں۔ وہ پلٹا اور سیدھا جا کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی۔ آپ حرم مکہ میں تشریف فرما تھے، سن کر فرمایا: ''کُفیت''، یعنی تیرا کہنا کافی ہوا۔ تَغلِبی مایوسی کے انداز میں واپس لوٹا کہ نہ جانے امیرالمؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کب اس کی شکایت کا ازالہ کریں گے؟ وہ کہتا ہے: میں نے ٹھان لی کہ ایک ہزار درہم مزید دے کر گزر جاؤں گا۔ مگر میری حیرت کا کیا ٹھکانہ؟ جب میں کسٹم کلکٹر کے پاس پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ امیرالمؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکم نامہ پہلے پہنچ چکا تھا۔ میں نے کسٹم کلکٹر زیاد بن حدیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عرض کیا: ہزار درہم کے ساتھ میں اس شخص کا دین بھی قبول کرتا ہوں جس کے انصاف کی پرواز میری فکر کی پرواز سے تیز ہے۔

(ابو یوسف: کتاب الخراج، باب في العشور)

❷ اسی طرح ایک دوسرے تَغلِبی نصرانی کا واقعہ ہے اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس شکایت درج کرائی۔ آپ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے۔ وہ دو تین دن مکہ مکرمہ میں مقیم رہا۔ اور یہ سوچ کر کہ اس کی شکایت پر ابھی عمل درآمد نہیں ہوا ہو گا۔ ڈرتے ڈرتے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر

=

محصول کی مقدار میں بھی تفاوت رہے اور یہ مال دو سو درہم [1] یا بیس مثقال کی قیمت سے کم نہ ہو ورنہ تو محصول سے معاف رہے گا۔

پس اس طریقہ سے حاصل شدہ محصول کا نام "عشور" ہے اور یہ محصول مسلمان کے مالِ تجارت میں سے چالیسواں اور ذمی کے اسبابِ تجارت سے بیسواں اور حربی کے مالِ تجارت سے دسواں حصہ لیا جاتا ہے۔ [2]

وقف ــــــ (Endowment):

جو اشیائے منقولہ ذاتی ملکیت سے نکال کر "فی سبیل اللہ" دے دی جائیں وہ اسلامی اصطلاح میں "وقف" کہلاتی ہیں اور اوقاف کی ایسی تمام آمدنی جو بیت المال کے لیے دی گئی ہو بیت المال کا حق تصور ہوتی ہیں۔ اسلام میں جائیداد غیر منقولہ کے پہلے "واقف" حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہیں۔ [3]

کہنے لگا: میں وہی نصرانی شیخ ہوں جس نے آپ سے زیاد بن حدیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواباً فرمایا: میں حنیفی شیخ (یعنی مسلمان) ہوں اور میں نے تمہاری شکایت نبٹا دی ہے۔
(ابو یوسف: حوالہ بالا. ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ: کتاب الاموال، ص ۷۱۷، ۷۱۸. یحیی بن آدم القرشی: کتاب الخراج ص ٦٤)

انہی منصفانہ فیصلوں کی روشنی میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے خلیفہ ہارون الرشید رحمہ اللہ کو جو نصیحت نامہ لکھا اس میں درج تھا:

أمّا العشور فرأيت أن توليها من أهل الصلاح والدين، وتأمرهم أن لا يتعدّوا على الناس فيما يعاملونهم به ولا يظلمونهم ولا يأخذوا منهم أكثر مما يجب عليم. (كتاب الخراج، باب في العشور)

ترجمہ: جہاں تک عشور کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں میری رائے ہے کہ ان کی وصولی کا کام نیک اور دیندار افسران کے سپرد کیا جائے۔ انہیں حکم دیں کہ وہ (گزرنے والے) لوگوں سے معاملہ کرتے وقت ان پر زیادتی نہ کریں نہ ان پر ظلم کریں نہ ان سے اس سے زیادہ لیں جس کی ادائیگی ان پر ضروری ہے۔

(۱) ایک درہم ۳ آنہ کا ہوتا ہے، بیس مثقال کا ۷½ تولہ سونا ہوتا ہے۔

(۲) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب في العشور

(۳) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر کے اموال غنیمت سے ایک جاگیر ملی تھی جو ان کا ذریعہ معاش بھی بن سکتی تھی مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ــــــ اللہ کریم کی رضا اور امت مسلمہ کے معاشی دکھوں کے =

کتبِ تفاسیر میں ہے کہ یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿مَن ذَا ٱلَّذِى يُقْرِضُ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۱) "کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے" ﴿لَن تَنَالُوا۟ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا۟ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (۲) "تم ہرگز بھلائی نہ پاسکو گے جب تک اس شے میں شے خرچ نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو۔" تو حضرت طلحہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا یا رسول اللہ! میرا فلاں باغ جو مجھے بہت پیارا ہے وہ خدا کے لیے دیتا ہوں، آپ نے ارشاد فرمایا: تم اس کو اپنی قوم کے محتاجوں کے لیے (وقف) کر دو۔ (۳)

اموالِ فاضلہ (Additional Properties- Amounts):

مسطورہ بالا آمدنی کے طریقوں کے علاوہ جو بھی متفرق آمدنیاں بیت المال کی ملک قرار دی جائیں ان سب کو "اموال فاضلہ" کہا جاتا ہے مثلاً اگر کسی مسلمان یا ذمی کا انتقال ہو جائے اور وہ لاوارث ہو تو اس کا مال "بیت المال" کا حق ہے اسی طرح اگر کوئی ذمی بغاوت کر کے یا کوئی مسلمان "العیاذ باللہ" مرتد ہو کر دارالحرب کو فرار ہو جائے تو اس کا تمام مال ضبط ہو کر "بیت المال" کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ (۴)

ماروں کی کفالت کے لیے ـــــ اسے وقف کر دیا۔ اور ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی اس زمین کو خرید سکتا ہے نہ وراثت میں اسے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی اسے بعد میں کسی کو دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی صراحت کر دی کہ اس کا متولی (Custodian) اس کی آمدن (Proceed) سے اپنا مناسب روزینہ لے سکتا ہے۔ یہ الوقف الخیری تھا۔ (متفق علیه، کتاب الوقف ـــــ التاج الجامع الاصول: ۷۳/۲)

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۴۵

(۲) سورۃ آل عمران (۳): ۹۲

(۳) متفق علیه، کتاب الوقف. ریاض الصالحین، باب الانفاق مما یحب ومن الجیّد.

(۴) الکاسانی، ابو بکر: بدائع الصنائع، ج ۷، کتاب السیر. اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہونے والے واقعات بطور سند ذکر کرتے ہیں۔

❶ عن عائشة رضی اللہ عنها ان مولی لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم مات وترك شیئا ولم یدع حمیعا ولا ولدا. فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم اعطوا میراثه رجلا من اهل قریته. (ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب میراث ذوی الارحام. جامع الترمذی، ابواب

الفرائض، باب ماجاء فی میراث المولی الأسفل)
ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آزاد کردہ غلام فوت ہو گیا، اس نے کچھ ترکہ چھوڑا، مگر نہ اس نے کوئی رشتہ دار چھوڑا نہ فرزند، لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا ترکہ اس کے گاؤں کے آدمی کو دے دو۔

❷ عن بریدة رضی اللّٰہ عنه قال: مات رجل من خُزَاعَة، فأتی النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم بمیراثه، فقال: التمسوا له وارثا أو ذارحم، فلم یجدوا له وارثا ولا ذارحم. فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: اعطوه الکبری من خزاعة. رواه ابوداؤد، وفی روایة له قال: انظروا اکبر رجل من خزاعة. (ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب فی میراث ذوی الارحام)

ترجمہ: حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کرتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص وفات پا گیا تو اس کا ترکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا کوئی وارث (ذوالفروض یا) ذوالارحام میں سے ڈھونڈو۔ مگر اس کا کوئی وارث (ذوالفروض میں سے) نہ کوئی ذوالارحام میں سے ملا۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا ترکہ (اس کے) قبیلہ خزاعہ کے کسی بڑے بوڑھے کو دے دو۔ ابوداؤد ہی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: اس کے قبیلہ کا کوئی بڑا بوڑھا (وراثت لینے کے لیے) تلاش کرو۔

مذکورہ بالا دونوں احادیث میں اگرچہ بیت المال کا ذکر نہیں، کیونکہ آپ کے مبارک دور میں بیت المال یا سرکاری خزانہ کا تصور نہ تھا، مگر بحیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رئیس مملکت اسلامیہ —— جن کے تابع بیت المال بھی ہوتا ہے —— ہونے کے لاوارثوں کی میراث (ترکہ) کو آپ ہی کے علم میں یا آپ کی خدمت میں لایا جاتا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل حاجت کو دینے کا حکم فرمادیتے جیسا ان احادیث میں ہے کہ آپ نے گاؤں کے بوڑھوں کو ان کی پیرانہ سالی اور حاجت مندی کا خیال فرما کر ترکہ کا مال دلوادیا۔
امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان میں سے پہلی حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

والعمل عند أهل العلم فی هذا الباب إذا مات رجل ولم یترك عصبة ان میراثه یجعل فی بیت مال المسلمین. (ترمذی، ابواب الفرائض)

ترجمہ: اس باب (مسئلہ) میں اہل علم کا عمل یہ ہے کہ جب کوئی شخص وفات پا جائے اور اس نے عصبات (ورثاء) میں سے کوئی نہ چھوڑا ہو تو اس کی میراث مسلمانوں کے بیت المال میں داخل ہوگی۔
(لقطہ (Luqta - Lost) یعنی کسی کا گم شدہ یا گرا پڑا قیمتی مال بھی بیت المال کی ملکیت بن جاتا ہے اگر لقطہ کی آمدن اور اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو کسی ملک کے ہوائی اڈوں (Air Ports) اور بندرگاہوں (Sea Ports) پر بڑے ایسے قیمتی مال و اسباب کا کبھی جائزہ لیں جن کے مالکان تلاش بسیار اور طویل انتظار کے بعد بھی نہیں ملتے۔ عموماً یہ اموال افسران اور ماتحت عملہ کی غیر قانونی ملکیت بن جاتے ہیں، حالانکہ اگر یہ بیت المال یا سرکاری خزانہ میں دیانتداری اور باقاعدگی سے آئیں تو سرکاری آمدنی کا ایک اچھا حصہ بنیں)۔

مصارف بیت المال

شعبہ ہائے مصارف(Expenditures of Bait – ul- Mal):

قرآن عزیز کی ان تفصیلات کے پیش نظر جو اہل مصارف کے سلسلے میں بیان کی گئی ہیں اسلامی فقہ میں تصریح کی گئی ہے کہ بیت المال کے محاصل کو چار مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے جدا جدا "چار بیت اموال" قائم کرنے چاہئیں مگر یہ چاروں مرکزی بیت المال کے تحت میں رہیں گے۔ چنانچہ چہار گانہ شعبوں کی تفصیل اس قدر مذکور ہے۔

(پہلا شعبہ) مالِ غنیمت، کنز اور رکاز کے "خمس" اور "صدقات" سے تعلق رکھتا ہے اور (دوسرا شعبہ خراج، جزیہ غیر مسلم تجار سے وصول کردہ عشور، فیٔ، کراء الارض اور ضرائب سے (چوتھا شعبہ) اموالِ فاضلہ (ضوائع) سے متعلق ہے۔[۱]

اور ان محاصل کے مصارف کی تفصیل یہ ہے:

پہلے اور دوسرے شعبہ کے مصارف:

پہلے اور دوسرے شعبہ کے مصارف "مصارفِ ثمانیہ" (Eight heads of Expenditures) ہیں جن کو قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے:

❶ ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤١﴾﴾[۲]

ترجمہ: اور معلوم رہے کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ

(۱) مثلاً لاوارث مال (لقطہ) لاوارث کا ترکہ اور لاوارث مقتول کی دیت: (شامی: ۳/۳۸۹)

(۲) سورۃ الانفال (۸): ۴۱

کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے۔ اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز جو ہم نے اتاری اپنے بندہ پر فیصلہ (جنگ بدر کے دن) جس دن بھڑ کیں دونوں فوجیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

❷ ﴿إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ﴾ (۱)

ترجمہ: ''زکوٰۃ و صدقات حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پر چانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے کے لیے (یعنی قیدیوں اور غلاموں کی رستگاری کے لیے) اور ان کے لیے جو تاوان کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں (یعنی قرض دار اور ضامن) اور اللہ کے راستہ میں (جان سے لڑنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے یہ مقرر ہے خدا کی جانب سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

پہلی آیت میں ''اللہ'' کا نام برکت کے طور پر مذکور ہے اور بعض علماء کے نزدیک اس سے کعبۃ اللہ اور مساجد اللہ کے مصارف مراد ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا اور آپ کے اہل قرابت (بنی ہاشم و بنی عبد المطلب) کے حصہ کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور یتامی اگر بذاتِ خود اغنیاء میں سے ہیں تو وہ بھی اس سلسلے میں داخل نہیں ہیں ورنہ پھر فقراء اور مساکین میں شامل ہیں۔ لہذا دونوں آیات کا مصرف ''مصارف ثمانیہ'' متعین ہیں جس کا مکمل بیان دوسری آیت میں مفصل

---

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): ۶۰

ہے۔ یعنی فقراء مساکین، عاملین، مؤلفۃ القلوب، رقاب، غارمین، سبیل اللہ، ابن سبیل۔

یہ حنفی مذہب (اسکول) کی تصریحات ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ [1] اور دوسرے آئمہ کی تصریحات بھی اسی کے قریب قریب ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ ''سبیل اللہ'' کا مصرف حنفی اسکول میں صرف مجاہدین کے اندر محدود ہے اور دوسرے آئمہ کے نزدیک تمام مصارف خیر (Welfare Expenditures) کے لیے عام ہے۔

تیسرے اور چوتھے شعبہ کے مصارف:

تیسرے شعبہ کے مصارف ہر قسم کے وظائف (Salaries & Stipends etc) اور شعبہ ہائے حکومت کے نظم و انتظام کے اخراجات ہیں اور چوتھے شعبہ کے مصارف رفاہِ عامہ (پبلک ورکس) لاوارث بچوں کی پرورش اور دیگر امور خیر (Social Welfare) ہیں۔ [2]

---

(۱) امام شافعی رحمہ اللہ، محمد بن ادریس شافعی قریشی رحمہ اللہ ۱۵۰ھ (مطابق ۷۶۷ م) غزوہ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ (مطابق ۸۱۹ م) مصر میں وفات پائی۔ محدث، فقیہہ، مفسر اور امام تھے، مسلک شافعی (Shafii School of Thought) کے بانی ہیں آپ کی مشہور کتب میں ''کتاب الام''، ''کتاب اختلاف الحدیث'' اور ''مسند امام شافعی'' ہیں۔

(۲) ابن عابدین: ردالمحتار، ۲/۷۸، ۷۹، ۳/۳۸۸، ۳۸۹

فقہاء اسلام اور سیرۃ نگاروں کی تصریحات کے مطابق بیت المال کے چوتھے شعبہ میں ایک مستقل مد قرض حسنہ بھی تھی خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد میں قرض حسنہ دو طرح سے دیا جاتا تھا:

❶ صرفی قرضہ (Consumption Loan)

❷ پیداواری قرضہ (Productive Loan)

صرفی قرضہ ذاتی ضروریات اور بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل مثلاً بیاہ شادی، علاج، مکان کی تعمیر و مرمت وغیرہا کے لیے دیا جاتا تھا یہ قرض محدود مدت کے لیے ہوتا تھا۔ جبکہ پیداواری قرضہ لمبی مدت کے لیے ہوتا تھا اور اس سے کاروباری سرگرمیوں کا (آغاز) یا انہیں جاری رکھا جاتا تھا۔ بسا اوقات پیداواری قرض حسنہ نفع نقصان کی شراکت (Profit Loss Sharing) کی بنیاد پر بھی دیا جاتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ: مقالہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اردو دائرۃ معارف اسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، بذیل مادہ۔

ابن عابدین، محمد امین بن عابدین (متوفی ۱۲۵۲ھ، مطابق ۱۸۳۶ء) فقہ حنفی کے بہت بڑے عالم تھے۔ شامی

مصارف میں خلیفہ (حاکم) کے صوابدیدی اختیارات (Discretionry Powers):

فقہاء نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ امام (خلیفہ "مصالح خلافت کے پیشِ نظر بوقتِ ضرورت ایک شعبہ سے دوسرے شعبہ کے لیے قرض لے سکتا ہے اور جب تک اس وافر آمدنی نہ ہو دوسرے شعبوں سے اس شعبہ کی ضروری کفالت کر سکتا ہے۔ در مختار میں ہے:

وعلى الإمام ان يجعل لكل نوع بيتا يخصه وله أن يستقرض من احدها ليصرفه للآخر الخ.[1]

ترجمہ: اور امام کے لیے ضروری ہے کہ ہر نوع کے لیے جدا بیت المال کا شعبہ مخصوص کرے اور اس کے لیے یہ درست ہے کہ ایک شعبہ سے قرض لے کر دوسرے شعبہ پر خرچ کر دے۔

اس کے علاوہ کتبِ فقہ میں مختاراتِ امام (Options of Iman / Head of the State) کے مباحث میں بھی امام کی اس صوابدید (Discretion) سے متعلق کثرت سے جزئیات ملتی ہیں۔

فقہ اسلامی میں یہ بھی تصریح ہے کہ صدقاتِ واجبہ (مثلاً زکوٰۃ عشر) کے علاوہ بیت المال کے محاصل کا تعلق جس طرح قلمرِ دِ اسلامی کے مسلمانوں کی ضروریات و حاجات سے وابستہ ہے، اسی طرح غیر مسلم (ذمی) کی حاجات و ضروریات سے بھی متعلق ہے۔ چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فقراء اور مساکین میں غیر

کے رہنے والے تھے۔ آپ کی کتب میں مشہور "رد المحتار علی الدر المختار" ہے دراصل یہ علامہ تمر تاشی رحمہ اللہ کی کتاب "تنویر الابصار وجامع البحار" پر تبصرہ (Commentary) بھی ہے، اور علاؤالدین حصکفی رحمہ اللہ کتاب "الدر المختار" کا جواب بھی ہے۔ فقہ میں ایک اور مشہور کتاب "نسماۃ الاسمار" حاشیہ علی افاضۃ الانوار ہے اور قاہرہ سے ۱۳۰۰ھ میں پہلی بار شائع ہوئی۔

(۱) الحصكفي، محمد علاؤالدين: الدر المختار، مطبوعه بمبى (هند)، ۱۳۰۹ھ، ۳/ ۳۸۹.
ابو يوسف: كتاب الخراج، باب تحريم منع الصدقة وفى مصرفها.

مسلموں (ذمیوں) کو بھی شامل کیا ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے قانونِ فقہ میں اس قول کو سند (Authority) ٹھہرایا ہے۔[1]

علاوہ ازیں جب کہ امام (خلیفہ) کے ذمہ یہ واجب قرار دیا گیا ہے کہ اسلامی قلمرو میں ایک شخص بھی محروم المعیشت نہ رہے تو پھر ان مباحث سے اصل مسئلہ (اعانتِ محتاجین) پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ بہرحال امام کا فریضہ ہے۔ الحاصل آئمہ مجتہدین کے ان جزوی اختلافات کے باوجود اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جن مصارف کے متعلق قرآن اور حدیث کی نص وارد ہو چکی ہے وہ اسی طرح بحال رکھتے ہوئے باقی امور میں محاصل و مصارف کا معاملہ "خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ" کی صوابدید (Discretion) پر ہے۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں فئ اور خراج پر بحث کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلہ پر جو عراق کی زمینوں کے متعلق انہوں نے دیا تھا، جو ارشاد فرمایا ہے وہ اس مسئلہ کو بخوبی واضح کر دیتا ہے ملاحظہ ہو:

قال ابو یوسف: والذی رای عمر رضی اللّٰہ عنہ من الامتناع من قسمة الارضین بین من افتتحها عند ما عرفه اللّٰہ ما کان فی کتابه من بیان ذالك توفیقا من اللّٰہ، کان له فیما صنع وفیه کانت الخیرة لجمیع المسلمین، وفیما راه من جمع خراج ذلك، وقسمته بین المسلمین عموم النفع لجماعتهم، لان هذا لو لم یکن موقوفا علی الناس فی الأعطیات والأرزاق لم تشحن الثغور ولم تقوا الجیوش علی السیر فی الجهاد. ولما امن رجوع اهل الکفر الی مدتهم اذا خلت من المقاتله والمرتزقة واللّٰہ

(۱) اور امام اعظم رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے تو تصریح کی ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ تمام صدقاتِ واجبہ و نافلہ مثلاً نذر و فطر وغیرہ ذمی فقراء کو دیئے جا سکتے ہیں اور حربی مستامن کی مدد بھی صدقاتِ نافلہ سے کی جا سکتی ہے۔ (فتاوی شامی، ج ۳، باب المصرف۔ ابو یوسف: حوالہ مذکور)

اعلم بالخير حيث كان.[1]

ترجمہ: ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فیصلہ کہ مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے ایسی صورت میں جبکہ کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی مذکور نہیں تھا، ایک بہترین فیصلہ ہے جس کی جانب خدائے تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کی، اور انہوں نے یہ جو کچھ کیا (اس لیے کہ) اسی میں تمام مسلمانوں کی فلاح و بہبود مضمر تھی اور زمین کا خراج جمع کر کے تمام مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچانا جماعتی اعتبار سے بہت ہی بہتر طریق ہے۔ کیونکہ اگر یہ اراضی مجاہدین میں تقسیم ہو جاتیں اور عام مسلمانوں کے عطایا اور وظائف کے لیے وقف نہ ہو جاتیں تو پھر نہ اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی اور نہ جہاد کے لیے مضبوط لشکر فراہم ہو سکتا اور جب جہاد اور وظائف کا دروازہ بند ہو جاتا تو مسلمانوں کے ملک کافروں کی چڑھائی سے ہرگز مامون نہ رہتے اور اللہ تعالیٰ ہر حیثیت سے زیادہ بہتر جاننے والا ہے۔

اور شرح شرعۃ الاسلام میں سید علی زادہ حنفی[2] نے فرائض امیر پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

ولا يدع فقيرا فى ولايته إلّا أعطاه، ولا مديونا إلّا قضى عنه دينه، ولا ضعيفا إلّا اعانه، ولا مظلوما إلّا نصره، ولا ظالما إلّا

---

(۱) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب فى الفئ والخراج

(۲) سید علی زاد حنفی رحمہ اللّٰه: شيخ زاده على محمد بن مصلح الدين الفرجوى محى الدين الحنفى المعروف شيخ زاده المدرس الرومى رحمۃ اللّٰه علیہ متوفی ۹۵۱ھ۔ آپ کی مشہور تصانیف: تعليق على شرح الهداية لابن مكتوم، حاشيه على انوار التنزيل للبيضاوى، شرح فرائض الراجية شرح قصيدة البردة، شرح المشارق للصنعانى اور شرح وقاية فى مسائل الهداية ہیں۔

منعه عن الظلم ولا عاريا إلّا كساه كسوة. الخ.[1]

ترجمہ: اور امام اپنی ولایت (مملکت) کے اندر کسی فقیر کو فقیر نہ رہنے دے نہ کسی قرض دار کو قرض دار باقی رکھے نہ کسی کمزور کو بے مددگار رہنے دے نہ کسی مظلوم کو داد رسی سے محروم کرے اور نہ کسی ظالم کو ظلم کرنے دے اور ہر ننگے کو لباس مہیا کرے۔

اور امام کو جب کہ یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ ایک شعبہ کے محاصل اس کے مصارف کو اگر کفایت نہ کریں تو وہ دوسرے شعبہ سے قرض لے سکتا ہے تو پھر فیٔ، خراج، جزیہ، خمس، کراء الارض ضرائب، عشور غیر مسلم اور اموال فاضلہ میں مدات کا یہ تفاوت (Gap) معاشی نصب العین اور مقصد و منہاج پر اثر انداز نہیں ہوتا اور تکمیلِ مقصد کے لیے ان مدات کے مصارف میں ''اولی الامر'' کو حقِ مُداخلت حاصل ہے۔[2]

---

(۱) حنفی، سید علی زادہ: شرح شرعة الاسلام، باب فرائض الأمير

(۲) البتہ شریعۃ اسلامیہ کی واضح تعلیمات اور امت کا اجتماعی ضمیر کبھی بھی اسلامی ریاست کے خلیفہ یا حاکمِ وقت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ بیت المال یا سرکاری خزانہ کو اپنی ذاتی اغراض و مصارف میں بے دریغ خرچ کرنے لگ جائے۔ اس ضمن میں مولانا جسٹس تقی عثمانی اپنی کتاب ''حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تاریخی حقائق'' میں عطیہ بن قیس رحمہ اللہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا:

...... فانه ليس بمالی، وانما هو مال الله الذی أفاء عليكم. (ابن تيميه رحمه الله تعالىٰ: منهاج السنة، ج ۳، مطبوعه بولاق، قاهرة: ۱۳۲۳ھ، ص ٦٥)

ترجمہ: اس لیے کہ وہ مال میرا مال نہیں بلکہ اللہ کریم کا مال ہے، جو اس کریم نے تمہیں بطورِ فیٔ عطا فرمایا ہے۔

انہی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بسند صحیح واقعہ نقل کیا ہے، جو بیت المال کے مصارف اور اس کے مستحقین کے بارے امت کی اجتماعی سوچ اور بیداری کی خبر دیتا ہے۔ لیجئے آپ بھی پڑھ لیں اور امت کے اجتماعی ضمیر کی بیداری اور بلندی کی داد دیتے رہیے:

عن معاوية وصعد المنبر يوم الجمعة فقال عند خطبته: أيها الناس! إن المال مالنا والفئ فيئنا، من شئنا أعطينا ومن شئنا منعنا، فلم يجبه أحد. فلما كانت الجمعة الثانية قال مثل ذلك، فلم يجبه أحد. فلما كانت الجمعة الثالثة قال مثل مقالته، فقام إليه رجل فقال: =

خلاصہ:

الحاصل کے المال کے محاصل کو اہل مصرف پر خرچ کرنے کے لحاظ سے

كلّا! إنما المال مالنا والفيء فيئنا، من حال بيننا وبينه حكمناه إلى الله بأسيافنا. فنزل معاوية رضى الله عنه فأرسل إلى الرجل فأدخل عليه. فقال القوم: هلك، ففتح معاوية رضى الله عنه الأبواب ودخل الناس فوجدوا الرجل معه. على السرير. فقال: إن هذا أحياني أحياه الله. سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ستكون أئمة من بعدى يقولون فلا يرد عليهم قولهم، يتقاحمون فى النار تقاحم القردة، وإنى تكلمت فلم يرد على أحد فخشيت أن أكون منهم، فتكلّمت الثانية فلم يرد على أحد، فقلت فى نفسى: انى من القوم، ثم تكلمت الجمعة الثالثة فقام هذا فرد على فاحيانى احياه الله، فرجوت ان يخرجنى الله منهم، فاعطاه واجازه هذا حديث حسن. (علامه ذهبى رحمه الله: تاريخ الاسلام، مطبوعه مكتبة القدسى، قاهرة، ۱۳۶۸ھ، ص ۳۲۱، ۳۲۲

ترجمہ: حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن منبر پر چڑھے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: سارا مال ہمارا مال ہے اور سارا مال فئ بھی ہمارا مال ہے، ہم جس کو چاہیں دیں، اور جس کو چاہیں روک دیں گے۔ اس پر کسی نے کوئی جواب نہ دیا، دوسرا جمعہ آیا تو انہوں نے پھر یہی بات دہرائی، مگر کوئی نہ بولا، پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو آپ نے پھر یہی بات کہی۔ تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: ”ہرگز نہیں! مال تو سارا ہمارا ہے، مالِ فئ بھی ہم سب کا ہے، جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان رکاوٹ ہو گا، ہم اپنی تلوار کے ذریعے اس کا فیصلہ اللہ کریم کے پاس لے جائیں گے۔“ یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر سے اترے، اس شخص کو بلوا بھیجا، جب اسے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے: یہ شخص مارا گیا، لیکن حضرت معایہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکان کے دروازے کھول دیئے، لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص ان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے، اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”میرے بعد کچھ امراء ایسے آئیں گے جو (غلط) باتیں کہیں گے، مگر ان کا جواب نہیں دیا جائے گا، ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔“ میں نے (بطور امتحان) ایک بات کہی تھی، مگر کسی نے اس کی تردید نہ کی تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں اُن امراء میں داخل نہ ہو جاؤں، تو میں نے دوبارہ وہی بات کہی، پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں، پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے میری تردید کی۔ اللہ کریم اسے زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا، اب مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے امراء کے زمرے سے نکال دے گا۔“ پھر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شخص کو انعام و اکرام کے ساتھ روانہ کیا۔ امام ذہبی رحمہ اللہ اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں: (سند کے لحاظ سے) یہ حدیث حسن ہے۔

''اولی الامر'' کے اختیارات اس طرح منقسم ہیں کہ زکوٰۃ اور عشر جیسے محاصل کے لیے وہ صرف محافظ (Custodian) ہے اور منصوص اہل مصرف (Prescribed Beneficiecieries) پر ہی خرچ کر سکتا ہے اور فئ و خراج جیسے محاصل میں وہ اپنی رائے اور مجلس شوریٰ (Consultative Council) کے مشورہ سے مصالحِ خلافت اور مستحقین کی ضرورت کے پیشِ نظر خرچ کر سکتا ہے۔



باب — ⑥

بیت المال کے اخراجات

اعداد و شمار اور ان کی اہمیت

(Statistics & Their Importance)

مردم شماری (Census):

سطحی نظر میں اس مسئلہ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوتی اور نہ یہ "اسلام کے معاشی نظام" کے اندر بظاہر دخیل نظر آتا ہے لیکن دراصل معاشی مسائل میں "اعداد و شمار" کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ جب تک کسی ملک کی صحیح مردم شماری نہ کی جائے اور پھر پبلک کی معاشی زندگی کے درجات (Classification) یعنی برسر روزگار، بے روزگار، تاجر، صناع نیز معذور، فقیر، دائم المریض اور صاحب حاجت افراد کے صحیح اعداد و شمار مرتب نہ ہوں اور زمین، کارخانے، معدنیات یعنی ذرائع پیداوار نیز محاصل و مصارف کی تعیین و تشخیص (Determination & Fixation) میں بھی اعداد و شمار کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر کوئی حکومت نہ اس مقصد کی تکمیل کر سکتی ہے کہ قلمرِ حکومت میں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہے اور نہ وہ معاشی عدل و انصاف کا حقیقی توازن قائم رکھ سکتی ہے۔

پس جبکہ "اعداد و شمار" معاشی مسائل کے عادلانہ توازن (Equitable Balance) کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو بلاشبہ ان کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اسلامی

فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تو منجملہ دیگر مہمات امور (Campaign of Affairs) کے اس امر اہم کی جانب بھی توجہ کی گئی اور ''اعداد و شمار'' کو ''خاص حیثیت'' دے کر خلافت کے مختلف مسائل میں ان سے مدد لی گئی۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عصر خلافت میں مفتوحہ ممالک سے کثیر مال و دولت حاصل ہوا تو آپ نے صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے مشورہ سے عطایا (Grants & Stipends) اور وظائف (Salaries) کے سلسلہ میں مردم شماری کے رجسٹر قبائل اور منازل (مکانات) کے لحاظ سے مرتب کرائے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرمادیا۔ (راوی مؤرخ طبری رحمہ اللہ ہیں)۔[1]

اری مالا کثیرا یسع الناس و إن لم یحصوا حتی تعرف من أخذ ممن لم یأخذ خشیت ان ینتشر الأمر. الخ[2]

ترجمہ: میں دیکھ رہا ہوں کہ مال اب اس قدر بہتات کے ساتھ حاصل ہو رہا ہے کہ لوگوں کے لیے وسعت کے ساتھ کفایت کر سکتا ہے سو اگر لوگوں کی شمار کر کے ان کی تعداد کا احاطہ نہ کیا گیا تاکہ پانے والے اور پانے والے کا صحیح حال معلوم ہو سکے تو مجھ کو خوف ہے کہ اس معاملہ میں انتشار نہ پیدا ہو جائے۔

حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اس رائے کو صحیح سمجھ کر اس پر عمل کیا ہے۔[3]

---

(۱) طبری، ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ ۲۲۴ھ (مطابق ۸۳۷ء) طبرستان کے شہر آمل میں پیدا ہوئے ۳۱۰ھ (مطابق ۹۲۳ء) میں بغداد میں وفات پائی۔ آپ ایک بہت بڑے مفسر، محدث اور مؤرخ تھے۔ آپ نے بہت سی کتب تحریر کیں، مگر آپ کو شہرت دوام بخشنے والی کتابیں ''تاریخ الامم والملوک'' مشہور بتاریخ طبری اور ''تفسیر کبیر'' جو تفسیر طبری کے نام سے مشہور ہے، ہیں۔ آپ فقہ میں ''مسلکِ طبری'' کے بانی ہیں، مگر یہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں ختم ہو گیا، صرف تاریخ فقہ میں کہیں اس کا ذکر ملتا ہے۔

(۲) طبری، محمد بن جریر: تاریخ الامم والملوك، ج ۵/ ۲۲، ۲۳، مطبعة الحسنية مصرية، علی نفقه السید محمد عبداللطیف الخطیب و شرکاه: ص ۲۳، ۲۲

(۳) کسی ملک کی معاشی منصوبہ بندی (Economic Planning) اس کی ترویج (Implementation) اور نتیجۂ معاشی

(اس مستحسن رائے پر عمل پیرا ہونے کے لئے چند روایات ملاحظہ ہوں۔)

❶ وكتب الناس على قبائلهم وفرض لهم العطاء.[۱]

ترجمہ: اور لوگوں کی قبائل وار فہرست بنائی اور ان کے روزینے مقرر کیے۔

❷ فدعا عقيل بن ابى طالب ومخرمه بن نوفل وجبير بن معطم (رضى الله عنهم) وكانوا من نسّاب قريش. فقال: اكتبوا الناس على منازلهم.[۲]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عقیل بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۳] مخرمہ بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جبیر بن معطم رضی

ترقی (Economic Development) میں مردم شماری (Census) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی اہمیت کا احساس بھی مسلمان حکمرانوں اور معیشت دانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عمل سے ہوتا ہے۔ اگرچہ باقاعدہ مردم شماری کا کام خلیفہ دوم امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ہوا مگر اس کی ابتداء بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی جب ایک مرتبہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے تھے ان کے نام لکھے جائیں۔ چنانچہ پندرہ سو (۱۵۰۰) صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسماء گرامی ایک دفتر میں درج کیے گئے۔

عن حذيفة رضى الله عنه قال: قال النبى صلى الله عليه وسلم: اكتبوا لى من تلفظ بالاسلام من الناس، فكتبنا له الفا وخمس مائة رجل. (صحيح بخارى، كتاب الجهاد، باب كتابة الامام الناس)

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں) حکم دیا: میرے لیے ان لوگوں کے نام لکھ دو جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پندرہ سو (۱۵۰۰) آدمیوں کے نام لکھ کر دیئے۔

(۱) حوالہ بالا: ص ۲۲

(۲) حوالہ بالا: ص ۲۳

(۳) عقیل بن ابی طالب بن عبد المطلب ابن ہاشم القرشی، کنیت ابویزید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بصرہ چلے گئے، پھر کوفہ تشریف لے گئے۔ آخر شام چلے گئے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں وفات پائی۔ (دیکھئے: مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ: تعلیق ممجد علی مؤطا امام محمد: ص ۱۱۸۔ الاستیعاب، تذکرہ عقیل بن ابی طالب)

اللہ تعالیٰ عنہ [1] کو بلایا اور یہ تینوں قریش کے نسب کے ماہر تھے اور فرمایا کہ لوگوں کی شمار ان کے مکانات کے اعتبار سے کرو۔

قال رایت عمر بن الخطاب (رضی اللّٰه عنه) يحمل دوادين خزاعة حتى ينزل قديدا فتاتيه بقديد. فلا يغيب عنه امراءة بكر ولا ثيب فيعيطهن فى أيديهن. ثم يروح فينزل بعسفان، فيفعل مثل ذالك أيضا حتى توفّا. [2]

ترجمہ: (ولید بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کہتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ بنی خزاعہ کا رجسٹر ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں یہاں تک وہ قدید پہنچ گئے، اور قدید میں اپنے ہاتھ سے عطایا تقسیم کر رہے ہیں حتی کہ ایک عورت کنواری اور بیوہ ان کی شمار سے باہر نہ تھی اور اپنا حق حاصل کر رہی تھی اسی طرح عسفان میں جا کر انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور وفات تک ہر سال یہی کرتے رہے۔

اسی طرح خراج اور جزیہ کے سلسلہ میں مصر اور عراق کی مردم شماری کرائی گئی [3]

---

(۱) حضرت جبیر بن معطم القرشی النوفلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شمار قریش کے بڑے سرداروں میں ہوتا تھا۔ فتح مکہ مکرمہ ۸ھ کے موقع پر دولت اسلام سے سرفراز ہوئے۔ ان کے والد محترم معطم بن عدی اپنے کفر کے باوجود طائف سے واپسی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امان میں مکہ مکرمہ میں لے کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس احسان کی وجہ سے حضرت جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسلام لا کر آپ مدینہ منورہ رہائش پذیر ہو گئے۔ انساب اور وقائع جاہلیت کے ماہر تھے۔ ۵۹ھ میں مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی۔ آپ کی روایات کردہ احادیث صحاح ستہ میں موجود ہیں۔ (دیکھئے: اکمال فی الرجال، مشکوۃ المصابیح کے ذیل میں درج ہے۔ حرف الجیم طبقہ الذکور۔ ڈاکٹر غفاری، نور محمد: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی، واقعہ: سرداران طائف کا انکار ان کی معاشی خوشحالی کے سبب تھا)

(۲) حوالا بالا: ص ۲۳ ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعه، بیروت، ۱٤۱۸ھ / ۱۹۹۷ء تذکره عمر بن خطاب رضی اللّٰه عنه، ص ۲۲٦

(۳) طبری، حوالا بالا

اور غیر مسلموں (ذمیوں) کے روزینے مقرر کرنے کے لیے فہرستیں مرتب کرائیں۔ (۱)

تدوین دواوین (Compilation of Registers):

"اعداد و شمار" کی اہمیت کے یہی وجوہ واسباب تھے جن کی بدولت تدوین دواوین کا افتتاح ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولیات (Prime Movements) میں سے اس کو شمار کیا گیا۔ (چند اور ہنگامی اسباب یہ بھی تھے):

❶ والسبب في تدوين الدواوين أن عامل عمر على البحرين أتاه يوما بخسماته الف درهم فاستعظمها وجعل عليها حراسا في المسجد، فاستشار عليه بعض من عرفوا فارس والشام أن يدّون الدواوين، يكتبون فيها الأسماء وما لواحد واحد، وجعل الأرزاق مشاهرة.

ترجمہ: ابتدا میں اعداد و شمار کے رجسٹروں کی ترتیب کا سبب یہ پیش آیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بحرین کے گورنر کے پاس سے پانچ لاکھ درہم موصول ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو بڑی تعداد سمجھتے ہوئے مسجد میں اس پر محافظ مقرر کر دیئے (اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کیا) اور بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جو فارس و شام کے حالات سے واقف تھے یہ مشورہ دیا کہ رجسٹروں کی ترتیب دی جائے جن میں لوگوں کے نام اور ان سے متعلق روزینہ کا تذکرہ ہو اور روزینہ کا معاملہ ماہواری ہو جائے۔

❷ ولما توسع المسلمون في الفتح وانتشروا في الممالك،

(۱) ابو یوسف، كتاب الخراج، باب كيف كان فرض ابوبكر و عمر رضى الله عنهما لاصحاب النبى صلى الله عليه وسلم. ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعه بيروت، ١٤١٨ھ / ١٩٩٧ء، ص ٢٢٨ تذكره عمر رضى الله عنه.

وكثرت موارد الدولة، وتبسطت فى مناحى العمران، واخذ يزداد الفئ من الخراج والجزية زيادة، لا طاقة للخليفة وأمرآئه بضبطها. ولا قبل لهم بأحصاء مستحقيها و توزيع الأعطيات (المرتبات) على أربابها بالعدل إلّا بضبطها وترقيبها على اصول ثابتة وقيدها فى قيود خاصة، دعا عمر رضى اللّٰه عنه الصحابة رضى اللّٰه عنهم واستشارهم فى كيفية تدوين الديوان.

ترجمہ: مسلمانوں کی فتوحات جب وسیع ہو گئیں اور انہوں نے بہت سے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور دولت وثروت کا ذخیرہ بہت کافی جمع ہو گیا۔ اور ان کی عمرانی حدود بڑھ گئیں اور خراج و جزیہ کے علاوہ فئ و غنیمت میں اس قدر اضافہ ہونے لگا کہ خلیفہ اور اعیانِ خلافت اس کے نظم وانتظام سے عاجز آنے لگے اور مستحقینِ مصارف اور تقسیم عطایا میں اصحاب عطیات کا احاطہ ناممکن ہو گیا، اور جب تک انہیں خاص قیودات اور متعین و مرتب اصول پر ان کو مرتب نہ کیا جائے، ان کی ترتیب دشوار ہو گئی۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مجلسِ شوریٰ منعقد کی اور ان سے مشورہ کیا کہ کس طرح اہل مصارف کی مردم شماری کے اور محاصل کی تفصیلات کے رجسٹر مرتب کیے جائیں؟

حضرت بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)[1] جب بحرین سے مالِ کثیر لے کر آئے تو

(۱) حضرت بلال، حضرت بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام)، والدہ محترمہ کا نام حمامہ اور حبشہ کے رہنے والے تھے، امیہ بن خلف کے غلام تھے، اسلام لانے پر طرح طرح کی تکالیف اور مصائب برداشت کیں کبھی امیہ بن خلف اذیت پہنچانے پر زور لگاتا تو کبھی ابو جہل طبع آزمائی کرتا، پتھروں سے مارا جاتا، تپتی ریت پر گھسیٹا جاتا مگر یہ ایک ہی رٹ لگاتے رہتے۔ احد احد۔ اللہ کریم تو اکیلے ہی معبود ہیں۔ آپ پر ہونے والے مصائب، تکالیف کو دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرطِ محبت میں آ کر فرمایا کرتے =

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجلسِ مشاورت طلب فرمائی اور ارشاد فرمایا:

۳ أيها الناس! انه قد جاء مال كثير فإن شئتم أن نكيل لكم كلنا، وإن شئتم أن نعدكم عددنا، وان شئتم نزن لكم وزنالكم. فقال رجل من القوم: يا امير المؤمنين! دوّن للناس دوادين، يعطون عليها، فأشتهى عمر رضى الله عنه ذلك الخ.[1]

ترجمہ: لوگو! یہ مالِ کثیر آیا ہوا ہے پس اگر تم چاہو تو میں پیمانہ سے ناپ کر تم میں تقسیم کر دوں اور اگر تمہاری یہ خواہش ہو کہ گن کر دوں تو شمار سے بانٹ دوں اور اگر یہ مرضی ہو کہ وزن کر کے دوں تو اس طرح تول کر دوں؟ قوم میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا: امیرالمؤمنین! لوگوں کی شمار کے لیے رجسٹر مرتب کرائیے تاکہ اس کے مطابق وظائف دیئے جایا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو

تھے: "ابو بكر سيدنا واعتق سيدنا يعنى بلالا" ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے سردار تھے، انہوں نے ہمارے سردار بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزاد کرایا۔ آپ پہلے سابقین (یعنی حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت بلال، حضرت خباب بن ارت، حضرت صہیب رومی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت سمیہ ام عمار رضی اللہ عنہم اجمعین) سعادت مند افراد میں شامل تھے۔ مدینہ منورہ ہجرت کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن رہے تمام غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ حضرت ابوبکیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سعادت مند بیٹی آپ کے عقد میں آئیں۔ ایک دوسری روایت کے مطابق مدینہ منورہ کی ایک خاتون سے آپ نے عقد کیا۔ اولاد کا پتہ نہیں چلتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں جہاد کی نیت سے مدینہ منورہ چھوڑ کر شام چلے گئے۔ دمشق میں ساٹھ سے زیادہ سال کی عمر میں آپ نے ۲۰ (بیس) ہجری میں وفات پائی اور "الباب الصغير" بمقبرۂ دمشق دفن ہوئے (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔ (برائے تفصیل دیکھیں: ابن سعد: طبقات، ۱۷۳/۳، ۱۸۰. امام بخاری: التاريخ الكبير. ابن عبدالبر: الاستيعاب، ۱۷۸/۱، ۱۸۲. ابن عساکر: تاریخ: ۳۰۴/۳، ۳۱۸، زرکلی: سیر اعلام النبلاء: ۳۴۷/۱، ۳۶۰)

(۱) ابو يوسف: كتاب الخراج، باب كيف فرض ابو بكر و عمر رضى الله عنهما لأصحاب النبى صلى الله عليه وسلم

بہت پسند کیا۔

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا:

إن كنت صادقا لياتين الراعي نصيبه من هذا المال باليمن ودمه في وجه الخ.[1]

ترجمہ: بلال اگر یہ سچ ہے کہ روپیہ کی مقدار وہ ہے جو تم بتا رہے ہو تو پھر یمن کے رہنے والے چرواہے تک کا اس مال میں حصہ ہے۔ بایں حالت کہ سفر کی وجہ سے ہے چہرہ تمتمایا ہوا ہو۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے حوالجات ہیں جو مقریزی، ابن کثیر، طبری، ابو عبید[2] اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ تعالیٰ نے بکثرت تفصیل کے ساتھ نقل کیے ہیں جن سے مختلف ضروریات کے لیے مردم شماری اور محاصل و معارف کی تفاصیل کے سلسلہ میں "اعداد و شمار" کی اہمیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اعداد و شمار اور رجسٹروں کی ترتیب کا یہ سلسلہ تو ہر ایک حکومت میں ہوتا ہے اور مختلف ضروریاتِ حکومت میں سے یہ بھی ایک اہم ضرورت ہے خواہ وہ حکومت سرمایہ دارانہ نظام کی حامی ہو یا اس کی مخالف و معاند ہو اس کا "صالح معاشی نظام" کے بنیادی مسائل سے کیا تعلق ہے؟

---

(۱) ابو یوسف: حوالا بالا

(۲) ابو عبید رحمہ اللہ، قاسم بن سلام الہروی ۲۰۰ھ کے دوسرے نصف کے آغاز پر ہرا میں پیدا ہوئے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ کے مطابق آپ ۱۵۰ھ میں جبکہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ کے مطابق ۱۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ مقام ہرا میں پیدا ہوئے تو آپ ہروی جبکہ بغداد میں لمبی مدت تک قیام کی بنا پر آپ بغدادی کہلائے۔ آپ نے کوفہ اور بصرہ میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر نامور اساتذہ کرام ـــــ جن میں امام کسائی، اسماعیل بن عیاش، اسماعیل بن جعفر، ہشیم بن بشیر، شریک بن عبد اللہ (۱۸۷ھ / ۸۰۳م) عبد اللہ بن مبارک، عبد الحمید، سفیان بن عیینہ، ابو زید، ابو عبیدہ، فراء رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم شامل ہیں ـــــ تعلیم پائی۔ آپ مجتہد تھے۔ بعض کی رائے میں وہ مالکی اور بعض رائے میں شافعی تھے، آپ نے چونتیس (۳۴) اہم تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں "کتاب الاموال" بہت اہم ہے جو اسلامی نظام مالیات پر دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ نے ۲۲۴ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور دار جعفر میں دفن ہوئے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ اعداد و شمار اور اس سے متعلق دوادین و سجلات (Registers) کا ہر قسم کی حکومت کے ساتھ تعلق ہے اور کسی خاص طرز حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن اس سلسلہ میں "صالح معاشی نظام" اور "فاسد معاشی نظام" کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس حکومت کا سسٹم ایسے اصول پر قائم ہے کہ ان سے مذموم سرمایہ داری عالم وجود میں آتی اور نشو و نما پاتی ہے تو اس نظامِ حکومت میں "اعداد و شمار" کی اہمیت اس لیے ہوگی کہ اس ذریعے سے معلوم کیا جائے کہ ملک میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کی ترقی کی شکل کیا ہو اور کس طرح اس ناپاک مقصد کو ترقی دینے کے لیے عوام اور غریب طبقے کو آلۂ کار بنایا جائے؟ اس نظام میں بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کی بھی آوازیں سنی جائیں گی۔ لیکن اس آواز کے پس پردہ بھی وہی ذہنیت کارفرما ہوگی جو اس نظام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

اور اس کے برعکس جس حکومت کا طرز و طریق سرمایہ داری کے خلاف خلقِ خدا کی فلاح و بہبود پر قائم ہے اس کے نظامِ معاشی میں اس مسئلہ کی اہمیت اس طرح کارفرما نظر آئے گی کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کو عوام و خواص سب کی حاجت روائی کے لیے ذریعہ بنایا جائے۔ خصوصاً محروم المعیشت افراد کی حق رسی کا بہترین وسیلہ ثابت ہو۔

پس اسلام کے "صالح معاشی نظام" میں اعداد و شمار کی اہمیت ان ہر دو نظریوں میں سے دوسرے نظریہ کے پیشِ نظر ہے اور اس لیے بلاشبہ وہ اقتصادی مسئلہ میں اساسی مقصد کا "مقدمہ خیر" ہے۔ "تمہیدِ شر" نہیں ہے اس لیے معاشی نظم و انتظام کے لحاظ سے بھی ازبس ضروری ہے کہ "اولی الامر" اپنے قلمرو میں "مردم شماری" کا نظم قائم کرے اور مسلم و غیر مسلم اور ذمی و مستامن کی تفصیلات کو جدا جدا رجسٹروں میں درج کرائے اور برسر روزگار، بے روزگار، مریض، معذور اصناف کے اعداد و شمار محفوظ رکھے۔ نیز محاصل و مصارف کی تفصیلات کے لیے علیحدہ رجسٹر رکھے تاکہ ہر شخص اپنے معاشی حقوق کو بآسانی حاصل کر سکے اور خلافت کا معاشی نظام "صالح

نظام" کہلانے کا مستحق ہو۔

وظائف

(Salaries, Grants & Stipends)

کیا، کیوں اور کیسے؟

گذشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں دو قسم کی رعایا حقوقِ شہری سے مستفید ہوتی ہے ایک "مسلم" یعنی وہ جماعت جس نے اسلام کے مکمل نظام کو قبول کر لیا اور دینِ الٰہی کے ہر فیصلہ کو اپنا ایمان بنا لیا ہے اور دوسری (ذمی) یعنی وہ غیر مسلم جماعت جس نے ایمانیات، عبادات اور اخلاقیات دینی میں آزاد رہ کر اور اسلام سے انحراف کر کے صرف سیاسی و اقتصادی اور معاشرتی امور میں حکومتِ اسلامیہ اور اس کے قوانین کی پناہ قبول کر لی ہے اور اسلامی طاقت (خلافت) کا مطیع رہنا منظور کر لیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اس دوسری جماعت پر اس کی مال، جان اور آبرو کی حفاظت کے باوجود مقررہ ٹیکس (خراج و جزیہ) کے علاوہ ان پر کوئی ٹیکس عائد ہوتا ہے نہ وہ فوجی خدمات کے لیے مجبور کیے جا سکتے ہیں اور نہ حکومت کی دوسری خدمات ان پر عائد ہوتی ہیں۔ لیکن پہلی جماعت (مسلم) پر یہ سب خدماتِ مالی و جانی عائد ہیں اور وہ ان خدمات کے لیے خاص خاص حالات میں مجبور بھی کی جا سکتی ہے۔

اور اس فرقِ باہمی کے لیے اسلام یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جب کہ پہلی جماعت نے اسلام کے مکمل نظام کو تسلیم کر لیا ہے تو اب اسلام کا حق ہے کہ وہ اپنی ہر ایک خدمت کے لیے اس کو پکارے اور حالات و مقتضیات (Requirements) وقت کے پیشِ نظر حکومتِ ربانی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو خدمت چاہے اس کے سپرد کرے اس کو انکار و منع کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ اس کے وفادارانہ انقیاد و تسلیم (Submission) کے جواہر ایسے ہی مواقع پر کھلتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا

چاہیے کہ جبکہ ملتوں کے مختلف نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں اسلام میں نظامِ حکومت خود اس کا اپنا انعام ہے تو بلاشبہ اس کا فرض ہے کہ اس نظام کی بہتری کے لیے ہر قسم کی خدمات انجام دے۔

پس جب کہ اس اصول کے ماتحت اس جماعت ''مسلم'' کا جان و مال اسلام اور حکومت اسلامی کے لیے وقف ہیں تو حکومت کے ذمہ ضروری ہے کہ ان کے بیشتر افراد کا تکفل (Maintenance) اپنے ذمہ میں لے اور بڑی حد تک ''اسٹیٹ'' ہی ان کی معاشی زندگی کی ضامن ہو تاکہ ملت کا ہر فرد اپنی دماغی اور عملی محنت کے ذریعہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود میں مصروف ہو اور فارغ البال ہو کر رفاہیت اور پاک عیش و راحت کے ساتھ جماعتی استحکام کے لیے کارآمد ''پرزہ'' بن سکے اور اس طرح ان کی زندگی کا بڑا حصہ خلافت (حکومت یا ملت) و ملک کی خدمات کے لیے وقف ہو جائے۔

علاوہ ازیں اس طریقِ کار سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا قوم و ملت کی جماعتی فلاح اور ترقی کا وہ اثر ''جو اس طریقہ سے پیدا ہوگا'' خود افرادِ قوم پر پڑے گا اور ہر فردِ ملت نہ صرف اپنی معاشی زندگی میں بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں اپنی اپنی طبعی استعداد کے مطابق بہرہ مند اور فیض یاب ہو سکے گا اور یہی اقتصادی نظام کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

پس حکومت (خلاف) اس جماعت کے افراد سے مختلف شعبوں کی خدمت لیتی اور ان کے اور ان کے اہل و عیال کی براہ راست کفالت کرتی ہے۔ مثلاً ''جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت'' ''وصولِ صدقات و زکوٰۃ کی خدمت'' ''تعلیم و تبلیغ کی خدمت'' ''مختلف محکمہ جات کی خدمت'' اور جو افرادِ امت ان خدمات کے قابل نہیں ہیں مثلاً مریض اور معذور یا معاشی وسائل سے قطعاً محروم ہیں۔ مثلاً یتامی و بیوگان، فقراء اور مساکین تو ان کا بار کفالت بھی حکومت ہی کے کاندھوں پر ہے تاکہ صالح معاشی نظام کا مقصد وحید فوت نہ ہونے پائے۔ حکومت کی یہی کفالت

اور معاشی ذمہ داری "عطایا اور وظائف" کے نام سے نامزد ہے۔

تنخواہ اور الاؤنس کا آغاز:

مسطورہ بالا وجوہ واسباب اور بیان کردہ مصالح عظیمہ کے پیشِ نظر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کے لیے زندگی کا جو دستور العمل مقرر فرمایا تھا اس کا ذکر احادیث و سیر کی کتابوں میں اجمال و تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ چنانچہ ابو عبید رحمہ اللہ نے کتاب الاموال میں اس کا مختصر نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

فلما كثرت الأموال في أيام عمر رضي الله عنه وضع الديوان، فرض الرواتب للعمال والقضاة ومنع ادخار المال، وحرم على المسلمين اقتناء الضياع والزاعة او المزارعة لأن ارزاقهم وارزاق عيالهم فدفع لهم من بيت المال حتى إلى عبيدهم و مواليهم. اراد بذلك ان تبقوا جندا على أهبة الرحيل لا يمنعهم انتظار الزرع ولا يقعدهم الترف والقصف الخ.[1]

ترجمہ: جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں حکومت میں مال کی بہتات ہو گئی اور اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب ہو گئے تو حکومت کے کارکنوں، گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہرے مقرر کر دیئے گئے اور مال اور خزانے جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور مسلمانوں پر کاشتکاری و زمینداری ممنوع کر دی گئی۔ اس لیے کہ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے روزینے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے بلکہ ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے بھی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ تمام قوم عسکری بن جائے اور اس طرح وہ کوچ کے لیے چست و چالاک رہے کہ ان کے سفر کے سامنے نہ زمینداری مانع آئے نہ کاشت کاری

---

(۱) جوهری طبطاوی: نظام العالم والامم، ۱۸۳/۲ مطبع رحمانيه، قاهرة، ماخوذ: از كتاب الاموال لابي عبيد وكتاب الخراج لابي يوسف رحمه الله تعالى.

اور یہ کہ وہ بے محنت کی زندگی اور عیش و عشرت میں نہ پڑ جائے۔

غلط فہمی کا ازالہ:

ممکن ہے یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر تمام رعایا کاشتکاری اور زمینداری دونوں سے محروم کر دی جائے تو پھر خام اجناس کی پیداوار اس ملک میں کیسے ہوگی اور جس ملک میں خاص اجناس کی پیداوار نہ ہو وہ کس طرح اپنی اقتصادی حالت کو برقرار رکھ سکتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہمیشہ کے لیے یہ حکم یکسانیت کے ساتھ قائم رکھا جائے گا، بلکہ اس حکم سے (جیسا کہ خود اس عبارت میں درج ہے) مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ جہاد کے قیام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے بقاء کی خاطر از بس ضروری ہے کہ تمام افرادِ ملت یہ یقین کریں کہ ان کی زندگی "اجتماعی نظام" کی حیات کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کے قویٰ عملی خود اپنے لیے نہیں ہیں بلکہ جماعت کی خدمت یا خلافتِ اسلامی کے استحکام کے لیے ہیں اور اسی لیے ان کی معاشی زندگی کے لیے بڑی حد تک خلافت (اسٹیٹ) خود متکفل (Responsible for Maintenance) ہے نیز یہ کہ زمینداری سسٹم چونکہ عیش پسندی، دوسروں کی محنت پر بھروسہ اور کاہلی و بے کاری کی دعوت دیتا ہے اس لیے بھی مسلمانوں کو اس سے جدا رکھنا مناسب سمجھا گیا۔

اور چونکہ کاشت کی یہ خدمت اس زمانے میں مفتوحہ ممالک کے وہ تمام ذمی انجام دیتے تھے جو اسلام کی حکومت کے زیر سایہ رہنا تو قبول کر لیتے تھے لیکن اسلام ان پر اپنے اقتصادی یا سیاسی نظام کو زبردست ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا تھا اور اس طرح خام اجناس وغیرہ ضروریات کی بہم رسانی کا بہترین ذریعہ حاصل تھا لہذا اس وقت کے مناسب یہی طریق کار تھا کہ مسلمان زمین سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ لیکن جب معاملہ کی یہ نوعیت باقی نہ رہے تو پھر اس شجر ممنوعہ کی اس حد تک اجازت باقی رہے گی جس سے اصل مقصد کسی درجے میں بھی فوت نہ ہونے پائے۔[1]

(۱) بعض روایات سے ایک مخصوص و محدود طرز کی زمینداری کا جواز ثابت ہے اور فارق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ =

اور اگر حقیقت بین نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اگر مسلمان زمین سے استفادہ کرنے کے جواز کی آڑ لے کر زمینداری اور کاشتکاری کے جال میں نہ الجھ جاتے اور "جہاد الحق" کو شعار بنا کر سادہ اور پاک معاشی زندگی کو اسوۂ بنائے رکھتے تو بلاشبہ آج دنیا کے ہر گوشہ میں حکومتِ الہیہ (خلافت حقہ) کا علم بلند نظر آتا ہے۔

وظائف کے شعبہ جات

بہرحال وظائف کا یہ نظم مختلف حیثیات کے اعتبار سے متعدد شعبوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک شعبہ کے لیے رجسٹر اور فہرستیں جدا جدا رہنا ضروری ہیں۔

پہلا شعبہ بقاعدہ اور رضا کار فوجی(Army Standing & Volunteers):

ان وظائف سے متعلق جو فوجی خدمات یعنی "جہاد بالسیف" سے متعلق تھا، اگرچہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اس کے ہر پیرو کے لیے "والنٹیر" (رضا کار) (Volunteer) ہونا ضروری ہے اور ہر شخص کو "جہاد" کے لیے آمادہ رہنا واجب ہے۔

اس لیے اس شعبہ کو دو حصوں پر تقسیم کرنا چاہیے۔

❶ وہ جو فوجی جماعت میدان جہاد میں عام طور سے حصہ لیتی رہتی ہے اور باقاعدہ فوج میں(Standing Army) شامل ہے۔

❷ دوسری وہ جماعت جو عام طور پر اپنے کاروبار میں مشغول رہتی ہے مگر وقت پر فوجی خدمت کے لیے حاضر ہو جاتی ہے ایسی جماعت کو والنٹیر (مطوعہ یا رضا کار) کہا جاتا ہے۔

خلافتِ اسلامیہ کی جانب سے ان دونوں جماعتوں کے لیے وظائف کا تقرر کیا

کے اس اثر سے ممانعت ظاہر ہوتی ہے تو ان ہر دو قسم کی روایات میں تطبیق کی صورت یہی ہے جو اس صفحہ پر درج ہے یعنی نفس جواز کے قبول کے ساتھ ساتھ اسلامی مرغوبات (Wishfuls) میں سے یہی بات ہے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلہ سے ظاہر ہے۔

جاتا ہے اور ابتداءِ دورِ خلافتِ فاروقی میں ”مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم“ اسی فہرست میں شامل تھے اور بحرین سے مالِ کثیر آنے پر جو روزینے مقرر کیے گئے وہ اسی شعبہ سے متعلق تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس بارے میں مشورہ کیا تو ولید بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ کہا:

❶ يا امير المؤمنين! قد جئت الشام فرائت ملوكها قد دوّنوا ديوانا، وجنّدوا جنداً. فدون ديوانا وجند جندا فأخذ بقوله الخ.[1]

ترجمہ: اے امیرالمؤمنین! میں شام رہ آیا ہوں میں نے وہاں کے بادشاہوں کے یہاں دیکھا ہے کہ انہوں نے رجسٹر بنا رکھے ہیں اور لشکریوں کو باقاعدہ درج رجسٹر کر رکھا ہے۔ آپ بھی روزینہ کے لیے رجسٹر بنوائیں اور لشکریوں کے نام درج رجسٹر کریں، پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی بات منظور کر لی۔

❷ لما فتح الله عليه وفتح فارس والروم، جمع اناسا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: ما ترون؟ فاني أرى أن أجعل عطاء الناس فى كل سنة واجمع المال فانه اعظم للبركة؟ قالوا: إصنح ما رائت، فانك انشاء الله موفق. قال: ففرض الاعطيات، فدعا باللوح. فقال: بمن أبداء؟ فقال له عبدالرحمٰن بن عوف رضى الله عنه: إبدأ بنفسك. فقال: ولا والله ولكن بنى هاشم، رهط النبى صلى الله عليه وسلم الخ.[2]

(۱) طبری: تاریخ الامم والملوك، ٢٣/٥. ابن سعد: طبقات، ج ٣ مطبوعه بيروت، ١٤١٨ھ/١٩٩٧ء، ص ٢٢٤

(۲) ابو يوسف: كتاب الخراج، باب كيف كان فرض ابو بكر و عمر رضى الله عنهما =

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ وسیع کر دیا اور فارس وروم بھی فتح ہو گیا تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مجلسِ مشاورت منعقد کی اور فرمایا: میرا ارادہ ہے کہ لوگوں کے سالانہ وظائف مقرر کروں اور مال کو بیت المال میں جمع رکھوں اس لیے کہ یہ باعثِ برکت ہو گا، آپ لوگوں کی رائے کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کہا: جو آپ مناسب سمجھیں وہ کیجئے، خدا کی توفیق آپ کے شاملِ حال ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وظائف کا تقرر کیا اور درج رجسٹر کرنے کے لیے تختی منگائی اور پھر پوچھا: پہلے کس کا نام لکھوں؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اپنے نام سے شروع کیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ کریم کی قسم! یہ تو نہ ہو گا بلکہ (میں تو) بنی ہاشم سے شروع کرتا ہوں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان ہیں۔

اس تقررِ وظائف میں اگرچہ فوجی شعبہ کے علاوہ بھی بعض لوگوں کے نام پائے جاتے ہیں لیکن ابتداء میں ایسا رہا ہے مگر بعد میں ایک شعبہ کو دوسرے شعبہ سے کلیۃً ممتاز کر دیا گیا تھا۔ اور جس طرح مجاہدین کے وظائف مقرر کیے گئے تھے اسی طرح ان کے اہل وعیال کے بھی وظائف مقرر تھے۔[1]

شروع شروع میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی بچہ کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہ کرتے جب تک اس کا دودھ نہ چھوٹ جاتا۔ مگر ایک مرتبہ انہوں نے رات کے گشت میں دیکھا کہ ایک عورت کا بچہ رو رہا ہے اور مچل رہا ہے، مگر اس کی والدہ پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے دریافتِ حال کیا تو عورت نے عرض کیا کہ عمر رضی اللہ

لاصحاب النبی الکریم صلی اللّٰه علیه وسلم

(۱) ابو عبید: کتاب الاموال (مطبوعه ۱۳۵۲ھ) ص ۲۳۷، ۲۴۱

تعالیٰ عنہ کا حکم ہے کہ جب تک بچہ کا دودھ نہ چھوٹ جائے اس کا وظیفہ مقرر نہیں کیا جاتا اور میں پریشانِ حال ہوں اس لیے قبل از وقت اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اس وجہ سے یہ بے تاب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صبح ہی کو تمام قلمرِدِ خلافت میں منادی کرادی کہ آئندہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا روزینہ مقرر کر دیا جایا کرے گا۔(۱)

دوسرا شعبہ عدلیہ اور انتظامیہ (Judiciary & Administration):

قضاۃ و عمال (Judges & Administrators) حکومت سے متعلق ہے، حکومتِ اسلامی میں جوڈیشیل اور ایگزیٹو (Judicial & Executive) کے کارکنوں کے مشاہروں کا سسٹم دوسرے قدیم و جدید طرز ہائے حکومت کے سسٹم پر قائم نہیں کہ ان کی اساس و بنیاد دماغی اور تعلیمی استعداد کا معیار قائم کر کے مقرر کی جائے اور اس طرح رضا کارانہ خدمات کو تجارتی (بزنس) سسٹم میں ڈھال دیا جائے بلکہ ان کے لیے بھی حکومت کی جانب سے وظائف مقرر ہوتے ہیں۔

ججوں اور افسران کی تنخواہوں کی مقدار:

ان کے تقرر میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے:

1. اول یہ کہ وہ اس مقدار میں ضرور ہو کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی بخوبی کفالت کر سکے اور ان کو مجبوراً رشوت کی جانب مائل نہ ہونا پڑے۔
2. دوسرا یہ کہ عام طور پر ان میں یکسانیت ہو یہ نہ ہو کہ ایک اگر سو پا رہا ہے تو دوسرا ایک ہزار اور ان وظائف کے تقرر کا معاملہ امام اور اولی الامر کی صوابدید پر ہے۔

تقرر وظائف پر فقہاء کی آراء:

1. قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ عمال، قضاۃ اور محکمہ ڈاک کے کارکنان کے وظائف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۲۳۷

❶ وتأمر باختيار الثقات العدول من اهل كل بلد ومصر. فتوليهم البريد والاخبار. وكيف ينبغى ان لا يقبل خبر الا من ثقة عدل؟ ويجرى لهم الرزق من البيت المال الخ.(۱)

ترجمہ: اے ہارون! اور تو قلمرو خلافت میں احکام بھیج دے کہ ہر شہر اور بستی میں عادل اور ثقہ لوگ چن کر ان کو ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ سپرد کر دیا جائے کیونکہ اگر عادل اور ثقہ کی خبر بھی قابل اعتماد نہ ہوگی تو اور کس کی خبر لائق وثوق ہو سکتی ہے؟ اور ان کے لیے بیت المال سے روزینے مقرر کر۔

❷ وكل رجل تصيره فى عمل المسلمين فاجر عليه من بيت مالهم. ولا تجر على الولاة والقضاة من مال الصدقة شيئا الا والى الصدقة، فانه يجرى عليه منها. كما قال الله تبارك و تعالى: او "العاملين عليها"، فامّا الزيادة فى ارزاق القضاة والعمال والولاة، والنقصان مما يجرى عليهم فذلك إليك.(۲)

ترجمہ: اور ہر وہ شخص جس کو تو مسلمانوں (حکومتِ اسلامی) کی خدمت پر مامور کرے اس کا روزینہ بیت المال سے مقرر کر اور گورنروں اور قاضیوں کو زکوٰۃ کی مد سے یہ وظیفہ نہ دیا جائے صرف "عمالِ صدقات" کو صدقات میں سے وظیفہ دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے تصریح فرما دی ہے "والعاملین علیھا" (یعنی صدقات میں سے ان کو دو جو اس کے وصول کرنے پر مامور ہوں) باقی ان کے وظائف میں کمی زیادہ کا معاملہ تیری (یعنی امام المسلمین) کی صوابدید پر

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، بیان اتخاذ العیون علی العمال وحسن اختیارھم، مطبوعہ دار الاصلاح، مصر کا صفحہ ۳٦۱

(۲) حوالہ بالا

ہے۔

❷ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ[1] تحریر فرماتے ہیں:

ثم إن الإمام لما كان لا يستطيع بنفسه أن يباشر جباية الصدقات واخذ العشور وفصل القضاء في كل ناحية، وجب بعث العمال والقضاة، ولما كان اولئك المشغولين بأمر من مصالح العامة وجب أن تكون كفايتهم في بيت المال الخ.[2]

ترجمہ: پھر جب امام تنہا یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ صدقات، زکوٰۃ اور عشور کو خود وصول کرے اور ہر مقام کے جھگڑوں کو چکائے تو ضروری ہوا کہ وہ قاضیوں اور عاملوں کو ہر جگہ مقرر کرے۔ اور جب کہ یہ مصالح عامہ اور ان کی خدمت گزاری پر لگا دیئے گئے ہوں تو یہ بھی ضروری ٹھہرا کہ ان کی معاشی کفالت بیت المال کرے۔

❸ اور امام ابو عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فانما لهم من المال بقدر سعيهم وعمالهم الخ.[3]

ترجمہ: اور ان عمال، حکام اور ولاۃِ مسلمین کے لیے بیت المال سے وظیفہ ان کی سعی اور کام کی نوعیت کے پیشِ نظر ملنا چاہیے۔

❹ عن مالك ليس للعامل على الصدقة فريضة مسماة انما ذالك الى نظر الامام واجتهاده.

ترجمہ: امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عاملین کا روزینہ کوئی مقررہ معینہ مشاہرہ نہیں ہے بلکہ امام اور اس کے اجتہاد کی صوابدید پر ہے۔

❺ قال ابو عبيد: وكذلك قول سفيان واهل العراق وهذا

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ: حجة البالغه، ج ۲، باب الخلافة

(۳) ابو عبيد: كتاب الاموال (۱۳۵۲ھ) ص ۶۰۶

عندنا هو المعمول به. الخ[1]

ترجمہ: ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہی سفیان رحمہ اللہ[2] اور اہل عراق کا قول ہے اور یہی ہمارا معمول بہ ہے۔

تیسرا شعبہ تعلیم و تبلیغ (Teaching & Preaching):

تعلیم و تبلیغ کی خدمات سے متعلق ہے یعنی جو افرادامت قرآن عزیز، مسائل دین کی تعلیم اور تبلیغ اسلام کی خدمت کے لیے انجام دیتے ہیں۔ اسلام نے تعلیم (دینی اور مفید تعلیم دنیوی) کو ہر فرد امت کے لیے ضروری قرار دیا ہے اس لیے وہ تعلیم و تعلم کے لیے عام سہولتیں پہنچانے کے لیے اس سلسلہ میں بھی وظائف کا تقرر ضروری قرار دیتا ہے اور دینی تعلیم میں اگرچہ معلّمین کی خدمت لوجہ اللہ اور فی سبیل اللہ ہونی چاہیے۔ مگر جبکہ وہ اپنے کاروباری وقت کو ان پاک اور اہم مقاصد کے لیے وقف کر چکے ہیں تو حکومتِ اسلامی کا فرض ہے کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی کفالت

---

(۱) حوالہ بالا: ص ٦٠٦

(۲) سفیان بن سعید ثوری کوفی رحمہ اللہ عراق کے علاقہ ثور میں ۶۷ھ میں پیدا ہوئے لہذا ثوری کہلائے۔ ایک روایت کے مطابق ایک دن مسجد میں داخل ہوتے وقت بھول کر بایاں پاؤں پہلے داخل کر گئے۔ ان کے استاد رحمہ اللہ نے فرمایا: "أانت ثور" کیا تو بیل ہے؟ (کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت کر کے دایاں کی بجائے بایاں پاؤں مسجد میں پہلے رکھ رہا ہے) استاد کے اس لقب کی وجہ سے عمر بھر ثوری (یعنی بیل کی طرح) کہلانا پسند کیا۔ آپ بڑے محدث، فقیہہ اور امام تھے۔ آپ کے نام سے باقاعدہ ایک فقہی مذہب بنا مگر بعد میں متروک ہو گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ رحمہ اللہ علیہا بہت عالی ہمت اور پکباز خاتون تھیں، انہوں نے اپنے بیٹے سفیان رحمہ اللہ سے فرمایا: میرے بیٹے! علم حاصل کر، میں چرخہ کات کر تیرے اخراجات پورا کروں گی۔ میرے بیٹے! تم دس احادیث نقل کر چکو تو دیکھو کیا تم اپنے ارادہ، تحمل اور وقار میں کچھ اضافہ پاتے ہو؟ لیکن اگر (اللہ کریم نہ کرے) تم ایسا محسوس نہ کرو تو جان لینا کہ تیرے علم نے تجھے نفع کی بجائے نقصان پہنچایا (یعنی تیرا علم اگر تقوی سے حاصل کیا گیا تو فائدہ ہی دے گا) آپ کی تصانیف میں الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، الفرائض، رسالہ الی عباد بن عباد اور تفسیر (مطبوعہ ہند) شامل ہیں۔ آپ نے ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔ (صبحی صحمصانی: فلسفه التشريع فى الاسلام، باب دوم، فصل ٦ متروك مذاهب۔ ابن سعد: طبقات، ٢٥٨/٦. ذهبى: تذكرة الحفاظ، ٢٠٦/١. سهمى، حمزه بن يوسف: تاريخ جرجان، حيدرآباد، ٤٤٩. ابن نديم: الفهرست، ص ٢٣٥)

کرے تاکہ ان کو محروم المعیشت ہو کر اس مقدس سعی سے بے تعلق نہ ہو جانا پڑے۔

تعلیمی وظائف (تنخواہوں) کا اجراء مختلف خلفاء کے ادوار میں:

چنانچہ حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور حضرت عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں اس شعبہ کا بہت بڑا اہتمام کیا اور معلّمین و مبلغین کے وظائف مقرر فرمادیئے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے سیرۃ العمرین میں نقل کیا ہے:

أن عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان رضی اللہ عنهما كانا يرزقان المؤذنين والائمة والمعلمين الخ.[1]

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما مؤذنوں، اماموں اور معلموں کو ماہانہ وظائف دیا کرتے تھے۔

اسی طرح فقہاء کے وظائف کے متعلق ابن جوزی رحمہ اللہ[2] نے تفصیلات نقل کی ہیں اور کس فقیہ کو کس شہر میں تعلیم فقہ پر مامور کیا گیا اس کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے[3] اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانۂ خلافت میں بھی یہ

---

(۱) ابن جوزی: سیرۃ العمرین، مطبعۃ الرحمانیہ، قاہرۃ: ۱۹۲۷ء، ص ۱۶۵

(۲) ابن جوزی، عبدالرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی القرشی البغدادی ابوالفرج رحمہ اللہ تاریخ اور حدیث نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں اپنے زمانہ کے بڑے عالم تھے۔ آپ نے تقریباً تین سو (۳۰۰) کتابیں لکھیں، جن میں زیادہ مشہور "تلقيح فهوم اهل الآثار فی مختصر السير الآثار"، "تلبيس ابليس"، "زاد المسير"، "صفة الصفوة" اور "مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ" ہیں۔ آپ نے بغداد میں ولادت اور بغداد ہی میں وفات پائی۔ (ابن كثير: البداية والنهاية، ۲۸/۳. زركلی: الاعلام، ۹۰/٤)

(۳) حوالہ بالا: ص ۱۶۸۔ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے اموی ادوار ـــــ بالخصوص حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد ـــــ میں فقہ کی تعلیم کے لیے ہر بڑے شہر میں فقہاء کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھیجا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض اپنی معاشی مجبوریوں کی بدولت وظیفہ بھی قبول کر لیا کرتے تھے جن میں سے بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ بھی کتب تاریخ کے سینہ میں محفوظ ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں علامہ جزری رحمہ اللہ تحریر کرتے ہیں:

=

کان أحد العشرة الذین بعثهم عمر رضی اللّٰه عنه الی البصرة یفقهون الناس. (علامه عزالدین ابوالحسن علی بن محمد الجزری رحمه اللّٰه: اسد الغابة، تذکره عبداللّٰه بن مغفل رضی اللّٰه عنه)

ترجمہ: یہ ان دس فقہاء میں سے ایک تھے جنہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصرہ میں لوگوں کو فقہ کی تعلیم دینے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو درداء اور حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن مجید پڑھائیں اور فقہ کی تعلیم دیں۔ (اسد الغابة، تذکرہ مذکورہ اصحاب رضی اللّٰہ عنھم)

حضرت عمران بن الحصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں فقہ کی تعلیم کے لیے بصرہ بھیجا گیا۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

وکان ممن بعثهم عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه الی اهل البصرة لیفقههم. (حافظ شمس الدین ابوعبداللّٰه الذهبی رحمه اللّٰه تعالیٰ: تذکرة الحفاظ، تذکره عمران بن الحصین رضی اللّٰه عنه)

ترجمہ: یہ ان (بزرگ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم) میں سے تھے، جنہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل بصرہ کو فقہ کی تعلیم دینے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔

انہی علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن غنم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہیں تعلیم فقہ کے لیے شام روانہ کیا گیا۔ (تذکرة الحفاظ، ذکر عبدالرحمٰن بن غنم رضی اللّٰه عنه)

اسی طرح حضرت ابن ابی جبلۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل مصر کی فقہ میں تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔ (جلال الدین سیوطی رحمه اللّٰه تعالیٰ: حسن المحاضره فی اخبار مصر والقاهرة)

حضرت محمد بن کعب قرظی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں انصار باوفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے پانچ حفاظ قرآن تھے حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو درداء اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں شام کے گورنر حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے درخواست کی کہ شام میں قرآن وفقہ کی تعلیم کے لیے اساتذہ کرام بھیجے جائیں۔ مشورہ ہوا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مریض تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بوڑھے تھے۔ لہذا باقی تین حضرات میں سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فلسطین کے لیے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ حمص کے لیے اور حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ دمشق کے لیے روانہ کیے گئے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمواس کی وبا میں، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فلسطین پہنچ کر اور حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حمص میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ (ابن سعد: طبقات، تذکره عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه)

سلسلہ جاری رہا۔

بعث عمر بن عبدالعزیز یزید بن ابی مالک الدمشقی والحارث بن یمجد الاشعری یفقھان الناس فی البدر، واجری علیھما رزقا، فاما یزید فقبل واما الحارث فابی الخ.[1]

ترجمہ: عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے یزید بن ابی مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حارث بن یمجد اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین سکھائیں اور ان کے لیے روزینہ مقرر فرمایا۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے تو قبول کر لیا مگر حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روزینہ لینے سے انکار کر دیا (یعنی بلا معاوضہ یہ خدمت انجام دی)۔

اسی طرح طلباء کے لیے بھی وظائف مقرر کیے:

أن عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ کتب الی بعض عما لہ ان اعط الناس علی تعلم القرآن.[2]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض عاملوں کو لکھا کہ قرآن سیکھنے والوں کے لیے وظیفہ مقرر کریں۔

اس حکم پر عاملوں نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن سیکھنے کی رغبت کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنے کی خاطر طالب علم بننا اختیار کر لیا ہے مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے باوجود وظیفہ بند نہیں کیا۔

---

(۱) ابو عبید: کتاب الاموال، ص ۲۶۲، بروایت نعیم بن حماد رحمہ اللہ تعالیٰ

(۲) حوالہ بالا، بروایت ابراھیم بن سعد رحمہ اللہ، ص ۲۶۱

امام محمد رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں صفیں درست کرنے کے لیے خاص اشخاص مقرر کیے گئے تھے اور حج کے دنوں میں بھی ایسے اشخاص مقرر تھے جو حجاج کرام کو مقررہ مقام تک پہنچاتے تاکہ ان کے مناسک حج صحیح طریقہ پر ادا ہو سکیں۔ (موطا: ص ۲۸۶، ۱۴۰)

چوتھا شعبہ: کفالت عامہ (Social Security):

ضرورت و اہمیت:

فقراء و مساکین اور محروم المعیشت افراد کے وظائف سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے اس شعبہ کا مقصد یہ ہے کہ قلمر دِ خلافت کا ایک فرد بھی معیشت سے محروم نہ رہے یعنی جو اشخاص مزمن مرض (دائمی مرض) ضعفِ پیری، نقص اعضاء، یتیمی و بیوگی یا دوسرے اسباب کی بنا پر کسب معیشت سے معذور ہیں وہ افراد امت پر بار دوش نہ بن جائیں بلکہ حکومت ''بیت المال'' سے ان کے وظائف مقرر کر کے ان کے حقِ معیشت کو پورا کرے۔

شعبہ کی بنیاد و اساس:

اس شعبہ کی اساس و بنیاد قرآنِ عزیز کی آیات صدقات و زکوٰۃ ہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں تصریح ہے کہ:

تؤخذ من اغنیائھم وتُردّ علی فقراءھم [1]

ترجمہ: ان کے مالداروں سے ''صدقات'' لیے جائیں اور ان کے حاجت مندوں پر صرف کیے جائیں۔

اور وہ صحیح روایات ہیں جن میں فقراء کی تنگی معیشت کے انسداد کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ (مثلاً):

وعن جریر رضی اللہ عنه قال: اتی النبی صلی اللہ علی وسلم قوم حفاۃ عراۃ مجتابی النمار او العباء، متقلدی السیوف، عامتھم من مضر. فتمعر وجه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لما رای بھم من الفاقة. فدخل ثم خرج فقال: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ...... إِنَّ

(۱) صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الزکاۃ - ریاض الصالحین، باب تاکید وجوب الزکاۃ۔

اَللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ﴿١﴾ ﴾ والآية التى فى الحشر: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ الآية.[1]

---

(۱)صحیح الامام البخاری و صحیح مسلم، جلد اول، کتاب الزکاۃ. ریاض الصالحین، باب السنن: ج ۱ کتاب الزکاۃ، باب التحریض علی الصدقۃ

فاضل مصنف رحمہ اللہ نے اختصار کی کوشش میں اس حدیث مبارکہ کا آدھا حصہ نقل کیا ہے لیکن اس متن کا باقی حصہ نقل کرنا بھی نہایت مفید ہے کیونکہ وہ حصہ یہ دکھاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپیل پر اس وقت کی امت مسلمہ ـــــ جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مشتمل تھی ـــــ نے کیسے عمل کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رنجیدگی کو دور کیا، جو ان بھوک کے مارے مسلمانوں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتی۔ دراصل یہی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے بھوکے امتیوں کے لیے درد تھا جسے فوراامت کے اغنیاء (صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے دور کر کے نہ صرف آخرت کے لیے رضی اللہ عنہم ـــــ اللہ کریم ان سے راضی ہو گیا ـــــ کا خطاب حاصل کیا بلکہ دنیا میں بھی خوشحالی نے ان کے قدم چومے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد میں امت کے تمام افراد اور ان کے خدام تک کے وظائف سرکاری بیت المال سے مقرر کیے گئے، معاشی خوشحالی کے اس مقام تک پہنچ گئے کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے عہد میں کوئی زکاۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ آپ اس حدیث کا بقیہ حصہ پڑھ لیں:

تصدق رجل من ديناره، من درهمه، من ثوبه، من صاع برّه، من صاع تمره، حتى قال: ولو بشق تمرة. فجاء رجل من الانصار بصرة كادت كفه تعجز عنها، بل قد عجزت. ثم تتابع الناس، حتى رأيت كومين من طعام وثياب، حتى رأيت وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتهلل، كانه مذهبة. (مسلم: كتاب الزكاة)

ترجمہ: (حدیث کے اوپر کے حصہ کے ترجمہ سے آگے پڑھیں) لہٰذا ہر شخص اپنے دینار، اپنے درہم، اپنے کپڑا، اپنے جو کے ایک صاع، اپنے کھجوروں کے ایک صاع کا صدقہ لایا، حتیٰ کہ خواہ کسی کے پاس کھجور ایک حصہ ہی ہو (وہ بھی لائے)، یہ سن کر انصار (باوفا) رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایک فرد خوراک کا ایک توڑہ لے کر حاضر ہوا، جسے اس کے ہاتھ اٹھا نہیں سکتے تھے بلکہ سنبھالنے سے عاجز تھے، پھر اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں (اللہ کریم ان سے راضی ہو) نے سامان لانا شروع کیا۔ (راوی فرماتے ہیں:) یہاں تک کہ میں نے اناج اور کپڑوں کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگے ہوئے دیکھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور اپنی امت کے بھوکوں کی بھوک مٹانے کا سامان دیکھ کر ـــــ خوشی سے دمکنے لگا گویا کہ وہ سونا (کا ایک ٹکڑا) تھا۔

دراصل اس حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اغنیاء کو تاکید فرمائی ہے کہ اپنے ان بھائیوں کی مدد کریں جو معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں یا حالات زمانہ یا معاشی ناہمواریوں نے انہیں محتاج کر دیا ہو، ان کی محتاجی کامل کر علاج کریں اور انہیں باوقار زندگی میں اپنا شریک بنائیں ورنہ نہ کسی کی انفرادی یا

ترجمہ: اور جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ[1] سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ایک قوم پیش کی گئی جو ننگے پیر اور ننگے بدن تھی، جو چیتے کے سے گل کی طرح کا صوف یا عباء پہنے ہوئے تھے، تلواریں حمائل تھیں۔ ان میں زیادہ تر قبیلۂ مضر کے لوگ

مخصوص گروہی خوشحالی کو معاشی ترقی کہا جاسکتا ہے، نہ امت من حیث المجموع (As a Whole) معاشی طور پر خوشحال ہوگی، نہ دیگر اقوام عالم میں اپنا مقام پیدا کر سکے گی، اور قیادت (جس کے لیے اسے چنا گیا ہے) کا خواب بھی نہیں دیکھ سکے گی۔

(۱) حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ محدث، فقیہہ اور مجاہد تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال سے چند ماہ قبل دولتِ اسلام سے مالا مال ہوئے۔ نہایت وجیہہ اور باوقار صحابی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے سنجیدہ شخص کو کہنا پڑا کہ جریر امت مسلمہ کے یوسف (علیہ السلام) ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی بہت عزت افزائی کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ لطف و محبت انہیں ایک عصا عنایت فرمایا اور ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی دی کہ قیامت کے دن یہ عصاء میرے اور تمہارے درمیان حجت ہو گا۔ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وصیت کے مطابق یہ عصاء ان کے ساتھ دفن کیا گیا (غالباروز قیامت کی دوری تک روح کو پیار کا دلاسہ کے لیے کہ ہجر کی پریشانی نہ ہو) حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے اہل بیت سے ہیں۔ حجۃ الوداع میں بھی شرکت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں قبیلہ کا سردار بنا کر فارس کے محاذ پر جہاد کے لیے بھیجا، فتح قادسیہ میں ان کا بڑا کردار تھا۔ ایک بار خلافت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں آپ آرمینیا تشریف لائے یہاں قحط اور امت کی معاشی پریشانی پر دل پسیج گیا تو امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فقراء کے تکافل کے لیے یہ حدیث لکھ کر ارسال فرمائی۔

أني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من لم يرحم الناس لم يرحم الله عز وجل. (متفق عليه)

ترجمہ: میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سن لیا تھا: جو (اللہ کریم کے) بندوں پر رحم نہیں کرتا اللہ عظیم و جلیل اس پر رحم نہیں کرتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد آپ نے کوفہ میں رہائش اختیار کرلی اور یہیں ۵۱ھ (ایک روایت کے مطابق ۵۴ھ) میں وفات پائی۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) (برائے تفصیل دیکھیں: علامہ ولی الدین خطیب رحمہ اللہ: اکمال فی الرجال، مشکوۃ المصابیح کے ذیل میں. ڈاکٹر محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی تاریخ تدوینہ، مطبوعہ ریاض، تذکرہ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ)

تھے اور ان کے چہروں سے فاقہ کی حالت ظاہر تھی یہ دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور حجرہ مبارک میں داخل ہوئے اور پھر باہر آکر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سامنے سورۃ نساء اور سورۃ حشر کی آیات پڑھ کر سنائیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو وہ امیر و کبیر ہوں یا فقیر و صغیر ایک انسان آدم علیہ السلام ہی سے پیدا کیا ہے اور اس لیے سب ہی بنی آدم ہیں اور یہ کہ انسان کو خدا سے ڈرنا چاہیے کہ وہ کل قیامت کے دن خدا کے سامنے کیا لے جا رہا ہے۔

تقرر وظائف کے لیے مختلف خلفاء کا طرز عمل:

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ اس قسم کے لوگوں کے حق خوراک سے متعلق تقرر وظائف میں یہ کیا کہ اچھی خوراک کے چند آدمیوں کو بلا کر دو وقت کھانا کھلایا اور پھر اسی انداز سے ہر شخص کی خوراک کا وظیفہ مقرر فرما دیا[1] اور ایک روایت میں ہے:

❶ قال عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه واخذ المدی بید والقسط بید: أنی قد فرضت لکل نفس مسلمة فی کل شهر مدی حنطة وقسطی زیت وقسطی خل. فقال رجل: والعبد؟ قال: نعم والعبد الخ.[2]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ہاتھ میں پیمانہ (مد) لیے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ میں پیمانہ (قسط) اور فرما رہے تھے: میں نے ہر مسلمان کے لیے ہر مہینہ دو مد گیہوں اور دو قسط روغن زیتون اور دو قسط سرکہ مقرر کر دیا ہے۔ تب ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: کیا غلام کے

---

(۱) علامہ بلاذری، احمد بن یحیی بن جابر: فتوح البلدان، قاھرۃ، ۱۹۳۳، ٤٤٢

(۲) ابو عبید: ص ۲٤٦. بلاذری رحمه اللّٰه: فتوح البلدان: ص ١٤٦

لیے بھی؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں! غلام کے لیے بھی۔

❷ ان عمر رضی الله عنه سعد المنبر، فحمد الله. ثم قال: انا أجر ينا عليكم أعطياتكم وأرزاقكم في كل شهر وفي يديه المدى والقسط.[۱]

ترجمہ: حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا، حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا: ہم نے تمہارے لیے ہر مہینہ عطایا اور روزینوں کا تقرر کر دیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں مدیٰ اور قسط[۲] دو پیمانے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خیار نہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۳] کے

---

(۱) ابو عبید: ص ۲٤۷

(۲) مدیٰ ½۱۲ اصاع۔ قسط ½ صاع، ایک مد = ¼۶، ۲مد = ۲۵/۴ × ۲ = ½۱۲ یا ۲۵/۲ اسی طرح اقسط = ½ صاع۔ ۲قسط = ½ × ۲ = ۱ صاع۔ اب ۲مد اور ۲قسط کی مقدار نئے اوزان میں نکالتے ہیں، تو

❶ ۲مد کی مقدار: ایک تحقیق کے مطابق:

اصاع = ½۳ یا ۷/۲، ½۱۲ یا ۲۵/۲ صاع = ۲۵/۲ × ۷/۲ = ۱۷۵/۴ = ۴۳٫۷۵ کلو گرام۔

ایک دوسری تحقیق کے مطابق:

اصاع = ½۴ یا ۹/۲ کیلو گرام، ½۱۲ یا ۲۵/۲ صاع = ۲۵/۲ × ۹/۲ = ۲۲۵/۴ = ۵۶٫۵ کیلو گرام

گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماہور ایک فرد کے لیے ۴۳٫۷۵ کیلو گرام یا ۵۶٫۵ کیلو گرام اناج (دوسری تحقیق کے مطابق) مقرر فرمایا۔

❷ دو قسط ماہوار گھی یا خوردنی تیل:

جدید اوزان میں یہ مقدار ہو گی۔

اقسط = ½ صاع

۲قسط = اصاع

اصاع = ½۳ (ساڑھے تین) کیلو گرام (ایک تحقیق کے مطابق)

یا اصاع = ½۴ (ساڑھے چار) کیلو گرام (دوسری تحقیق کے مطابق)

گویا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماہوار فی کس گھی ½۳ کیلو گرام یا ½۴ کیلو گرام مقرر فرمایا (پاکستان کے علماء کرام کی غالب اکثریت اصاع = ½۴ کیلو گرام کے حق میں ہے۔ واللہ اعلم)

(۳) خیار نہدی، حضرت خیار بن سلمہ ابو زیاد نہدی شامی رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں۔

ضعفِ پیری اور کثرتِ اہل و عیال کو دیکھ کر ان کے بچوں کی تعداد دریافت کرنے کے بعد ان کا اور ان کے بچوں کا جداگانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ (۱)

اور صفحات گذشتہ میں جن وظائف کا ذکر کیا گیا ہے، ابتداءِ دورِ فاروقی میں فوجی اور غیر فوجی دونوں قسم کے وظائف کا خلط رہا ہے مگر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو جدا جدا رجسٹروں میں درج کرا کر ممتاز کر دیا تھا اور والنٹیروں کا رجسٹر (دیوان) علیحدہ تھا اور فقراء اور صاحبِ حاجات کا جدا رجسٹر (دیوانِ) تھا چنانچہ ابو عبید رحمہ اللہ نے ''کتاب الاموال'' میں اس فرق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ فوجی وظائف کا تعلق زیادہ تر ''فئ'' سے تھا اور فقراء اور صاحبِ حاجات کا ''زکوٰۃ'' عشر، عشور اور دوسرے ہر قسم کے ''صدقات'' سے تھا۔ (۲)

علاوہ ازیں بیت المال کے مصارف کی بحث میں کتب فقہ میں باب الزکوٰۃ، باب الجہاد، باب السیر کے اندر بصراحت بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ کے ذمہ فقراء، مساکین، یتامیٰ، بیوگان، مسافر اور مقروض کی کفالت ضروری ہے اور حسبِ ضرورت سالانہ، ششماہی یا ماہوار ان کے لیے وظائف مقرر کرنا چاہیے۔

ذمی اور فوجی خدمات:

بہرحال بحث کا یہ نقطہ اسلامی حکومت کے اس جزء سے متعلق ہے جو ''مسلم'' کہلاتا ہے رہا دوسرا جزء یعنی غیر مسلم (ذمی) سو اس سے متعلق بھی اسلام نے یہ تصریحات کی ہیں کہ بغیر جبر و اکراہ کے ''ذمی'' بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو کر بہ رضا و رغبت جنگ میں حصہ لے تو اس پر سے جزیہ معاف ہو جائے گا اور مالِ غنیمت میں سے بھی اس سے معقول عطیہ دیا جائے گا اور اگر امام مناسب سمجھے تو اپنی صوابدید پر اس کا بھی فوجی وظیفہ مقرر کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورت میں ''جزیہ اٹھا لینے کی تصریح'' ان معاہدوں میں موجود ہے جو خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے

(۱) ابو عبید: ص ۲۳۸

(۲) حوالہ بالا: ص ۲۳۳، ۲۳٤

زمانے میں ذمیوں سے کیے گئے ہیں۔ مثلاً فتح جرجان کے موقع پر معاہدہ میں یہ لکھا گیا:

❶ ومن استعنّا به منكم فله جزاءه فى معونته عوضا من جزية.(۱)

ترجمہ: اور تم (ذمیوں) میں سے جس شخص سے ہم فوجی مدد لیں گے تو اس کی مدد کا یہ صلہ ہو گا کہ اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

اور فتح آذربائیجان کے معاہدہ میں تحریر ہے:

❷ ومن حشر منهم فى سنة وضع عند جزاء تلك السنة.(۲)

ترجمہ: اور جو (ذمی) مسلمانوں کے لشکر میں حصہ لے گا اس سال کا جزیہ اس سے معاف کر دیا جائے گا۔

اور در مختار میں ان کے لیے مال غنیمت میں سے عطیہ دینے کے متعلق یہ تصریح ہے:

❸ (أو دل الذى على الطريق) ومفاده جواز الاستعانة بالكافر عند الحاجة، وقد استعان عليه الصلوة والسلام باليهود على اليهود. ورضخ لهم ولا يبلغ به السهم الا فى الذى اذا دلّ فيزاد على السهم لأنه كالاجرة الخ.(۳)

ترجمہ: (یا ذمی جنگ کے سلسلہ میں راستہ کا راہنما بنے) اس کا مفاد یہ ہے کہ اسلامی ضروریات کے پیشِ نظر کافروں سے مدد لینا جائز ہے کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہودیوں کے مقابلہ میں یہودیوں سے مدد لی تھی اور ان کے لیے مال غنیمت میں سے عطیہ عطا فرمایا تھا اور یہ

---

(۱) طبری: تاریخ الامم والملوك: ۲۵٤/٤
(۲) حوالہ بالا: ص ۲۵٦
(۳) علامہ ابن العابدین: فتاوی شامی، ۳۲۵/٤

عطیہ تقسیم غنیمت کے حصہ سے بڑھنے نہ پائے البتہ اگر وہ راستہ کا راہنما ہے تو غنیمت کے حصہ سے بھی زیادہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اجرت کی طرح ہے۔

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں مشرکین سے جنگ میں مدد حاصل کرنے کے جواز میں بیان کیا ہے۔

۴ فلا بأس إن يستعان بالمشركين على قتال المشركين إذا أخرجوا طوعا و يرضخ لهم الخ.[۱]

ترجمہ: امام کے لیے کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ مشرکین کے مقابلہ میں مشرکین سے مدد لے جبکہ وہ (ذمی مشرکین) بخوشی اس کے لیے تیار ہوں اور اس صلہ میں ان کے لیے مالِ غنیمت میں سے بطورِ عطیہ کے ادا کرے۔

اور فتوح البلدان میں بلاذری[۲] نے نقل کیا ہے کہ عبید اللہ بن زیاد نے بخارا کی ایک بڑی جماعت کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اسلام کی امان میں آجائیں اور یہ کہ ان کے لیے معاشی وظیفہ بھی مقرر کر دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بخوشی اس کو قبول کر لیا اور بصرہ میں قیام پذیر ہو گئے۔[۳]

---

(۱) امام شافعی، محمد بن ادریس رحمہ اللہ: کتاب الام، ۱۷۷/۳

(۲) بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری رحمہ اللہ علامہ محمد ابن سعد رحمہ اللہ (مؤلف الطبقات الکبری) کے شاگرد تھے آپ نے تمام دینی علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ (۲۳۲ھ، ۲۴۷ھ) کے دربار میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ تاریخ و رجال (Biography) میں ان کی دو کتابیں: فتوح البلدان اور انساب الاشراف بہت مفید اور مقبول ہیں۔ فتوح البلدان بلاد اسلامیہ کے ہر صوبہ، ہر ہر ضلع بلکہ ہر ہر قابل ذکر شہر کے الگ الگ عنوان قائم کر کے ان کے ابتداء فتح اسلامی سے لے کر اپنے عہد تک کے حالات درج ہیں۔ دوسری کتاب میں مشہور اسلامی شخصیات کا تذکرہ ہے۔ دونوں کتابیں شائع ہو کر عام ہو چکی ہیں۔ آپ بیک وقت محدث، فقیہہ، مؤرخ اور مشیر تھے۔ ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔

(۳) علامہ بلاذری: فتوح البلدان، ص ۲۶۹

غیر مسلم رعایا کی کفالت:

غیر مسلم (ذمی) کے یہ ان عطایا اور وظائف کا ذکر تھا جو فوجی نظام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن فقراء، مساکین اور دوسرے اہل حاجات کے بارے میں اسلام بغیر کسی تفریق کے وظائف معاشی کا سلسلہ قائم کرتا ہے اور کسی ایک ذمی کو بھی محروم المعیشت رکھنا جائز نہیں سمجھتا۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کا واقعہ ذیل اس حقیقت کی روشن دلیل ہے۔ ایک مرتبہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مکان پر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک بوڑھا نابینا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہودی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا: کس چیز نے تجھ کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا: اداء جزیہ، معاشی ضرورت اور ضعفِ پیری نے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے مکان پر لے جا کر جو موجود تھا اس کو دیا پھر بیت المال کے خزانچی کے پاس فرمان بھیجا:

أنظر هذا وضربائه. فوا اللّٰه ما انصفناه إن أكلنا شبيبته ثم نخذ له عند الهرم. إنما الصّدقات للفقرآء والمساكين. والفقرآء هم المسلمون وهذا من المساكين من اهل الكتاب وضع عند الجزية وعن ضربائه الخ۔[1]

ترجمہ: یہ اور اسی قسم کے دوسرے حاجت مندوں کی تفتیش کرو، خدا کی قسم ہرگز انصاف پسند نہیں ہو سکتے۔ اگر ان (ذمیوں) کی جوانی کی محنت

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فیمن تجب علیه الجزیة. انہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں علامہ بلاذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جابیہ (شام کا علاقہ) کے عیسائیوں کے لیے صدقات کی آمدن سے پنشن کا انتظام کیا تھا۔ (علامہ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری رحمہ اللہ: فتوح البلدان بحوالہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ: Introduction To Islam پیراگراف نمبر ۳۵۳)

(جزیہ) تو کھائیں اور ان کی پیری کے وقت ان کو بھیک کی ذلت کے لیے چھوڑ دیں۔ قرآن عزیز میں ہے: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِينِ﴾. میرے نزدیک یہاں فقراء سے مسلمان مفلس مراد ہیں اور مساکین سے اہل کتاب کے غرباء و فقراء۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام ایسے لوگوں سے جزیہ بھی معاف کر دیا اور ان کا وظیفہ بھی بیت المال سے مقرر فرمادیا۔

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] نے اہل حیرہ کے لیے جو عہد نامہ تحریر فرمایا اس میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ ہیں اور حقوق معاشرت میں مسلم اور غیر مسلم (ذمی) کی ہمسری کا اعلان کرتے ہیں۔

وجعلت لهم أيمّا شيخ ضعف عن العمل، أو أصابته آفة من الآفات، أو كان غنيا فافتقرو صار أهل دينه يتصدقون عليه، طرحت جزيته، وعيل من بيت مال المسلمين وعياله ما أقام بدار هجرة ودار الإسلام الخ. [2]

---

(۱) خالد بن ولید قرشی مخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیف اللہ نامور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جس مہارت، چابکدستی اور قائدانہ صلاحیتوں کا ثبوت دے کر آپ غزوہ موتہ سے اسلامی فوج کو نکال کر لائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر انہیں سیف اللہ (اللہ کریم کی تلوار) کا خطاب دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں عراق اور شام کی فتوحات میں آپ نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے لیکن جب معزول کیے گئے تو اخلاص اور للّٰہیت کا کوہِ گراں اور بردباری، اطاعت اور امت مسلمہ کی خیر خواہی کا سمندر نظر آئے۔ آپ کی والدہ محترمہ لبابہ صغریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن تھیں، گویا آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ آپ نے ۲۱ھ میں مدینہ منورہ اور دوسری روایت کے مطابق حمص (شام) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (مشکاۃ المصابیح کے ذیل میں ''الکمال فی اسماء الرجال'' میں تذکرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۲) حوالہ بالا، باب فی الکنائس والبیع والصلبان، مطبوعہ دار الاصلاح قاھرة، ص ۲۹۰

ترجمہ: اور میں یہ طے کرتا ہوں کہ اگر ذمیوں میں سے کوئی ضعفِ پیری کی وجہ سے ناکارہ ہو جائے یا آفاتِ ارضی و سماوی میں سے کسی آفت میں مبتلا ہو جائے یا ان میں سے کوئی مالدار محتاج ہو جائے اور اس کے اہلِ مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو ایسے تمام اشخاص سے جزیہ معاف ہے اور بیت المال ان کی اور ان کے اہل و عیال کی معاش کا کفیل ہے جب تک وہ دارِ ہجرۃ اور دارالاسلام (یعنی اسلامی ریاست) میں مقیم ہیں۔

اور حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو تو اس بارے میں اس قدر اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ جبکہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دجلہ کی ایک سمت میں اور حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دجلہ کی دوسری طرف سمت میں خراج کی وصول یابی کے لیے روانہ فرمایا اور وہ خراج وصول کر کے واپس ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: شاید تم نے ذمیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ وصول کیا ہو گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جو ان کے پاس چھوڑا ہے اس کے مقابلہ میں یہ بہت ہی کم مقدار ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ان کے پاس اس سے دو گنا حصہ چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر بھی معاملہ کی اہمیت کو اس طرح ظاہر فرمایا:

إمّا واللہ لئن بقیت لأرامل أھل العراق لأدعنّھُنّ لا یفتقرن الی أمیر بعدی الخ.[1]

ترجمہ: معلوم رہے بخدا! اگر میں زندہ رہ گیا تو اہلِ عراق کی بیواؤں کو ایسا کر چھوڑوں گا کہ میرے بعد کسی امیر کی محتاج نہ رہیں گے۔[2]

---

(۱) حوالہ بالا، باب ما عمل بہ فی السواد، ص ۸۸

(۲) مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ذمی رعایا کے حقوق کے تحفظ اور بالخصوص ان کی معاشی کفالت کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا وہ گرامی نامہ بہت اہمیت کا حامل ہے جو انہوں نے اپنے عامل (گورنر) =

غرض اسلام اپنے معاشی نظام میں وظائف کے سسٹم کو مختلف شعبوں میں اس لیے قائم کرتا ہے کہ معاشی نظام کا جو حقیقی مفاد ہے وہ باحسن طریق پورا ہو جائے۔ اور اس کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے۔

کفالت رعایا کے لیے خلیفہ (حاکم) کے فرائض

چنانچہ خلیفہ کے فرائض پر بحث کرتے ہوئے علماء اسلام نے اس حقیقت کو بار بار آشکارا کیا ہے (اس موضوع پر فقہاء اسلام نے خوب لکھا ہے۔ چند فقہاء اسلام کی آراء درج ذیل ہیں):

ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ کی رائے:

ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب المحلی میں جو وقیع رائے دی ہے وہ دوسرے باب میں درج کر دی گئی ہے۔

مصنف مختار الکونین کی رائے:

مصنف رحمہ اللہ کی یہ عبارت قابل مطالعہ ہے:

حضرت عدی بن ارطاۃ رحمہ اللہ کو لکھا اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں:

فانظر أهل الذمة فارفق بهم، و إذا كبر الرجل منهم وليس له مال فانفق عليه، فان كان له حميم فمر حميمه ينفق عليه، وقاصه من جراحة كما لو كان لك عبد فكبرت سنّهُ لم يكن لك بد من ان تنفق عليه حتى يموت او يعتق. (ابن سعد: طبقات، ج ٥، تذكره عمر بن عبدالعزيز بن مروان رضى الله عنه، مطبوعه دارالكتب العلمية، بيروت، لبنان، ١٤١٨ھ/١٩٩٧ء، ص ٢٩٦

ترجمہ: ذمیوں کی حالت پر توجہ رکھنا اور ان سے حسن سلوک سے پیش آنا اگر ان میں سے کوئی بڑھاپا کو پالے مگر خرچ کے لیے مال نہ رکھتا ہو تو تمہیں اس (کی کفالت) پر خرچ کرنا ہوگا۔ اگر اس کا کوئی (معاہدہ کا) بھائی بند ہو تو اس سے مطالبہ کرنا کہ وہ اس پر خرچ کرے۔ اگر کوئی اس (بوڑھے ذمی) کو ضرر (نقصان) پہنچائے تو انتقام لینا۔ ایسے (ضعیف القمر ذمی) شخص کا معاملہ بالکل ایسے ہی جیسے تمہارا غلام ہو جو بڑھاپا کو پالے، تمہیں اس (کی کفالت) پر خرچ کرنا ہوگا، یہاں تک اسے موت آئے یا تم اسے آزاد کر دو۔ (ابن سعد: طبقات: ٥/٢٩٦)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس گرامی نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ بے سہارا ذمی کی عمر بھر کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہے۔

ثم أعلم بأنه لا بد للانسان من ثلثة أشياء بلوازماتها سواء كان ذكراً أو أنثى، لا يمكن حياته وفراغه لعبادة ربه و بقاء نسله الا بها. فيجب على الإمام ان يقصد بتيسير الاشياء ثلاثة بكل من الناس على حسب استعداده وحاله، سواء كان غنيا أو فقيرا، ذكرا او أنثى. اولها: الطعام والشراب وهو سبب حيوته فلا يمكن حيوته الا بها، والثانى: اللباس سواء كان من القطن والكتان والصوف أو غيرها، الثالث: التزويج لأنها سبب بقاء النسل الخ.[1]

ترجمہ: یہ بات جان لینا چاہیے کہ انسان کی ضروریاتِ زندگی میں تین چیزیں لازمی ہیں۔ مرد ہو یا عورت سب ہی اس میں برابر ہیں اس لیے کہ زندگی کی بقا عبادت الٰہی کے لیے طمانیت اور بقاء نسل ان تینوں امور سے ہی وابستہ ہیں اس لیے امام (خلیفہ) کے ذمہ واجب ہے کہ وہ ہر انسان کے لیے خواہ وہ دولت مند ہو یا غریب اور فقر، مرد ہو یا عورت اس کے حالات و ضروریات کے پیشِ نظر ان تین چیزوں کے حصول کے لیے ہمہ قسم کی آسانیاں بہم پہنچائے (تاکہ ہر شخص اپنا معاشرتی و معاشی حق پا لے) اور وہ تین چیزیں یہ ہیں: اول کھانے پینے کی سہولت، دوسری لباس کی سہولت، خواہ وہ صوف کا ہو یا کتان کا یا سوت کا یا کسی بھی چیز کا ہو۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں انسانی حیوات کے لیے ضروری ہیں، اور تیسری ازدواجی زندگی کی سہولت اس لیے کہ یہ بقاء نسل کے لیے ضروری چیز ہے۔

---

(۱) ص ۴۴ قلمی مصنف نے یہ کتاب اپنے دور کے بادشاہوں کے مظالم سے متاثر ہو کر لکھی ہے اور مملکت سے متعلق اجتماعی مسائل پر یہ کتاب بے نظیر ہے۔

ابوبکر الکاسانی صاحب رحمہ اللہ کی رائے[1]:

بدائع الصنائع میں "نفقات" کی بحث میں یہ تصریح موجود ہے کہ جس شخص کے ذمہ کسی غریب اور صاحبِ حاجت کا معاشی تکفل (Maintenance) ضروری قرار دیا جائے گا تو اس تکفل میں یہ چند چیزیں لازمی اور ضروری ہوں گی۔

ویجب علیه المأکل والمشرب والملبس والسکنی والرضاع إن کان رضیعا لأنّ وجوبها للکفایة. والکفایة متعلق بهذه الاشیاء، فإن کان للمنفق علیه خادم یحتاج الی خدمته تفرض له أیضا لأن ذلك من جمله الکفالة الخ.[2]

ترجمہ: اور اس متکفل (کفالت کرنے والا) پر واجب ہے کہ وہ صاحبِ حاجت کے کھانے پینے، لباس اور مکان کا تکفل (انتظام) کرے اور اگر حاجت مند شیر خوار بچہ ہے تو اس کے دودھ پلانے کا بھی، اس لیے کہ اسی معاشی کفالت کا وجوب صاحبِ حاجت کی حاجت روائی کے لیے ہے اور حاجت روائی کے لیے یہ چیزیں ضروری لازمی ہیں اور اگر صاحبِ حاجت اپنی اہم ضرورت کی بناء پر کسی خادم کا محتاج ہے تو اس خادم کا نفقہ بھی متکفل کے ذمہ واجب ہے۔

تقرر وظائف میں خلیفہ کے صوابدیدی اختیارات

وظائف کے سلسلہ میں اگرچہ چند شعبوں کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس سے یہ

(۱) الکاسانی ملک العلماء علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی (م ۵۸۷ھ) فقہ حنفی کے بہت بڑے امام تھے۔ ان کی مشہور اور مقبول کتاب "البدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع" ہے۔ یہ کتاب ۱۳۷۷ھ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ یہ دراصل ان کے استاد محترم علاؤالدین محمد بن علی سمرقندی رحمہ اللہ کی کتاب "تحفۃ الفقہاء" پر مبنی ہے۔ اس میں دیگر فقہاء بالخصوص امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے مذاہب کی آراء کو نقل کیا گیا ہے۔

(۲) الکاسانی: بدائع الصنائع، ۳۸/٤

مراد ہرگز نہیں ہے کہ ''نظام معاشی'' اس خاص تعداد کا پابند ہے بلکہ ''خلیفۂ اسلام'' کو حسبِ ضرورت ان میں اضافہ و بیشی کا مجاز ہے اور یہ حقیقت وہ شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے جو دورِ رسالت اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دورِ خلافت کی صحیح تاریخ کا حق آگاہ ہو۔

گذشتہ صفحات میں ایک مقام پر ذکر آچکا ہے کہ وظائف کے تقرر میں ''اسلام کے معاشی نظام'' میں دماغی کاوش اور محنت کو دو حریف بنا کر کاروبار (Business) کے اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا، بلکہ ''امام'' کبھی عمل اور محنت میں فاضل و مفضول (جس پر فضیلت دی گئی) کا فرق کر کے وظائف کا تقرر کرتا ہے۔ اور کبھی اس فرق کو بھی نظر انداز کر کے ''مساوات'' کے اصول پر تقرر کرتا ہے۔

(الف) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اصول مساوات:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مساوات ہی کو ''اسوہ'' بنایا اور اعمال کی فضیلت کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ قلمرِ دِ خلافت سے مال کثیر وصول ہوا تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مستحقین میں برابر تقسیم کرنا شروع کر دیا یہ دیکھ کر بعض مسلمانوں نے عرض کیا خلیفۂ رسول اللہ! آپ نے اس تقسیم میں سب کو برابر کر دیا۔ کاش کہ آپ ''اہل سوابق و قدم''[1] کو فضیلت دے کر دوسروں سے زیادہ دیتے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا:

أما ما ذكرتم من السوابق والقدم والفضل، فما أعرفني بذالك، أنما ذالك شئ ثوابه على الله جل ثناؤه، وهذا معاش فالأسوة فيه خير من الأثرة الخ.[2]

---

(۱) وہ مسلمان جنہوں نے اسلام میں سبقت کی اور جانی و مالی خدمات سب سے پہلے انجام دیں جیسا کہ مجاہدین بدر۔

(۲) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب كيف كان فرض ابو بكر و عمر رضى الله عنهما لاصحاب النبى صلى الله عليه وسلم: ص ۹۹

ترجمہ: تم نے جو اہل سبقت و قدم اور اہل فضیلت کی سبقتِ اسلام اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو یہ تو مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے مگر وہ تو ایسی چیز ہے جس کا ثواب اللہ جل شانہٗ کے پاس ہے اور یہ معاش کا معاملہ ہے سو اس میں ترجیح (Preference) کے مقابلہ میں مساوات (Equality) ہی بہتر ہے۔

(ب) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اصول ترجیح سے رجوع:

اور حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے ابتدائی دورِ خلافت میں ﴿وَٱلسَّـٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ﴾ [1] کی سبقتِ اسلام اور فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے مجاہدین بدر اور غیر مجاہدین بدر جیسے فضائل کی بناء پر عطایا اور وظائف میں فرق جائز رکھا مگر آخری دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی رائے کو مفید سمجھا اور اپنی سابق رائے سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا:

لئن عشت إلى هذه الليلة من قابل لألحقن أخرى الناس بأولاهم حتى يكونوا في العطاء سواء الخ۔ [2]

(۱) دراصل یہ قرآن مجید کی اس آیت کا پہلا حصہ ہے جس میں اولین مہاجرین اور انصار اکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف اور انہیں اللہ کریم کی رضامندی اور بہت بڑی کامیابی کی خوشخبری دی گئی ہے، آئیے پوری آیت پڑھ لیتے ہیں:

﴿وَٱلسَّـٰبِقُونَ ٱلْأَوَّلُونَ مِنَ ٱلْمُهَـٰجِرِينَ وَٱلْأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحْسَـٰنٍ رَّضِىَ ٱللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا۟ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى تَحْتَهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ خَـٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ﴿١٠٠﴾﴾ (سورة التوبة (۹): ۱۰۰

ترجمہ: اور وہ پہلے پہل مہاجرین اور انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) میں سے (قبولیتِ اسلام میں) سبقت لے جانے والے اور وہ بھی جنہوں نے (اسلام قبول کرنے میں) اچھی طرح ان کی اتباع کی، اللہ کریم (قدر دانی میں) ان سے راضی ہو گیا اور وہ (شکریہ میں) اللہ کریم سے راضی ہو گئے۔ اور اللہ کریم نے ان کے لیے باغات تیار فرمائے۔ جن کے نیچے نہریں جاری رہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

(۲) ابن سعد: طبقات، ج ۳، بیروت، ۱٤۱۸ھ ص ۲۲۹. ابوعبید: کتاب الاموال، ص ٤٦،

ترجمہ: اگر میں آئندہ سال ان وظائف کے دنوں میں بھی زندہ رہ گیا تو یقیناً
"سابقون الاولون" اور بعد میں آنے والوں کو سب کو ملا دوں گا اور
عطیہ اور وظیفہ میں سب کو برابر کر دوں گا۔

(ج) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اصول:

ابو عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] بھی

٢٦٤

خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور خلافت خوشحالی کا دور تھا، اموال غنائم میں اضافہ ہوا، جن حضرات نے کاروبار شروع کیے انہیں خوب ترقی ہوئی، جو حضرات خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے یا دفاع اسلامی ریاست اور جہاد پر مامور تھے، انہیں بیت المال (سرکاری خزانہ) سے نہایت معقول (Hadnsome) مشاہرہ ملتا تھا ضرورت اور احتیاج (Need & Want) پوری ہو رہی تھیں، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اس ضمن میں بہت توجہ فرماتے تھے، ذاتی مال سے بھی محتاجوں کی مدد فرماتے تھے اس لیے انہوں نے حلال کمانے اور حلال طریقوں پر خرچ کرنے میں امت مسلمہ پر کوئی قدغن لگانا پسند نہ کیا، مگر مال آخر مال تھا، اس کی فراوانی معاشرتی رقابت، طبقاتی کشمکش، اقتدار کی ہوس، سازشوں اور بالآخر خانہ جنگی پر منتج نہ ہوتو اور کیا ہو؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدد احادیث میں مال کے اس فتنہ کی خبر بھی دی ہے۔ آخر کار سازشویوں کے سبائی گروہ نے اس مالی فتنہ اور امت کے افتراق سے فائدہ اٹھایا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے معصوم اور پکباز صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا گیا، امت تقسیم ہو گئی اور آج تک اکٹھی نہ ہو سکی۔

(۱) جو پہلا خطاب امت مسلمہ سے فرمایا، اس میں دیگر انتظامی اور سیاسی امور کے ساتھ یہ بھی شامل تھا:
لوگو! سنو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم —— مہاجرین ہوں یا انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم —— میں سے جو کوئی یہ خیال کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ صحابیت (Companionship) کی بنا پر وہ دوسروں (بعد میں آنے والوں) پر فضیلت (Superiority) رکھتا ہے، وہ جان لے کہ اس کی یہ فضیلت (جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا) کل (قیامت کے دن) اسے اللہ کریم کے روبرو پیش ہونے پر کام آئے گی۔ یاد رکھو! جو کوئی بھی اللہ کریم اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہے اٹھا، جس نے بھی ہماری ملت (Muslim Community) کو تسلیم کیا، جو کوئی ہمارے دین میں شامل ہوا اور اس نے قبلہ کی طرف (بوقتِ نماز) منہ کر لیا اس نے اسلام کے حقوق و فرائض قبول کر لیے (گویا وہ ہمارے برابر کا مسلمان بن گیا)۔ درحقیقت تم سارے کے سارے (بشمول میرے) اللہ کریم کے بندگان ہو اور یہ مال بھی اللہ کریم ہی کا ہے، یہ تم میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں کسی کو بھی دوسروں پر ترجیح (Preference) نہیں دی جائے گی، تاہم اللہ کریم کے ہاں پرہیز گاری کا بہترین صلہ ہے۔ (اقتباس از سید
=

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کے مؤید تھے۔

وکذلك یروی عن علی رضی اللّٰہ تعالٰی عنه التسویة أیضا ولکلا الوجهین مذهب.[1]

ترجمہ: اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مساوات ہی منقول ہے بہرحال دونوں طریقوں کے لیے راہ سلوک موجود ہے۔

قطب: العدالة الاجتماعیة فی الاسلام، عنوان السیاسة المالیة، مطبوعه قاهرة)

خلفاء راشدین —— رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی تقسیم دولت اور تقرر وظائف (Pay Fixation) میں اصول مساوات (Equalitarian) کو اپنایا۔

ابو بکر بن ابی مریم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

ان عمر بن عبدالعزیز جعل العرب والموالی فی الرزق والکسوة والمعونة والعطاء سواء. (ابن سعد: طبقات، ج ٥، تذکره عمر بن عبدالعزیز بن مروان رحمه اللّٰه تعالٰی)

ترجمہ: حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عرب اور ان کے موالی (آزاد کردہ غلاموں تمام) کو رزق، لباس، گزارہ الاؤنس اور عطا (Grants) میں برابر کر دیا۔

آپ رحمہ اللہ حق معیشت اور اس کی خاطر دیئے جانے والے عطایا (Stipends- Grants) اور وظائف (Salaries) وغیرہ میں اصول مساوات برائے کفالت محتاجین کے علمبر دار تھے بلکہ خود اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب کو بھی اس اصول کے تابع لانا چاہتے۔ ان کا ایک مشہور خطبہ —— جو انہوں نے خناصرہ کے مقام پر اس وقت کی امت مسلمہ اور اسلامی ریاست کے شہریوں کو مخاطب کرتے ہوئے دیا —— اس حقیقت کا غماز ہے، فرمایا: تم میں سے جو شخص بھی اپنی ضرورت میرے سامنے پیش کرے گا، میری خواہش ہوگی کہ جہاں تک مجھے قدرت ہو میں اس کی ضرورت پوری کروں، اور اگر کوئی شخص اپنی ایسی ضرورت پیش کرے جس کی گنجائش میرے پاس نہ ہو تو میری تمنا ہوگی کہ اس کی محرومی کی ابتداء مجھ سے اور میرے خاندان کے قریبی لوگوں سے ہو تاکہ ہماری اور تمہاری معیشت برابر کی سطح پر آجائے۔ اللہ کریم کی قسم! اگر میں یہ حالت چھوڑ کر (اپنے اور اپنے خاندان کے لیے) فراخی اور عیش کوشی کا ارادہ کروں، تو یہ کام نہایت آسان ہو گا۔ لیکن اللہ کریم کی طرف سے ناطق کتاب نازل ہو چکی ہے، جس میں مجھے اس کی اطاعت کا حکم اور نافرمانی سے بچنے کو کہا گیا ہے۔ (ابن الحکم، ابو محمد عبداللّٰه: سیرة عمر بن عبدالعزیز رحمه اللّٰه تعالٰی)

[1] حواله بالا: ص ٢٦٤

اسلام کا نظامِ کفالتی وظائف ضروری، معاشی سرگرمیوں، اور مفید پیشوں، کا مخالف نہیں

مگر اس جگہ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ "مساواتِ معاشی" کا یہ مسئلہ بیت المال یا خلیفۂ اسلام کے مقرر کردہ عطایا و وظائف سے متعلق ہے۔ ذاتی ملکیت کے مسئلہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ وہ عنقریب اپنی تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آنے والا ہے۔ وظائف کے اس سلسلۂ عام کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ عمالِ حکومت اور اصحابِ حاجات کے علاوہ اگر وظائف و عطایا کا یہ انفرادی و شخصی سلسلہ اس طرح قائم رکھا جائے جس طرح "اسلام کے معاشی نظام" میں زیر بحث آیا ہے تو ملک میں تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے اہم ذرائع معیشت صفر کے برابر ہو جائیں گے حالانکہ یہی ذرائع معیشت (Economic Resources) اقتصادی فلاح و ترقی کے مدار ہیں؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا نظریہ:

بلاشبہ یہ سوال کافی اہمیت کا حامل اور قابلِ غور ہے چنانچہ مفکر اسلام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [1] نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں "سیادت مدنیہ" پر بحث فرماتے ہوئے اس بات کو اچھی طرح صاف کر دیا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ایک لمحہ کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی قلمرو میں تجارت، صنعت و حرفت اور مفید و جائز معاشی وسائل میں اضمحلال پیدا ہو جائے اور مملکت کی آبادی مفت خورانہ وظائف پر گزر اوقات بسر کرنے لگے اور وہ یہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ عام حالاتِ زندگی میں تمام قلمروِ اسلامی کا جہاد میں مصروف رہنا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ ان میں تاجر، صناع، کاشتکار سب ہی کا وجود ضروری ہے۔ (چنانچہ فرماتے ہیں):

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۱) أو يكون توزعهم في الإقبال على الاكتساب بحيث يضرّ بالمدينة مثل ان يقبل اكثرهم على التجارة و يدعوا الزراعة أو يكتسب أكثرهم بالغزو ونحوه. وأنما ينبغي أن يكون الزراع بمنزلة الطعام والصناع والتجاره والحفظة بمنزلة الملح المصلح. الخ [1]

ترجمہ: سیاست ملکی میں تقسیمِ کار اور مختلف منازلِ کسب واکتساب کا ہونا ازبس ضروری ہے اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ صورتِ حال یہ ہو کہ وہ سب ایسے کسب واکتساب کی جانب متوجہ ہو جائیں کہ آخر کار وہ ملک (شہر) کے نقصان کا باعث بن جائے مثلاً ملک کی اکثریت زراعت کو چھوڑ بیٹھے اور صرف تجارت کی جانب متوجہ ہو بیٹھے (یعنی خام اجناس کے وسائل کے باوجود ان کو پیدا نہ کیا جائے) یا اس کی اکثریت صرف غزوہ ہی میں مشغول ہو جائے (اور تجارت اور صنعت وزراعت معدوم ہونے لگے) یا اسی طرح کسی ایک مشغلہ میں ملک کی اکثریت مشغول رہ کر دوسرے ذرائع ترقی ملک کو کھو بیٹھے تو یہ سیاستِ مملکت کے لیے سخت مضر ہے بلکہ شہری باشندوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ کاشتکار اجتماعی حیات کے لیے بمنزلہ طعام کے ہیں اور تاجر و صناع اور فوج و سپاہی گویا نمک برائے اصلاحِ طعام کی مثال ہیں۔

نیز انہوں نے صراحت کے ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ مملکت کی تباہی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ افرادِ ملت ہاتھ کی کمائی اور ذاتی محنت کے ذریعہ تحصیل معاش کو چھوڑ کر اپنا بوجھ صرف "بیت المال" پر ڈال دیں اور اس کے حقیقی مصارف کے لیے باعثِ مصیبت بن جائیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض افرادِ ملت کا حقِ معیشت بیت المال سے ہی کیوں نہ متعلق ہو مثلاً مجاہدین اور علماء۔

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ مصر، باب السیاسۃ المدینۃ: ۱/ ٤٤

❷وغالب سبب خراب البلدان في هذا الزمان شيئان: احدهما تضيقهم على بيت المال بان يعتادوا التكسب بالأخذ منه على انّهم من الغزاة أو من العلماء الذين لهم حق فيه. أو من الذين جرت عادة الملوك بصلتهم كالزهاد والشعراء او بوجه من وجوه التكدر ويكون العمدة عندهم هو التكسب دون القيام بالمصلحة فيدخل على قوم فينغصون عليهم ويصيرون كلا على المدنية الخ. [1]

ترجمہ: اور اس زمانہ میں مملکتوں کی بربادی کا سببِ غالب دو امور ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ بیت المال کے مالیہ پر ضیق اور تنگ حالی چھا جائے یعنی ایسے افراد بھی اپنی تمام تر معیشت کا بار اس پر ڈال دیں جن کا واقعی بیت المال میں حق ہے جیسے مجاہدین اور علماء اور وہ افراد بھی جن کے لیے آج کل کے بادشاہوں نے داد و دہش کے خزانے کھول رکھے ہیں جیسے صوفی اور شاعر وغیرہ یا اسی قسم کے دوسرے مکدر اور غلط اسباب کی راہ سے بیت المال کو زیرِ بار کیا جائے۔ درحقیقت ان کے دماغوں میں یہ بات آنی چاہیے کہ بہترین ذریعۂ معاش قوتِ بازو سے کمانا ہے نہ کہ اجتماعی مصالح کے قیام کی راہ سے صرف بیت المال کے روزینہ پر اکتفا کر بیٹھنا کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ مزاحمت کرتی ہے اور پھر آپس میں ایک دوسرے کے لیے تکدر اور معاشی خرابی کا باعث بنتی ہے اور بالآخر شہریت اور مملکت کے لیے بار دوش ہو جاتی ہے۔

اور دوسری جگہ قابلِ ملامت تعیش پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسے ملک کے باشندے معاش کے ان اصولی وسائل کو چھوڑ بیٹھتے ہیں جن پر نظامِ عالم کی

---

(۱) حوالہ بالا: ۴۵/۱

بنیاد قائم ہے۔

۴ وصار جمهور الناس عيالا على الخليفة يتكففون منه تارة على انهم من الغزاة والمدبرين المدينة، يترسمون برسومهم ولا يكون المقصود دفع الحاجة ولكن القيام بسيرة سلفهم وتارة على انهم شعراء جرت عادة الملوك بصلتهم. وتارة على انهم زهاد وفقراء يصح من الخليفة أن لا يتفقد حالهم. فيضيق بعضهم بعضا وتتوقف مكاسبهم على صحبة الملوك، والرفق بهم، وحسن المحاورة معهم التملق منهم. وكان ذلك هو الفن الذى تتعمق أفكارهم فيه وتضيع أوقاتهم معه. فلما كثرت هذه الاشغال فى نفوس الناس هيئات خسيسة وأعرضوا عن الاخلاق الصالحة.[1]

ترجمہ: اور باشندوں کی اکثریت خلیفہ کی عیال بن جاتی اور بیت المال پر بار ہو جاتی ہے اور کبھی وہ یہ کہہ کر وظیفہ حاصل کرتے ہیں کہ وہ "غازی" ہیں اور ملک کے "سیاسی راہنما" ہیں اور اس وظیفہ طلبی میں ضروری حاجات کا دفع کرنا مقصد نہیں رہتا بلکہ باپ دادا کی رسم کو قائم رکھ کر مفت خوری مقصد ہو جاتا ہے۔ اور کبھی یہ کہہ کر وصول کرتے ہیں کہ وہ "درباری شاعر" ہیں اور بادشاہوں کی جانب سے شعراء پر داد و دہش ہوا ہی کرتی ہے اور کبھی یہ کہہ کر حاصل کرتے ہیں کہ وہ "صوفی اور درویش" ہیں اور خلیفہ ان کے تفتیشِ حالات کو معیوب سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی ضیق اور تنگی کا باعث بن جاتے ہیں اور ان کا معاشی کسب و اکتساب صرف بادشاہوں کی مصاجبت، ان کی خوشامد اور جی حضوری اور ان کی مدح میں چرب زبانی پر رہ جاتا ہے، اور آخر کار یہ

(۱) حوالہ بالا: ۱/۱۰۶ باب اقامة الارتفاقات واصلاح الرسوم

ایسا فن بن جاتا ہے کہ ان کے تمام افکار اور دماغی خیالات اس بدترین
فن پر صرف ہونے لگتے اور وقت کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔
بہرحال، جب کسی قوم میں یہ اشغال بڑھ جاتے ہیں تو لوگوں کے نفوس
میں ادنی اور ذلیل افکار و خیالات رونما ہونے لگتے ہیں اور پست خیالی و
دناءت ان کو اخلاق صالحہ سے باز رکھتی ہے۔

ان حوالہ جات کے مطالعہ کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں ''وظائف کا طریقہ'' اس مذموم رسم و رواج کا حامی ہے جس کا ذکر سائل کے سوال میں کیا گیا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں!

بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ چونکہ اس وقت ''اسلام کے اقتصادی نظام'' کے تمام خانوں کو جدا جدا بیان کیا جا رہا ہے اس لیے اس شبہ نے جگہ بنا لی ورنہ جب تمام خانے اپنی اپنی جگہ فٹ ہو کر مکمل نقشہ سامنے آجائے گا تو اس کے بعد یہ سوال خود بخود حل ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں وظائف کے تقرر کے وقت یہ سوال خود فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا اور حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو جواب دیا وہ باحسن وجہ اس شبہ کو حل کر دیتا ہے چنانچہ بلاذری رحمہ اللہ نے ''فتوح البلدان'' میں وظائف و عطایا کی بحث میں اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے۔

فلما وضع عمر الديوان، قال ابو سفيان بن حرب: اديوان
مثل ديوان الأصفر؟ إنك أن فرضت للناس اتكلوا على
الديوان وتركوا التجارة. فقال عمر رضى الله عنه: لا بد من
هذا فقد كثر فئ المسلمين.[1]

ترجمہ: جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وظائف کے لیے رجسٹر

(۱) ابن سعد: طبقات، ج ۳، ترجمہ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مرتبہ کرائے تو ابو سفیان بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] نے عرض کیا: کیا آپ بھی رومیوں کی طرح وظائف کے لیے رجسٹروں کا یہ طریقہ جاری فرماتے ہیں؟ اگر آپ نے اس طرح ان کے روزینے مقرر فرمادیئے تو پھر یہ سب ان وظائف پر ہی بھروسہ کر بیٹھیں گے اور تجارت کو چھوڑ دیں گے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میرے لیے ایسا کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ "مال فیٔ" کثرت سے بیت المال میں داخل ہو رہا ہے۔

حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے اس مختصر سے اشارہ کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ سوال اساسی اور بنیادی سوال تھا جس کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی انکار نہیں فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بیت المال سے متعلق ہمہ قسم کے مصارف کو پورا کیا جارہا ہے اور اس سلسلہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا مصرف بھی تشنہ تکمیل نہیں ہے، تاہم بیت المال کا خزانہ "مال فیٔ" سے بہت پُر ہے تو اب میں اس کو اپنی ذات پر یا حکومت کے عمال پر خرچ کرنے کا مجاز نہیں ہوں اور نہ اس کو بہت بڑا خزانہ بنانا چاہتا ہوں بلکہ چاہتا یہ ہوں کہ فقراء، غرباء، مساکین، یتامی اور دوسرے اہل حاجات کے علاوہ افرادِ

---

(۱) ابو سفیان بن صخر بن حرب ابو حنظلہ قرشی اموی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام الفیل سے دس سال قبل پیدا ہوئے سرداران قریش میں تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد محترم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سسر تھے۔ آپ کی بیٹی حضرت بی بی ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المؤمنین حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ پھر غزوہ حنین میں شریک ہوئے۔ طائف اور یرموک کی جہادی لڑائیوں میں آپ کی ایک ایک آنکھ اللہ کریم کی راہ میں قربان ہوگئی۔ جہاد شام میں شریک رہے۔ آپ کی احادیث کو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے روایت کیا ہے۔ آپ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت ۳۴ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں دفن کی سعادت پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ملاحظہ: اسد الغابۃ، ترجمہ ابی سفیان بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ: مشکاۃ المصابیح کے ذیل میں "الکمال فی اسماء الرجال"، ترجمہ ابو سفیان بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

امت پر بھی اس کو خرچ کروں تاکہ اپنے کاروبار اور قوتِ بازو سے حاصل کردہ رقوم کے علاوہ اس ذریعہ سے بھی ان میں زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش حالی پیدا ہو جائے۔

ان جوابات کے ساتھ ساتھ یہ بھی فراموش نہیں کرنا اہئے کہ وظائف کا یہ سلسلہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ ملت کے تمام افراد ملت کی مشین کے کل پرزے ہیں لہذا ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق ملت کی خدمت انجام دے اور ملت کا خزانہ "بیت المال" ان کی زندگی کا کفیل ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے دورِ خلافت میں اسی لیے اعلان کر دیا تھا کہ جبکہ مسلمانوں ان کے اہل و عیال حتیٰ کہ ان کے غلاموں کو بھی حکومت سے وظائف مل رہے ہیں تو ان کو ہرگز ہرگز نہ زمینداری کی اجازت دی جائے گی نہ کاشت کاری کی۔



باب ——— ⑦

وسائلِ معیشت کی توسیع

(Ectension To Economic Resources)

بیت المال کا قیام، اعداد و شمار کا انتظام، وظائف کا تقرر، ان تینوں عنوانات کے علاوہ چوتھا عنوان ——— جو براہِ راست حکومت کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے ——— وسائلِ معیشت کی توسیع ہے۔

عاملینِ پیدائش

(Factors of Production)

علم المعیشت کی نگاہ میں معاش کے بنیادی وسائل زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت ہیں اس لیے کہ علماءِ معاشین قدیم و جدید نے عاملینِ پیدائش[1] کو جو کہ ترقی

(۱) روایتی معاشیات یا سرمایہ دارانہ معاشیات کے ماہرین نے عاملین پیدائش چار بتائے ہیں: ① محنت ② زمین ③ سرمایہ ④ تنظیم

مگر اسلامی معاشیات کا نظریہ برائے عاملین پیدائش سرمایہ دارانہ معاشیات کے نظریہ سے مختلف ہے:

اسلامی معاشیات نے اصل عاملین دو بتائے ہیں:

یعنی محنت (انسان) اور زمین (قدرتی وسائل)

انسان اپنی محنت کے ذریعے زمین یعنی قدرتی وسائل کو کام میں لا کر جو کچھ پیدا کرتا ہے یہی وہ کچھ ہے جو اس دنیا میں نظر آرہا ہے۔ تمام معاشی خزانوں، معاشی ترقیات اور معاشی فلاح و بہبود کے تمام معاشی نظریات کی اصل دو ہی عاملین ہیں۔

انسان (محنت) اور زمین (وسائل قدرت)

لہٰذا ہم یوں مساوات بنا سکتے ہیں:

پیدائش دولت = انسان (محنت) + زمین (قدرتی وسائل) کا نتیجہ

=

پھر انسان اپنی محنت کے ذریعے زمین (قدرتی وسائل) کو استعمال کر کے جو دولت پیدا کرتا ہے وہ ساری کی ساری استعمال نہیں کرتا بلکہ اس میں سے کچھ پس انداز بھی کرتا ہے اس پس انداز دولت کو جب وہ مزید دولت کی پیدائش کے لیے استعمال کرتا ہے تو یہ "سرمایہ" بن جاتی ہے۔ لہٰذا یوں کہا جاسکتا ہے کہ:

سرمایہ = انسان + زمین کے نتیجہ میں پیدا شدہ دولت کا وہ حصہ جو انسان بچا کر رکھ لیتا ہے اور مزید دولت کی پیداوار کے لیے خرچ کرتا ہے۔

یہاں تک رواجی معاشیات اور اسلامی معاشیات کے عاملین پیدائش میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اختلاف اس صورت میں ہے کہ رواجی معاشیات نے چوتھا عامل پیدائش "تنظیم" کو شمار کیا ہے جبکہ اسلامی معاشیات نے اسے "محنت" ہی کی ایک شکل قرار دیا ہے آیئے! پہلے "تنظیم" کی حقیقت سمجھ لیجئے:

مختلف افراد زمین پر محنت کر کے جو پیدائش دولت کرتے ہیں اس میں سے کچھ حصہ مزید دولت پیدا کرنے یا برے وقت میں استعمال کے لیے یا مستقبل کی متوقع ضروریات کے لیے بچا کر رکھ لیتے ہیں۔ اب اس بچے ہوئے سرمایہ کو استعمال کرنے کی صلاحیت ہر انسان نہیں رکھتا۔ یا اگر کوئی بڑا عمل پیدائش (مثلاً سیمنٹ یا شکر کا کارخانہ وغیرہ) شروع کرنا ہو جس کے لیے کسی ایک انسان کی بجائے مختلف انسانوں کے پس انداز کردہ سرمایہ کی ضرورت پڑ جائے اور کوئی ایک تجربہ کار شخص یا ایک کمپنی مختلف لوگوں کو نفع (رواجی معاشیات میں سود) کا وعدہ کر کے ان کی جمع شدہ سرمائے کو اکٹھا کرے اور پیدائش بر پیمانہ کبیر شروع کرے تو رواجی معاشیات اس تجربہ کار شخص یا کمپنی کو ناظم کہے گی اور اس کے اس عمل کو "تنظیم" کا نام دے گی اور اسے ایک الگ عامل پیدائش تسلیم کرتی ہے۔ یہ ناظم یا کمپنی دراصل چند انسانوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو اس طرح قوم کے سرمایہ کو اکٹھا کر کے اس سے پیدائش دولت کرتے ہیں پھر بہت سے اصل داروں کو ـــــ جنہوں نے اپنی پس انداز کردہ دولت ان کے سپرد کی تھی ـــــ کچھ سود کے نام پر دے کر باقی سب ہڑپ کرتے ہیں اور مالک و قوم کے بڑے سرمایہ دار بن کر پوری قوم کا استحصال کرتے ہیں۔

اسلام، ناظم یا تنظیم کا مخالف نہیں بلکہ ان کے پیچھے کام کرنے والے معاشی نظریات، محرکات اور طریق کار کے خلاف ہے۔ اسلام نے اس "تنظیم" کو محنت کی ایک شکل قرار دیا ہے جس کے چلانے والے ناظمین یا ناظم کو شریک یا ضارب قرار دیا ہے۔ جو لوگوں کی پس انداز رقم کو شراکت یعنی نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر یا مضاربت یعنی لوگوں کی پس انداز شدہ رقم لے کر ان سے کاروبار کر کے انہیں فائدہ پہنچاتا ہے اور خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ شرکت و مضاربت کا یہ کاروبار چھوٹے کاروبار سے لے کر بڑے بڑے پیمانہ پیدائش پر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام تفصیلات آگے آئیں گی۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں "تنظیم" محنت ہی کی ایک قسم ہے اور یہ محنت سے الگ کوئی عامل پیدائش نہیں ہے۔

اسلامی معاشیات میں "تنظیم" کو ایک مستقل عامل پیدائش اس لیے تسلیم نہیں کیا گیا کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دینے کا ایک بڑا ذریعہ اور تمام دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹ کر آجانے کا بہت بڑا آلہ ہے۔ اسلام جس عادلانہ نظام تقسیم دولت کا داعی ہے وہ اس قسم کے استحصالی ذریعہ کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ مختصراً یوں کہہ لیجئے کہ اسلامی معاشیات میں پیدائش دولت کے عاملین تین ہیں:

=

معیشت کی عمارت کے ستون ہیں، زمین محنت اور اصل میں منحصر سمجھا ہے۔ زمین اور محنت تو معروف و مشہور ہیں البتہ "اصل (Capital) کی وضاحت ضروری ہے۔

اصل اور دولت:

علم معیشت میں "اصل" اور "دولت" حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک ہی شے کے دو نام ہیں مگر طریق استعمال کے لحاظ سے دونوں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے اور دو علیحدہ چیزیں شمار ہونے لگتی ہیں۔ پس اگر ہم دولت کو عامل پیدائش بنائیں یعنی اس کو اس طرح کام میں لائیں کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو تو وہ علم معیشت کی نگاہ میں "اصل" کہلاتی ہے اور اگر اس کو ثمرۂ پیدائش اور ماحصل سمجھیں اور اس طرح اس کو استعمال کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونے کے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہوتی ہو تو اس کا نام "دولت" ہے۔ مثلاً سکونت کا مکان دولت ہے اور اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جائے یا اس کو کرایہ پر دے دیا جائے تو وہ "اصل" بن جائے گا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی اصل کہلاتی ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی دولت ہے۔

مفکرِ اسلام شاہ ولی اللہ (رحمہ اللہ) نے معاشی نظریوں کی ان جدید کاوشوں کو ایک سادہ عبارت میں بیان فرما کر ان حقائق پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> واصول المكاسب الزرع والرعي والتقاط الاموال المباحة من البر والبحر من المعدن والنبات والحيوان والصناعات من تجارة وحدادة وحياكةوغيرها مما هو من جعل الجواهر الطبيعة بحيث يتاتى منها الارتقاق المطلوب الخ.[1]

❶ زمین

❷ محنت

❸ سرمایہ

(۱) حجة الله البالغه، ج ۱، مصری، باب المعاملات، ص ۴۳

ترجمہ: زراعت، جانوروں کی پرورش، معدنیات، نباتات اور حیوانات کا خشکی اور تری سے حاصل کیا جانا، اور نجاری (Carpentry) لوہاری، پارچہ بانی (Textile) وغیرہ کی صنعتیں یہ اور اس قسم کی وہ تمام چیزیں کہ جن کے طبعی جوہر سے انتفاعِ مطلوب حاصل ہو سکے اصولِ معاشیات کہلاتی ہیں۔

اور یہ بھی بہت واضح بات ہے کہ ہر سہ عاملین[۱] پیدائش زمین، محنت، اصل کا تعلق کم و بیش فرق کے ساتھ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت تینوں ہی کے ساتھ ہے۔ چنانچہ علم معیشت میں اس حقیقت کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے:

یوں تو پیدائشِ دولت کے واسطے ہر سہ عاملین زمین، محنت اور اصل کی شراکت لازمی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ زراعت میں زمین کا حصہ غالب رہتا ہے اور صنعت و حرفت میں اصل کی کارگزاری خاص طور سے قابلِ لحاظ ہوتی ہے۔ محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے۔[۲]

عمل پیدائش کے فوائد تمام انسانوں کے لیے ہوں:

ان تمہیدی سطور کے بعد یہ بات بآسانی ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ علم معیشت کے جدید فنی مسائل اور قدیم سادہ مسائل کے درمیان یہ بہرحال مسلّم ہے کہ معاشی

---

(۱) یاد رہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی رواجی معاشیات (Traditional Economics) میں عاملین پیدائش چار ہیں: زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم۔

ان تمام میں سب سے زیادہ اہمیت تنظیم (Organization) کی ہے، جو دیگر تینوں عاملین پیدائش کو منظم کر کے عمل پیدائش کو ممکن اور آسان بناتی ہے، لہٰذا چاروں عاملین پیدائش کے باہمی تعاون سے جو پیداوار ہوتی ہے اس کا بڑا حصہ تنظیم یعنی ناظم (Entrepreneur) کو جاتا ہے اس معاشی نظام میں سب سے زیادہ جس عامل پیدائش کا استحصال ہوتا ہے وہ محنت (Labour) ہے۔

اسلام کے معاشی نظام میں تنظیم کوئی مستقل عامل پیدائش نہیں بلکہ اسے محنت ہی ایک شاخ تصور کیا جاتا ہے، یہاں ناظم کو تنخواہ (Wage) ملتی ہے یا اگر وہ شریک کاروبار ہے تو نفع یا نقصان میں شریک ہو گا۔

(۲) جو اشیاء اپنے جوہر طبیعت میں باسباب ظاہر معیشت کے وجود و ترقی کا باعث بنتے ہیں "عاملین پیدائش" کہلاتے ہیں۔ (مصنف رحمہ اللہ)

وسائل کی بنیادیں زراعت "تجارت اور صنعت" پر قائم ہیں اور ان کی ترقی پر ہی معیشت کی فلاح و بہبود کا مدار ہے۔ لہذا اسلام نے اپنے معاشی نظام میں اگرچہ فنِ معیشت کی طرح مسائل معاشی میں کنج و کاوٗ اور دقیق فنی مسائل کو اختیار نہیں کیا مگر اس کاوش و تحقیق کے مقصد و منہاج کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے عملی حیثیت سے اپنے نظام میں نمایاں جگہ دی اور ان کو معاشی اساس قرار دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رکھا کہ "معاشی نظام" کے بہتر اور صالح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں ان وسائلِ معیشت کو نہ تو فاسد (Vitiatad) اور خراب ہونے دیا جائے کہ ان کے فساد و ضیاع سے معاشی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں اور نہ ان کی ترقی و وسعت کا وہ پیمانہ اختیار کیا جائے کہ جس سے عام رفاہیت اور خوشحالی کی بجائے ایک خاص طبقہ کی مجرمانہ ترقی کو مدد ملے کہ اس سے نہ صرف معاشی نظام میں ابتری پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ تمدن و اخلاق، معیشت و معاشرت اور روحانیت تمام شعبہ ہائے زندگی کے فساد کا سبب بن جاتی ہے۔

بلکہ ان دونوں راہوں سے الگ ان کی وسعت و ترقی کا پیمانہ اس طرح تیار کیا جائے کہ اس سے انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں کو فائدہ پہنچے اور انفرادی ترقی اجتماعی ترقی کا ایک جزو ثابت ہو نہ کہ اس کی تنگی اور ضیق کا باعث بنے اور اجتماعی ترقی سے ہر فرد ملت کو رفاہیت و ترقی حاصل کرنے کا یکساں موقع حاصل ہو۔ چنانچہ حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [1] ارشاد فرماتے ہیں:

> وایضا لما کان الناس مدنیین بالطبع، لا تستقیم معایشھم الا بتعاون بینھم، نزل القضاء بایجاب التعاون وان لا یخلو احد منھم مما له دخل فی التمدن الا عند حاجة لا یجد منھا بدًا و أیضا فاصل التسبب حیازة الأموال المباحة أو استنماء ما اختص به بما یستمد من الأموال المباحة کالتناسل بالرعیٰ

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

والزراعة بإصلاح الأرض وسقى الماء و يشترط فى ذالك أن لا يضيق بعضهم على بعض بحيث يفضى الى فساد التمدن. الخ.[۱]

ترجمہ: اور جبکہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوئے ہیں کہ ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون اور امداد باہمی کے بغیر مستقیم اور درست نہیں ہو سکتی تو خدائی فیصلہ یہ ٹھہرا کہ امداد باہمی کو واجب کر دیا جائے۔ اور یہ کہ جس شخص کے ذریعہ بھی تمدن کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کو تمدنی زندگی سے علیحدہ ہونا نہ چاہیے الا یہ کہ کسی خاص وجہ سے مجبوری پیش آجائے، نیز معاشی وسائل کو وسیلہ بنانے کے لیے بنیادی سلسلہ یہ ہے کہ اموال مباح (Permissible Properties) کو قبضہ میں کیا جائے یا اموال مباح میں سے جو جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے خصوصی جوہروں کے ذریعہ اموالِ مباح میں ترقی کی جائے مثلاً مویشیوں کی افزائش، نسل آبپاشی اور اصلاحِ زمین کے ذریعہ زراعت وغیرہ اور اس باہمی تعاون سے معاشی وسائل حاصل کرنے میں یہ شرط لازمی ہے کہ یہ قبضہ اور یہ حصولِ ترقی ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی اور ضیق کا باعث نہ بن جائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ نظامِ تمدن فاسد اور خراب ہو کر رہ جائے۔

(اب ہم عمل پیدائش کی اولین اور نہایت ضروری صورت زراعت کی طرف آتے ہیں)

زراعت (Agriculture)

ضرورت واہمیت:

اللہ (جل شانہ) نے قرآن عزیز میں زراعتی پیداوار کو انسانی دنیا پر عظیم الشان

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ، ۱۰۳/۲ من ابواب ابتغاء الرزق

احسان جتا کر اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ طبعی وسائل معیشت میں زراعت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

﴿أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿٦٥﴾ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ﴿٦٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٦٧﴾﴾ (۱)

ترجمہ: بھلا بتلاؤ تو تم جو کھیتی کرتے ہو اس کو تم پیداوار بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کریں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ بلاشبہ ہم پر تاوان ڈالا گیا بلکہ ہم تو محروم رہ گئے۔

اور اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کے فضائل میں گراں قدر ارشادات فرمائے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: اطلبوا الرزق في خبايا الأرض. (۲)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو۔

امام سرخسی رحمہ اللہ (۳) اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

يعني عمل الزراعة. (۴)

---

(۱) سورة الواقعة (٥٦): ٦٣

(۲) الهيثمي: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج ٤ باب الكسب والتجارة، ص ٦٣. یہاں یہ حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی مروی ہے۔

(۳) امام سرخسی رحمہ اللہ شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی رحمہ اللہ فقہ حنفی کے مقلد اور مؤید تھے۔ حق کہنے کی پاداش میں قید کر دیئے گئے۔ قید خانہ میں رہ کر آپ نے اپنی مشہور کتاب "المبسوط" تیس (۳۰) جلدوں میں لکھی ہے۔ دراصل یہ ابوالفضل مروزی مشہور حاکم الشہید رحمہ اللہ کی کتاب "الکافی" کی شرح ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آخر میں وفات پائی۔ (ڈاکٹر صبحی محمصانی: فلسفہ التشریع فی الاسلام، باب مذہب حنفی)

(۴) امام سرخسی، شمس الآئمة: المبسوط، مطبع السعادة، قاهرة، ج ۲۳، كتاب المزارعة =

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے زراعت اور کاشتکاری مراد ہے۔

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ما من مسلم یغرس غرسا أو یزرع زرعا فیأکل منه طیر أو إنسان أو بهیمة إلا کان له بذلك صدقه.[1]

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان درخت بوتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرند، انسان اور جانور اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں تو یہ عمل اس کے حق میں صدقہ بنتا ہے یعنی اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ زراعت ایسا عمل ہے کہ عامل کی نیت کے بغیر بھی اس سے مخلوقِ خدا کو فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ چنانچہ شیخ بدرالدین عینی[2] اس کی شرح میں اس طرح تصریح فرماتے ہیں:

وفیه حصول الأجر للغارس والزارع وإن لم یقصد ذلك حتی لو غرس وباعه، أو زرع وباعه، کان له بذلك صدقه لتوسعته علی الناس فی أقوامهم الخ.[3]

ترجمہ: اور اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ درخت لگانے والے اور کھیتی کرنے والے کو اس عمل پر اجر و ثواب ملتا ہے خواہ اس نے اس ثواب کا ارادہ بھی نہ کیا ہو حتی کہ اگر اس نے درخت بویا اور فروخت کر دیا اور

۱۳۳۱ھ۔

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعة، باب فضل الزراعة والحرث

(۲) علامہ عینی، بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد رحمہ اللہ (۷۶۲ھ - ۸۵۵ھ) محدث، فقیہ اور استاد تھے۔ علم الحدیث اور اس کی ترویج و اشاعت میں ان کا بڑا مقام تھا۔ آپ نے بخاری شریف کی شرح "عمدۃ القاری" لکھی جو علوم حدیث کے طلبہ کے لیے ایک بڑا احسان ہے۔

(۳) عینی، بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد: عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، ۷۱۱/۵

کاشت کی اور اس کو فروخت کر دیا تب بھی یہ اس کے حق میں صدقہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا یہ عمل مخلوقِ خدا کی روزی میں اضافہ کا باعث ہوا۔

اور امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقرب الی اللہ کے علاوہ اس عمل کا کارِ خیر ہونا مسلم اور کافر دونوں کے حق میں یکساں ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے:

عمروا بلادی فعاش فیها عبادی.[1]

ترجمہ: (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:) میری بستیوں کو آباد کرو تاکہ اس میں میرے بندے زندگی بسر کر سکیں۔

فلهذا قلنا هذا الفعل حسن من کل احد الخ.[2]

ترجمہ: پس اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ یہ عمل (زراعت) ہر کسی کے ہاتھوں بہتر عمل ہے۔

اور یہی سرخسی رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام جرف میں زراعت کی ہے:

وأزرع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بالجرف.[3]

ترجمہ: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جرف میں خود کاشت کی ہے۔

زراعت اور دیگر ذرائع معاش کا تقابل

آیت قرآنی اور ان صحیح روایات کے پیشِ نظر علماء کے سامنے یہ مسئلہ قابلِ توجہ

---

(۱) سرخسی: المبسوط، ج ۳، کتاب المزارعة

(۲) حوالہ بالا۔ میرے ناقص علم کے مطابق اس عبارت ''حسنٌ من کل احد'' کا شاید یہاں موزوں ترجمہ: ''دوسرے ہر ایک پیشہ سے اچھا ہے'' ہو گا، کیونکہ شمس الائمہ امام سرخسی رحمہ اللہ زراعت کو دیگر پیشوں مثلاً صفت و حرفت وغیرہا سے تقابل کی بات کر رہے ہیں اور چونکہ زراعت ایسا عمل ہے جس کا ثواب بغیر ارادہ و نیت کے بھی اللہ کریم عنایت فرماتے ہیں۔ لہٰذا یہ ترجمہ اس موضوع کے مناسب حال ہو گا (واللہ اعلم)

(۳) حوالا بالا: ۲/۲۳

رہا ہے کہ مسطورہ بالا معاشی وسائل میں سے کون سا وسیلہ دوسرے وسائل سے افضل اور اہم ہے؟ چنانچہ ان ہی روایات کے تحت میں امام سرخسی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ بعض مشائخ حنفیہ کا قول ہے تجارت اور صنعت سے زراعت افضل ہے:

ولهذا قدم بعض مشائخنا رحمهم الله الزراعة على التجارة لأنها أعم نفعا وأكثر صدقة، وفي الحديث رد على من يكره عن المتعسفة الغرس والبناء الخ.[1]

ترجمہ: اور ان ہی روایات کے پیش نظر ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ زراعت کو تجارت سے افضل فرماتے ہیں اس لیے کہ اس کا نفع عام ہے اور اس کی خیر کثیر ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور عمل مبارک میں ان رکیک خیال لوگوں کا رد ہے جو کاشت کاری اور تعمیر کو برا سمجھتے ہیں۔

لیکن شیخ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں اس اختلاف رائے پر بحث کرتے ہوئے یہ بہترین فیصلہ دیا ہے کہ ان ہر سہ وسائل کی اہمیت دراصل ذاتی نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ مخلوق کی فلاح اور عام خوشحالی اور رفاہیت کا ذریعہ ہیں لہذا جن ممالک کے طبعی ماحول میں یا جن حالات میں زراعت زیادہ مفید اور نفع بخش ہے وہ تجارت اور صنعت پر قابلِ ترجیح ہے اور جن مقامات میں اور جن واقعات و حالات میں تجارت یا صنعت عام رفاہیت کی کفیل ہیں تو بلاشبہ وہاں وہ لائق ترجیح ہیں، غرض ان ہر سہ وسائل کے باہم راجح اور مرجوح (Preferable) کا سوال ملکوں کی طبعی حالت اور زمانہ کی ضروریات و حاجات کے پیش نظر ہے نہ کہ ذاتی فضیلت کے پیشِ نظر۔ شیخ کی اصل عبارت یہ ہے:

واذا كان كذلك، فينبغي أن يختلف الحال في ذلك باختلاف حاجة الناس. فحيث كان الناس محتاجين الى الأقوات أكثر

---

(۱) حوالا بالا: ١٤/٣

كانت الزراعة أفضل للتوسعة على الناس، وحيث كانوا محتاجين الى المتجر لإنقطاع الطرق كانت التجارة افضل. وحيث كانوا محتاجين إلى الصنائع أشد كانت الصناعة أفضل وهذا احسن الخ.[۱]

ترجمہ: اور جب یہ بات متعین ہو گئی کہ ان وسائلِ معیشت کی افضلیّت کا منشاء نفع عام ہے تو پھر ظاہر ہے کہ لوگوں (اہل ملک) کی حاجات و ضروریات کے اختلاف سے ان کی باہمی افضلیّت (Relative Preference) بھی مختلف ہو گی پس جب باشند گانِ ملک خام اجناس کے زیادہ محتاج ہوں تو زراعت افضل ہے تاکہ لوگوں کے لیے اس کا نفع عام ہو اور اگر کسی جگہ زراعت کے وسائل مفقود ہوں تو وہاں تجارت کو برتری حاصل رہے گی اور اگر کسی ملک کے باشندوں کو قدرتی اور طبعی طور پر زراعت اور تجارت کے مقابلہ میں صنعت کی زیادہ حاجت ہے تو وہاں صنعت و حرفت کو فوقیت ہو گی اور یہی فیصلہ بہتر اور خوب ہے۔

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے:

اور فیلسوفِ اسلام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [۲] بنیادی معاشی وسائل میں سے ''زراعت'' کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ جس ملک میں اس کے وسائل موجود ہوں اس جگہ اگر اس سے بے اعتنائی برتی جائے تو اس ملک کی تمدنی حالت کبھی درست نہیں رہ سکتی اور اس کا فاسد اور برباد رہنا یقینی ہے اس لیے کہ خام اجناس کی پیداوار کے بغیر نہ تجارت چل سکتی ہے اور نہ صنعت و حرفت بروئے کار آسکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

فأنهم إن كان أكثرهم مكتسبين بالصناعات وسياسة البلدة،

---

(۱) عيني: عمدة القاري، مطبوعه منيريه، قاهرة، ١٣٤٨ھ، ٥/ ٧١١

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا میں درج ہے۔

والقليل مكتسبين بالرعىٰ والزراعة فسدحالهم فى الدنيا. الخ.[1]

ترجمہ: پس اگر باشند گانِ ملک کی اکثریت صنعت و حرفت اور شہری سیاسیات ہی میں مصروف رہے اور زراعت اور مویشیوں کی حفاظت اور پرورش کی جانب بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیوی تمدنی زندگی فاسد اور خراب ہو جائے گی۔

اور آگے چل کر زراعت، تجارت اور صنعت کو مدنی حیات کا اہم جزو قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب قومیں معاشی وسائل کو چھوڑ کر عیش پرستانہ وسائل زندگی کو اختیار کر لیتی اور سرمایہ دارانہ سربلندیوں اور مسرفانہ (Excessive Well-Being) رفاہیت میں باہمی مقابلہ کو معیار حیات بنا لیتی ہیں تو وہ کبھی مدنی زندگی میں پھل پھول نہیں سکتیں اور ان کی یہ غیر طبعی عیش کوشی ان کو جلد ہی لے ڈوبتی ہے۔

فاذا أقبل جم غفير منهم الى هذه الاكساب اهملوا مثلها من الزراعات والتجارات، واذا انفق عظما المدينة فيها الاموال اهملوا مثلها من مصالح المدنية، وجر ذلك الى التضيق على القائمين بالاكساب الضرورية كالزراع والتجار والصناع وتضاعف الضرائب عليهم وذلك ضرر بهذه المدينة يتعدى من عضو منها الى عضو حتى يعم الكل ويتجارىٰ فيها كما يتجارىٰ الكلب فى بدن المكلوب.[2]

ترجمہ: پس جب باشند گانِ ملک کی بڑی اکثریت اس قسم کے (غیر طبعی اور غیر مفید) کسب و اکتساب میں منہمک ہو جاتی ہے تو زراعت اور

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجة الله البالغه، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق

(۲) حوالا بالا

تجارت جیسے کسب و ہنر کو چھوڑ بیٹھتی ہے اور جبکہ شہر کے روساء اور امراء ایسے غلط وسائلِ معیشت پر خرچ کرتے ہیں تو ایسے لوگ مدنی مصالح کو برباد کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ غلط انہاک ان لوگوں کی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے جو اہم اور ضروری معاشی وسائل کی جانب مشغول ہیں مثلاً کاشتکار، تجار اور صناع۔ نیز یہ فاسد انہاک ان پیشہ ور افراد پر بھاری ٹیکسوں کا باعث ہو جاتا ہے اور یہ مدنی زندگی کے لیے اس قدر نقصان دہ بن جاتا ہے کہ اعضاء جماعت کے ایک عضو سے متعدی ہو کر دوسرے عضو تک پہنچتا اور آہستہ آہستہ تمام اعضاء (افراد) جماعت میں ایک داء الکلب (چیچڑی لگ جانے کا مرض) کی طرح متعدی ہو جاتا ہے۔

اور علامہ عبدالرحمٰن جزائری[1] فرماتے ہیں:

أمّا الزرع فی ذاته سواء كان مشاركة أولا فهو فرض كفاية لاحتياج الانسان والحيوان إليه.[2]

ترجمہ: لیکن زراعت خواہ شرکت سے وجود میں آئے یا بغیر شرکت اپنی ذات میں فرض کفایہ ہے اس لیے کہ انسان اور حیوان سب ہی اس کے

(۱) الجزائری، علامہ عبدالرحمٰن بن محمد عوض الجزیری رحمہ اللہ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء میں مصر کے جزیرہ سندویل —— جو علاقہ سوہاج کا مرکز ہے —— میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ سال کی عمر سے لے کر ۲۶ سال (۱۳۱۳ھ سے ۱۳۲۶ھ) تک جامعہ ازہر مصر عالم اسلام کی مشہور دانشگاہ میں زیور علم سے آراستہ ہوئے۔ تکمیل علم کے بعد مصر کی وزارتِ اوقاف میں اصلاح مساجد کے متعلق تحقیقات کے کام پر مامور ہوئے۔ پھر تحقیقات علمیہ کے سربراہ اور بعد میں پروفیسر اصول الدین، جامعہ ازہر مقرر ہوئے۔ پھر لجنۃ العلماء —— جو مصر میں نہایت مقتدر علمی و فقہی بورڈ ہوتا ہے —— کے رکن بنا دیئے گئے۔ آپ کی مشہور تصانیفات میں کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ کے سوا توحید العقائد، الاخلاق الدینیۃ والحکم الشریعۃ، ادلۃ الیقین فی الرد علی بعض المبشرین اور دیوان خطب ہیں۔ تمام شائع ہو چکی ہیں۔ آپ نے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں حلوان میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

(۲) الجزائری، عبدالرحمٰن: كتاب الفقه على المذاهب الاربعة، قسم المعاملات، كتاب الزراعة

محتاج ہیں۔

مسطورہ بالا حوالجات سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ اسلام اپنے نظامِ معیشت میں "وحدت عمومی" (General Unity) کا کس درجہ قائل ہے اور اس کی کس درجہ یہ خواہش ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اور مملکتیں اگر اسلامی اقتدار اعلیٰ کو نہ بھی قبول کریں تب بھی ان معاشی وسائل میں ایک دوسرے کی معاون ثابت ہوں اور معاشی دستبرد کے ذریعہ ظلم کی راہ نہ کھولیں اور زراعتی ملک تجارتی اور صنعتی ملکوں کے لیے اور تجارتی و صنعتی ممالک زراعتی اقوام کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوں نہ کہ باعثِ مناقشت و منازعت (Tussele & Conflict) اور وہ قومیں اور وہ ممالک تو بہت ہی خوش بخت ہیں کہ جو خدائے برتر کی قدرتی فیاضیوں سے زراعتی بھی ہیں اور تجارتی اور صنعتی بھی۔ ایسے ممالک اگر اپنے اندر صحیح جذبۂ حمیت وغیرت رکھتے اور اپنی آزادی کے مالک ہوں تو نہ صرف یہ کہ وہ دوسروں کے غلام اور دستِ نگر نہ رہیں ان کو یہ بہترین موقع میسر ہے کہ وہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچا سکتے اور معیشت کی عام افادیت میں پیش پیش رہ سکتے ہیں اور یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ آج کی دنیا میں جب کہ بعض قومیں اپنے ملکوں میں زراعت کی قومی صلاحیت موجود نہ ہونے کے باوجود تجارت اور صنعت و حرفت کے ذریعہ سے زراعتی ملکوں سے زیادہ خوشحال اور مدنی حیات میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں تو زراعتی اہمیت کہاں رہتی ہے؟

یہ خیال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ جن قوموں کی جانب سائل کا اشارہ ہے ان کی مدنی اور معاشی ترقیات اس لیے نہیں ہیں کہ وہ تجارتی اور صنعتی ممالک کی باشندہ ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اسلحہ کی طاقت سے زراعتی ملکوں کو غلام بنا کر اور ان کی تجارت و صنعت کو مفلوج کر کے ان پر معاشی دستبرد قائم کر لی اور ظالمانہ دستبرد کو دلیلِ راہ بنا لیا ہے مگر بقول حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ایسا نظامِ اقتصادی دیرپا نہیں ہو سکتا اور اس کی بربادی پر قدرت کی مہر لگ جاتی ہے۔ پس جب تک "صحیح اور صالح معاشی نظام" کائنات کے لیے دلیل راہ نہیں بنے گا دنیا کی یہ باہمی

دستبرد اور فتنہ حرب و ضرب برابر قائم رہے گا اور صالح معاشی نظام کی جو اساس اسلام نے قائم کی ہے کائنات کے امن اور عام خوشحالی کے لیے اس سے بہتر نظام ناممکن ہے۔

جواز و فضیلت زراعت کے بارے میں ایک شبہ اور اس کا حل

گذشتہ اوراق میں آیات، صحیح روایات اور علماءِ اسلام کی تشریحات سے جب یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں بنیادی وسائل معیشت میں سے ''زراعت'' کو کافی اہمیت حاصل ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جو بخاری کتاب المزارعۃ میں حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] سے منقول ہے:

عن ابی امامة رضی اللّٰه عنه أنه رای سكة وشيئا من الة الحرث فقال: سمعت النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: لا یدخل هذا بیت قوم الا ادخله اللّٰه الذل. [2]

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک جگہ ہل اور کھیتی کے بعض دوسرے آلات کو دیکھا تو فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس گھر میں یہ آلات داخل ہو جاتے ہیں اس گھر میں ''اللہ تعالیٰ'' ذلت اور مسکنت داخل کر دیتا ہے۔

اس حدیث سے تو ''زراعت'' کے متعلق حقارت اور ذلت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ گویا زراعت پیشہ خدا کی دی ہوئی عزت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

---

(۱) ابو امامہ الباہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں ہجرت نبوی سے ۱۰ سال پیدا ہوئے اور ۸۱ھ میں وفات پائی۔ (عبدالبر: الاستیعاب نمبر ۱۲۳۷)

(۲) صحیح الامام البخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب ما یحذر من عواقب الاشتغال بآلة الزرع

بلاشبہ یہ سوال اپنے اندر اہمیت رکھتا ہے اور اسی لیے شروع ہی سے علماء اسلام اس کی صحیح توجیہ اور اس کا حقیقی مفہوم بیان کرتے ہیں تاکہ زراعت کی اہمیت سے متعلق جو آیات اور صحیح روایات بکثرت وارد ہوئی ہیں ان کے اور اس روایت کے درمیان خلاف باقی نہ رہے۔

(الف) امام محمد رحمہ اللہ کا جواب:

چنانچہ امام محمد رحمہ اللہ اور ان کے اتباع میں امام سرخسی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس حدیث کا مفہوم یہ بیان فرماتے ہیں:

ظنوا ان المراد بالتزام الخراج وليس كذلك. بل المراد أن المسلمين إذا اشتغلوا بالزراعة واتبعوا أذناب البقر وقعدوا عن الجهاد كر عليهم عدوهم فجعلوا هم اذلة الخ۔[1]

ترجمہ: لوگوں نے اس حدیث سے یہ غلط مطلب سمجھ لیا کہ چونکہ اکثر (جو غیر مسلموں) کی زمینوں پر "خراج" لازم ہوتا ہے تو شاید اس وجہ سے زراعت ذلت کا باعث ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حدیث کی حقیقی مراد یہ ہے کہ مسلمان اگر زراعت کو زندگی کا مستقل مشغلہ بنالیں اور بیلوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھریں اور "جہاد" جیسے اہم فریضہ سے غافل ہو جائیں تو ان کے دشمن ان پر حملہ آور ہو جائیں گے اور ان کو ذلیل و خوار کر چھوڑیں گے۔

گویا حدیث یہ کہتی ہے کہ یہ مسلم کہ معاشی وسائل میں "زراعت" بہت اہم وسیلہ ہے لیکن یہی وسیلہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کا باعث بن جاتا ہے جبکہ مسلمان اس میں اس درجہ منہمک ہو جائیں کہ زندگی کے سب سے اہم مقصد جہاد کو چھوڑ بیٹھیں اور اس سے بے پرواہ ہو جائیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی یہی توجیہ پسند فرمائی ہے۔

---

(۱) سرخسي، شمس الائمة: المبسوط، ۸۳/۱۰، مطبع السعادة، قاهرة

(ب) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا جواب:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں:

اعلم ان النبی صلی اللہ علیه وسلم بعث بالخلافة العامة، وغلبة دینه علی سائر الأدیان، لا یتحقق إلا بالجهاد و إعداد آلاته، فاذا ترکوا الجهاد واتبعوا أذناب البقر احاط بهم الذل وغلب علیهم أهل سائر الادیان. الخ[1]

ترجمہ: یہ واضح رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالمگیر انقلاب و اقتدار (خلافت عامہ) کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور تمام مسخ شدہ ادیان پر ان کے انقلابی دین کا غلبہ جہاد اور وسائل جہاد میں انہماک کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، پس اگر مسلمان جہاد کو چھوڑ بیٹھیں اور بیلوں اور گایوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھرنے لگیں تو ان کو چہار جانب سے ذلت و رسوائی گھیر لے گی اور تمام اہل مال ان کو مغلوب اور محکوم بنائیں گے۔

(ج) محدث داؤدی رحمہ اللہ کا جواب:

اور محدث داؤدی رحمہ اللہ[2] اس حدیث کا مطلب سابق مفہوم کی مطابقت کے ساتھ کچھ محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "عام" نہ تھا بلکہ آپ نے ایک خاص موقعہ پر دشمن سے قریب سرحدوں پر آباد مسلمانوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا، مگر روایت کی تعبیر نے اس کو عام کر دیا اور اصل حقیقت پوری طرح سامنے نہ آسکی، داؤدی رحمہ اللہ کی اصل عبارت یہ ہے:

هذا لمن یقرب من العدو فإنه اذا اشتغل بالحرث لا یشتغل بالفروسیة، و یتأسد علیه العدو، واما غیرهم فالحرث محمود

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجة اللہ البالغة، باب الجهاد، ۱۷۳/۲

(۲) محدث داؤدی، حافظ شمس الدین محمد بن علی بن احمد داؤدی رحمہ اللہ ان کی مشہور تصنیف "طبقات المفسرین" جسے علامہ علی بن محمد رحمہ اللہ نے تحقیق کیا اور ۱۳۹۲ھ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

لهم. وقال عزوجل: ﴿وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسۡتَطَعۡتُم﴾ الاية وهو لا تقوم الا بالزراعة. ومن هو بالثغور او المقاربة للعدو لا يشتغل بالحرث. فعلى المسلمين ان يمدوهم بما يحتاجون اليه الخ.[1]

ترجمہ: یہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس جماعت کے لیے ہے جو دشمنوں کی سرحدوں کے قریب آباد ہے اس لیے کہ اگر وہ کھیتی باڑی میں لگ جائے تو پھر شجاعانہ فنون سے بے پرواہ ہو جائے گی اور دشمن اس پر غالب ہو جائے گا۔ لیکن ایسے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے زراعت کا کام پسندیدہ اور مرغوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسۡتَطَعۡتُم﴾ اور تم تیاری کرو دشمنوں کے مقابلہ میں بقدرِ طاقت۔ اور ظاہر ہے کہ یہ زراعت کے بغیر نامکمل رہتی ہے کیونکہ جو لوگ سرحدوں پر اور دشمنوں کے قرب و جوار میں آباد ہیں وہ کاشت میں مشغول نہیں رہ سکتے۔ پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان کی ضروریات و حاجات کے لیے زراعت کے ذریعہ سے مدد دیں۔

(د) محدث ابن متین رحمہ اللہ کی عمدہ توجیہ:

مگر ان تمام توجیہات سے زیادہ بہتر توجیہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی حقیقی روح وہ ہے جو مشہور محدث ابن متین رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک زراعت سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر بیان نہیں کرتا بلکہ مستقبل میں ہونے والے ایک ایسے تکلیف دہ واقعہ کی جانب متنبہ کرتا ہے جو آج کی دنیا میں ارشاد گرامی کے مطابق حرف بہ حرف

(۱) علامہ عینی: عمدة القاری شرح بخاری، مطبوعہ مطبعة منیرية، قاهرة، ۱۳۴۸ھ، ۷۱۲/۵

صحیح نظر آرہا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت کا مناد (Caller-Declarant) ہے وہ یہ کہ دنیا کی تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ ظلم وجور کا شکار اس جماعت کو بنایا جائے گا جس کو کاشتکار کہا جاتا ہے اور سب سے زیادہ ذلت و رسوائی اور مسکنت سے ان ہی کو دوچار ہونا پڑے گا۔ ابن متین کے الفاظ یہ ہیں:

هذا من اخباره صلى الله عليه وسلم بالمغيبات لأن المشاهدة الآن أن أكثر الظلم أنما هو على اهل الحرث. الخ [1]

ترجمہ: یہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب کی اطلاعات (پیشین گوئیوں) میں سے ایک اطلاع ہے اس لیے کہ آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ ظلم کا شکار وہی ہیں جو کھیتی باڑی کرنے والے (کاشتکار) ہیں۔

یہ "ابن متین" کا مشاہدہ ہے جو تقریباً چھٹی صدی ہجری کا زمانہ ہے اور آج دنیا میں خام اجناس پیدا کرنے والے اور مدنیت (Civic) کی ابتدائی بنیادوں کو استوار کرنے والے اس طبقہ "کاشت کار" کی جو حالتِ زار ہے وہ ہمارا اور آپ کا مشاہدہ ہے تو کیا ایک حقیقت بین نگاہ کے لیے یہ بات قابلِ غور نہیں ہے کہ جن نگاہِ وحی آگاہ نے بساطِ دنیا کے ان باریک اور دقیق نقوش (Minute Signs) تک کو خدا تعالیٰ کی عطا کردہ روشنی میں دیکھ لیا ہو، اس کا پیش کردہ "معاشی نظام" بلکہ انسانیت کا پورا نظام یقیناً افراط و تفریط سے پاک اور عام رفاہیت کا کفیل بن سکتا ہے اور بلاشبہ وہی اخوت اور امنِ عام کا داعی ہو سکتا ہے۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"

ترقیِ زراعت کے ذرائع

بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی اصل مبحث تو یہ ہے کہ وسائل معیشت کی توسیع

---

(۱) ابن متین رحمہ اللہ غالباً شارح بخاری ہیں چھٹی صدی ہجری کے بزرگ تھے ان کے حالات اور ان کی علمی تصانیف کا بڑی جستجو کے بعد بھی سراغ نہ مل سکا۔ شاید اللہ کریم اپنا کرم فرما کر کسی محقق کی ان کے حالات تک رسائی فرمادے۔

کے سلسلہ میں اسلام کے معاشی نظام نے ''زراعت'' کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور وہ اس عمل کو معاشی وسائل کی بنیاد سمجھتا ہے اس لیے اس نے اس کی افزائش اور ترقی کے لیے جو ذرائع اختیار کیے ہیں وہ بلاشبہ ''علم معیشت کی نگاہ'' میں حقیقی اور بنیادی ذرائع کہے جا سکتے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے عملی لائحہ عمل کو اگر بغور دیکھا جائے تو آپ بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نگاہ میں ''زراعت'' کی ترقی کے لیے حسبِ ذیل امور بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں:

1. مال گزاری یا لگان کا کم ہونا۔
2. کاشت کرنے والوں کے لیے خصوصی حقوق و مراعات دینا۔
3. غیر مزروعہ اور بنجر زمینوں کو مزروعہ بنانے کے لیے وسائل اختیار کرنا۔
4. آبپاشی کے وسائل کو سہل اور وسیع بنانا۔

مالگذاری یا لگان (Rent):

''زراعت'' دو طرح عالم وجود میں آتی ہے ایک یہ کہ کوئی شخص زمین کو خود کاشت کرے اور دوسرے یہ کہ اپنی زمین کو کسی قسم کے مبادلہ پر دوسرے کو کاشت کے لیے دے دے اور اس دوسری صورت میں کبھی صاحبِ زمین حکومت (اسٹیٹ) ہوتی ہے اور کبھی جماعت (پبلک) میں سے کوئی فردِ خاص۔ [1] ایک صورت یہ بھی ہے کہ زمین کی ملکیت افرادِ ملک ہی کے ہاتھوں میں رہے اور حکومت نے اس پر کوئی محصول مقرر کر دیا ہو پس حکومت یا فرد جماعت اگر کسی کو ایک مقررہ شرح پر کاشت کے لیے زمین دیتا ہے تو اس کو لگان کہا جاتا ہے اور اگر زمین پر سالانہ محصول لگایا جاتا ہے تو اس کو مالگذاری کہتے ہیں زراعت کے اس طریق سے کسب معیشت میں دو اصناف معاملہ کرتے نظر آتے ہیں ایک کاشتکار اور دوسرا زمیندار، دنیا کے نظام ہائے حکومت میں ان دونوں میں سے عموماً کاشتکار کے ساتھ جو

---

(۱) زمینداری صرف حکومت کا حق ہے یا شخصی اور انفرادی زمینداری بھی جائز ہے یہ مسئلہ ''زمین کے خصوصی احکام'' کی بحث میں آئے گا۔

ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں اور اس کو جس طرح مظالم کا شکار بنایا جاتا رہا ہے اور ان کی حیثیت محکوموں اور غلاموں کی طرح رہی ہے وہ اظہر من الشّمس ہے اور اسی کا رد عمل آج طبقاتی جنگ کی شکل میں رونما ہے۔ پس اسلام سب سے پہلے اس سلسلہ میں اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جہاں تک زراعت اور کاشت کا تعلق ہے زمیندار اور کاشت کار دو برابر کے معاملہ دار ہیں اس لیے کہ ایک صاحبِ زمین اور مستاجر (Employer) ہے اور دوسرا شریک عمل اور آجیر (Employee) کہ محکوم یا غلام۔ کیونکہ ایک جانب اگر دولت (زمین) ہے تو دوسری جانب دولت (بیج اور آلاتِ زراعت) اور محنت دونوں ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایک (زمیندار) حاکم اور آقا ہو اور دوسرا (کاشتکار) محکوم اور غلام۔

خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عادلانہ فیصلہ:

اسلام کے اس نقطۂ نظر کا آپ صرف ایک واقعہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک غیر مسلم (ذمی) کاشتکار نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ شکایت کی کہ اسلامی فوج جب ہمارے گاؤں سے مارچ کرتی ہوئی جارہی تھی تو اس نے میری تمام کھیتی کو روند ڈالا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر بیت المال سے دس ہزار درہم بطور تاوان ادا کر دیئے۔

اتی عمر رضی اللّٰه عنه رجل فقال: یا امیرالمؤمنین! زرعت زرعا فمر به جیش من اهل الشام فأفسدوه. قال: فعوّضه عشرة الآف.[1]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: اے امیرالمؤمنین! میں نے کاشت کی تھی اتفاقاً اس جانب سے شام کا لشکر گزرا اور اس نے تمام کھیتی کو خراب کر ڈالا۔ حضرت عمر رضی اللہ

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی تقبیل السواد (وغیر السواد) واختیار الولاۃ لھم والتقدم الیھم (بالکل آخر میں)

تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر بیت المال سے دس ہزار درہم معاوضہ کے طور پر ادا کر دیئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہود خیبر سے معاہدۂ مخابرہ:

اور خیبر کے یہود کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالگزاری کا جو معاملہ کیا اور جس کو فقہی اصطلاح میں ''مخابرہ'' کہا جاتا ہے اس سے پیدا شدہ مسئلہ ''مزارعہ'' کی حقیقت، بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ یہود خیبر مسلمانوں کے غلام نہیں تھے بلکہ زمین کے مالک اور اسلامی حکومت کو زمین کا خراج ادا کرنے والے تھے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

وهذا أصح التاويلين فأنه لم ينقل عن أحد من الولاة أنه تصرف فى رقابهم أو رقاب أولادهم كالتصرف فى المماليك الخ.[1]

ترجمہ: اور ہر دو توجیہات میں سے یہ توجیہ بہت صحیح ہے اس لیے کہ والیوں میں سے کسی والی سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے ان یہودیوں کی ذات پر یا ان کی اولاد پر اس قسم کا تصرف کیا ہو جیسا کہ غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی نقول موجود ہیں جو اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام کے معاشی نظام میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کے بغیر خراج (مالگذاری) کے تقرر میں بھی خلیفہ کے ہر وقت یہ پیشِ نظر ہے کہ مفتوح ہو جانے کے باوجود صاحبِ زمین اور کاشتکار حکومت کے محکوم یا غلام نہیں ہیں بلکہ صرف کاشتکار یا مالگذار زمیندار ہیں۔ پس جب ایسی صورت میں کہ وہ تمام علاقے اسلامی حکومت کے مفتولہ علاقے ہیں ان علاقوں کے خراج گزاروں کے ساتھ اسلام کا یہ طرز عمل ہے تو کاشت کے باقی دوسرے عام طریقوں میں تو اس کے نظام میں ایک لمحہ کے لیے بھی

(۱) سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، ۲/۲۳

یہ صورت نہیں بن سکتی۔

مزارع اور زمیندار کی برابر حیثیت:

کاشتکار زمیندار کا محکوم یا غلام نہیں بلکہ بلاشبہ وہ مستاجر ہے جو حکومت (اسٹیٹ) یا کسی فرد خاص کی زمین کو بطور اجارہ (Rent) کے لیتا ہے اور یا شریک معاملہ (Partner) ہے اور ایک شریک کی طرح حصہ دار ہے۔ چنانچہ مزارعہ (بٹائی) کی بحث میں فقہاء اسلام نے تصریح کی ہے کہ اس شکلِ خاص میں کاشتکار اور زمیندار معاملہ کاشت میں دو برابر کے شریک ہیں اور اسلامی قانون ان دونوں کو اسی حیثیت میں رکھتا ہے تا کہ اگر ان دونوں کے باہم کبھی مناقشہ (Controvesy) پیدا ہو تو ان کے معاملہ کو اسی اصول کے پیشِ نظر طے کیا جائے۔ فقہ حنفی کی ایک مشہور اور مستند کتاب بدائع الصنائع میں ہے:

لأن المزارعة فيها الإجارة والشركة، تنعقد إجارة ثم تتم شركة الخ.[1]

ترجمہ: اس لیے کہ مزارعۃ (بٹائی پر معاملۂ کاشت) میں اجارہ اور شرکت دونوں معنی پائے جاتے ہیں یہ ابتداء معاملہ میں اجارہ ہوتا ہے اور نتیجہ میں جا کر شرکت کا معاملہ بن جاتا ہے۔

اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ مزارعۃ کے جواز و عدمِ جواز پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وكذلك الأرض عندي هي بمنزلة مال المضاربة الخ.[2]

ترجمہ: (جس طرح مضاربت درست ہے یعنی ایک شخص کا مال ہو اور دوسرے کی محنت اور دونوں نفع کے شریک) اس طرح میرے نزدیک زمین بھی مالِ مضاربۃ کی طرح ہے (کہ ایک صاحبِ زمین ہے اور دوسرا

(۱) الکاسانی، ابو بکر: بدائع الصنائع، مطبوعہ قاهرة، ۱۳۲۸ھ، ٦/٧٧

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی إجارة الارض البيضاء وذات النخيل.

مستاجر اور دونوں نفع میں شریک، خواہ مزارعۃ کا معاملہ ہو یا اجارہ کا۔)

اور امام نسائی رحمہ اللہ، محمد بن سیرین رحمہ اللہ[1] مشہور جلیل القدر تابعی کا یہ قول نقل فرماتے ہیں:

روی النسائی رحمه اللّٰه تعالٰی من طریق ابن عون رحمه اللّٰه تعالٰی قال: کان محمد یعنی ابن سیرین رحمه اللّٰه تعالٰی یقول: ألارض عندی مثل مال المضاربة، فما صلح فی مال المضاربة، صلح فی الأرض وما لم یصلح فی المال المضاربة لم یصلح فی الأرض.[2]

ترجمہ: امام نسائی رحمہ اللہ نے ابن عون رحمہ اللہ کے ذریعہ نقل کیا ہے: محمد بن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں: میرے نزدیک زمین کی حیثیت مالِ مضاربت کی سی ہے۔ جس قسم کے معاملات وہاں درست ہیں، یہاں بھی جائز ہیں اور جو وہاں ناجائز ہیں وہ یہاں زمین (کے معاملات) میں بھی نادرست ہیں۔

یعنی زمین کا معاملہ نقد لگان پر ہو یا بٹائی پر ہر حالت میں ایسا معاملہ ہے جیسا کہ تجارتی معاملات میں ''مضاربۃ'' کا اور ''مضاربۃ'' کے متعلق تمام علماءِ اسلام متفق ہیں کہ تجارت کی یہ شکل باہمی تعاون و اشتراک کی بہترین شکل ہے اور یہ کہ اس

---

(۱) ابن سیرین، محمد بن سیرین (۳۳ھ - ۱۱۰ھ) بہت بڑے محدث اور امام تھے۔ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظ تھے۔ حدیث لکھتے کم تھے یاد زیادہ کرتے تھے، مگر حدیث لکھنے کے مخالف نہ تھے ان سے امام اوزاعی، سالم بن عبد اللہ البصری، ہشام بن حسان، اور یحییٰ بن سیرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ یحییٰ بن سیرین رحمہ اللہ کے پاس امام محمد بن سیرین کی ایک کتاب تھی جس میں احادیث نقل تھیں۔ (برائے تفصیل دیکھئے: پروفیسر محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی، طبع فی الریاض، تذکرہ، ابن سیرین رحمہ اللہ)

(۲) النسائی، احمد بن شعیب بن علی: السنن، ج ۲، کتاب الایمان والنذور، باب من الشروط فیه المزارعة، ذکر اختلاف الالفاظ الماثورة فی المزارعة

معاملہ میں جانبین ایک دوسرے کے شریک معاملہ ہوتے ہیں نہ کہ حاکم و محکوم یا آقا اور غلام۔ (حتی کہ اس قسم کے معاملات میں حکومت اسلامی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ آزاد ذمیوں کے ساتھ غلام اور محکوم کا سا معاملہ کرے۔ چنانچہ یہ واقعہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر مصر کے صاحبزادے نے ایک مصری (قبطی) مزارع کو کسی بات پر چند کوڑے مار دیئے۔ اس نے دربار فاروقی میں جا کر شکایت کی۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اور ان کے صاحبزادہ) کو دار الخلافہ طلب کیا اور قبطی سے ان کے روبرو بات چیت کی اور جب جرم ثابت ہو گیا تو فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبطی مصری کو حکم دیا کہ وہ عمرو (بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بیٹے کے اسی طرح کوڑے لگائے تاکہ اس کی شیخی کا نشہ کر کرا ہو جائے۔ پھر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: اے عمرو!

مذكم تعبد تم الناس؟ وقد ولدتهم أمهاتم إحرارا. قال: يا أمير المؤمنين! لم أعلم ولم يأتني.[1]

ترجمہ: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا ہے؟ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! مجھے اس واقعہ کا علم ہی نہ ہو سکا اور نہ اس شخص نے میرے پاس آکر اس کی اطلاع کی۔)

تخفیف مالگذاری و لگان (Decreasing of Rent):

مسئلہ زراعت میں اس بنیادی نقطہ کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب تخفیف لگان اور مالگذاری کی بحث کو اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

---

(۱) سیوطی، جلال الدین: حسن المحاضرة، ۲/۲

لگان اور لگان سے متعلقہ اصطلاحات کی پہچان:

دنیا کے معاشی نظام میں مالگذاری اور لگان کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک پیداوار میں سے حصہ مقرر کرنا اور دوسری صورت نقد لگان قائم کر دینا، اسلام کے معاشی نظام میں بھی اگرچہ یہی قدرتی صورتیں رائج ہیں مگر حکومت کے عائد کردہ لگان اور اس کی قائم کردہ مالگذاری اور افرادِ امت کے درمیان زمینداری اور کاشت کاری سے پیدا شدہ لگان کی تفصیلات حسب ذیل صورتیں اختیار کر لیتی ہیں:

❶ اگر زمین افرادِ ملک کی ذاتی مملوکہ ہے اور حکومت ان سے اجتماعی حق ''سالانہ محصول'' لیتی ہے تو اس صورت میں وہ زمین یا عشری ہوگی اور یا خراجی۔

❷ اگر زمین عشری ہے تو اس کی ہر پیداوار پر عشر (دسواں حصہ پیداوار) لیا جائے گا۔ جو کہ سال میں دو یا تین مرتبہ تک ہو سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ۔

❸ اور اگر خراجی ہے تو اس سے سال میں صرف ایک مرتبہ مقررہ مالگذاری لی جائے گی خواہ پیداوار سال میں دو مرتبہ ہو یا تین مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ۔[1]

❹ اور اگر خراجی زمین کو مسلمان خرید لے تو اس زمین پر خراج ہی قائم رہے گا اور وہ عشری زمین نہیں بن سکتی۔

❺ اور اگر عشری زمین کو ذمی یا مستامن (غیر مسلم) خرید لے تو وہ خراجی ہو جائے گی اس لیے کہ غیر مسلم پر عشر (زکوٰۃ) واجب نہیں ہے۔

❻ اور اگر زمین کی مالک حکومت اسٹیٹ ہے اور وہ اجارہ پر کاشت کراتی ہے اور یا کسی فرد خاص کی ملکیت ہے اور دوسرے کسی شخص سے اجارہ پر کاشت کراتا ہے تو اگر نقد لگان پر زمین کو دیا ہے تو وہ سال میں ایک ہی مرتبہ لیا جائے گا اور اس کو اجارہ یا استکراء الارض (Rent of Land) کہتے ہیں اور اگر بٹائی پر دیا جائے تو وہ پیداوار کے ساتھ مربوط رہے گا اور اس کو ''مزارعۃ'' (Farming) کہا جاتا ہے۔

---

(۱) یہ خراج مؤظف کہلاتا ہے اور اگر بٹائی پر امام نے معاملہ کیا ہے جیسا کہ خیبر میں ہوا تو اس کو خراجِ مقاسمہ کہتے ہیں۔ (مصنف)

۵ اور اگر باغ کی پیداوار کا معاملہ ہے تو اس کو ''مساقاۃ'' (Gardening) کہتے ہیں۔

تخفیفِ لگان کی اہمیت: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرزِ عمل:

پس زراعت کی ان تمام صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ہو اسلام کے معاشی نظام میں مسلم اور کافر کی تفریق کے بغیر یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اکثر حالات میں ''کاشتکار'' کی مصالح کو زمیندار یا حکومت کی مصالح پر مقدم رکھا جائے اور عشر کے علاوہ جو کہ پیداوار کی منصوص زکوۃ ہے ہر قسم کے لگان اور مالگذاری میں کاشت کار کی سہولت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ''تخفیف لگان'' کو اسوہ بنایا جائے اور یہ تو کسی حال میں بھی جائز نہیں سمجھا گیا کہ لگان یا مالگذاری کی شرح زمین کی حیثیت سے بڑھ کر مقرر کر دی جائے اور ایسا کرنے کو وہ ''ظلم و عدوان'' (Tyranny) سمجھتا ہے۔

تخفیفِ لگان اور کاشت کار کی سہولت اسلام کے معاشی نظام میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ ذیل کے احکام و واقعات اس کا مفصل جواب دے سکتے ہیں:

۱ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد یہود خیبر سے مخابرہ کا معاملہ کر کے ان کی زمینوں کو ان ہی کی ملکیت میں چھوڑ دیا اور جب پیداوار کے وقت حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصول یابی کے لیے بھیجا تو انہوں نے یہود سے صاف لفظوں میں یہ فرمایا:

> لم يبعثني النبي صلى الله عليه وسلم لأكل أموالكم، وانما بعثني لأقسم بينكم وبينهم. ثم قال: ان شئتم عملت وعاجلت، وكلت لكم النصف. وإن شئتم عملتم وعاجلتم، وكلتم النصف فقالوا: بهذا قامت السموات والارض الخ.[1]

---

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فیما ینبغی ان یعمل به فی السواد. ابن ماجه: السنن، ج۱، کتاب الزکاة، باب خرص النخل والعنب، ۵۸۲. سیرة ابن هشام: ۳۵۴/۲

ترجمہ: مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے نہیں بھیجا کہ میں تمہارے مال (پیداوار) کو ناحق ہضم کر جاؤں بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ تمہارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ کے مطابق پیداوار کو تقسیم کرو۔ اور تم کو پورا اختیار ہے کہ اگر یہ پسند کرتے ہو کہ میں عملداری کر کے اس کا تخمینہ کر دوں اور نصفا نصفی بانٹ دوں تو میں حاضر ہوں۔ اور اگر یہ بہتر سمجھتے ہو کہ تم خود عملداری اور کنکوت کر کے نصف نصف کر دو تو مجھے بھی یہ منظور ہے۔ یہ سن کر یہودی کاشتکار کہنے لگے: یہی وہ عدل و انصاف ہے جس کی وجہ سے زمین و آسمان قائم ہیں۔

❷ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ [(۱)] کو دجلہ کی اور حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ [(۲)] کو فرات کے کنارہ کی زمینوں پر خراج وصول کرنے کے لیے روانہ فرمایا، جب وہ واپس آئے اور خراج کی معقول رقم پیش کی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا:

كيف وضعتما على الأرض لعلكما كلفتما أهل عملكما مالا يطيقون. [(۳)]

---

(۱) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصار باوفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قبیلہ اوس سے تھے۔ آپ نے غزوہ احد سے لے کر بعد کے تمام غزوات میں شرکت کی۔ معاشیاتِ اراضی مثلاً پیمائش زمین، آباد کاری، زمین، محصولاتِ زمین وغیرہ کے ماہر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں عراق میں بصرہ اور اضلاعِ دریافرات کا بندوبستی آفیسر مقرر کیا تھا۔ آپ نے کوفہ میں رہائش اختیار کی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہے۔ (مشكاة المصابيح كا ذيل الكمال في اسماء الرجال تذكره عثمان بن حنيف رضي الله تعالى عنه)

(۳) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب ما عمل به في السواد، مطبوعه دار الاصلاح قاهرة، صفحه ۸۸، ۸۹

ترجمہ: تم نے زمین پر خراج کس مقدار سے مقرر کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کاشتکاروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

لعلكما حملتما على الأرض مالا تطيق.[1]

ترجمہ: شاید تم نے زمین کی حیثیت سے زیادہ خراج وصول کیا ہے؟

یہ سن کر حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

لقد تركت فضلا (أو) وضعت عليها أمراً هي له محتملة، وما فيها كثير فضل.[2]

ترجمہ: میں نے ان کے لیے بہت زیادہ چھوڑا ہے یا میں نے زمین سے مناسب لگان وصول کیا ہے اور جس قدر اس میں چھوڑ آیا ہوں وہ بہت زیادہ ہے۔

اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خراج کے تقرر میں زیادہ سے زیادہ تخفیفِ لگان کے مسئلہ کو پیشِ نظر رکھنے کی تنبیہ فرمائی اور فرمایا:

أنظر ألا تكونا حملتما على الأرض ما لا تطيق. إما لئن بقيت لارامل اهل العراق لادعنّهنّ لا يفتقرن (لا يحتجن) الى احد بعدى.[3]

ترجمہ: خراج مقرر کرتے یا وصول کرتے وقت خوب دیکھ بھال لیا کرو کہ کہیں "لگان" زمین کی حیثیت سے زیادہ تو نہیں ہو گیا اگر میں زندہ رہ گیا تو اہل عراق کی بیواؤں کو ایسا متمول کر دوں گا کہ میرے بعد پھر وہ کسی امیر کی محتاج نہ رہیں۔

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا

(۳) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب ما عمل به فی السواد، مطبوعه دار الاصلاح قاهرة، صفحه ۸۸، ۸۹

۳ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب عراق کا خراج وصول ہو کر آتا تو عراق کے متمدن شہروں کوفہ اور بصرہ سے دس دس آدمیوں کا وفد بلاتے اور وہ چار مرتبہ قسمیں کھا کر یہ شہادت دیتے کہ ہم سے یہ جو کچھ وصول کیا گیا ہے بغیر کسی ظلم کے برضاء ورغبت وصول کیا گیا ہے اس میں نہ کسی مسلمان پر ظلم کیا ہوا ہے اور نہ کسی معاہد (ذمی) پر۔[1]

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا تبصرہ:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ انہی روایات کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں:

ثم تكون المقاسمات فى أثمان ذالك أو يقوم ذلك قيمة عادلة، لا يكون فيها حمل على أهل الخراج ولا يكون على السلطان ضرر. ثم يؤخذ منهم ما يلزمهم من ذالك، أى ذالك كان أخف على أهل الخراج فعل ذالك بهم الخ.[2]

ترجمہ: پھر ان کے پھلوں کو بانٹ لیا جائے یا ان کی قیمت انصاف کے ساتھ اس طرح لگائی جائے کہ وہ اہلِ خراج پر بوجھ نہ ہو جائے اور نہ حکومت ہی کو نقصان پہنچے۔ پھر ان کے ذمے اس طرح جو لازم آئے وہ ان سے لیا جائے مگر یہ پیشِ نظر رہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے وہی صورت اختیار کی جائے جو اہلِ خراج کے لیے سہل اور خفیف ہو۔

اور دوسری جگہ (حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا اپنے گورنر عبد الحمید بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ کو لکھے گئے فرمان کا —— جو انہوں نے گورنر کو وصولی خراج کے بارے نصیحت کرتے ہوئے لکھا تھا سے یہ حصہ نقل کرتے ہوئے) فرماتے ہیں:

فخذه فى رفق وتسكين لأهل الأرض.[3]

---

(۱) حوالہ بالا، باب ما عمل فى السواد، ص ۸۹

(۲) حوالہ بالا، فيما ينبغى ان يعمل فى السواد، ص ۱۱۳

(۳) حوالہ بالا، باب فى الزيادة والنقصان من الخراج، ص ۱۸۶

ترجمہ: اور تم خراج اس طرح لو کہ اہل زمین (کاشت کار) کو اس کے دینے میں آسانی، نرمی اور تسکین رہے۔

اور ایک جگہ خراج (مالگذاری) کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقۂ وصول بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فلم نحملهم مالا يطيقون. ولم نأخذهم من الخراج إلا بما تحتمله أرضهم الخ.(۱)

ترجمہ: پس ہم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ لگان مقرر نہیں کریں گے اور نہ ان کی اراضی کی حیثیت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالیں گے۔

مقدارِ خراج کی حد:

اور عدمِ طاقت کے متعلق بحر الرائق(۲) میں یہ تصریح موجود ہے۔

❶ وقالوا: ونهاية الطاقة أن يبلغ الواجب نصف الخارج لا يزاد عليه. التنصيف عين الانصاف.(۳)

ترجمہ: فقہاء فرماتے ہیں: طاقت و برداشت کی آخری حد یہ ہے کہ خراج (لگان) پیداوار سے نصف ہو اور اس سے بڑھانا جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ تنصیف (آدھا آدھا کرنا) ہی انصاف ہے۔

❷ وأما اذا أراد الإمام توظيف الخراج على أرض إبتداء وزاد على وظيفة عمر رضى الله عنه فأنه لا يجوز عند أبي حنيفة

---

(۱) حوالہ بالا، باب مذکورة، ص ١٨٤

(۲) بحر الرائق: علامہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی رحمہ اللہ (متوفی ۹۷۰ھ) کی بہت مشہور اور متداول کتاب ہے۔ دراصل یہ حنفی فقہ کی بنیادی درسی کتاب (Text Book) "کنز الدقائق" مؤلفہ حافظ الدین نسفی رحمہ اللہ (متوفی ۷۱۰ھ) کی شرح ہے۔ ابن نجیم رحمہ اللہ کی دیگر کتب میں بہت اہم کتاب "الاشباہ والنظائر" ہے۔ بحر الرائق ۱۹۷۰ء میں قاہرہ سے چھپی۔

(۳) ابن نجیم، زین العابدین: بحر الرائق، مطبع دار الکتب العربیة، قاهرة، ۱۳۲٤ھ، ص ١١٦، ١١٧

رحمه الله تعالیٰ وهو الصحيح لأن عمر رضی الله عنه لم يزد لما أخبر بزيادة الطاقة.[۱]

ترجمہ: لیکن جب امام کسی زمین پر ابتداءً خراج لگائے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مقدار سے زیادہ لگانا جائز نہیں اور یہ ہی صحیح ہے اس لیے کہ اہل خراج کے زیادہ طاقت رکھنے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خراج نہیں بڑھایا۔

عراق کی زمینوں کا لگان / خراج:

عراق فتح کر لینے کے بعد باشندگانِ ملک کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمینوں کی کاشت سپرد کرتے ہوئے جس نسبت سے سالانہ مال گذاری (خراج) مقرر فرمائی وہ ان تمام اقوال و احکام کی جو سطور بالا میں تخفیف لگان سے متعلق بیان ہوئے ہیں، عملی شہادت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو کہ پیمائش کے ماہر تھے عراق کی پیمائش کرائی تو پہاڑ، جنگل اور نہروں کو چھوڑ کر قابل زراعت زمین کا کل رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب قرار پایا۔[۲] ان میں سے شاہی جاگیروں، آتشکدوں کے اوقاف، لاوارثوں مفروروں اور باغیوں کی جائیدادوں، دریا برد زمینوں، شاہراہوں اور ڈاک کے مصارف کی زمینوں اور جنگل کو ”خالصہ“ قرار دے کر رفاہِ عامہ کے لیے وقف کر دیا جس کا تخمینہ ستر لاکھ درہم سالانہ ہوتا تھا اور باقی تمام زمینوں کو مالکانِ ملک کی ملکیت تسلیم کر کے ان پر حسبِ ذیل معمولی لگان مقرر فرمادیا۔

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب ما عمل به فی السواد، ص ۸۷
حضرت علامہ شبلی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق کل رقبہ طول ۳۷۵ میل اور عرض میں ۲۴۰ میل یعنی کل رقبہ ۳۷۵×۲۴۰=۸۰۰۰۰ مربع میل ٹھہرا۔ جس میں سے پہاڑ، صحرا اور نہروں کو چھوڑ کر قابل زراعت زمین ۳ کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ٹھہری۔ (الفاروق، حصہ دوم، صیغہ محاصل، عنوان: عراق کا کل رقبہ)

گیہوں	فی جریب	(سوادو بیگہ خام)	پون بیگہ پختہ	۲درہم	تقریباً۸
گیہوں	″	″	″	۲درہم	تقریباً۴/عہ
جَو	″	″	″	۱درہم	تقریباً۸/عہ
نیشکر	″	″	″	۶درہم	تقریباً۴/عہ
روئی	″	″	″	۵درہم	تقریباً۴/عہ
انگور	″	″	″	۱۰درہم	تقریباً۸/عہ
کھجور	″	″	″	۱۰درہم	تقریباً۸/عہ
تِل	″	″	″	۸درہم	تقریباً۸/عہ
ترکاری	″	″	″	۳درہم	تقریباً۱۲/عہ

اور عمدہ پیداوار اور عمدہ زمینوں کے اعتبار سے کسی کسی جگہ گیہوں پر فی جریب چار درہم (عہ/) اور جو پر ۲ درہم (۸/) لگان مقرر رہا۔ اس انتہائی نرمی اور سہولت کے باوجود فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں عراق کا خراج آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ درہم (دو کروڑ روپیہ پندرہ لاکھ روپیہ) وصول ہوا تھا۔[1]

---

(۱) حوالہ بالا، ص ۸۷ تا ۹۱

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قدیم زمینداران اور تعلقہ داران —— جنہیں فارسی زبان میں مرزبان (Land Lords) اور دہقان (Farmers) کہتے تھے —— کو ان کی اسی حالت (Status) پر ان کے تمام حقوق کے ساتھ بحال رکھا۔ افتادہ زمینیں آباد کرائیں لہٰذا دفعتاً زرعی پیداوار میں اضافہ ہو گیا۔ بندوبست جس خوبی اور خوبصورتی سے کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے ہی سال خراج کی مقدار آٹھ کروڑ ساٹھ درہم سے بڑھ کر دس کروڑ ہو گئی۔ (احمد بن ابی یعقوب واضح الخطیب یعقوبی: التاریخ، ص ۱۷٤)

عجیب بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اگرچہ نہایت نرمی سے خراج مقرر کیا تھا۔ لیکن جس قدر مالگذاری ان کے عہد میں وصول ہوئی، زمانہ مابعد میں کبھی نہیں ہوئی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: حجاج (بن یوسف) پر خدا کی لعنت ہو کم بخت کو دین کی لیاقت تھی نہ دنیا کی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق کی مالگذاری ۱۰ کروڑ ۲۸ لاکھ درہم کی۔ زیاد نے ۱۰ کروڑ ۱۵ لاکھ اور حجاج نے باوجود جبر و ظلم کے صرف ۲ کروڑ ۸ لاکھ وصول کیے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: یاقوت حموی، شہاب الدین ابوعبداللہ بغدادی: معجم البلدان، ذکر السواد)

مصر کی زمینوں پر لگان:

مصر کی حالتِ پیداوار ''نیل'' کے سبب سے چونکہ بہت عمدہ رہتی ہے اس لیے وہاں کے لگان کی شرح اس سے زیادہ مقرر کی گئی تھی مگر اس اصول کے ساتھ کہ لگان کم سے کم ہو زیادہ سے زیادہ نہ ہو اور چونکہ نیل کی طغیانی وغیر طغیانی سے سالانہ پیداوار میں فرق پڑتا تھا۔ اس لیے ہر سال جب ادائیگی قسط کا وقت آتا تھا تو مقامی زمیندار، مکھیا، کاشتکار اور ماہرین تخمینہ کو جمع کر کے سب کے مشورہ سے تخمینہ کرایا جاتا تھا اور پھر بھی اطمینان نہ ہوتا تھا تو صرف فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ وصولی کرنے والوں سے حلف اور قسمیں لیتے تھے کہ انہوں نے ایسی سختی تو نہیں کی جس میں کاشتکاروں اور لگان و مالگذاری دینے والوں پر ظلم ہوا ہو اور اس کے بعد مصر کے کاشتکاروں اور زمینداروں سے اس کی تصدیق کی جاتی تھی۔[1]

عہد فراعنہ (فرعونوں) اور رومیوں میں مصر کا نظامِ مالگذاری:

مصر میں فراعنہ کے زمانے میں مالگذاری کے حسبِ ذیل اصول مقرر تھے۔

1. خراج، نقد اور پیداوار دونوں شکل میں لیا جا سکتا ہے۔
2. چند سالوں کی پیداوار کا اوسط نکال کر اس کے لحاظ سے جمع بندی کی تشخیص کی جائے۔
3. بندوبست چار سالہ ہو۔

رومیوں نے جب مصر پر قبضہ کیا تو دو باتوں کا اور اضافہ کیا یعنی

4. خراج، مالگذاری یا لگان کے علاوہ غلہ کی ایک بہت بڑی مقدار پایۂ تخت قسطنطنیہ

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں مصر کے خراج کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھی۔ یہ مقدار بعد کے تمام مسلمان خلفاء امراء ـــــ وہ اموی ہوں یا عباسی ـــــ وصول نہ کر سکے، صرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گورنر حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار وصول کر لائے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوش ہو کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گورنر مصر تھے اور ایک کروڑ بیس لاکھ دینار وصول کر لاتے تھے سے ـــــ فرمایا: اب تو اونٹنی نے زیادہ دودھ دیا۔ تو انہوں نے برجستہ فرمایا: ہاں! مگر بچہ بھوکا رہا۔ (مقریزی: الخطط، ۱/۱۷۸)

کے لیے وصول کی جائے۔

❺ فوج کی رسد کے لیے غلہ یہیں سے لیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اصلاحات:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پانچوں اصول میں انصاف کے پیش نظر ترمیم واصلاح(۱) کی اور حسب ذیل قاعدے مقرر کر دیئے:

❶ خراج نقد و پیداوار دونوں شکلوں میں وصول ہو سکتا ہے مگر اس میں (لگان) دینے والے کی سہولت کا لحاظ ضروری ہو گا۔

❷ تشخیص کا مسطورہ بالا قاعدہ مقرر کرنا اور چند سالوں کا اوسط نکال کر جمع بندی کرنا، کاشتکاروں کی معاشرتی زندگی کے اعتبار سے سخت ظلم ہے، بلکہ تشخیص لگان زمین کی حیثیت اور پیداوار کی نوعیت کے پیشِ نظر تراضی طرفین سے ہونی چاہیے۔

❸ بندوبست کے متعلق کوئی خاص وقت مقرر کرنا نہ حکومت کو مفید ہے اور نہ رعایا کو بلکہ حسبِ موقعہ کاشتکاروں اور مالکانِ زمین کی سہولت کا لحاظ کر کے کیا جائے۔

❹،❺ لگان کے علاوہ کچھ اور وصول کرنا نہایت ظلم ہے لہذا رومیوں کے دونوں قاعدوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

حتی کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں حرمین کو جو غلہ بھیجا

---

(۱) ان ترامیم واصلاحات کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا برتاؤ نہایت حکیمانہ اور منصفانہ تھا وہ ایسے تمام امور میں ذمی رعایا ـــــ جو پارسی اور عیسائی تھے ـــــ سے ہمیشہ رائے طلب کرتے تھے اور ان کی آراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ جب آپ نے عراق کا بندوبست کرنا چاہا تو اپنے گورنروں کو لکھا کہ عراق کے دو رئیسوں (Chieftains) کو ان کے ترجمانوں کے ساتھ میرے پاس بھجوائیں۔ (ابو یوسف: کتاب الخراج، باب ما عمل بہ فی السواد، ص ۹۰)

اسی طرح مصر کی آراضی کے بندوبست کرنے لگے تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ شاہ مقوقس (Muqawqis) سے پہلے جو حاکم تھا اس کی رائے طلب کریں مگر جب تسلی نہ ہوئی تو ایک واقف کار قبطی کو مدینہ منورہ بلا کر اس کی رائے طلب کی۔ (مقریزی: الخطط، ۷۴/۱، ۷۵)

جاتا تھا اس کی قیمت حکومت پائی پائی اپنے پاس سے ادا کرتی تھی۔[۱]

خراج اور عشر کا امتیاز

اگرچہ یہاں یہ بحث خارج از مقصد ہے کہ مسلمانوں کی زمینوں پر عشر زکوٰۃ کیوں ہے اور غیر مسلموں کی زمینوں پر خراج کیوں۔ اس لیے کہ یہ بحث اسلام کے نظامِ مملکت کے تحت میں قابلِ ذکر ہے اور الفاروق حصہ دوم "ذمی رعایا کے حقوق" میں مفصل اور بہت خوبی سے علامہ شبلی[۲] مرحوم نے بیان[۳] کی ہے جو قابلِ

(۱) علامه مقريزى، تاج الدين احمد بن على: الخطط والآثار، مطبعة النيل (قاهرة)، ۱۳۳٤ھ، ۷۵/۱ تا ۷۹

(۲) شبلی، حضرت علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ ۸ مئی ۱۸۵۷ء کو بندول ضلع اعظم گڑھ بھارت میں شیخ حبیب اللہ رحمہ اللہ کے ایڈوکیٹ کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم مولانا حکیم عبداللہ رحمہ اللہ اور مولانا شکر اللہ رحمہ اللہ سے حاصل کی، تکمیل مدرسہ عربیہ اسلامیہ اعظم گڑھ سے کی۔ فقہ حنفی، منطق، ریاضی اور علم الکلام میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۷۶ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت پائی۔ ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا مگر محض ایک سال پریکٹس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بن گئے ۱۸۹۹ء میں دولتِ عثمانیہ نے "تمغہ مجید" اور ۱۸۹۴ء میں حکومت برطانیہ نے "شمس العلماء" کا خطاب دیا۔ سر سید احمد خان کی وفات کے بعد دار العلوم ندوہ کے سیکرٹری بنے ۱۹۱۳ء میں استعفیٰ دے کر دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرح ڈالی۔ آپ کے علمی و تصنیفی کارناموں میں مشہور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول، الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، سفر نامہ روم و مصر و شام، الکلام، علم الکلام اور شاعری میں "بوئے گل" اور "دستہ گل" ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں وفات پائی۔ اللہ کریم کی آپ پر کروڑوں رحمتیں نازل ہوں۔ (آمین)

(۳) علامہ شبلی رحمہ اللہ کا اس ضمن میں یہ بیان بھی قابل توجہ ہے: مسلمانوں کے ساتھ عشر کی تخصیص اگرچہ بظاہر ایک قسم کی ناانصافی یا قومی ترجیح معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے اس سلسلہ میں مسلمانوں کو کوئی رعایت نہیں دی گئی بلکہ ان سے قربانی کا مطالبہ کیا گیا ہے، کیونکہ: اولا: مسلمانوں کو بمقابلہ ذمیوں کے بہت سی زائد رقمیں ادا کرنا پڑتی تھیں مثلاً: مویشی پر زکاۃ، گھوڑوں پر زکاۃ، روپے (نقد) پر زکاۃ حالانکہ ذمی ان محصولوں سے بالکل مستثنیٰ (Exempted) تھے۔ اس بنا پر خاص زمین کے معاملہ میں جو نہایت اقل قلیل مسلمانوں کے قبضہ میں آئی تھی، اس قسم کی رعایت بالکل مقتضائے انصاف (In accordance with the Justice) تھی۔

ثانیا: عشر ایک ایسی رقم تھی (اور ہے) جو کسی حالت میں کم یا معاف نہیں ہوسکتی تھی (نہ ہوسکتی ہے یا کبھی

مراجعت ہے۔

تاہم اس قدر واضح کر دینا ضروری ہے کہ عشر، خراج کے مقابلہ میں زیادہ گراں ٹیکس ہے اور اس اعتبار سے مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلم زیادہ فائدہ میں ہیں، مثلاً:

❶ عشر پیداوار کا دسواں حصہ ایک مقرر شدہ فرض ہے جس میں کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن خراج کی گذشتہ تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ زمین کی پیداوار کا کم سے کم ٹیکس ہے اور اس کمی کے اصول کے پیشِ نظر طرفین کی رضامندی سے حادثات کی صورت میں ترمیم کی لچک بھی رکھتا ہے۔

❷ عشر سال کی مختلف فصلوں میں ہر پیداوار کے وقت لازم ہے مگر خراجِ موظف سال میں صرف ایک مرتبہ لیا جاتا ہے۔

❸ عشر، پیداوار کی حالت میں کسی صورت میں معاف نہیں ہو سکتا اور خراج خلیفۂ اسلام کی صوابدید پر معاف بھی ہو سکتا ہے۔[1]

ان مذکورہ بالا امور کے پیشِ نظر انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ عشر جو درحقیقت مذہبِ اسلام کے قانونِ زکوٰۃ کا ایک جزء ہے صرف ان ہی پر نافذ ہو جو مسلمان کہلائے جاتے ہیں لیکن جو اسلام کے عقیدہ (Creed) کو تسلیم نہیں کرتے ان پر اس قسم کی مذہبی پابندی عائد کرنا بلاشبہ ظلم ہوتا۔

ہو سکے گی) یہاں تک کہ خود خلیفہ یا بادشاہ معاف کرنا چاہے تو معاف نہیں کر سکتا تھا (نہ کر سکتا ہے، نہ کر سکے گا)

بخلاف اس کے:

❶ خراج میں تخفیف اور معافی (Reduction & Remission) جائز تھیں (اور ہیں) اور وقتاً فوقتاً اس پر عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔

❷ اس کے علاوہ خراج سال میں صرف ایک بار لیا جاتا تھا، جبکہ عشر کا یہ حال تھا کہ سال میں جتنی فصلیں ہوتی تھیں سب کی پیداوار سے الگ الگ وصول کیا جاتا تھا۔ (الفاروق، حصہ دوم، عنوان: خراجی اور عشری)

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الزیادۃ والنقصان من الخراج، ص ۱۸۳، ۱۸۷

علاوہ ازیں اگر بعض خصوصی حالات میں خراج کی مقدار عشر سے زیادہ بھی نظر آئے تو یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مسلمان عشر اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد بھی ٹیکسوں سے بری نہیں ہو سکتا اور اسلامی قانون کی رو سے حسبِ ضرورت اس کو فوجی ضروریات رفاہِ عام کی ضروریات حوادث سے پیدا شدہ ضروریات کے لیے ٹیکس ادا کرنا ضروری ہے مگر اس کے برعکس غیر مسلم جماعت جو کہ اسلام کے عقیدہ و اصول کو نہ مانتے ہوئے اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے نیچے رہنا منظور کر لیتی ہے۔ خراج اور جزیہ کے بہت ہی معمولی ٹیکس ادا کرنے کے بعد ہر قسم کے ٹیکسوں سے سبکدوش ہو جاتی ہے اور پھر تمام اقتصادی امور میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان مساوات کا اعلان ہو جاتا ہے اور اسلامی قانون کی رو سے جان، مال، آبرو اور دنیوی ترقیات میں دونوں کے درمیان فاتح و مفتوح کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

تخفیف لگان میں کاشتکار کو ترجیح:

یہ تمام حوالجات حکومت کی عائد کردہ مالگذاری (خراج) سے متعلق تھے لیکن اجارہ اور مزارعۃ کا وہ معاملہ جو کہ کاشتکار اور زمیندار کے درمیان ہے حکومت اور رعایا کے درمیان معاملات کا سا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں دونوں معاملہ دار (متعاقدین) برابر کی حیثیت میں ہیں تو ایسی حالت میں اسلام کا معاشی نظام زمیندار کو ہرگز کاشتکار پر ترجیح نہیں دیتا بلکہ اس امر کے پیشِ نظر کہ مستاجر (کاشتکار) شرکتِ کاشت میں دولت بھی خرچ کرتا ہے اور محنت بھی اور زمین دار صرف دولت (زمین) ہی سے شرکت کرتا ہے، وہ مستاجر (کاشتکار) کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتا ہے اور اسی لیے زمین کے لگان میں تخفیف کے اصول کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ علامہ سرخسی رحمہ اللہ نے مبسوط میں تصریح کی ہے کہ اگر ایک مستاجر (کاشتکار) نے زمین لگان پر لی یا بٹائی پر اور معاملہ ہو جانے کے بعد اس نے زمین کی کاشت سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں اس کام کو اس سال کرنا نہیں چاہتا تو معاملہ فسخ ہو جائے گا اور کاشت کار کو مجبور نہیں کیا جائے گا اور دلیل یہ بیان کرتے ہیں:

لأن المزارعة على قول من يجيزها اجارة.والاجارة تنقض بالعذر وهذا لان الاجارة جوزت لحاجة المستاجر ففی الزام العقد إیاه بعد ما بدا له ترك ذلك العمل اضرار به. الخ.[1]

ترجمہ: اس لیے کہ مزارعت کو جن فقہا نے جائز کہا ہے وہ اس کو اجارہ مانتے ہیں اور اجارہ عذر کی وجہ سے فسخ (Invalid) ہو جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ اجارہ کو مستاجر (کاشتکار) کی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے جائز رکھا گیا ہے پس ایسی حالت میں کہ وہ کاشت کرنا نہیں چاہتا اور اس کی رائے بدل گئی ہے اس کو معاملہ پر مجبور کرنا اس کو نقصان پہنچانا ہے۔

اور علامہ عبد الرحمٰن الجزائری نے مزارعت کے جواز و عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے اپنی جانب سے جو محاکمہ بیان فرمایا ہے وہ اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کا بہترین آئینہ دار ہے چنانچہ علامہ موصوف ارشاد فرماتے ہیں:

واذا كان الحال على ما ذكر فانه يمكننا ان نطبق راى الفريقين على ما هو واقع فی زماننا وان نختار ما هو مناسب لمصالح الناس ومنافعهم. فمن الناس من ينتهز فرصة حاجة العامل الشديدة الى العمل فلا يعطى له ارضه الا اذا غبنه غبنا فاحشا وارهقه ارهاقا شديدا. فاذا ما دفعته الحاجة الى العمل مزارعة فی تلك الارض كانت نتيجه عمله للمالك خاصة، فيستولى على غلتها فوق ما يفرضه عليه من مال وعمل. وهذا لا يجوز فی نظر الشريعة الاسلامية التی توجب مساعدة المضطر ومعونة العامل الضعيف. فلهذا ينبغی تحذير الناس من المزارعة التی يترتب عليها حرمان العامل من كده واستغلال المالك اياه لحاجته. أما إذا كانت عاطفة الخير

---

(۱) سرخسی: المبسوط، مطبوعه مطبع السعادة، قاهرة، ۱۳۳۱ھ، ۲۵/۲۳

متبادلة بين الناس وكل من الشريكين لا يريد الا ان ينتفع بما يستحقه من ارض او عمل. فلا يبغي احدهما على صاحبه. ولا يبغيه في امر ولا يخونه في عمل. وكانت المصلحة تقتضي العمل في الارض مزارعة بقسمة ما يخرج من غلتها، فانه في هذا الحالة يفتي برای من أجاز تأجير الأرض الخ.[1]

ترجمہ: اور جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ جو ابھی مذکور ہوئی تو زمانہ کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارے لیے ان دونوں راویوں کے درمیان تطبیق (Coincidence) ممکن ہے اور یہ آسان ہے کہ لوگوں کے فوائد اور منافع کے مناسب ہم ان ہر دو میں سے کسی ایک کو پسند کر لیں۔ پس بعض لوگ ایسے ہیں جو عامل (کاشتکار) کی شدید ضرورت اور حاجت کی تلاش میں اور غنیمت موقعہ کی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کاشت کار کب کاشت کے لیے مجبور ہوتا ہے، اور جب ایسی حالت میں کاشت کار ان سے معاملہ کرنے آتا ہے تو وہ اپنی زمین کو بغیر ایسی شرطوں کے نہیں دیتے کہ جس سے کاشت کار سخت نقصان میں پڑ جائے اور یہ معاملہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت بوجھ ہو جائے پھر جب وہ اپنی شدید حاجت کی وجہ سے کاشت پر مجبور ہو جاتا ہے تو اس کی محنت کا تمام ثمرہ (زمیندار) مالک زمین کو پہنچ جاتا ہے اور کاشتکار سے مال اور عمل کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا زمین کی پیداوار میں سے اس معاہدہ سے کہیں زیادہ پر اس طرح تسلط جما لیتا ہے۔ یہ طریقہ شریعت اسلامی کی نظر میں کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا کیونکہ شریعت اسلامی کو کمزور عامل کاشتکار کی مدد اور مضطر اور پریشان حال کی حمایت کو واجب قرار دیتی

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة: ج ۳ قسم المعاملات، کتاب المزارعه

ہے پس ایسی زمینداری کے متعلق جو کاشت کار کو اس کی محنت کے پھل سے محروم کرتی ہو اور ایک حاجت مند کی حاجت کو اپنی ازدیاد (Increase) دولت کا آلہ کار بناتی ہو، یہی مناسب ہے کہ لوگوں کو اس سے روک دیا جائے اور اس سے ڈرایا جائے لیکن جب لوگوں کے آپس میں نیک رجحانات ہوں اور ہر دو شریک (زمیندار و کاشتکار) میں سے ایک دوسرے کے لیے یہ ارادہ رکھتا ہو کہ زمین اور محنت کے پیشِ نظر ہر ایک اپنے اپنے حق کو ضرور پائے اور ایک دوسرے کے خلاف بدنیتی نہ رکھتا ہو اور زمیندار (لگان یا بٹائی کے معاملہ میں) بددیانتی نہ کرے اور کاشت کار عمل اور محنت میں خیانت کا مرتکب نہ ہو اور معاشی ضرورت کا تقاضا ہو کہ مزارعۃ کے معاملات رائج ہوں تو ان حالات میں جو فقہا اس کے جواز کے قائل ہوں ان کے فتوے پر اجازت دے دی ہے۔

خلاصہ:

اس مہتم بالشان عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کی نظر میں زمینداری و کاشت کاری باہمی تعاون و اشتراک اور امداد باہمی کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ اور اس میں بھی ہر دو شرکاء میں سے اس کی زیادہ رعایت کی جائے گی جو صاحبِ حاجت ہو اور محنت سے معاش کمانے پر مجبور ہے اور اس معاملۂ خاص میں جبکہ سو فیصدی یہ بات کاشت کار پر صادق آتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کے ساتھ زیادہ رفق و نرمی کا معاملہ کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ محنت اور زمین کی حیثیت کو سامنے رکھ کر تخفیفِ لگان ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ نیز یہ کہ ہر دو فریق کو اپنے مفوضہ (Assigned) فرائض دیانت داری سے انجام دینے چاہئیں اور اگر عام حالات اس قسم کے باقی نہ رہیں اور زمینداروں کی جانب سے محنت کش طبقہ کی شدید حاجت اور اضطراری کیفیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا جذبہ نمایاں نظر آنے لگے تو امام (خلیفہ) کو حق ہے کہ وہ اس قسم کے عقد و معاملہ کو حکماً روک دے اور اس سسٹم کو

بند کر دے۔

بہرحال یہاں تو صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ اسلام کا معاشی نقطۂ نظر زمینداری اور کاشتکاری میں عامل (کاشتکار) کی محنت اور عمل کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ لگان اور مالگذاری میں رفق و نرمی یا بالفاظ دیگر تخفیفِ لگان کا لحاظ رکھا جائے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [۱] نے اسلام کے اس نظریہ کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب کسی قومی تمدن میں بے جا عیش کوشی، مسرفانہ تعیش اور مذموم سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے معیشت کے بنیادی وسائل پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں، اور گراں بار مال گذاری اور لگان عائد کر دیئے جاتے ہیں تاکہ اس طرح جلبِ زر (Money Making) کی صورت پیدا ہو اور اس طرح تمدن کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

وجر ذلك الى التضيق على القائمين بالاكساب الضرورية كالزارع والتّجار والصناع وتضاعف الضرائب عليهم الخ.[۲]

ترجمہ: اور یہ بے جا تعیش ان پیشہ وروں کی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے جو ضروری معاشی اعمال (Economic Activities) میں مشغول ہیں یعنی زراعت پیشہ، تجارت پیشہ اور صنعت پیشہ اور ان پر بھاری ٹیکس (اور گراں بار لگان و مالگذاری کا) سبب بنتا ہے۔

کاشتکاروں کے لیے خصوصی حقوق و مراعات:

(الف) ضرورت کیوں؟

اسلام کے معاشی نظام میں یہ مسئلہ عنوان سے کہیں نظر نہیں آتا اس لیے کہ

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ: حجة الله البالغه، ابواب ابتغاء الرزق، ۱۰۷/۲

اس نے اس سلسلہ میں ایسے صاف اور واضح اصول بیان کر دیئے ہیں کہ جن کے تحقق (Fulfillment) کے بعد اس عنوان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یعنی جو افراد مملکت زمینوں کے مالک ہیں، ان کے لیے تو تخفیف لگان کے علاوہ زمین سے متعلق کسی رعایت اور حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ خود مالک زمین ہیں اور اس کے تصرف میں مرضی کے مختار اور جو افراد زمین کو اجارہ پر لیتے ہیں اور زمین کے مالک نہیں ہیں تو فقہ اسلامی ان کے لیے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس خاص حالت میں دو چیزیں قابل توجہ ہیں۔ ایک زمین اور دوسری اس سے استفادہ اور انتفاع۔ پس مالکِ زمین کا حق تو صرف یہ محفوظ رہنا چاہیے تاکہ اس کی زمین کی ملکیت برقرار رہے اور یہ کہ اس کو خراب اور برباد نہ کیا جائے اور مستاجر (کاشتکار) کا حق یہ محفوظ رہنا چاہیے کہ زمین سے انتفاع (Benefiting) اور استفادہ (Utilization) کی باہمی طے شدہ تمام صورتوں میں وہ قطعاً آزاد ہو اور یہ کہ عدل و انصاف کے ساتھ باہمی طے شدہ لگان یا بٹائی کے علاوہ اور کسی قسم کا بار اس پر نہ ڈالا جائے چہ جائکہ وہ مستاجر کی حیثیت میں محکوم، غلام یا رعایا سمجھا جائے۔ نیز اس کے عقد و معاملہ (Contract & Undertaking) میں زمیندار کے مقابلہ میں اجیر اور کاشتکار کی مصالح و مراعات (Welfares & Considrations) مقدم رکھی جائیں۔

پس اگر دنیا میں اراضی کی کاشت کے سلسلہ میں ان ہر دو اصول کا لحاظ رکھا جاتا تو اس نئے عنوان کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اسلام سے قبل بھی اور اسلام کی صحیح حکومت (خلافت راشدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بعد بھی یہ ہوتا رہا ہے کہ کاشت کار اپنی حاجت اور ضرورتِ معیشت کی وجہ سے ہمیشہ زمیندار کے مظالم کا شکار بنتا اور اپنی زندگی کو اس کے رحم و کرم پر گزارتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ عنوان بالا کے تحت میں چند ایسے احکام و جزئیات کو نقل کر دیا جائے جس سے قدیم اور جدید مظالم متعلقہ کاشت کار کا سدباب ہو سکے اور یہ روشن ہو جائے کہ اس بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے اور اس نے اس ضعیف اور مظلوم جماعت پر

عائد شدہ بوجھ کو کس طرح ہلکا کیا۔

(ب) قبل از اسلام کمزور کاشتکار پر مظالم:

اسلام سے قبل عرب سے متصل دو حکومتیں بہت بڑی شہنشائیت (Imperialism) کی مالک تھیں: ایک ایران کی اور دوسری روم کی، ایرانی مجوسی مذہب کا پیرو تھا اور روم عیسائیت کا مقلد، مگر دونوں حکومتوں کا تمدن ایسے فاسد نظام اور ظالمانہ استبدادیت (Wicked Tyranny) کا حامل تھا جس کی مختصر کہانی شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی زبانی گذشتہ اوراق میں سنائی جا چکی ہے یعنی بادشاہ، امراء ارکان دولت اور تعلقہ داروں کے مسرفانہ تعیش اور معاشی دستبرد نے رعایا کو اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ کاشت کار، مزدور صناع اور تجار، ٹیکس، لگان اور مالگذاری کی گراں باریوں کے علاوہ عموماً نت نئے مظالم کا شکار ہوتے رہتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اونچے طبقہ کے ان سرمایہ داروں نے پیشہ ور طبقوں کو عموماً اور کاشتکاروں کو خصوصاً اپنا غلام اور محکوم بنالیا تھا اور ان پر اپنی تمام عیاشیوں کا بوجھ ڈال کر ان کو اس قدر محتاج اور ضعیف المعیشت (Economically Weak) بلکہ محروم المعیشت (Economically Deprived) بنا دیا تھا کہ مجبور ہو کر انہوں نے اس غلامانہ اور محکومانہ زندگی ہی پر قناعت کر لی تھی اور اس کو تعلقہ داروں اور جاگیر داروں کی زبان میں ''تراضی'' (Mutual Consent) اور ''رضا'' (Will) کہا جاتا تھا، یعنی محکوم رعایا اور غلام کاشت کار ان ظالمانہ شرائط کو برضاء و رغبت تسلیم کرتے ہیں اور اس لیے یہ ظلم نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کی طرف سے رحیمانہ مراعات اور اصلاحات کا پروگرام:

اسلام نے جب مدینہ منورہ میں پہنچ کر ''خلافتِ حقہ'' کا اعلان کیا اور آہستہ آہستہ یہ تمام ممالک اس کے زیر نگیں آگئے تو حکومت کے مختلف شعبوں کے انقلابی اور اصلاحی پروگرام میں اس اصلاح کو بھی شامل کر لیا اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ ہی میں عراق، مصر اور شام وغیرہ

ممالک میں اس طبقاتی ظلم کا خاتمہ کر کے عدل وانصاف کا علم بلند کیا۔

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ان تمام مظالم اور ان کی اصلاحات کو ترتیب وار بیان کر کے عنوان بالا کی حقیقت کو واشگاف کر دیا جائے تاکہ حق وباطل کا موازنہ ہو سکے اور دورِ حاضر کے تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو بھی اس آئینہ میں اپنے قیصرانہ (Caesarish) اور کسرویانہ (Kisraish) مظالم کا چہرہ دیکھنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے کا موقعہ میسر آسکے۔

وصولی مالگذاری اور لگان کے طریقوں کا خاتمہ:

ایرانی اور رومی حکومت کا ایک طریہ یہ تھا کہ وہ کاشت کاروں کو اپنا محکوم اور غلام سمجھ کر مالگذاری اور لگان کے وصول کرنے میں وحشیانہ سختیاں کرتے تھے اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھتے تھے اور حاکموں کے اس رویہ کو دیکھ کر تعلقہ دار اور جاگیردار اور بڑے بڑے زمیندار بھی یہی عمل کرتے اور بجائے عدالت میں نالش (Litegation) کے ذریعہ حق خواہی کے خود ہی زد و کوب کر کے لگان اور مالگذاری وصول کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اس جابرانہ رسم کا انسداد کیا۔ قانون کے ذریعے اس کا خاتمہ کیا، اور اس سلسلہ میں ہر قسم کے جبر وتشدد کو حرام قرار دیا، اور نہ صرف یہ بلکہ اس قسم کے جبر وتشدد کے خلاف آخرت کے عذاب کی وعیدیں سنا کر اخلاقاً بھی اس کا استیصال ضروری سمجھا اور اگر ایرانیوں کی تقلید میں کبھی کسی عامل نے اس قبیح رسم کا اعادہ کیا تو خلیفہ اسلام نے ایسے عامل کو یا معزول کر دیا اور یا سرزنش (Taunt) کے ذریعہ اس کا انسداد کر دیا حتیٰ کہ یہ صاف وصریح حکم دیا کہ اگر اہل خراج معاشی مجبوریوں کی وجہ سے وقت پر خراج (لگان) ادا نہ کر سکیں تو ان کو مہلت دو تاآنکہ بسہولت ادا کرنے پر قادر ہو جائیں چنانچہ حسب ذیل احکام ونظائر اس کی روشن دلیل ہیں۔

❶ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کے ملک سے واپس آرہے تھے راہ میں دیکھا کہ کچھ آدمی دھوپ میں کھڑے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دریافتِ حال

پر معلوم ہوا کہ جزیہ نہ ادا کرنے پر سزا دی جارہی ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادا نہ کرنے کی وجہ دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ اس وقت وہ ادا کرنے سے معذور ہیں، آپ نے عاملوں کو بہت سختی کے ساتھ اس ظالمانہ روش پر باز پرس کی اور فرمایا:

دعوهم، لا تكلفوهم مالا يطيقون قال: سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: لا تعذّبوا الناس. فان الذين يعذّبون الناس فى الدنيا يعذّبهم اللّٰه يوم القيمة. وأمر بهم فخلى سبيلهم.[1]

ترجمہ: ان کو چھوڑ دو اور ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف نہ دو اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے: لوگوں کو عذاب میں نہ ڈالو اس لیے کہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب میں مبتلا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن عذاب میں مبتلا کرے گا۔ پھر آمرانہ حکم دے کر ان کو اس سے نجات دلائی۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ وصیت مشہور ہے:

❷ أوصي الخليفة من بعدي بأهل الذمة خيرا، أن يوفى لهم بعهدهم، وأن يقاتل من ورائهم، ولا يكلفوا فوق طاقتهم.[2]

ترجمہ: میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے۔ ان کے عہد کو پورا کرے، ان کی حفاظت میں ان کے دشمن سے جنگ کرے اور (اداءِ خراج) میں ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالے۔

---

(۱) ابو يوسف: كتاب الخراج، باب فيمن تجب عليه الجزية، ص ۲۵۸. ابو عبيد: كتاب الاموال، مطبوعه مصر، ۱۳۵۲ھ، ص ۴۳

(۲) ابو يوسف: حواله بالا، ص ۲۵۸، ۲۵۹. ابوعبيد: حواله بالا، ص ٤٤

❸عن عبدالرحمٰن بن جبير بن نفير عن أبيه: أن عمر بن الخطاب رضى الله عنه اتى بمال كثير: قال ابو عبيد: احسبه قال من الجزية. فقال: انى لأظنكم أهلكتم الناس؟ قالوا: لا والله ما اخذنا إلا عفوا صفوا قال: بلا سوط ولا نوط؟ قالوا: نعم قال: الحمد لله الذى لم يجعل ذالك على يدى ولا فى سلطانى.[1]

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بہت سا مال پیش کیا گیا۔ ابو عبید (قاسم بن سلام رحمہ اللہ) کہتے ہیں: میرے خیال میں جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گمان کیا کہ یہ مال جزیہ کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر کے یہ جمع کیا ہے؟ عاملوں نے کہا: بخدا ایسا نہیں ہوا۔ ہم نے ان کی حاجات سے. فاضل مال میں سے راضی خوشی سے وصول کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: بغیر مار پیٹ اور باندھ کر لٹکانے جیسی تکالیف کے؟ سب نے عرض کیا: بے شک بغیر ایذا دیئے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس خدا کا بے غایت شکر ہے جس نے میرے ہاتھ پر ایسے کام نہیں کرائے

---

(۱) ابو عبيد: كتاب الاموال (۱۳۵۲ھ)، ص ٤٤

(۲) حضرت عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر ابو عبس انصاری اوسی بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل میں شامل تھے۔ تمام غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ان فضیلت مآب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں شامل تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ شرف اسلام کے بعد بنی حارثہ کے بتوں کو توڑنے کا شرف بھی آپ نے پایا۔ آپ نے ۳۴ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں وفات پائی۔ (مظاہر حق کا ذیل اسماء الرجال میں تذکرہ عبدالرحمٰن بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اور نہ میرے زمانہ خلافت میں اس قسم کے مظالم ہو سکے۔

ایک مرتبہ سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۱] والی شام نے خراج بھیجنے میں دیر کی، جب وہ دربارِ خلافت میں آئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سخت باز پرس کی۔ سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: آپ نے دو حکم دیئے تھے، میں ان دونوں پر عامل ہوں: ایک یہ کہ کاشتکاروں پر فی جریب چار دینار سے زیادہ لگان نہ لگاؤں اور دوسرے یہ کہ اداءِ لگان میں نرمی سے کام لوں، سو میں اس وقت تک لگان نہیں لیتا جب تک ان کو خوب آمدنی نہیں ہو جاتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرط وجد میں آکر فرمایا: یہی چاہیے اب میں تجھ کو کبھی معزول نہیں کروں گا۔

قال: أمرتنا أن لا نزيد الفلاحين على أربعة دنانير، فلسنا نزيدهم على ذالك. ولكنا نؤخّرهم الى غلاتهم. فقال عمر رضي اللّٰه عنه: لا معزلتك ما حييت. [۲]

ترجمہ: سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا آپ نے ہم کو حکم دے رکھا ہے کہ کاشتکاروں پر چار دینار سے زیادہ لگان نہ لگائیں۔ سو ہم اس کے پوری طرح پابند ہیں اور ہم ان سے وصولی میں ان کی آمدنی آنے تک تاخیر

---

(۱) حضرت سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جلیل القدر لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ انتظامی امور کے ماہر تھے نہایت ذہین اور حاضر جواب تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو شام ایسے اہم صوبہ کا گورنر بنایا تھا۔

(۲) حوالہ بالا: ص ٢٤ امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تصنیف "کتاب الاموال" میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے گورنر شام حضرت سعید بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ پورا مکالمہ نقل کیا ہے۔ مگر جو ضروری حصہ حضرت مؤلف رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کا خلیفہ (حاکم) اس کمزور طبقہ —— کسانوں، کاشتکاروں کے لیے کتنا مشفق اور نرم خو ہونا چاہیے کہ وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو ابھی ذرا پہلے حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کر رہے تھے کہ انہوں نے وصولی و ترسیل خراج میں تاخیر کیوں کی؟ جب معلوم ہوا کہ وجہِ تاخیر غریب کاشتکاروں کی رعایت اور سہولت کے لیے تھی تو اب خوش ہو کر وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنی عمر بھر کے لیے گورنری کا پروانہ دے رہے ہیں۔

کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں تجھ کو زندگی بھر معزول نہیں کروں گا۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ [1] نے عبد الحمید والیٔ کوفہ کو ایک مفصل والانامہ تحریر فرمایا تھا، جس میں درج تھا:

ولا من العامر إلا وظيفة الخراج فى رفق وتسكين لأهل الارض الخ [2]

ترجمہ: اور آباد زمینوں پر مقررہ خراج سے ہرگز زیادہ نہ لو اور جو بھی وصول کرو اہل زمین سے نرمی اور دلجوئی کے ساتھ وصول کرو۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا تبصرہ:

اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ ان ہی روایات کے پیشِ نظر ارشاد فرماتے ہیں:

❶ ولا يُضْرَبَنَّ رجل فى دراهم خراج، ولا يقام على رجله. فأنه قد بلغنى أنهم يقيمون أهل الخراج فى الشمس ويضربونهم الضرب الشديد، ويعلّقون عليهم الجرار، ويقيدونهم بما يمنعهم من الصلوة. وهذا عظيم عندالله شنيع فى الاسلام. [3]

ترجمہ: اے ہارون! کسی شخص کو بھی لگان (خراج) کے سلسلہ میں زدو کوب نہ کیا جائے اور نہ ایک پیر پر کھڑا رکھا جائے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ بعض وصول کنندہ اس قسم کی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں کہ اہل خراج کو دھوپ میں کھڑا کرتے ہیں ان کو

(۱) حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا تذکرہ باب ۴ میں درج ہے۔

(۲) حوالہ بالا: ص ٤٦. ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الزیادۃ والنقصان من الخراج، ص ١٨٦

(۳) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی تقبیل السواد واختیار الولاۃ لهم والتقدم الیهم، ص ٢٣١

سخت مار پیٹ کرتے ہیں، ان کی گردنوں میں گھڑے لٹکاتے ہیں اور ان کو قید کر دیتے ہیں کہ وہ نماز بھی نہ پڑھ سکیں، حالانکہ یہ تمام باتیں اللہ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہیں اور اسلام ان حرکتوں کو بدترین سمجھتا ہے۔

اور آگے ارشاد فرماتے ہیں:

❷ ان العدل وانصاف المظلوم وتجنب الظلم، مع ما فی ذلك من الاجر، یزید به الخراج، وتكثر به عمادة البلاد، والبركة مع العدل تكون. وهی تفقد مع الجور. والخراج الماخوذ مع الجور تنقص البلاد به وتخرب.[1]

ترجمہ: واضح رہے کہ عدل، مظلوم کے ساتھ انصاف اور ظلم سے پرہیز ان باتوں میں جو کچھ اجر و ثواب ہے وہ تو ظاہر ہے اس کے علاوہ فائدہ یہ ہے کہ اس سے خراج بڑھتا ہے اور اس سے شہروں کی آبادی بڑھتی ہے، اور انصاف سے برکت میں اضافہ ہوتا ہے اور ظلم سے برکت مٹ جاتی ہے۔ اور جو لگان (خراج) ظلم سے حاصل ہوتا ہے اس سے شہر اجڑ جاتے ہیں اور ملکوں میں تباہی اور خرابی آجاتی ہے۔

خراج کی وصول یابی میں سہولت و نرمی اور عدم ادائیگی کی صحیح اور واقعی مجبوریوں کی رعایت کے جو اصول مسطورہ بالا حوالجات میں نظر آتے ہیں یہ ان کاشتکاروں کے لیے ہیں جو کاشتکار ہونے کے علاوہ حکومت کی رعایا بھی ہیں لہذا جو کاشتکار معاملۂ

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۲۳۵

حوالہ بالا عبارت موکف رحمہ اللہ نے "کتاب الخراج" سے جس ایڈیشن سے نقل کی ہے، وہ مجھے مل نہ سکا میرے پاس پروفیسر محمد ابراہیم البنا، كلية اللغة العربية، جامعۃ الأزہر کا تحقیق کردہ نسخہ ہے جس سے اوپر حوالہ جات درج کیے گئے ہیں، اس میں عبارت کا آخری حصہ اس طرح ہے: "والخراج بالجور ينقص، والبلادِ به تخرب" (ترجمہ: جو خراج ظلماً وصول کیا جاتا ہے، وہ (نتیجۃً) گھٹتا ہے، اور (اس طریقۂ وصولی) سے شہر (اور ممالک) برباد ہو جاتے ہیں) یہ عبارت سیاق و سباق کے اعتبار سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم)

کاشت میں زمیندار کے لیے صرف شریکِ عمل کی حیثیت میں ہیں، ان کے لیے کس طرح اسلام یہ روا رکھ سکتا ہے کہ زمیندار کاشتکار پر تشدد اور جبر و ظلم روا رکھے اور عملاً اس کو اپنا غلام بنا لے۔

لگان کے علاوہ ظالمانہ وصولیوں کا خاتمہ:

شہنشاہیت پسند (Imperialists) قدیم و جدید حکومتوں میں یہ عام رواج رہا ہے کہ حکومت، عمالِ حکومت، تعلقہ دار (Empire Owner)، جاگیر دار اور بڑے بڑے زمیندار لگان اور مالگذاری کے علاوہ رواج اور رسوم کے نام سے مزید رقم وصول کرتے تھے اور اس کو اس لگان سے زیادہ اہم اور اپنا واجبی حق تصور کرتے اور اس طرح اصحاب زراعت کو تباہ کرتے تھے۔ دورِ جدید میں اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو برٹش شہنشاہیت کے زمانے میں ہندوستان کے تعلقہ داری اور زمینداری سسٹم میں تعلقہ دار، زمیندار اور ان کے کارندوں اور ضلعداروں کے عمل میں یہ سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام نے اس کو بھی ''ظلم'' قرار دیا ہے اور اعمالِ حکومت کے لیے اس کو سخت جرم مقرر کیا ہے اور اجارۂ زمین پر بحث کرتے ہوئے باب الاجارہ (Rent) میں اس قانونی دفعہ کو بنیادی دفعہ رکھا ہے کہ اجرتِ زمین (لگان) میں جس نقد یا جس اشیاء معلوم کو طرفین کے درمیان جزوِ معاملہ بنایا گیا ہے اس کے علاوہ کاشتکار سے مستاجر ہونے کی حیثیت سے کچھ وصول کرنا ناجائز ہے اور رواج و رسوم کو معاملہ کا جزء یا شرط بنانا فاسد ہے اور ایسی شرائط ناقابلِ قبول ہیں۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ولا یؤخذ منهم ما قد یسمونه رواجا لدراهم یؤدونها فی الخراج، فإنه قد بلغنی ان الرجل منهم یأتی بالدراهم لیؤدیها فی خراجه، فتقتطع منها طائفة ویقال: هذا رواجها

وصروفها.[۱]

ترجمہ: اور اہل خراج سے وہ رقم ہرگز نہ لی جائے جو خراج کی رقم کے علاوہ "رواج" کے نام سے لی جاتی ہے مجھے یہ معلوم ہوا کہ جب کاشتکاروں میں سے کوئی خراج (لگان) کی رقم لاتا ہے تو عامل اس سے کچھ سکے نکال کر کہتا ہے کہ تو یہ "رواج اور رسوم" کی رقم ہوئی (اور اصل خراج میں اسی قدر اور باقی ہے)۔

اور اجارہ فاسد (Invalid Lease) اور مزارعۃ فاسدۃ (Invalid Share - Cropping) کے مباحث میں کتب فقہ میں یہ قانونی دفعہ مذکور ہے:

لأنها كالبيع. تفسد بالشروط الفاسدة. فكل ما أفسد البيع أفسدها. الخ[۲]

ترجمہ: اس لیے کہ اجارہ، بیع کی طرح کا معاملہ ہے جو فاسد شرطوں کے ساتھ فاسد (Invalid) ہو جاتا ہے۔ پس جو شرط بیع کو فاسد بنا دیتی ہے وہی اجارہ کو بھی فاسد کر دیتی ہے۔

أو شرط فيه شرط لا يقتضيه العقد.

ترجمہ: یا ایسی شرط اس میں رکھ دی کہ جو عقدِ اجارہ کی مقتضیات (Exegency) میں سے نہیں ہے وہ بھی مؤجب فساد ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہارون الرشید[۳] کو خراج سے متعلق احکام بتاتے

(۱) حوالہ بالا: ص ۲۳۱

(۲) سرخسي: المبسوط، ج ۲۳، باب المزارعة —— ابن نجيم، زين العابدين: بحر الرائق، ج ۲، باب الاجارة الفاسدة، ص ۳۲۹. سعيديات، نصف ثاني، ابواب معاملات، ص ۱۵٤

(۳) ہارون الرشید بن مہدی خلیفہ عباسی ۱۴۸ھ (مطابق ۷۶۴ء) میں پیدا ہوئے۔ اپنے بھائی ہادی کی وفات کے بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۷۰ھ (بمطابق ۷۸۶ء) تخت خلافت پر متمکن ہوئے۔ (۱۹۳ھ مطابق ۸۰۹ء) تک خلیفہ رہے۔ آپ کا اقتدار سواحل بحر ابیض متوسط (Mediterranean Sea) سے ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ آپ کی درخواست پر امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے "کتاب الخراج" لکھی جو اسلام کے نظام مالیات پر سند کا درجہ

ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض تحصیلدار یہ غضب کرتے ہیں کہ اپنے ماتحتوں کو جب وصول خراج کے لیے بھیجتے ہیں تو ان کی اجرت مقرر کر دیتے ہیں اور اس کو اہل خراج سے وصول کرتے ہیں اور بعض مرتبہ یہ رقم اصل لگان سے بھی بڑھ جاتی ہے یہ سب ظلم اور سخت گناہ ہے۔ امیر المؤمنین کے لیے واجب ہے کہ اس قسم کے تمام امور کا قلع قمع کر دے۔ فرماتے ہیں:

بلغني أنه ربما وظف له اكثر مما يطالب به الرجل من الخراج، فاذا اتاه ذلك الموجه إليه قال له: اعطني جعلي الذي جعله لي الوالي، فان جعلي كذا وكذا. فان لم يعطه ضربه وعسفه، وساق الغنم والبقر، ومن امكنه من ضعفاء المزارعين، حتى يأخذ ذلك منهم ظلما وعدوانا. وهذا كله ضرر على أهل الخراج ونقص للفئ مع ما فيه من الاثم [1]

ترجمہ: مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ اکثر (اوقات) اس (حوالدار) کا مطالبہ اجرت خراج کی اصل رقم سے بڑھ جاتا ہے اور جب یہ (حوالدار) کاشت کاروں میں پہنچتا ہے تو کہتا ہے: خراج کے علاوہ یہ مزدوری اور میرا حق ہے۔ پس اگر انہوں نے اس کا مطالبہ نہ دیا تو ان کو مارتا ہے اور ظلم و جبر کرتا ہے، غریب کاشتکاروں کی گائے بیل اور بکریوں کے ریوڑ اور جو بھی ہاتھ لگتا ہے ہنکالاتا ہے اور قبضہ میں کر لیتا ہے، اور یہ سب ظلم و جور سے ان سے وصول کرتا ہے۔ تو واضح رہے کہ یہ اہل خراج (لگان) کے لیے سخت مضرت کا باعث ہے اور نتیجہ میں حکومت کی آمدنی کو بھی گھٹاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں

رکھتی ہے۔ آپ نے ۳ جمادی الآخر ۱۹۳ھ (مطابق ۸۰۹ء) طوس کے مقام پر وفات پائی آپ کا دور خاندان عباسی کا دور عروج تھا ایک دن کہیں سفر میں تھے کہ بادل کے گرجنے کی آواز سنی، کہا: تو گرج لے جہاں بھی برسے گا، میری سلطنت میں ہی برسے گا۔

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب في تقبيل السواد الخ، ص ۲۲۹

یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

ظالمانہ بیگار کا خاتمہ:

ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ حکومت تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں سے بیگار (Labour Without Wage) لیتی تھی یعنی جو کام لیتی تھی اس کا معاوضہ نہیں دیتی تھی اور تعلقہ دار، زمیندار اپنی جان بچا کر کاشت کاروں کو سامنے کر دیتے تھے اور وہی ظلم کا شکار بنتے تھے اور اس پر بس نہیں کرتے بلکہ گھریلو زندگی کی ضروریات میں خود بھی ان سے بیگار لیتے تھے چنانچہ بیگار کا یہ سسٹم شاہنشاہیت پسند حکومتوں میں اب بھی کسی نہ کسی صورت سے رائج ہے اور نہ صرف کاشت کار بلکہ غریب طبقہ عام طریقہ سے اس کا شکار نظر آتا ہے۔

اسلام نے اس ظالمانہ روش کو بھی مٹا ڈالا اور حکومت اور صاحبِ زمین کے لیے یہ حرام قرار دیا کہ وہ کسی کاشتکار یا مزدور سے بغیر مقررہ اجرت اور باہمی رضا مندی کے مفت جبریہ کوئی خدمت لے۔ اور ایک مفلس غریب اور معاشی مضطر کی رضامندی حقیقی معنی میں رضا کب کہلائی جا سکتی ہے؟ اس کے متعلق اسلامی نظریہ شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء کی نقول سے گذشتہ اوراق میں بیان ہو چکا ہے۔

محلی ابن حزم رحمہ اللہ میں تصریح ہے کہ مزارعۃ میں کاشتکار سے زمین معلوم کی کاشت سے متعلق کاموں کے علاوہ اور کوئی خدمت لینا قطعاً ناجائز ہے مثلاً مکان بنوانا، یا مکان کی تعمیر کرانا، یا مکان کی صفائی کرانا یا مرمت کرانا یا باغ کی دیوار بنانا یا اسی قسم کے اور کام لینا وغیرہ اور اس قسم کے امور کو شرائطِ مزارعۃ میں کاشتکار سے معاملہ مزارعۃ کو بھی فاسد کرتا ہے اس لیے کہ عامل (کاشتکار) کے ذمہ صرف وہی امور ہیں جو اجرت پر لی ہوئی زمین کی کاشت سے متعلق ہیں۔

لأن السنة أنما وردت بأن الشرط عليهم أن يعتملوها بأموالهم وبأنفسهم فقط الخ[1]

---

(۱) ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ: المحلی، ۸/۲۳۴. البحر الرائق: ۷/۳۳۹، ۳۴۰

ترجمہ: اس لیے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف یہ نکلتا ہے کہ کاشت کار کے ذمہ ایک ہی شرط ہے کہ وہ اجارہ پر لی ہوئی زمین کو اپنے مال اور محنت کے ذریعہ بوئے اور جوتے (تاکہ پیداوار حاصل ہو)۔

اس خاص قانونی دفعہ کے علاوہ اسلام نے اس سلسلہ میں کہ "بیگار" بدترین ظلم ہے ایک بنیادی اعلان بھی کیا ہے تاکہ نہ صرف کاشتکاروں سے بلکہ کسی بھی آدمی سے بہ جبر بلا معاوضہ یا اس کی محنت سے کم دے کر کام لینے کا کلیۃً انسداد ہو جائے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: قال اللّٰه تعالىٰ: ثلاثة انا خصمهم يوم القيمة: رجل أعطى لى ثم عذر، ورجل باع حرا فأكل ثمنه، ورجل أستاجر أجيرا فاستوفى منه ولم يعطه أجره.[1]

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کریم کا ارشاد نقل کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تین قسم کے آدمی ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا، ایک وہ شخص کہ جس نے مجھ کو اپنا عہد دیا اور پھر غداری کی اور ایک وہ شخص جس نے آزاد کو غلام بنا کر فروخت کیا اور اس کا ثمن (عوض) کھایا اور ایک وہ انسان جس نے کسی شخص سے اجرت پر کام لیا اور کام پورا کرا لیا مگر اس کی واجبی اجرت نہ دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ کی رائے:

حافظ ابن حجر عسقلانی[2] اور شیخ بدرالدین عینی رحمہما اللہ جیسے جلیل القدر

---

(۱) صحيح الامام البخاري: ج ۲، باب الاجاره، كتاب البيوع، باب من باع حرا —— باب أثم من منع أجر الأجير.

(۲) ابن حجر عسقلانی، حافظ ابوالفضل احمد بن حجر عسقلانی شافعی رحمہ اللہ (۷۷۳ھ/۸۵۲ھ) فقیہ، محدث اور =

محدثین اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ''رَجَلُ اسۡتَاجَرَ'' سے آخر جملہ حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ کسی شخص سے کام لے کر اس کی اجرت نہ دینا اس قدر شدید گناہ اس لیے ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے گویا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے گویا ایک آزاد شخص کو غلام بنا لیا اور آزاد کو غلام بنانا جس قدر شدید گناہ ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ اور ارشاد فرماتے ہیں:

هو فى معنى من باع حراً وأكل ثمنه لأنه أستوفى منفعته بغير عوض وكأنّه أكلها. ولأنّه أستخدمه بغير أجرة وكأنّه أستعبده الخ.[1]

ترجمہ: کسی سے خدمت اور کام لے کر اس کی واجبی اجرت نہ دینا اس معنی میں ہے کہ کسی آزاد شخص کو فروخت کر کے اس سے معیشت پیدا کرنا۔ اس لیے کہ جب اس نے بغیر عوض کے اپنی منفعت کو پورا کر لیا تو گویا اس شخص کی ذات کو فروخت کر کے اس کو روزی بنا لیا اور اس لیے بغیر اجرت دیئے خدمت لے لینا گویا اس کو اپنا غلام سمجھ لینا ہے۔

(علامہ بدرالدین رحمہ اللہ مذکورہ بالا ارشاد نبوی کے آخری حصہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:)

واما الثالث: فهو داخل فى بيع حر لأنّه أستخدمه بغير عوض وهذا عين الظلم. الخ.[2]

ترجمہ: لیکن حدیث کے تیسرے جملہ کی شرح یہ ہے کہ وہ اسی قسم میں داخل ہے کہ جس میں آزاد شخص کو فروخت کرنے کی حرمت کا ذکر ہے

متکلم تھے، آپ کی کتاب ''فتح الباری شرح صحیح البخاری'' نے شہرت دوام پائی۔

(۱) ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ: فتح الباری، مطبوعہ قاهره، ج ٤ باب الاجاره، ص ۲۳۱

(۲) عینی، بدرالدین: عمدة القاری (شرح صحيح بخاري) مطبع منيرية، قاهرة، ۱۳٤۸ھ، ۵۹۱/۵

اس لیے کہ بغیر معاوضہ ادا کیے کسی شخص سے خدمت لینا سراسر ظلم ہے۔

اسی طرح یہ فرمان رسالت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اعطوا الأجیر أجرہ قبل أن یجفّ عرقہ۔[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مزدور کی اجرت اس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

اب ان حوالجات سے آپ یہ بھی اندازہ لگائیے کہ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن قائم رکھنے میں کس درجہ دقت نظر سے کام لیتا ہے۔

تاوان یا بھینٹ کا انسداد:

ایران اور روم کی حکومتوں میں ایک یہ بھی طریقہ رائج تھا کہ اپنے تہواروں میں شادی اور غمی کی رسوم میں اور مکان کو خام سے پختہ بنانے وغیرہ امور میں کاشت کاروں سے بھینٹ (Sacrifice) لیتے تھے اور اکثر بھینٹ کا یہ تاوان (Ransom) لگان کے مساوی یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتا تھا مگر اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے اس ظلم کو بہرحال برداشت کرتے تھے یا بہ جبر ان کو برداشت کرایا جاتا تھا، اس زمانہ میں بھی اگر اس کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں میں شادی کے وقت "شادیانہ" ہاتھی اور موٹر کاروں کی خرید کے وقت "ہاتھیانہ" اور "موٹرانہ" اور تہواروں کی بھینٹ کے نام سے اب بھی یہ مظالم علی رؤس الاشہاد (بالکل صاف) نظر آئیں گے۔

اسلام کے معاشی نظام کی وہ دفعات پڑھ لینے کے بعد جو زمین کی کاشت سے متعلق "اجارہ اور مزارعۃ کے احکام" نمبر ۳ میں نقل کیے گئے ہیں خود یہ اندازہ ہو

---

(۱) ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید: السنن، ج ۲، باب اجر الاجراء، عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

جاتا ہے کہ اسلام اس قسم کے ظالمانہ رسم و رواج کو جائز نہیں سمجھتا اور ظلم تصور کرتا ہے نیز اس کے ظلم ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ کاشتکاروں سے اس قسم کی مالی بھینٹ بغیر کسی معاوضہ اور بدل کے لی جاتی ہے، یعنی اس کے مقابلہ میں کاشتکار کو لگان میں سے اسی قدر کمی یا معافی نہیں دی جاتی یا اضافہ لگان کے بغیر زمین میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ اور اسلامی قانون اس قسم کے معاملہ کو جبر قرار دیتا ہے اور حرام بتاتا ہے، اور کاشت کار کی مجبورانہ رضامندی کو رضاءِ حقیقی نہ سمجھتے ہوئے اس کو "ربوا" اور "سود" کی طرح کا معاملہ یقین کرتا ہے۔ چنانچہ کتبِ فقہ میں معاملات کی بحث میں جانبین سے رضاء و رغبت اور بدل و عوض (Compensation) کو ضروری اور معاملہ کے جواز کا مدار ٹھہرایا گیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے فتاویٰ اور نصائح:

اسی لیے امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ہارون الرشید کو ذمی کاشت کاروں سے وصولِ خراج یعنی (لگان) سے متعلق احکام بتاتے ہوئے یہ تصریح فرمائی ہے:

❶ وآمرك أن لا تأخذ في الخراج إلّا وزن سبعه. ليس فيها تبر، ولا اجور الضرابين، ولا اذابة الفضة، اولا هدية النيروز والمهرجان، ولا ثمن الصحف، ولا اجور الفتوح،[1] ولا اجور البيوت ولا دراهم النكاح.[2]

---

(۱) ابو یوسف کی کتاب الخراج کے بعض نسخوں میں "الفتوح" کی بجائے "الفیوج" (جو کہ جوالیق کا معرب) ہے، جس کے معنی "بادشاہ کا قاصد" ہیں۔

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الزیادۃ والنقصان فی الخراج: ص ۱۸۶، ۱۸۷. دراصل یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس گرامی نامہ کے متن کا آخری حصہ ہے، جو آپ نے وصولی خراج کے بارے میں ہدایات دینے کے لیے اپنے گورنر کوفہ حضرت عبدالحمید بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ کو تحریر فرمایا تھا۔ مؤلف رحمہ اللہ نے اس کا صرف یہ حصہ نقل کیا ہے:

"دراھم النکاح" ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں: دراہم نکاح سے وہ ٹیکس مراد ہے جو دیہات میں پیشہ ور عورتوں (Prostitutes) پر غیر اسلامی حکومتوں میں لگایا جاتا تھا۔

ترجمہ: ہارون! میں تجھ کو یہ حکم دیتا ہوں کہ تو خراج میں وزن سبعہ (درہم و دینار کی ایک خاص قسم جو عام طور پر رائج تھی) کے علاوہ نہ لینا کہ اس وزن میں خالص سونے کے پتر داخل نہیں ہیں اور سکہ ڈھالنے والوں کی اجرت بھی نہ لینا اور نہ چاندی پگھلانے کی اجرت لینا اور نہ نوروز اور مہر جان کے ہدایا (بھینٹ) لینا اور نہ رسید کی لکھائی کی اجرت اور نہ نہر کے پانی کی اجرت اور نہ مکانوں کی اجرت (ہاؤس ٹیکس) اور نہ نکاح کا ٹیکس لینا۔

❷ ولا يؤخذ الخراج برزق عامل، والا أجر مدى ولا احتفان ولا نزلة، ولا حمولة طعام السلطان، ولا يدعّى عليهم بنقيصه فتوخذ منهم. ولا يؤخذ منهم ثمن صحف ولا قراطيس. ولا أجور الفتوح ولا أجور الكيالين، ولا مؤنة لأحد عليهم فى شئ من ذلك، ولا قسمة، ولا نائبة، سوى الذى وصفناه من المقاسمة الخ.[1]

ترجمہ: اور اہل خراج سے نہ تحصیلدار کی تنخواہ مجرا کی جائے اور نہ تولنے یا ناپنے کی اجرت لی جائے اور نہ کٹائی کی اور نہ خلیفہ کے لیے رسد، اور مہمان نوازی کے سلسلہ میں کوئی بار ڈالا جائے اور نہ یہ بہانہ بنا کر اور الزام لگا کر کہ انہوں نے پیداوار میں سے چرا لیا ہے ان سے مزید لیا جائے اور نہ رسید اور رجسٹر کی اجرت لی جائے اور نہ نہروں کے پانی کی اور نہ تولنے والوں کی اور نہ اسی قسم کا اور بوجھ ان پر ڈالا جائے اور بٹائی کے اس حصے کے علاوہ جو ہم نے بیان کر دیا ہے نہ کسی اور قسم کا حصہ لیا جائے اور نہ حادثہ کا تاوان ان پر ڈالا جائے۔

---

(۱) ابو یوسف: حوالہ بالا، باب فی تقبیل السواد الخ: ص ۲۳۱

اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ اموی نے گورنر کوفہ عبد الحمید[1] کو اس سلسلہ میں جو فرمان بھیجا تھا اس میں بھی یہی احکام درج تھے جو ''کتاب الخراج'' سے نقل کیے گئے ہیں۔

اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اہل خراج پر عاملوں کی بے عنوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی تنبیہ کی تھی کہ رشوت اور بھینٹ کی ان ظالمانہ رسوم کا کلیۃً انسداد ہونا چاہیے۔ تحریر فرماتے ہیں:

إنما مذهبهم أخذ شئ من الخراج كان أو من أموال الرعية، ثم أنهم يأخذون ذلك فيما بلغني بالعسف والظلم والتعدى ثم لا يزال الوالى ومن معه قد نزل بقرية فأخذ أهلها من نزله بما لا يقدرون عليه ولا يجب عليهم، حتى يكلفوا ذلك.[2]

ترجمہ: ان عاملوں کا تو یہ مذہب ہے کہ بہرحال لینا چاہیے خواہ وہ مقررہ خراج ہو یا رعیت کا ذاتی مال و متاع اور مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ یہ ظلم و جبر اور سختی کرتے ہیں اور لے کر چھوڑتے ہیں، پھر حاکم اور اس کے کارندے اگر کسی گاؤں میں جاتے ہیں تو حق مہمانی کے نام سے وصول کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کی مقدرت (استطاعت) سے بھی زیادہ لے لیتے ہیں اور جو حق ان کے ذمے نہیں ہے اس کو ظلماً حق بتا کر لیتے ہیں۔

---

(۱) عبد الحمید بن عبد الرحمٰن بن زید بن الخطاب بن نفیل رحمہ اللہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتا تھے۔ آپ کی والدہ حضرت میمونہ بنت بشر بن معاویہ رحمہا اللہ تھیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے آپ کو عراق کا گورنر مقرر کیا اور حضرت ابو الزناء رحمہ اللہ کو آپ کا سیکرٹری اور خراج کا افسر بنا کر بھیجا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن سعد: طبقات، ج ۵، ترجمہ عبد الحمید بن عبد الرحمٰن. الجرح والتعديل، ۱۵/۶

(۲) حوالہ بالا: ص ۲۲۹

ایک مغالطہ:

اس سلسلہ میں عموماً یہ کہا جاتا رہا ہے کہ "بیگار" (Labour Without Wage) اور "بھینٹ" کے اس رسم و رواج کا تعلق ایک کاشتکار کی کاشتکاری سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ زمیندار یا تعلقہ دار نے انکے رہنے کے لیے مفت جگہ عطا کی ہے اور وہ رعایا کی طرح ان کے علاقے میں آباد ہو گئے ہیں اور ان پر اجرتِ مکان کی جگہ اس قسم کے حقوق عائد کر دیئے گئے ہیں اور کاشتکاروں نے رعایا کی حیثیت میں برضاء و رغبت ان حقوق کو منظور کر لیا ہے۔

سو یہ سخت مغالطہ یا فریب ہے اس لیے کہ "اسلام کے قانونی معاملات" میں اس قسم کا مجہول معاملہ جائز ہی نہیں رکھا گیا اور ظلم اور مناقشہ (Controversy) کی راہ پیدا ہونے کے امکانات کی وجہ سے اس نے ایسے معاملات کو ناجائز کہا ہے؟ اسلام کا قانون اس بارہ میں یہ ہے کہ جس طرح کاشت کے لیے زمین اجرت پر دی جا سکتی ہے اسی طرح رہنے سہنے یا اور کسی ضرورت کے لیے بھی اجرت پر دی جا سکتی ہے اور دیگر معاملات کی طرح اس میں بھی جگہ کا تعین اور اس کی اجرت کا تعین ابتداءِ عقد ہی میں ضروری ہے اور یہ بھی اجارہ ہی کی ایک قسم ہے اور اگر زمیندار اپنے مفاد کے یعنی کاشت کی افزونی (Increase) کے پیشِ نظر یا کاشتکار کی آسانی اور راحت کی خاطر یعنی بغیر اجرت کے کاشت کار کو بساتا اور رہنے کے لیے زمین دیتا ہے تو یہ اس کا تبرع (احسان) اور حسنِ سلوک شمار ہو گا اور اس صورت میں کاشت کار کے ذمہ نہ کوئی معاوضہ عائد ہوتا ہے اور نہ مبینہ حقوق ہی اس پر قائم کیے جا سکتے ہیں چہ جائے کہ وہ صاحبِ زمین کی محکوم رعایا یا غلام متصور ہو۔

البتہ زمیندار اور کاشتکار کے درمیان اجارہ اور مزارعۃ سے پیدا شدہ تعلقات کی بناء پر تہواروں میں ہدایا کا لین دین مسطورہ بالا "بھینٹ" کی مذموم رسم سے الگ باہمی تعاون کے استحکام کے لیے مفید طریقہ ہے بشرطیکہ رسم و رواج کی پابندی سے جدا محض رضاء و رغبت کے ساتھ عمل میں آئے اور اس قسم کے ہدایہ کے قبول و عدمِ

قبول کی تفصیلات کتبِ فقہ میں قابلِ مراجعت ہیں۔

نقد لگان کے ساتھ دیگر استحصالی شرائط کا خاتمہ:

اسلام سے قبل ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ کاشتکار جب اپنی ضرورت کے لیے زمین نقد لگان پر لیتا تھا تو مالک زمین اس سے اس قسم کی شرطیں لگاتے تھے جس سے زمین کی حیثیت مستقل طور پر بڑھ جائے اور جو کام یا ذمہ داری خود اپنے ذمہ عائد ہے وہ اس حیلہ سے کاشتکار پر عائد ہو جائے اور اس طرح مستقل مزید نفع حاصل ہو جائے۔

اسلام کے معاشی نظام میں اس قسم کے اجارہ کو اجارۂ فاسدہ (Invalid Lease) میں شمار کیا گیا ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے اگرچہ اس قسم کی جزئیات (Sections) قانونِ اسلامی (فقہ) میں بہت کافی ملیں گی لیکن نمونہ کے طور پر چند جزئیات (Sections) ذکر کر دینا کافی ہیں۔

فعلم بھذا أن ما یقع فی زماننا من إجارة ارضِ الوقف بأجرة معلومة علی أن المغارم وکلفة الکاشف علی المستاجر أو علی ان الجرف علی المستاجر فاسد الخ[1]

ترجمہ: اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ جو ہمارے زمانے میں دستور ہو گیا ہے کہ موقوفہ زمین (Endowed Land) کو ایک معین اجرت (لگان) پر اس شرط کے ساتھ دیتے ہیں کہ زمین پر جس قدر بھی تاوان پڑیں گے اور معہودہ کاشت کار (Contracted Cultivation) کے مقصد سے جدا زمین کی اصلاح کے لیے جو بھی محنت و مشقت پڑے گی وہ یا زمین میں نہر کی کھدائی کی ذمہ داری کاشت کار پر ہوگی۔ یہ دستور ناجائز اور فاسد اجارات میں سے ہے۔

---

(۱) ابن عابدین: فتاوی شامی، جلد ۵، باب الإجارة، ص ۳۸ —— ابن نجیم، زین العابدین: بحر الرائق، مطبوعہ مطبع دار الکتب العربیة، قاهرة، ۱۳۲٤ھ، ۳۳۹/۷

پس اگر وقف کی زمین کا یہ حکم ہے تو زمیندار کی شخصی زمین کے لیے یہ حکم بدرجہ اولیٰ نافذ العمل ہو گا۔ اس لیے کہ اس صورت میں متعاقدین (Contractors) (زمیندار اور کاشتکار) میں سے مالکِ زمین کاشتکار پر عقد کے خلاف ذمہ داری ڈالتا ہے جو صراحۃً ظلم ہے۔

ظالمانہ قرقی مال کا خاتمہ:

کاشتکار اور اہل خراج پر گذشتہ تمام مظالم سے زیادہ سخت ظلم یہ ہوتا تھا کہ اگر پیداوار کی کمی کی وجہ سے یا قدرتی آفات کے نزول کے سبب سے یا کسی اور معقول عذر کی وجہ سے وہ مقررہ لگان ادا نہیں کر سکتے تھے تو حکومت یا زمیندار زراعت کا سامان ہل، بیل گاڑی اور ضروریاتِ زندگی کو نیلام کرا لیتے اور ان کو فروخت کر کے اپنا لگان وصول کر لیا کرتے تھے نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ کاشت کار آئندہ کے لیے بھی اس قابل نہیں رہتا تھا کہ وہ محنت کر کے دوسری فصل میں روزی پیدا کر سکے اور اس کے لیے زندگی ایک مستقل عذاب بن جاتی تھی اور آفات سے پیدا شدہ نقصان کی وجہ سے لگان کی کمی یا معافی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اسلام کے معاشی نظام میں اس کو بھی ظلم قرار دیا گیا ہے اور مطالبۂ لگان واجب ہونے کے باوجود وصولِ لگان کے سلسلہ میں آلات زراعت کے نیلام کی اجازت نہیں دی گئی اس لیے کہ ایسا کرنا اس کو معاشی زندگی کے ذرائع سے محروم کرنے کے مترادف ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] نے ایک

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے گورنر کے مکالمہ کا صرف تھوڑا سا حصہ نقل کیا ہے، مگر قارئین کرام کی دلچسپی اور عبرت کے لیے میرا دل چاہتا ہے کہ اس مکالمہ کا بقیہ حصہ بھی نقل کروں، لیجئے پڑھئے:

أستعملني علي ابن أبي طالب رضي الله عنه علی عکبراء فقال لي ــــ وأهل الأرض معي يسمعون ــــ أنظر! أن تستوفي ما عليهم من الخراج، واياك أن ترخص لهم في شئ. و إياك أن يروا منك ضعفا. ثم قال: رح اليّ عند الظهر فرحت اليه عند الظهر. فقال: إني إنما أوصيتك به قدام أهل عملك، لأنهم قوم خُدُعٌ.

=

مرتبہ شام کے ایک مشہور مقام "عکبراء" کے عامل کو اہل خراج کے سامنے نہایت سختی کے ساتھ یہ حکم دیا کہ تم کو ان سے خراج کا ایک حبہ (Grain) وصول کرنا چاہیے اور پھر فرمایا: مجھ سے دوپہر کو ملاقات کر لینا جب عامل حاضر ہوا تو ارشاد فرمایا:

أنظر إذا قدمت عليهم فلا تبيعنّ لهم كسوة شتاء ولا صيفٍ ولا رزقا يأكلونه، ولا دآبة يعملون عليها، ولا تضربن أحدا منهم سوطا واحدا في درهم، ولا تقمه على رجله في طلب درهم، ولا تبع لأحد منهم عرضا في شئ من الخراج الخ.[1]

ترجمہ: دیکھو جب تم ان کے یہاں پہنچو تو خراج (لگان) میں نہ تو ان کے سردی اور گرمی کے لباس کو فروخت کرنا، نہ ان کے روزانہ کھانے کی اشیاء کو، نہ ان جانوروں کو جن سے وہ کاشت کرتے ہیں، نہ ان کو ایک کوڑا تک مارنا، نہ ایک پیر پر کھڑے ہونے کی سزا دینا اور نہ خانہ داری کے ضروری سامان میں سے کوئی شے خراج میں فروخت کرنا۔

یعنی ان کو اس قدر مہلت دو کہ وہ حالات کی درستی کے بعد بآسانی ادا کر سکیں اور اگر ان کے آلاتِ کاشت کو یا روز مرہ کی ضروریاتِ زندگی کو "خراج" میں لے لیا

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے (شام کے علاقے جو آج کل بغداد کے قریب ہے) عکبراء کا گورنر بنایا۔ اور مجھے آپ نے نصیحت کرتے ہوئے ـــــ جب کے اس علاقہ کے زمیندار بھی میرے ساتھ سن رہے تھے ـــــ فرمایا دیکھو! ان (زمینداروں) پر جو خراج کی رقم ہے وہ پوری پوری وصول کرنا۔ اور خبردار! اس معاملہ میں انہیں رعایت نہ دینا اور خبردار! وہ تم میں (وصولی خراج کے سلسلہ میں) کوئی کمزوری نہ پائیں، پھر فرمایا: مجھے (دن ڈھلے) ظہر کے وقت (دوبارہ) آکر ملنا۔ میں ظہر (دن ڈھلے) کے وقت انہیں ملنے گیا تو مجھے آپ نے (سرگوشی کے انداز میں) فرمایا: میں نے جو تمہیں نصیحت کی تھی وہ تمہارے علاقہ کے لوگوں کے سامنے تھی کیونکہ وہ دھوکہ باز لوگ ہیں (اب اوپر مصنف رحمہ اللہ کی نقل کردہ عبارت کا ترجمہ ملا کر پڑھیں)

میں نے سارا مکالمہ اس لیے نقل کیا ہے کہ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیاسی بصیرت، فہم و فراست اور رعایا سے رحیمانہ برتاؤ کا اندازہ لگا سکیں۔

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، مقدمہ، ص ۵۲

گیا تو پھر نہ یہ کہ ان کی زندگی برباد ہو جائے گی بلکہ ساتھ ہی حکومت کے لگان اور مالگذاری کی آمدنی میں بھی کمی ہوتی چلی جائے گی۔

پس جو معاشی نظام ان ذمی کاشتکاروں کے لیے جو کہ کاشتکار ہونے کے علاوہ حکومتِ اسلامی کی رعایا بھی ہیں، مسطورہ بالا مظالم کا سدِ باب کرتا اور اس کی بجائے بہتر سے بہتر حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نظام ان کاشت کاروں کے حق میں کب ایسے مظالم کو برداشت کر سکتا ہے جو حکومت یا زمیندار کے ساتھ یا تو اجارہ کا معاملہ رکھتے ہیں اور یا مزارعۃ کا؟ یعنی وہ اور زمیندار باہمی تعاون کے محتاج ہو کر معاملہ میں ایک دوسرے کے مساویانہ طور پر شریک ہیں اور اس لیے بلاشبہ وہ مسطورہ بالا حسن سلوک کے زیادہ سے زیادہ مستحق ہیں۔

جاگیردارانہ چراگاہوں کا خاتمہ:

دورِ اسلام سے قبل اور دورِ حاضر دونوں میں یہ دستور رہا ہے کہ حکومت زمینداروں کو اجازت دے دیتی ہے کہ سرکاری افتادہ مگر شاداب و سبزہ زار زمینوں کو معمولی ٹیکس کے ذریعہ یا مفت ''حمی'' چراگاہیں بنالیں اور ان کی حدود بندی کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہیں اس کو عربی میں ''حمی'' اور اردو میں ''رکھا'' کہتے ہیں۔

اس سے عموماً عوام اور غریب کاشتکاروں کے لیے ایک مصیبت نازل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مویشیوں کے لیے چارہ سے محروم ہو کر سخت دقتیں برداشت کرتے ہیں۔

اسلام نے اس ظالمانہ طریقہ کو روک دیا اور ایسا کرنے کی سخت ممانعت کر دی۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم: لا حمی إلا للہ و رسولہ.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حمی'' یعنی مویشیوں کے

(۱) صحیح الامام البخاری: ج ۲، کتاب المساقاۃ، باب حمی الا اللہ ولرسولہ

لیے چراہ گاہ کی حد بندی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ کسی کے لیے روا نہیں ہے۔

یعنی یہ حق صرف خلافت "حکومت" کا ہے کہ جہاد اور صدقات کے مویشیوں کے لیے چراگاہ محدود کر دے اس کے علاوہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ [1] فرماتے ہیں:

أقول لما كان الحمى تضييقا على الناس وظلما عليهم و إضرارا فهي عنه. [2]

ترجمہ: میں کہتا ہوں جب کہ حمی کا دستور لوگوں کی ضروریات میں دشواری کا باعث اور ان کے مفاد عامہ پر ظلم تھا اور باعث نقصان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناجائز فرمادیا۔

اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر بارش کی کمی یا کسی اور وجہ سے خودرو گھاس کی کمی ہو اور افراد ملک کے مویشی چارہ سے محروم ہو جائیں تب "سرکاری" "حمی" بھی پبلک مفاد کے لیے عام کر دیا جائے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

عن زيد بن اسلم عن أبيه قال: رايت عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه أستعمل مولى له على الحمى. فقال له: ويحك يا هُنَيُّ! اضمم جناحك عن الناس، واتق دعوة المظلوم فان دعوته مجابة. أدخل لي رب الصريمة ورب الغنيمة. ودعني من نعم عثمان بن عفان رضي الله عنه وابن عوف رضي الله عنه إن هلكت ما شيتهما رجعا إلى المدينة إلى نخل وزرع وإن

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ: حجة الله البالغة، ۱۰۴/۲

هذا المسكين، إن هلكت ما شيته جاءني يصيح يا أمير المؤمنين! يا أمير المؤمنين! والماء والكلاء أهون علي من إن أغرم له.[۱]

ترجمہ: زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۲] اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے: میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اس وقت موجود تھا جب انہوں نے اپنے آزاد شدہ غلام "ہنی" کو "سرکاری چراگاہ"[۳] پر نگران بنایا تو فرمانے لگے: اے ہنی! خبردار اپنے بازوؤں کو

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الکلا والمروج، ص ۲۲۲، ۲۲۳

(۲) زید بن اسلم، ابو معشر زید بن اسلم بن ثعلبہ بن عدی بن الجد بن العجلان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدری صحابی ہیں، غزوہ احد میں بھی شریک ہوئے۔ ابن سعد: طبقات، ج ۳، تذکرہ زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) سرکاری حمی، سرکاری چراگاہ: جس چراگاہ کی طرف اس روایت میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ مدینہ منورہ سے چار منزل ربذہ کے مقام پر تھی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آزاد کردہ غلام ہنی (Hunney) کو اس کا نگران مقرر کیا، یہاں جہاد کے لیے اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور اونٹ پائے جاتے تھے اور بوقت ضرورت عام مسلمانوں کے مواشی بھی یہاں چر لیا کرتے تھے۔ یہ چراگاہ دس (۱۰) میل لمبی اور دس (۱۰) میل چوڑی تھی۔
خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم ـــــ بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ ـــــ کے عہد میں ایسی سرکاری چراگاہیں اسلامی ریاست کے متعدد مقامات پر بنائی گئیں، جن میں جہادی گھوڑے اور اونٹ پرورش پاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے قریب ربذہ کی چراگاہ کے علاوہ ایک چراگاہ مکہ مکرمہ سے سات (۷) منزل کے فاصلہ پر ضریہ کے مقام پر تھی یہ چراگاہ چھ میل لمبی اور چھ میل چوڑی تھی اس میں تقریباً ۴۰ چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) جہادی اونٹ پرورش پاتے تھے۔
ایک تیسری چراگاہ بصرہ میں تھی، جس کا انتظام اہواز کے گورنر حضرت جزو بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا۔
ایک چوتھی چراگاہ کوفہ میں تھی، جس کا انتظام حضرت سلمان بن ربیعہ الباہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سنبھالتے تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کریم نے گھوڑوں کی شناخت اور پرداخت کا خاص ملکہ ودیعت فرمایا تھا گویا وہ پیدا ہی جہادی گھوڑوں کی تربیت کے لیے ہوئے تھے، اسی شناختی اور پرداختی کمال کی وجہ سے ان کا نام ہی سلمان الخیل ـــــ سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑوں والے ـــــ پڑ گیا۔
اس طرح ایک چراگاہ عاقول کے قریب دریائے فرات کے کنارہ پر تھی جہاں حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہار کے موسم میں کوفہ کی چراگاہ کے گھوڑے لاتے تھے۔ (ان تمام چراگاہوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ طبری: ص ۲۵۰۴۔ خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)، مطبوعہ قاہرۃ، ص ۲۵۵،
=

لوگوں سے سمیٹے رکھ اور مظلوم کی بد دعا سے پرہیز کر اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے۔ تو میری اس قائم کردہ چراگاہ میں بکریوں اور دیگر چوپاؤں کے ریوڑ والوں کو اجازت دے کہ وہ چراگاہ میں چرا سکیں اور عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ [1] کے

۲۵۶ـــــ شبلی نعمانی: الفاروق، حصہ دوم، عنوان: صیغہ فوج، تذکرہ: گھوڑوں کی پرداخت)
دراصل ایسی چراگاہوں کا آغاز بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقیع کو حمی (چراگاہ) مقرر فرمایا، یہاں مجاہدین اسلام کے جہادی گھوڑے، اونٹ چرا کرتے تھے اور عام غریب مسلمانوں کے مواشی بھی۔ بخاری کے الفاظ ہیں:

وقال صعب بن جثامه ليثى رضى الله عنه بلغنا أن النبى صلى الله عليه وسلم حمى النقيع، وأن عمر (رضى الله تعالىٰ عنه) حمى السرف والربذه. (صحيح بخارى، كتاب المساقات، باب لا حمى الا لله ورسوله صلى الله عليه وسلم)

ترجمہ: اور حضرت صعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "نقیع" اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "سرف" اور "ربذہ" کو چراگاہیں بنایا۔

(۱) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ابو محمد زہری قرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام الفیل سے دس سال قبل پیدا ہوئے، نہایت جلیل القدر صحابی تھے، عشرہ مبشرہ (دس سعادت مند ترین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنہیں جنت کی دنیا میں اللہ کریم نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی خوشخبری دی) میں شامل تھے اور اس سات رکنی مجلس کے رکن اعظم تھے، جس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے بعد خلیفہ منتخب کرنا تھا۔ ابتداء اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت پر مشرف باسلام ہوئے۔ دوبارہ ہجرت حبشہ کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی، غزوہ احد میں ثابت قدمی پر بہت زخم کھائے حتی کہ عمر بھر لنگ کا شکار رہے۔ غزوہ موتہ (دومۃ الجندل) میں امیر لشکر اسلامی بنا کر بھیجا گیا واپسی پر آپ کے اقتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز بھی ادا کی۔ امامت کا یہ شرف صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تھا۔

ہجرت مدینہ منورہ سے قبل غریب تھے، ہجرت کر کے کاروبار کیا، امیر ترین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ان کا شمار ہوا۔ جہاد اور امت کی خوشحالی کے کاموں پر بہت خرچ کرتے تھے۔ امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن کا بہت خیال کیا کرتے تھے۔ وفات کے وقت وصیت کر گئے کہ ان کے مال سے اصحاب بدر رضوان اللہ علیہم اجمعین (جو زندہ ہوں) کو چار چار سو دینار فی کس دیئے جائیں۔ چنانچہ تقریباً سو بدر یین ـــــ ان کی قبروں پر اللہ کریم کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں ـــــ کو چار چار سو دینار پیش کیے گئے۔ ۳۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع کے خوش نصیبوں میں صور پھونکے جانے کے دن تک زمین اوڑھ کر سو گئے۔ (دیکھئے: اسد الغابہ، استیعاب، اصابہ وغیرھا میں ترجمہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی

چوپایوں کی پرواہ نہ کر اس لیے کہ اگر ان کے چوپائے ہلاک بھی ہو جائیں تو وہ مدینہ میں اپنے کھجوروں کے باغ اور زمین کی کاشت سے فائدہ اٹھا سکیں گے، اور اگر ان چرواہوں کے چوپائے مر گئے تو یہ مسکین چیختے پکارتے آئیں گے اور امیرالمؤمنین! امیر المؤمنین کہہ کہہ کر امداد طلب کریں گے اس لیے بیت المال کے روپیہ پیسہ سے ان کی امداد کرنے سے میرے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ ان کو چراگاہ کے گھاس پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت رہے۔

مفاد عامہ کی قدرتی اشیاء پر طاقت وروں کا قبضہ ختم:

ایک یہ بھی دستور تھا کہ زمیندار خودرو گھاس، تالاب اور کھیتوں کا پانی، خودرو درختوں کی خشک لکڑی پر بھی بلا شرکتِ غیر قابض رہتے تھے اور اپنی زمین کی ملکیت کے دعوے سے دوسروں کو اس سے نفع نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ یہ بھی عوام اور غرباء کے ایسے مفاد میں ظالمانہ دستبرد تھی جس کو خدائے تعالیٰ کی سخاءِ عام (General Generosity) نے بغیر محنت ان کو بخشا تھا۔

اسلام نے اس قبضہ کی بھی مخالفت کی اور ان چارہ ہائے مویشی کے علاوہ جن کو غلہ کی طرح بیج ڈال کر اور محنت کر کے بویا جاتا ہے اپنے مقامِ روئیدگی (Place of Growth) میں ان سب کا مفاد عام (Public Good) کر دیا اور کسی کو ان کی ذاتی ملکیت کا حق نہیں بخشا۔ الا اس قدر کہ محنت سے حاصل کر کے اس کو اپنی ملکیت میں لے آئے جیسا کہ گھسیارہ کا گھاس کاٹ کر اپنی ملکیت میں کر لینا یا سقہ کے پانی کو اپنی مشک میں بھر کر مالک ہو جانا۔

❶ عن ابی هريرة رضی الله عنه أن النبی صلى الله عليه وسلم

الله تعالیٰ عنه —— ولی الدين خطيب رحمه الله تعالیٰ صاحب مشكاة المصابيح، الكمال فی اسماء الرجال)

قال: لا تمنعوا فضل الماء لتمنعوا به فضل الكلاء.[۱]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضرورت سے بچے ہوئے پانی سے لوگوں کو اس لیے نہ روک دیا کرو کہ اس بہانے سے تم کو فاضل گھاس سے روکنے کا موقع مل جائے۔

۲ ولأبي داؤد والمسلمون شركاء في ثلاث في الماء والكلاء والنار.[۲]

ترجمہ: اور ابوداؤد میں ہے کہ تمام مسلمان پانی، گھاس اور سوختہ (کی لکڑی) میں برابر کے شریک ہیں۔

اور صحاح کی بعض روایات میں نمک کا اضافہ ہے اور بعض روایات میں ایسا کرنے والے پر قیامت میں خدا کے غضب نازل ہونے کی وعید آئی ہے۔

۳ قال أبو عبيد: وهو عندي في الأرض التي لها رب ومالك ويكون فيها الماء العد الذي وصفناه. والكلاء الذي تنبته الأرض من غير أن يتكلف لها ربها لذلك غرسا ولا بذرا.[۳]

ترجمہ: ابوعبید رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حکم میرے نزدیک اس زمین کے بارہ میں ہے جو کسی شخص کی مملوکہ ہو اور اس میں بیان کردہ جاری چشمہ کی طرح کا پانی ہو یا بغیر بیج ڈالے اور کھیتی کیے خودرو گھاس اگی ہوئی ہو۔

۴ ومن السحت ما يؤخذ على كل مباح كماء وكلاء وماء

---

(۱) صحيح بخاری، كتاب المساقات، باب من قال ان صاحب الماء أحق بالماء. أبوداؤد، كتاب البيوع، جامع ترمذی، كتاب البيوع، باب ماجاء في بيع فضل الماء. صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب تحريم بيع فضل الماء

(۲) أبوداؤد: السنن، كتاب البيوع باب في منع الماء. ابن ماجه، كتاب الرهون، باب المسلمون شركاء في ثلاث حدیث کی باقی کتابوں میں "المسلمون" کی بجائے "الناس" آیا ہے۔

(۳) ابو عبيد: كتاب الاموال (۱۳۵۲ھ) ص ۳۰۰

ومعادن.[1]

ترجمہ: اور وہ ٹیکس ظلم ہے جو نمک، گھاس اور پانی اور ظاہری کانوں پر لیا جائے۔

❺ قال ابو یوسف رحمه الله تعالىٰ: ولو أن أهل قرية لهم مروج يرعون فيها ويحتطبون منها، قد عرف أنها لهم، فهى لهم على حالها يتبايعونها ويتوارثونها، ويحدثون فيها ما يحدث الرجل فى ملكه. وليس لهم أن يمنعوا الكلاء ولا الماء ولا أصحاب المواشى أن يرعوا فى تلك المروج يسقوا من تلك المياه الخ[2]

ترجمہ: ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر کسی بستی والوں کے متعلق یہ معلوم ہو کہ ان کی چراگاہیں ”کہ جس میں وہ اپنے مویشیوں کو چراتے اور اس سے سوختہ حاصل کرتے ہیں“ ان کی ذاتی ملک ہیں تو وہ ذاتی ملک ہی رہیں گی اور ان کو اس کے فروخت کرنے، خریدنے اور ترمیم و تنسیخ (Alteration & Cancellation) کرنے کا حق ہے، اور اس میں ان کی وراثت بھی جاری کی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کو یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ وہ چراگاہ کی خود رو گھاس اور اس کے پانی سے دوسروں کو روکیں۔ اور چرواہوں اور مویشیوں والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بغیر روک ٹوک ان چرواہوں میں چرائیں اور ان کا پانی پئیں پلائیں۔

یعنی اگر چراگاہیں حکومت کی ذاتی ملک اور افتادہ زمینوں کی قدرتی چراگاہیں نہ بھی ہوں اور زمینداروں کی ذاتی ملک بھی ہوں تب بھی ان کو خود رو گھاس اور پانی سے

(۱) الدر المختار على حاشية رد المحتار، مطبوعه بمبئی (ہند) ۱۳۰۹ھ، ۳۷٤/٥

(۲) ابو يوسف: كتاب الخراج، باب فى الكلاء والمروج. ابن عابدين: شامى، ج ٥ كتاب احياء الموات، ص ۳۸۸

دوسروں کو فائدہ اٹھانے سے روکنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تمام افراد برابر ہیں۔

کاشت کار اور مستاجر کے لیے چند مزید مراعات

مسطورِ بالا مظالم کا انسداد اور ان کی جگہ عادلانہ اصلاحات و انقلابات کے علاوہ اس سلسلہ میں چند اور مراعات بھی ہیں جو اس لیے مستاجر اور کاشت کار کے حق میں تسلیم کی گئی ہیں کہ معاملہ زیرِ بحث میں باہمی تعاون اور شرکتِ منافع کا جو مقصد ہے وہ فوت نہ ہونے پائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی تعمیل ہو سکے۔ جو باہمی معاملات کے لیے ایک بیش بہا اصول ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا ضرر ولا ضرار.[1]

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما[2] سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (تمام معاملات زندگی میں یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے) کہ نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔

ارشادِ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ صرف لین دین کے معاملات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر اس شعبہ میں کہ جو باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کا محتاج ہے یہ گرانقدر اصول پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ نہ مجھ کو نقصان اٹھانا چاہیے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہیے اور جو کچھ بھی ہو عدل و مساوات اور اخوت و مساوات کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے۔ لہٰذا اسلام کے معاشی نظام میں بھی اس اصول کو بنیادِ کار بناتے ہوئے حسبِ ذیل دفعات کا اعلان کیا گیا ہے:

1. اگر کوئی زمین پانی میں غرق ہو جانے یا خشک سالی پیش آجانے کی وجہ سے قابلِ

(۱) احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ: مسند، ۲۱/۲۱۲، مرویات عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما

(۲) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

زراعت نہ رہے یا کسی آفت سے کھیتی تباہ ہو جائے تو اس سال کا (خراج) (مالگذاری) معاف ہے اور اگر آفت سے نقصان پہنچ گیا ہے تو بقدرِ نقصان معافی ہوگی اور خراج کی اس معافی میں خراج موظف (نقدی لگان) اور خراج مقاسمہ (بٹائی) دونوں کا یکساں حکم ہے۔

ولا خراج إن غلب على أرضه الماء وانقطع أو أصاب الزرع آفة. الخ[1]

ترجمہ: اور اگر کاشت کار کی زمین کو پانی کے سیلاب نے غرق کر دیا یا پانی سے محرومی نے زمین کو ناقابلِ برداشت بنا دیا یا کھیتی کو کسی آفت نے برباد کر دیا تو ان سب صورتوں میں زمین کا خراج (مالگذاری) معاف ہے۔

اور اگر کھیتی کو ضرر "نقصان" پہنچا ہے تو بقدرِ نقصان معاف ہو گا اور خلیفہ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ مزارعین کو اس صورت میں بھی معاف کر دینا مناسب سمجھتا ہے تو کل معاف کر سکتا ہے۔[2]

❷ اگر کاشت کار نے حکومت یا زمیندار سے زمین کو اجارہ پر "بٹائی" (مزارعۃ) سے لیا ہے تو اس صورت میں بھی ان تینوں حالتوں میں مالگذاری اور لگان قطعاً معاف ہیں اور اگر کھیتی کو صرف نقصان پہنچا ہے تو بقدرِ نقصان معاف ہو گا اور موجودہ پیداوار ہی کی بٹائی کی جا سکے گی۔

❸ اور اگر زمین کو نقد لگان (کراء الارض) پر لیا ہے تو اکثر فقہاء اسلام کے نزدیک اس صورت میں بھی تینوں حالتوں میں لگان یا مالگذاری معاف ہے۔

کھیتی پر آفت کی صورت میں امام اعظم رحمہ اللہ اور دیگر آئمہ کی رعایات:

امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین کے غرق آب ہو جانے اور پانی سے محروم ہو کر ناقابلِ کاشت ہو جانے پر تو معاف ہے لیکن کھیتی پر

---

(۱) کنز الدقائق مع شرح بحر الرائق، ج ۵، باب الخراج، ص ۱۱۷

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی والی الخراج

آفت آجانے سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ [1] کے فقہ میں حسبِ ذیل تفصیلات (فتاویٰ

---

(۱) امام ابو حنیفہ، نعمان بن ثابت زوطی ابو حنیفہ رحمہ اللہ ۸۰ھ (مطابق ۶۹۹م) کوفہ میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر ریشم کا کاروبار کیا۔ آپ کے زمانہ میں چار اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ـــــ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بصرہ میں، حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ میں، حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں اور حضرت ابوالطفیل عامر بن واصلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ میں ـــــ زندہ سلامت تھے۔ آپ رحمہ اللہ نے پہلے علم الکلام میں مہارت حاصل کی، پھر تجارت میں تجربات حاصل کیے، پھر علم فقہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ نے فقہاء کے مرکز کوفہ جسے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سبب قائم ہوا تھا ـــــ کے ترجمان حضرت حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ سے فقہ حاصل کی۔ عطا بن ابی رباح، ابو اسحاق سبیعی، محمد بن المنکدر، نافع، ہشام بن عروہ، سماک بن حرب رحمہم اللہ تعالیٰ سے حدیث سماعت کی۔ مروان بن محمد اموی نے حاکم عراق، ابن ہبیرۃ کے ذریعہ قاضی القضاۃ کے عہدہ کی پیش کش کی مگر انکار کی صورت میں پس دیوار زنداں بھیج دیا گیا، ۱۰۰ کوڑے مارے گئے، زہر کھلایا گیا مگر موقف پر قائم رہے۔ عباسی خلیفہ منصور نے آپ کو کوفہ سے بغداد منتقل ہونے کو کہا۔ آپ ہجرت فرما کر وہاں مقیم ہوگئے، پھر عہدہ قضاۃ کی پیش کش کی گئی، پھر انکار، پھر قید، پھر آخر سانس تک زندان کی رسم وفا کو زندہ رکھا سرمد مجذوب رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت کہا: ؎

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

الحکم بن ہشام رحمہ اللہ نے کیا کہا؟ اور کن کانوں نے کیسے سنا؟

أنه كان من أعظم الناس أمانة، وأراد السلطان على أن يتولى مفاتيح خزائنه أو يضرب ظهره، فأختار عذابهم على عذاب الله. (الكمال فى اسماء الرجال لصاحب المشكوة شيخ ولى الدين رحمه الله تعالىٰ الباب الثانى)

ترجمہ: وہ (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ) امانت داری میں دنیا کے عظیم ترین انسانوں میں سے تھے۔ بادشاہِ وقت نے ارادہ کر لیا کہ یا تو وہ ان کے خزانوں کی چابیاں سنبھال لیں یا پیٹھ پر کوڑا پٹوائیں۔ مگر اس (عظیم انسان) نے ان (صاحب اقتدار و اختیار) کے عذاب کو عظیم و جلیل اللہ کے عذاب سے ہلکا سمجھ کر اختیار کر لیا۔

یہی امام الحکم بن ہشام رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا تذکرہ امام ابن مبارک رحمہ اللہ کے سامنے کرنے لگا تو انہوں نے مجھے روک کر کہا:

اتذكرون رجلا عرضت عليه الدنيا بحذافيرها ففرّمنها. (حوالہ بالا)

ترجمہ: ارے تم میرے سامنے اس (عظیم) شخص کا تذکرہ چھیڑنا چاہتے ہو جس پر دنیا اپنے تمام کمال و جمال کے ساتھ پیش کی گئی۔ مگر اس نے اس سے منہ پھیر لیا۔

قید خانہ میں ہی ۱۵۰ھ (مطابق ۷۶۷م) میں وفات پائی۔ آپ مسلک حنفی رحمہ اللہ کے بانی ہیں۔ مسلک حنفی =

قاضی خان[1] میں مذکور ہیں:

❶ رجل استاجر أرضا ليزرعها فزرعها فأصاب الزرع آفة فهلك أو غرق، ولم ينبت كان عليه الأجر، ولو غرقت الأرض قبل أن يزرعها فلا أجر عليها. وكذا لو غصبها رجل فزرعها الغاصب لا أجر على المستاجر وذكر الشيخ الامام المعروف بخواهر زاده أنه إذا استاجر أرضا للزراعة فزرع فاصطلمه آفة كان عليه أجر ما مضى وسقط عليه أجر ما بقي من المدة بعد الاصطلام.[2]

ترجمہ: کاشت کار نے اگر زمین کو کاشت کے لیے نقد لگان پر لیا اور اس کو بولیا، جوت لیا، کھیتی کر لی پھر کھیتی کو آفت نے آگھیرا اور وہ برباد ہو گئی یا پانی میں غرق ہو گئی اور پیداوار نہ ہوئی تو لگان اس کے ذمہ واجب رہا اور اگر زمین کھیتی سے پہلے ہی غرق آب ہو گئی تو لگان معاف ہو جائے گا اور اسی طرح اگر کھیتی سے قبل کسی غاصب نے زبردستی زمین پر قبضہ کر کے اس کو کاشت کر لیا تو کاشتکار کے ذمہ لگان واجب نہیں ہو گا اور شیخ امام

کے پیروکار کی تعداد دو تہائی (۲/۳) مسلمان ہیں۔ زیادہ اکثریت پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان، افغانستان، ترکی، مصر وغیرہا میں آباد ہے۔ آپ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف، امام محمد، امام وکیع بن الجراح، عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اساطین علم وفضل ہیں۔

(۱) فتاویٰ قاضی خان: قاضی فخر الدین حسن بن منصور اوزنجدی فرغانی رحمہ اللہ (متوفی ۵۹۲ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے امام محمد بن حسن شیبانی، شاگرد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کتب "ظاہر الروایۃ" اور "النوادر" کو بنیاد بنا کر متقدمین اور متاخرین فقہاء احناف کے دلائل کی روشنی میں نئے مسائل و واقعات کا حل تلاش کرتے اور ان پر فتوی دیتے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں متاخرین کی آراء مختلف ہوں تو وہ اپنی ترجیح بدلائل بیان کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں فتاویٰ عالمگیریہ کے حاشیہ پر شائع ہوئی۔

(۲) قاضی خان، فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندي الفرغاني رحمه الله تعالىٰ: فتاوى، ج ۲، مطبوعه كلكتة (هند)، ۱۸۳۵م (فتاویٰ عالمگیری کے حاشیہ پر) كتاب الاجارات، ص ۴۰۳

مشہور بہ خواہر زادہ فرماتے ہیں کہ اگر کاشتکار نے کھیتی کر لی اور بعد میں زراعت کسی آفت سے برباد ہو گئی تو اس صورت میں بھی پورا لگان واجب نہیں ہو گا بلکہ جس عرصہ تک کاشت موجود رہی اس مدت کا لگان واجب ہو گا اور تباہی کے وقت سے آخر سال تک کا معاف ہو جائے گا۔

❷ رجل أستاجر أرضا فزرعها فلم يجد ماء يسقيها فيلبس الزرع قالوا: ان أستاجرها بغير شرب فلم ينقطع ماء النهر الذی يرجی منه السقی، فعليه الأجر، و إن أنقطع كان له الخيار، و إن استاجرها بشربها فانقطع منه الشرب فجاء وقت الذی يفسد فيه الزرع عند القطاع الماء فسد الزرع سقط عنه الأجر الخ.[1]

ترجمہ: (ایسے) کاشتکار کا معاملہ جس نے اگر زمین کو لگان پر لیا اور اس میں کاشت کی اور پھر پانی میسر نہ آیا اور کھیتی خشک ہو گئی تو فقہاء کہتے ہیں: اگر کاشتکار نے پانی کی شرط کے بغیر لگان پر لیا ہے اور جس نہر سے پانی مل سکتا تھا اس کا پانی بھی منقطع نہیں ہوا تو اس صورت میں کاشتکار پر لگان واجب ہے اور اگر پانی کی سبیل منقطع ہو گئی اور وہ بن نہیں پڑ تا تو اس کو اختیار ہے کہ وہ زمین کو واپس کر دے۔ اور اگر زمین پانی کی شرط کے ساتھ ملی ہے اور پانی کے ذرائع منقطع ہو گئے اور وہ وقت آ گیا کہ جب پانی کی محرومی کی وجہ سے کھیتی ضائع ہو جاتی ہے اور ضائع ہو گئی تو اس صورت میں کاشتکار سے لگان معاف ہے۔

❸ ولو أستاجر أرضا بشربها ليزرع فيها فخرب النهر الأعظم فلم يستطع سعيها فهو بالخيار إن شاء ردّها و إن شاء

(۱) حوالہ بالا

امسکھا. فان لم یرد حتی مضت المدة کان علیه الأجر إذا کان بحال یمکنه أن یحتال بحیلة وزرع فیها شیئا بغیر ماء بوجه من الوجوہ ولا حیله فی ذالك فلا أجر علیه الخ.[1]

ترجمہ: اور اگر زمین کو پانی کی شرط کے ساتھ کھیتی کے لیے لیا ہے اور پھر بڑی نہر خراب ہو گئی (اور یہ گولوں اور جیہوں سے) پانی حاصل نہ کر سکا اور سیرابی کی کوئی صورت نہ بن پڑی تو اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو زمین کو واپس کر دے اور چاہے تو قبضہ میں رکھے۔ پس اگر واپس نہ کی اور مقررہ مدت ختم ہو گئی تو اگر یہ صورت ہے کہ اس کو ایسے ذرائع ممکن ہیں کہ بغیر پانی کے وہ اس میں زراعت کر سکتا ہے تب تو لگان واجب ہو گا اور اگر زراعت کی کوئی صورت بھی نہیں ہو سکتی تو لگان واجب نہیں ہے۔

④ رجل أستاجر أرضا فأنقطع الماء إن کانت والأرض تسقی بماء الارض وماء المطر، وانقطع ماء المطر أیضا لا أجر علیه لأنه لم یتمکن من الإنتفاع بها الخ.[2]

ترجمہ: اگر کاشتکار نے زمین کو نقد لگان پر لیا، پھر پانی میسر نہ آسکا اور زمین کنوئیں وغیرہ کے پانی اور بارش کے پانی دونوں سے سیراب ہونے والی ہے، اور بارش کا پانی بھی منقطع ہو گیا تو اس صورت میں لگان معاف ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ زمین سے فائدہ اٹھانے پر قادر نہیں ہے۔

اور جن بعض صورتوں میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ یا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک لگان واجب رہتا ہے ان کے نزدیک بھی یہ فیصلہ ہے کہ زمیندار کو کاشت

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا

کار سے اس وقت تک مطالبہ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ اس کے حالات درست نہ ہو جائیں اور وہ بآسانی لگان ادا کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔ چنانچہ شیخ منصور علی ناشف رحمہ اللہ التاج الجامع الاصول کے باب وضع الجوائح سے متعلق احادیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ظاهر ما تقدم أن من أستاجر أرضا وزرعها أو اشترى زرعا أو ثمرا بعد بدوّ صلاحه ثم أصابته جائحة فالحكم وضعها أى سقوط اجارة الأرض وثمن الزرع والثمر بسببها وعليه جماعة. ومنهم الشافعي فى القديم. وقال فى الجديد وابوحنيفة عليه الضمان. ولكن ينبغى المدائن التساهل معه للحديث الاول. الخ[1]

ترجمہ: اس سے قبل جو احادیث مذکور ہوئیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی نے زمین کو نقد لگان پر لیا اور زراعت کی یا زراعت کو یا درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کو ان کے قابل استعمال ہونے کے بعد خرید لیا پھر اس کو آفت نے آدبایا اور برباد کر دیا تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ لگان اور زمین اور پھلوں کی قیمت دونوں مستاجر اور خریدار سے ساقط ہو جائیں گی اور اسی پر فقہاء کی ایک جماعت نے فتویٰ دیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ قدیم بھی یہی ہے اور ان کا قولِ جدید اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ (ان تفصیلات کے ساتھ جو گذشتہ سطور میں بیان ہو چکیں) کاشت کار پر لگان اور خریدار پر قیمت واجب ہے لیکن "صاحبِ زمین اور صاحبِ ثمر" کو چاہیے کہ حدیثِ اول کے مطابق اپنے مطالبہ میں سہولت اور نرمی کا معاملہ کرے۔

(۱) ناشف، شیخ منصور علی رحمہ اللہ تعالیٰ، ناصف ازهری، التاج الجامع الأصول، باب وضع الجوائح، ۲/۲۶۲

لیکن لگان کی کمی اور معافی کا یہ حکم ان ہی صورتوں میں ہے کہ زمین اور کھیتی پر آئی ہوئی تباہی مستاجر کے اختیار سے باہر ہے اور اگر یہ تباہی اور خرابی اپنے ہاتھوں سے لائی گئی ہے یا جان بوجھ کر غفلت برتی گئی تو پھر کمی یا معافی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ یہ صاحبِ زمین کو نقصان پہنچانا ہے اور "ضرار" میں داخل ہے۔

جب سرکار اور کاشتکار کے درمیان زمیندار کا دخل ہو:

۴ اگر کاشت کار زمین کا خود مالک نہیں ہے اور حکومت اور کاشت کار کے درمیان زمیندار کا بھی داخل ہے تو سرکاری مالگذاری (عشر یا خراج) اصولاً زمیندار کے ذمہ ہے نہ کہ کاشت کار کے ذمہ، چنانچہ فقہ میں اس کی جو جزئیات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ تصریحات موجود ہیں:

۱ والحاصل ان العشر عند الإمام على رب الأرض مطلقا وعند هما كذلك لو البذر ولو من العامل فعليهما. ثم اعلم ان هذا كله في العشر إما الخراج فعلى رب الأرض اجماعا. الخ[1]

ترجمہ: حاصل کلام یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک "عشر" ہر حالت میں مالکِ زمین کے ذمہ واجب ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے اگر بیج مالکِ زمین کے ذمہ ہے اور اگر کاشتکار کے ذمہ ہے تو دونوں کے ذمہ بقدر حصہ ہو گا اور واضح رہے کہ یہ تفصیل بھی صرف عشر کے متعلق ہے لیکن خراج اور نقد لگان (کراء الارض) میں باتفاق ہر صورت میں مالگذاری زمیندار کے ذمہ ہے۔

۲ وفي المزارعة إن كان البذر من رب الأرض فعليه، ولو من العامل فعليهما بالحصة الخ.[2]

---

(۱) ابن نجيم: بحر الرائق، ۱۱۷/۵

(۲) ابن العابدين: ردالمختار، ج ۲، مطبع دار السعادة، قاهرة ۱۳۲٤هـ، باب ۱۰، ص ٧٦

ترجمہ: اور مزارعۃ (بٹائی) میں اگر بیج مالکِ زمین کا ہے تو عشر اسی پر واجب ہو گا اور اگر کاشت کار کے ذمہ بیج ڈالنا ہے تو دونوں پر حصہ رسدی واجب ہو گا۔

ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں سرمایہ (زمین) اور محنت میں عادلانہ توازن کا بخوبی لحاظ رکھا گیا ہے اور خاص مسئلہ میں محنت کو سرمایہ کے مقابلے میں نفع کا حق زیادہ دیا گیا ہے۔ نیز ان مسائل میں مالگذاری کے واجب ہونے نہ ہونے میں "بیج" کو اس لیے اہمیت دی گئی ہے کہ زمین کی کاشت کے مسئلہ میں جس کے ذمہ بیج ہوتا ہے حقِ انتفاع بھی اسی کو زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

سرکاری زمین کے کاشتکار کو بے دخل نہ کیا جائے:

⑤ اگر زمین سرکاری ہے اور کاشت کار مقررہ لگان (کراء الارض) ادا کر رہا ہے تو اس کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا اور یہ اس لیے کہ کاشتکار جبکہ زمین نہیں رکھتا اور اس نے اپنی معاشی زندگی کے لیے ایک زمین کو کرایہ پر حاصل کیا ہے تو اس کا یہ حق ہونا چاہیے کہ جب تک وہ زمین کا واجبی لگان ادا کرتا رہے اس سے یہ معاشی ذریعہ چھینا نہ جائے، چنانچہ شامی نے ارضِ موقوفہ (State Land or Endowed Land) کی بحث میں یہ تصریح کی ہے:

ثم إعلم أن أراضي بيت المال المسماة بأراضي المملكة وأراضي الحوذ إذا كانت في ايدي زراعها لا تنزع من أيديهم ما دموا يؤدّونها ما عليها، ولا يورث عنهم اذا ماتوا ولا يصح بيعهم لها، ولكن جرى الرسم في الدولة العثمانيه ان من مات عن ابن انتقلت لابنه مجانا والا فلبيت المال. الخ[1]

ترجمہ: یہ واضح رہے کہ بیت المال کی زمین کہ جن کو ارض حوز اور ارض مملکت کہا جاتا ہے ان کو اگر کاشتکار کاشت کر رہے ہیں تو جب تک وہ

(۱) حوالہ بالا، ج ۳، باب العشر والخراج والجزیۃ، ص ۵۵

اس کا مقررہ لگان ادا کر رہے ہیں ان زمینوں کو ان کے قبضہ سے نہیں
نکالا جائے گا۔ مگر وہ ان میں وراثت نہیں چلا سکتے اور نہ ان زمینوں کو
فروخت کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن دولتِ عثمانیہ میں یہ رسم جاری ہو گئی
ہے کہ اگر کسی کاشتکار کے انتقال کے وقت اس کا لڑکا موجود ہے تو وہ
سرکاری زمین اس کی جانب مفت منتقل ہو جاتی ہے ورنہ تو پھر بیت المال
ہی کی جانب واپس ہو جاتی ہے۔

یہ حکم اگرچہ زمینِ وقف اور زمینِ حکومت سے متعلق ہے لیکن کاشتکار کے قبضہ سے نکالنے کی جو فقہی وجہ بیان کی گئی ہے "کہ وہ مقررہ لگان برابر ادا کر رہا ہے" چونکہ یہ وجہ شخصی زمیندار کی زمین پر بھی صادق آتی ہے اس لیے خلیفہ اور امیرالمؤمنین کے اختیار میں ہے کہ وہ اگر چاہے تو یہی شخصی اراضی پر بھی عائد کر دے۔

نیز اس لیے بھی کہ جب کاشتکار کسی زمین کو محنت کے ذریعہ قابلِ کاشت بناتا ہے تو وہ یہ محنت اس یقین پر کرتا ہے کہ اس محنت کا پھل اس کے حصہ کے مطابق اس کو ضرور ملتا رہے گا۔ پس اگر زمیندار کو یہ حق بغیر کسی قید و شرط کے حاصل ہے کہ وہ جب چاہے کاشتکار کو زمین سے اس لیے بے دخل کر دے کہ وہ مالکِ زمین ہے تو ایسی حالت میں وہ کاشتکار کے اس نفع کا غاصب (Usurper) ہوتا ہے جس کو کاشتکار کی محنت نے کاشت کار کے لیے وقتی کاشت کے علاوہ بطور ثمرہ ممتد (Continuous) کے بخشا تھا البتہ اگر "زمین" عقد کے عرصہ بعد حالات و واقعات کی بناء پر ازدیاد (Increase) لگان کی مستحق ہے تو بلاشبہ صاحبِ زمین کو ازدیاد کے مطالبہ کا اسی طرح حق ہے جس طرح خصوصی حالات و واقعات کی بناء پر انتقاص (کمی) کے مطالبہ کا کاشتکار کو حق حاصل ہے۔

کاشتکار کا کاشت کردہ زمین پر رہائشی مکان اور درخت:

❻ اگر کاشت کار نے رہنے کے مکان میں یا کاشت کی زمین میں کوئی درخت لگالیا

ہے اور اس سے زمین کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا تو صاحبِ زمین اس درخت کو اکھاڑنے پر مجبور نہ کرے اور اگر لگانا چاہتا ہے تو اجازت دے دے اور یہ درخت کاشتکار ہی کی ملکیت میں رہے گا۔ البتہ جب وہ زمین سے بے دخل ہو جائے یا اجارہ فسخ ہو جائے تو صاحبِ زمین اگر اپنی زمین کو اس درخت سے خالی کرانا چاہے تو کاشتکار کو اپنا درخت اکھاڑ لینا ہو گا۔

للمستاجر غرس الشجر بلا إذن الناظر إذا لم يضرّ بالأرض وليس له الحفر إلا بإذن و يأذن له خيرا و إلا لا. وما بناه مستاجر أو غرسه فله مالم ينوه للوقف.[1]

ترجمہ: ناظر وقت کی اجازت کے بغیر کاشتکار کو درخت لگا لینے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ زمین کو اس سے نقصان نہ پہنچتا ہو اور اس کو ناظر کی اجازت کے بغیر زمین کی کھدائی کا حق نہیں ہے، مگر ناظر کو چاہیے کہ اگر زمین کے لیے یہ امر بہتر ہے اور مضر نہیں ہے تو اجازت دے دے ورنہ نہیں۔ تاہم کاشتکار نے جو مکان بنایا ہے یا جو درخت لگایا ہے وہ کاشتکار ہی کا ہے جب تک کہ وہ اس کو وقف نہ کر دے۔

غرض یہ اور اسی قسم کے اور حقوق ہیں جو کاشتکار کی آسانیوں اور سہولتوں کے پیشِ نظر قائم کیے گئے ہیں کیونکہ مبسوط اور دیگر کتب فقہ سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مزارعۃ اور اجارہ زمین کے جواز میں تعاونِ باہمی کے ساتھ ساتھ مستاجر (کاشتکار) کی معاشی حاجت کا انسداد اور رفعِ ضرورت زیادہ مقصود ہے۔[2]

---

(۱) درمختار بر رد المحتار: ۵۹۳/۳ بحث ارض موقوفہ والبحر الرائق، ۱۳/۸

(۲) نوٹ: اس بحث میں چند امور قابلِ لحاظ ہیں:

(الف) خراج ان زمینوں پر عائد ہوتا ہے جو کاشت کرنے والوں کی ذاتی ملکیت ہوتی ہیں اور اگر حکومت یا کسی دوسرے فرد کی زمین کو نقد اجرت پر کاشت کے لیے لیا جائے تو وہ "اجرت ارض" کہلاتی ہے۔ کتاب میں دونوں باتوں کی تفصیل کے باوجود ان مسائل میں دونوں کو ایک لفظ "لگان" ہی سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے ان مسائل میں دونوں کے احکام یکساں ہیں اور جن احکام میں فرق ہے وہ یہاں زیر

بنجر زمینوں کو مزروعہ بنانا

(Rerival of Waste Lands)

زراعت کو ترقی دینے اور اس کی افادیت کو وسیع کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جانے چاہئیں ان میں سے ایک ذریعہ "احیاءِ اموات" (Rerival of Waste Lands) ہے یعنی بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنانا گویا ناقابلِ کاشت زمین مردہ زمین ہے اور اس کو قابلِ کاشت بنانا اس کو زندگی بخشنے کے مترادف ہے چنانچہ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے قرآن عزیز نے یہی اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔

﴿فَأَحْيَا بِهِ ٱلْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۱)

ترجمہ: پھر زندہ کر دیا ہم نے پانی سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد۔

خشک چٹیل میدان، ریتلی زمینیں اور خشک ٹیلے عام طور پر ناقابلِ زراعت ہوتے ہیں مگر سخت محنت اور بعض زراعتی تدابیر کے ذریعہ ان میں سے اکثر حصہ کو قابلِ کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ پس اسلام کے معاشی نظام کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے کہ ملک کی اس قسم کی تمام زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے اور خام پیداوار سے ملک کو مالا مال کیا جائے اور حتی الامکان زمینوں کو بنجر نہ رہنے دیا جائے اسی طرح جو زمینیں قابلِ کاشت ہونے کے باوجود غیر آباد پڑی ہیں یا لاوارث ہیں ان کو بھی مزروعہ بنایا جائے۔ اور بیکار و معطل نہ رہنے دیا جائے۔

بحث نہیں ہیں۔

(ب) عام بول چال میں لگان اور مالگذاری میں فرق ہے اگرچہ حاصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کاشتکار اگر خود مالک زمین ہے تو اس سے وصول شدہ ٹیکس "مالگذاری" کہلاتا ہے اور اگر حکومت اور کاشتکار کے درمیان زمیندار ہے تو حکومت جو ٹیکس زمیندار سے لیتی ہے وہ مالگذاری کہلاتا ہے اور زمیندار کاشتکار سے جو اجرت لیتا ہے وہ لگان ہے۔

(ج) "عشر" کے علاوہ "جو کہ ایک مقررہ زکوٰۃ ہے" تخفیف لگان و مالگذاری کے مسائل "خراج" اور "اجارہ" (کراء الارض) دونوں سے متعلق ہیں۔

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ١٦٤

بنجر زمین کی آبادی کاری کے طریقے:

اسلام کے معاشی نظام میں اس کے لیے دو طریقے ہیں:

اقطاع یا جاگیر کا طریقہ:

ایک یہ کہ امیرالمؤمنین افرادِ ملک کو ترغیب دے اور اعلان کرے کہ جو شخص ان زمینوں کے جس قدر حصہ کو آباد کرے گا وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا اس کو عربی میں اقطاع اور اردو میں "جاگیر" کہتے ہیں۔

وللإمام أن يقطع كل موات، وكل ما كان ليس لأحد فيه ملك، وليس في يد أحد و يعمل في ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين وأعم نفعا.[1]

ترجمہ: اور امام کو چاہیے کہ وہ بنجر زمینوں کو اور غیر مملوکہ اور لاوارث زمینوں کو جاگیر کے طور پر دے دے (تاکہ وہ مزروعہ بن سکیں) اور ان کے سلسلہ میں ایسا عمل اختیار کرے جس میں تمام مسلمانوں کی بھلائی اور نفع عام ہو۔

"اور فقہاء کے نزدیک بنجر زمین، سخت زمین، ریتلی یا ریت چڑھی ہوئی زمین، پتھریلی زمین ٹیلے جو آبادی سے دور ہوں اور جن کا نہ کوئی مالک ہے یا مالک کا پتہ نہیں چلتا اور خلاصۂ کلام یہ کہ جو زمین ناکارہ پڑی ہو اور اس کی خرابی قدیم اور عادی ہو (تو یہ سب موات ہیں) پس اگر کسی مسلمان یا ذمی (کافر) نے خلیفہ کی اجازت سے اس کو زندہ (قابلِ زراعت) کر لیا تو وہ زمین اسی کی ملکیت ہو جائے گی۔"[2]

اور اگر امام یہ سمجھ کر کہ زمین بہت زیادہ محنت اور خرچ کے بعد قابلِ کاشت ہو سکتی ہے ایک دو سال کا لگان بھی معاف کر دے تو اس کو ایسا کرنے کا مجاز ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی زمینوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

---

(۱) ابو یوسف: كتاب الخراج، باب في موات الأرض في الصلح والعنوة وغيرها، ص ۱۴۱

(۲) سعیدیات في المعاملات: ص ۳۰۰، ۳۰۱

❶ من عمر أرضا ليست لأحد فهو أحق بها.[1]

ترجمہ: جس شخص نے ایسی زمین کو کاشت کے قابل بنالیا جو کسی کی ملک نہیں ہے تو وہ شخص ہی اس کی ملکیت کا مستحق ہے۔

❷ من أحيا أرضا مواتا فهي له.[2]

ترجمہ: جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کرلیا وہ اسی کی زمین ہے۔

بنجر زمین کی آباد کاری کی شرائط:

اس کے لیے تین شرطیں ہیں:

❶ ایک یہ کہ وہ زمین فناءِ شہر میں شامل نہ ہو یعنی عام شہری ضروریات کے کام میں نہ آتی ہو۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

"اور اے امیر المؤمنین! آپ نے ان زمینوں کے متعلق دریافت کیا ہے جو فوج کشی کے ذریعہ سے یا مصالحت کی راہ سے فتح کی گئی ہیں اور ان زمینوں کے متعلق دریافت کیا ہے جو بعض دیہات میں اس حالت کے اندر موجود ہیں کہ نہ ان میں مکان ہونے کے نشانات پائے جاتے ہیں اور نہ زراعت کے تو ان کے متعلق کیا مشورہ ہے؟ پس اگر ایسی زمینوں میں نہ مکانیت کے اثرات ہوں اور نہ زراعت کے اور نہ وہ اہل بستی کے حق میں فئ ہو اور نہ قبرستان ہو اور نہ چراگاہ اور نہ وہ کسی کی ملکیت ہو اور نہ کسی کی مقبوضہ تو ایسی زمین "أرض اموات" ہے پس جو شخص اس کو یا اس میں سے بعض حصہ کو زندہ (کاشت) کرلے تو وہ اسی کی ملک ہو جائے گی۔"[3]

---

(۱) صحیح امام بخاری، ابواب الحرث والمزارعة، باب من أحیا أرضا مواتا

(۲) جامع ترمذی، ج ۲. ابواب الاحکام. تحفة الاحوذی باب ما ذکر فی أحیاء أرض الموات. ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الأرض الخ ص ۱۳۸

(۳) حوالہ بالا: ص ۱۳۷

ایسی زمینوں کے متعلق جاگیر کے طور پر دے دینے کا بھی اختیار ہے اگر مناسب سمجھیں اور اجرت پر کاشت کرالینا یا کوئی دوسرا مناسب طریقہ اختیار کر لینا بھی جائز ہے۔[۱]

❷ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایسی زمین پر اجازت امام سے قبضہ کر لینے کے بعد تین سال تک اس کو بنجر ہی رہنے دیا اور جاگیر دینے کا جو مقصد تھا وہ پورا نہ کیا تو وہ زمین اس کے قبضہ سے نکال لی جائے گی اور کسی دوسرے شخص کو دے دی جائے گی جو اس کو کاشت کرے اس لیے کہ اس نے اس مفاد کو پورا نہ کیا جس کے لیے زمین اس کو بطور جاگیر دی گئی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

عادی الأرض لله وللرسول ثم لکم من بعد فمن أحیاء أرضا میتا فهی له ولیس لمحتجر حق بعد ثلاث۔[۲]

ترجمہ: افتادہ (غیر مملوکہ) زمین اللہ اور اس کے رسول (خلافت) کی ہے پھر اس کے بعد تمہارے لیے ہے پس جس شخص نے اس کو زندہ کاشت کر لیا تو وہ اسی کی ملک ہے اور بے کاشت روک رکھنے والے کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جاتا ہے۔

بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۳] کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا: ص ۱۳۹

(۳) بلال بن حارث ابن عاصم بن سعید بن قرۃ بن خلاف بن ثعلبہ ابو عبد الرحمٰن مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ۵ ہجری میں قبیلہ مزینہ کا وفد لے کر حاضر ہوئے تھے۔ فتح مکہ کے دن قبیلہ مزینہ کا جھنڈا انہوں نے تھام رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد انہوں نے بصرہ اقامت اختیار کر لی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے آخری دنوں میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔ (دیکھئے: ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ تعالیٰ: اسد الغابة فی معرفة الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنهم، ترجمہ بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ. مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ: التعلیق الممجد لمؤطا امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، حاشیہ باب الرکاز)

ایک بہت بڑا "مربعہ" جاگیر کے طور پر دے دیا تھا مگر وہ اس تمام کو کاشت میں رکھنے سے معذور تھے اس لیے ایک کافی حصہ اراضی بیکار پڑی رہتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو بلا کر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو اس لیے جاگیر دی تھی کہ اس کو کام میں لاؤ اور فائدہ اٹھاؤ مگر اتنے بڑے حصہ آراضی کو تم کام میں لانے سے معذور ہو۔ لہذا بقدرِ ضرورت رکھ لو اور باقی واپس کر دو تاکہ میں حاجت مند مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔

فقال: لا افعل، واللّٰہ شیئا اقطعنیہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم. فقال عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ: واللّٰہ لتفعلن فأخذ منہ ما عجز عن عمارتہ فقسمہ بین المسلمین.[1]

ترجمہ: بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: یہ جاگیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بخشی ہوئی ہے خدا کی قسم! میں ہرگز اس میں سے کچھ نہ دوں گا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم! تجھ کو یہی کرنا ہوگا اور جس قدر اراضی کو وہ کام میں لانے سے عاجز تھے اس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔

۳ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ زمین، کنوئیں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی حریم (Boundary) نہ ہو۔[2]

---

(۱) ابو عبید: کتاب الاموال، ص ۲۹۰

(۲) جنگل میں کنوئیں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی ضروریات اور ان کی حفاظت کے لیے چہار جانب جو جگہ چھوڑی جاتی ہے اس کو "حریم" (باڑہ) کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جو کنوئیں چوپایوں کے پانی پینے کے لیے ان کے چہار جانب چالیس گز زمین چھوڑی جائے اور جو زراعت کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے لیے ساٹھ گز مربع زمین اور چشموں کے لیے پانچ سو گز زمین مربع چھوڑنی چاہیے۔ کتاب الخراج ص ۱۰۰ اوسعیدیات جز ص ص ۲۱۲۔

آباد کاری کا دوسرا طریقہ:
حکومت اپنی نگرانی میں کاشت کرائے:

بنجر زمینوں کو آباد کرنے اور کاشت کے قابل بنانے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ حکومت (خلافت) خود اپنی نگرانی میں کاشت کرائے اور وہ حکومت ہی کی ملکیت رہیں۔

ایسی زمینوں کے لگان کے متعلق فقہی احکام یہ ہیں کہ اگر یہ زمین ذمی کے قبضہ میں دی گئی ہے تو باتفاق آراء (Consensus of Opinions) اس پر خراج مقرر کیا جائے گا اور اگر ''مسلم'' کے قبضہ میں دی گئی ہے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور دوسرے آئمہ کے نزدیک اگر وہ زمین عشری زمینوں سے ملحق یا اس کا جزء ہے تو اس پر ''عشر'' واجب ہو گا اور اگر خراجی زمینوں سے ملحق یا اس کا حصہ ہے تو اس پر ''خراج'' عائد ہو گا۔

اور امام محمد رحمہ اللہ [1] فرماتے ہیں کہ اگر عشری زمین کے پانی سے اس زمین کو سیراب کیا گیا ہے تو اس پر عشر عائد ہو گا اور اگر خراجی زمینوں کے پانی سے سیراب کی گئی ہے تو خراج واجب ہو گا۔ [2]

---

(۱) امام محمد، محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ (۱۳۲ھ۔۱۸۹ھ) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ فقہ حنفی کی تدوین و اشاعت کا تقریباً سار کام آپ ہی کتب سے ہوا۔ جنہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: کتب ظاہر الروایۃ جن میں المبسوط، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، کتاب السیر الکبیر، کتاب السیر الصغیر اور زیادات ہیں، جنہیں ابو الفضل مروزی رحمہ اللہ نے ''الکافی'' میں اکٹھا کیا، جن کی شرح شمس الآئمہ امام سرخسی رحمہ اللہ نے ''المبسوط'' میں تیس (۳۰) بڑی بڑی جلدوں میں لکھی۔ دوسری قسم کتب النوادر پر مشتمل ہے۔ اس قسم میں کتاب امالی یا کسانیات (جسے شعیب کسائی نے روایت کیا) کتاب الرقیات، کتاب ہارونیات، جر جانیات، کتاب المخارج فی الحیل، الزیادات اور کتاب نوادر محمد رحمہ اللہ بروایت ابن رستم رحمہ اللہ۔ آپ ہارون الرشید کے عہد میں رقہ کے قاضی بھی رہے آپ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ —— بانی فقہ شافعی —— کے استاد ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ)

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الأرض فی الصلح والعنوۃ وغیرھما. فتاوی عالمگیری، کتاب الخراج

چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس جانب پوری توجہ فرمائی اور اذن عام دیا کہ جو شخص ان زمینوں کو آباد کرے گا وہ اسی کی ملک ہو جائے گی اور اگر کسی نے قبضہ سے تین سال تک اس کو مزروعہ نہ بنایا آباد نہ کیا تو اس کے قبضہ سے نکال لی جائے گی اس فرمان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس طرح قلمرِ خلافت کی تمام زمینیں مزروعہ اور آباد ہو گئیں اور حکومت کی ترقی کا باعث بنیں۔[۱]

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احیاء موات کے لیے اقطاع (جاگیر دینے) کا یہ طریقہ سلف میں مسلسل جاری رہا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اقطاع (جاگیر دینے) کے بارہ میں ان آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف قوموں کو زمینیں دی ہیں اور آپ کے بعد خلفاء نے بھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس عمل میں یہ حکمت سمجھی کہ اس ذریعہ سے اسلام کے ساتھ قوموں کی رغبت بھی بڑھتی ہے اور زمین کی آبادی بھی ہوتی ہے اور اسی طرح آپ کے خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس اسلامی بیت المال کی رفاہیت و ترقی اور دشمن کو زک دینے کا سبب سمجھتے تھے یعنی مالی خوشحالی حکومت کے ساتھ رعایا کی وفاداری کا موجب ہوتی ہے۔[۲]

---

(۱) ابو یوسف: حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا. غیر مزروعہ اور بنجر زمینوں (Un-Cultivated & Barren Lands) کی آبادی کاری کے سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا اپنے گورنر کے نام حکم ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔ ترجمہ پڑھئے:

"اپنے صوبہ میں (بے کار) پڑی زمینوں کا اچھی طرح جائزہ لو اور انہیں پیداوار کے پچاس فی صد (۵۰٪) حصہ پر مزارعت کی شرط پر (بے زمین کسانوں یا ضرورت مند کسانوں میں) تقسیم کر دو۔ اگر زمین کم تر درجہ (زرخیزی) کی ہو تو ایک تہائی (۱/۳ حصہ) بلکہ اس سے بھی کم ریاستی حصہ پر دے دو، حتیٰ کہ (زمین کے محل وقوع اور زرخیزی کو مدنظر رکھتے ہوئے) دسویں (۱/۱۰) حصہ پر دے دو۔ البتہ اگر زمین اتنی ہی بنجر اور بے کار ہو گئی ہے کہ کوئی شہری اسے ۱/۱۰ حصہ پر بھی کاشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اسے مفت دے دو۔ اگر کوئی ایسی بنجر زمین ہو جسے کوئی کسان مفت کاشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر مسلمانوں کے بیت =

ذرائع آبپاشی کو ترقی دینا

نہریں:

زراعت کی ترقی اور وسعت کے سلسلہ میں چوتھا ذریعہ "وسائل آبپاشی کو سہل الحصول اور وسیع بنانا ہے" اسی وجہ سے زراعتی ترقی میں نہروں اور آبپاشی کے کنوؤں کو بہت دخل ہے اور آبپاشی کی وسعت ہی ایک ذریعہ ہے جو زراعت کی بیش از بیش ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

آب پاشی کے اصول:

اس لیے اسلام نے بھی اپنے اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کو عملی صورت دینے اور اس کے افادہ کو زیادہ سے زیادہ عام بنانے کے لیے چند اصول مقرر کیے ہیں:

❶ تالاب کھیتیاں، جوہڑ، کنوئیں اور چشمے اگر شخصی ملکیت نہیں ہیں تو ان میں تمام پبلک کا یکساں حق انتفاع (Right of Benefit) ہے اور وہ کسی بھی حال میں شخصی ملکیت نہیں بن سکتے۔ قرآن عزیز میں ناقہ صالح (علیہ السلام) کے واقعہ میں ہے:

﴿لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿١٥٥﴾﴾ (۱)

ترجمہ: ناقہ کے لیے ایک دن پانی کی باری ہے معین اور تمہارے لیے ایک دن معین۔"

﴿وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾﴾ (۲)

المال سے خرچ کر کے اسے زیر کاشت لاؤ (اور ایسا کرتے رہو) یہاں تک کہ تمہارے زیر تسلط کوئی بھی زمین تمہاری عدم توجہ کا شکار (ہو کر بے کار) نہ ہو جائے۔" (یحیی بن آدم القرشی: کتاب الخراج، مطبوعہ لیدن، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۵)

(۱) سورۃ الشعراء (۲٦): ۱۵۵

(۲) سورۃ القمر (٥٤): ۲۸

ترجمہ: (اور ان کو مطلع کر دو کہ پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان باری سے بٹا ہوا ہے لہذا اپنی باری پر پہنچنا چاہیے)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''المبسوط'' میں ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام مسلمان تین چیزوں میں برابر کے شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ۔ اور دوسری روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام انسان ان تینوں چیزوں میں برابر کے حصہ دار ہیں اور یہ روایت پہلی روایت سے عام ہے کیونکہ اس میں مسلمان اور کافر سب کی شرکت کا اعلان ہے۔ اور واقعہ بھی یونہی ہے کہ تمام انسان ان چیزوں میں برابر کے حقدار ہیں اور پانی کے بارے میں یہ شرکت وادیوں کے پانی اور دریاؤں (یعنی خود رو پانی) سے متعلق ہے۔ مثلاً سیحون، جیحون، فرات، دجلہ، نیل وغیرہ اس لیے کہ ان سے فائدہ اٹھانا ایسا ہے جیسا کہ سورج کی دھوپ اور ہوا سے فائدہ حاصل کرنا کہ اس میں تمام کائناتِ انسانی مساوی شریک ہیں اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس افادہ سے دوسرے کو روک دے یا اس کی مثال راستہ اور شارع عام کی سی ہے جس پر ہر مسلم و کافر سب کو چلنے کا برابر حق ہے اور لفظ شرکت سے اصل اباحۃ (Permission) اور انتفاع (نفع اُٹھانے) میں تمام انسانوں کا مساوی ہونا مراد ہے یہ مراد نہیں کہ وہ ان کی ملک ہے اس لیے کہ پانی وادیوں اور دریاؤں میں کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتا۔ [1]

❷ اور اگر یہ پانی شخصی ملکیت بھی ہو تب بھی عام حالات میں پینے اور استعمال کرنے کے لیے دوسروں کو اس سے یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے کیونکہ پانی اپنے مقام میں کسی کی بھی شخصی ملک نہیں ہے اور نہ اس حالت میں اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔ البتہ انسانوں اور حیوانوں کے پینے اور نہانے جیسی ضرورتوں کے علاوہ ''آبپاشی کے لیے'' مالکِ زمین سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے اور بصورتِ اذن مالک کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس کی اجازت دے اور اگر ایسا کرنے میں خود اس کی

---

(۱) امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، مطبع السعادۃ، قاہرۃ، ۱۳۳۱ھ، ۱۲/۱٦٤

اپنی زراعت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو وہ دوسروں کو آبپاشی کرنے سے روک دینے کا مجاز ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب سعیدیات، مبسوط اور کتاب الخراج میں ہے:

اور بعض پانی ذاتی ملک بھی ہوتے ہیں جو شخصی کنوؤں، حوضوں، گولوں اور خاص چشموں کی صورتوں میں نظر آتے ہیں تو ان میں بھی ہر شخص کو پانی پینے اور اپنے چوپایوں کو پانی پلانے کا عام حق ہے، جیسا کہ گذشتہ حدیث سے واضح ہے اور اگر چوپایوں کی آمد و رفت سے کنوئیں یا نہر کی فصیلوں کو تباہ ہونے اور خراب ہو جانے کا خطرہ ہو تو مالک زمین اس کی حفاظت کی حد تک روک بھی سکتا ہے البتہ ایسے کنوؤں، حوضوں، نہروں اور خاص چشموں سے دوسروں کو آبپاشی کرنے کا حق نہیں ہے۔[1]

والماء فی الحوض لیس مملوك لصاحب الحوض فلا یجوز بیعه الخ.[2]

ترجمہ: اور حوض میں جمع کردہ پانی صاحبِ حوض کی ملک نہیں ہے اس لیے اس حالت میں اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

وله أن یمنع السقی للأرض والزرع والنخل والشجر، ولیس لأحد أن یسقی شیئا من ذالك إلّا بإذنه.[3]

ترجمہ: اور مالک کا یہ حق ہے کہ وہ زمین، کھیت، کھجوروں کے باغ اور درختوں کی آبپاشی سے روک دے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر آبپاشی کا اقدام کرے۔

---

(۱) سعیدیات: جزء ۲ ص ۳۰۳

(۲) سرخسی رحمه الله تعالیٰ: المبسوط، ۱۹٤/۲۳

(۳) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی القنی والآبار والانهار والشرب، (شرب الشفقة)، ص ۲۰۵

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے غلام نے ان کو خط لکھا کہ میں نے آپ کی زمینوں کی آب پاشی اور باغوں کی سیرابی کے بعد باقی پانی کا معاملہ تیس ہزار درہم میں دوسروں سے کر لیا ہے اور آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جواب دیا: میں تمہارا مطلب سمجھ گیا لیکن میرے پیشِ نظر وہ حدیث ہے جس میں ضرورت سے فاضل پانی اور گھاس کو روکنے اور دوسروں کو فائدہ نہ پہنچنے دینے والے شخص کے بارہ میں سخت وعید کا تذکرہ اور قیامت میں رسوائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ لہذا تم زمینوں اور باغوں کی سیرابی و آبپاشی کے بعد ہمسایوں کو موقع دو کہ وہ اس پانی سے مفت اپنے کھیت اور باغ سیراب کریں اور اس میں درجہ بدرجہ نزدیکی کا لحاظ رکھنا۔ والسلام [۱]

نہریں:

آبپاشی کے لیے کثرت سے نہریں کھدوائی جائیں اور اس کا تمام خرچ بیت المال (سرکاری خزانہ) پر لازم ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو اہلِ دول پر جبر کیا جائے گا، کہ وہ حکومت کو اس معاملہ میں مدد دیں۔

"اور اگر نہریں حکومت کی جانب سے کھودی جارہی ہیں تو ان کا تمام خرچ بیت المال کے ذمہ ہے اس لیے کہ وہ مصلحت عامہ کے لیے ہیں لہذا کسی خاص جماعت پر اس کا خرچ نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ بیت المال میں اگر مال موجود ہے تو اسی قسم کی مصالح کے لیے ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو خلیفہ لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ نہروں کی اس کھدائی میں صرف کے ذمہ دار ہوں اس لیے کہ بیت المال میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے اگر نہروں کی کھدائی نہ کی جائے گی تو یہ لوگوں کے لیے بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگا اور یہ شاذ و نادر بات ہے کہ عام مصالح کی خاطر لوگ برضاء و رغبت خرچ پر تیار ہو جائیں اور چونکہ امام مصالح عامہ کا نگران ہے

(۱) حوالہ بالا، باب بیع الماء، ص ۲۰۷

اس لیے اس کو اس معاملہ میں جبر کرنے کا حق ہے۔"(۱)

❹ جو چھوٹی چھوٹی نہریں عام مصالح آبپاشی اور بہمرسانی آب کے لیے نہ بنائی جائیں بلکہ ان کو اہل محلہ یا اہل قصبہ و شہری اپنی ضروریات کے لیے بنانا چاہیں تو اگر اس میں مصالح عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور جس دریا یا بڑی نہر سے پانی لیا جائے گا اس کو نقصان پہنچ کر عام ضروریات کے لیے حرج پیدا نہ کرتا ہو تو امام ایسی خصوصی نہروں کی اجازت دے سکتا ہے البتہ ان کے اخراجات کا مطالبہ کرنے والوں پر پڑے گا۔ حکومت کا خزانہ ذمہ دار نہ ہو گا۔

"اور اگر نہر کسی ذاتی ملکیت میں اس کی خاص اپنی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہے تو اس کے مصارف کا تمام بار اسی پر ہو گا کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور اس کی منفعت خاص اس کی جانب راجع ہے۔"(۲)

❺ آبپاشی کی نہریں اور کنوئیں پبلک کی مصالح عامہ اور معاشی وسائل کی ترقی کے لیے ہیں حکومت کے محاصل میں اضافہ کرنے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہیں اس لیے حکومت کی نہروں اور کنوؤں سے آبپاشی کرنے والوں سے یا تو قطعاً محصولِ آبپاشی نہ لیا جائے یا صرف اس قدر لیا جائے جس قدر ان نہروں اور کنوؤں کی بقاء کے لیے ضروری ہو باقی انتظامات کا کل خرچ بیت المال پر ڈالا جائے۔ مبسوط میں ہے:

"کیا تم کو یہ معلوم نہیں کہ امام پر یہ واجب ہے کہ بیت المال کے مال سے چھوٹے بڑے پل اور مہمان سرائیں تیار کرائے اسی طرح اس کے ذمے یہ بھی واجب ہے کہ اس بڑی نہر کا خرچ بھی بیت المال ہی پر ڈالے اور اسی طرح اس کے کناروں کی درستی و اصلاح کا بھی اگر اس کی خرابی کی وجہ سے غرق ہونے کا اندیشہ ہے۔"(۳)

---

(۱) سعیدیات: ۳۰۴/۲. ابو یوسف: کتاب الخراج، باب بیع الماء، الشرکۃ فی الماء —— امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، ۱۷۸/۲۳

(۲) سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ: المبسوط، ج ۲۲ کتاب الشرب

(۳) حوالا بالا: ص ۱۷۵

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نہریں:

بہرحال اسلامی نظامِ اقتصادی میں ان اصولوں کے پیشِ نظر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں اس محکمہ پر خاص توجہ دی گئی، نہریں جاری کی گئیں، بند باندھے گئے، تالاب بنائے گئے۔ گولیں اور چھوٹی نہریں نکالی گئیں اور اس طرح زراعت کو بھی ترقی دی گئی اور پانی کی قلت کا حل بھی کیا گیا۔ (۱)

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مقصد کے لیے ایک بڑا محکمہ آبپاشی (Irrigation Department) قائم کیا اس محکمہ کی وسعت کا اندازہ لگائیے کہ صرف مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار کارندے (Employees) سال بھر اس کام میں لگے رہتے، جن کی تنخواہیں اور دیگر مصارف بیت المال سے دیئے جاتے تھے۔ (مقریزی رحمہ اللہ تعالیٰ: الخطط، ۶/۱)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر حضرت جزر بن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہواز، خوزستان کے اضلاع میں بہت سی نہریں تیار کرائیں، جن کی بدولت بہت سی بنجر اور دو افتادہ زمینیں آباد ہو گئیں اور امت کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بنیں۔ (شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ: الفاروق، ج ۲، عنوان: محکمہ آبپاشی)

نہر ابی موسیٰ۔ یہ نہر بصرہ کے لوگوں کے لیے دریائے دجلہ سے کاٹ کر بنائی گئی۔ اس کی لمبائی ۹ (نو) میل تھی یہ نہر حضرت حنیف بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی درخواست پر کھدائی گئی جو ایک وفد کے ساتھ اس غرض کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نہایت مؤثر تقریر میں یہ عوامی مطالبہ پیش کیا۔ چونکہ یہ نہر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر بصرہ نے حضرت امیرالمؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر کھدوائی۔ لہٰذا اس کا نام "نہر ابی موسیٰ" رکھا گیا۔

نہر معقل: یہ نہر بھی دجلہ سے کاٹ کر لائی گئی تھی۔ اس کی کھدائی کا سارا اہتمام حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد تھا، لہٰذا اس کا نام ہی "نہر معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ" پڑ گیا۔

نہر سعد: یہ کوفہ کے علاقہ انبار (جو آج کل بھی عراق کا ایک صوبہ ہے، اور عراق پر غیر ملکی غاصبین کے خلاف مزاحمتی تحریک کا مرکز ہے) کے باسیوں کی درخواست پر نکالی گئی۔ انبار کے عوام کے مطالبہ پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر کوفہ نے حضرت سعد بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس پر مامور فرمایا انہوں نے بڑے اہتمام سے شروع کر دیا، مگر کچھ دور جا کر درمیان میں ایک پہاڑ حائل ہو گیا، کام وقتی طور پر روکنا پڑا۔ حجاج بن یوسف نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اس پہاڑ کو کاٹ کر بقیہ کام مکمل کرایا۔ چونکہ آغاز اور کام کا اکثر حصہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں ہوا، لہٰذا نہر کا نام نہر سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑ گیا۔

نہر امیرالمؤمنین: یہ نہر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر دریائے نیل کو بحیرہ قلزم (بحر احمر Red Sea)

اسی سلسلہ میں بصرہ کی "نہر ابو موسیٰ"(۱) جو دجلہ سے کاٹ کر بنائی گئی ہے اسی طرح نہر معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی دریائے دجلہ سے نکالی گئی اور کوفہ کے علاقہ

سے ملا کر بنائی گئی تھی۔ اس کی تعمیر کا قصہ بھی قادر مطلق کی قدرت میں اپنی نوعیت کا عجیب ہے۔ ۱۸ھ میں جزیرہ عرب قحط سالی کی لپیٹ میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیار وامصار سے غلہ منگوایا اور قحط زدہ لوگوں کو مدینہ منورہ بلا کر کھلاتے رہے، مگر قحط سالی سایہ فگن رہی۔ آپ نے مصر سے غلہ منگوانے کا ارادہ کیا، مگر درمیان میں سمندر پڑتا تھا، خشکی کا راستہ ہزاروں میلوں کا تھا۔ آپ نے گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ مصر کے معتبر حضرات کا ایک وفد لے کر مدینہ منورہ آئیں۔ ان کے آنے پر آپ نے ان کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر دریائے نیل کو سمندر سے جوڑ دیا جائے تو عرب دنیا میں قحط سالی کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے۔ آمدہ وفد نے بخوشی اس بات کو قبول کیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس جا کر فسطاط —— جو موجودہ قاہرہ سے دس بارہ میل کی دوری پر ہے —— دریائے نیل سے بحیرہ قلزم تک نہر کھدوا کر نیل کو قلزم سے ملا دیا۔ طرفہ تماشہ کہ یہ نہر ۶۹ میل لمبی تھی اور صرف چھ ماہ کے مختصر عرصہ میں تیار ہو گئی اب مصر سے اناج کے لدے پھندے ۲۰ جہاز جن میں ساٹھ ہزار اردب (ایک اردب ۲ من کے برابر) اناج بھرا ہوا تھا فسطاط سے بحیرہ قلزم (بحیرہ احمر) میں داخل ہوئے اور جدہ (یلنبوع) لنگر انداز ہو کر چند دنوں میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہ نہر مدتوں جاری رہ کر مصر کی تجارتی ترقی میں شاہ رگ کا کردار ادا کرتی رہی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے بعد مصر کے حاکموں کی بے پروائی کی وجہ سے جابجا اٹ گئی اور مقام ذنب التمساح (مگرمچھ کی دم) پر آ کر بالکل رک گئی۔ مگر بعد میں عباسی حکمرانوں کے دور میں دوبارہ جاری ہو گئی اور ایک زمانہ تک جاری رہی۔ (ان نہروں کی تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ: حسن المحاضرۃ، ص ۹۳، ۹۴۔ علامہ مقریزی: الخطط والآثار، مطبع النیل (قاہرۃ)، ۱۳۲۴ھ، ۱/۷۱، ۱۳۹/۲ تا ۱۴۴ —— علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ: الفاروق: ج ۲، عنوان: پبلک ورک یا نظارات نافعہ، نہریں جو تیار کرائیں)

علامہ بلاذری رحمہ اللہ نے عراق میں ایسی ایک سو سے زائد نہروں کے نام گنوائے ہیں جو دریاؤں کو کاٹ کر کھودی گئی تھیں (بلاذری: فتوح البلدان، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۳۲ء، ص ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۷۲، ۱۸۴، ۲۸۴، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۵۶ تا ۳۶۴ وغیرہا) جبکہ مورخ اصطخری رحمہ اللہ نے بصرہ کے آس پاس ۱۹ ایسی چھوٹی بڑی (جن میں غالبا چھوٹے نالے (Water Cources) بھی شامل ہوں گے) ایک لاکھ بیس ہزار (۱۲۰۰۰۰) نہروں کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسری سے مربوط تھیں۔ (اصطخری، ابراہیم بن محمد رحمہ اللہ: مسالک الممالک، لیدن، ۱۸۷۰ء، ص ۸۰) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کو زمینوں کی آباد کاری اور زراعت کو ترقی دینے کا کس قدر خیال تھا۔ اور یہ صورت حال تو بنو امیہ کے دور تک کی ہے، اس کے بعد زراعت کی ترقی کے ذرائع کو مزید وسعت ملی ہوگی۔

(۱) بلاذری: فتوح البلدان، ص ۳۵۲، ۳۵۳، مقریزی: الخطط، ص ۷۱

انبار کی "نہر سعد" اور مصر کی "نہر امیرالمؤمنین" مشہور نہریں ہیں [۱] اور فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد نہر ثار، نہر دبیس، نہر اساورہ، نہر عمرو، نہر حرب وغیرہ کا ذکر تاریخی کتب میں آج تک موجود ہے جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ [۲]

زراعت اور ترقئ زراعت کی داستان بہت طویل ہے اور اس کے تمام شعبوں کی اصلاحات کا قانون، اسلامی تاریخ کا اہم جزء شمار ہوتا ہے یہاں صرف اختصار کے طور پر چند نمونے پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔



(۱) سیوطی، جلال الدین: حسن المحاضرة فی اخبار مصر والقاهرة، مطبوعه قاهرة، ص ۹۳، ۹۴

(۲) بلاذری: حواله بالا: ص ۳۵۳

باب ــــــ ⑧

زمین کے متعلق خصوصی احکام

زمین اور انفرادی ملکیت

زراعت سے متعلق احکام اور گذشتہ صفحات میں بیان شدہ اسلام کے معاشی نظام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ”زمین“ اور ”ذرائع پیداوار“ میں انفرادی ملکیت کو تصور کرتا ہے؟ بے شک یہ صحیح ہے، اور اس لیے صحیح ہے کہ اسلام کی نظر میں ”زمین“ یا ”ذرائع پیداوار“ کا انفرادی ملکیت ہونا دراصل معاشی نظام کے فساد کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں ”اعتدال و توازن کا فقدان“ راہِ فاسد کھولتا ہے۔

نیز اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کا انسداد انسان کے جائز انفرادی حقوق و فرائض پر ضرب کاری کے مترادف ہے اور قوائے عملی میں جمود و تعطل پیدا کرنے کا موجب ہے اس لیے اس قسم کا اقدام گویا فطرت کے ساتھ بغاوت ہے اس لیے وہ کہتا ہے کہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ قوانینِ فطرت (نوامیس الٰہیہ) (Divine Laws) کی مطابقت کے ساتھ ساتھ ایک جانب ”زمین“ اور ”وسائل پیداوار“ میں انفرادی ملکیت کو ایک حد تک جائز قرار دیا جائے اور دوسری جانب اجتماعی مفادات کے پیش نظر اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کر دیئے جائیں کہ جو انفرادی ملکیت میں اعتدال و توازنِ حقیقی برقرار رکھیں کیونکہ علم الاخلاق (Ethical Science) اور علم الاجتماع (Social Science) دونوں کا یہ نظریہ ہے کہ ”انفرادی حقوق و فرائض میں اعتدال ہی اجتماعی حقوق و فرائض کے لیے بہترین کفیل ہے۔“

اسی نظریہ کے ماتحت اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ''زمین کی انفرادی ملکیت'' کو چند شرائط و قیود کے ساتھ ایک حد تک تسلیم کیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر زراعت کی بحث میں آچکا ہے اور ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کس طرح سرمایہ دارانہ مفاسد کا انسداد اور سد باب کر کے عام رفاہیت و خوش حالی کے سامان مہیا کرتا ہے۔

زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات

اس سلسلہ [1] میں پہلی بات جو جاذبِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے متعلق

---

(۱) شاید بہت سے دیگر قارئین کرام کی طرح آپ بھی حضرت مصنف رحمہ اللہ کا یہ عنوان: ''زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات'' عنوان پڑھ کر حیران ہوں، کیونکہ یہ نہ اسلام کے صالح معاشی نظام کے مزاج و فطرت سے ہم آہنگ ہے نہ اس کی عادلانہ سوچ سے موافق ہے جو زمیندارانہ نظام کی نہ مصالحت کرنے والی مخالف (Un-Compromising Opponent) ہے، نہ اس کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کے مقصد و منہاج کے مطابق ہے، نہ ہی حضرت مصنف رحمہ اللہ کے علوِ فکر کا ترجمان ہے۔ میرے خیال میں حضرت مصنف رحمہ اللہ کے عبقری ذہن میں عنوان ''مزارعت سے متعلق اسلامی جوازات'' تھا جیسا کہ انہوں نے مذکورہ عنوان ''زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات'' کے ذیل میں تمام بحث جواز مزارعت اور اس کے عدم جواز پر کی ہے۔ اور ایسا عنوان لکھ کر وہ نفسیاتی طور پر ایسے قاری کی توجہ بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اسلام میں مذموم اور استحصالی زمینداری کے جواز تلاش کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

مزارعت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو اس شرط پر دے کہ یہ شخص اسے کاشت اور برداشت (Harvest) کرے گا اور پیداوار پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق آدھوں آدھ یا تہائی یا چوتھائی کے حساب سے دونوں آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ بیج اور پانی وغیرہ کے اخراجات کی شرائط بھی پہلے طے شدہ ہوں گی۔

اگر یہی معاملہ باغ یا پھل دار درختوں کا ہو تو اسے مساقات (Gardening) کہا جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے میں مزارعت کا معاملہ فاسد اور باطل ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایسا عقد اجارہ (Lease) ہے جس میں اجرۃ (Earning Or Wage) مجہول (Un- Known) اور غیر یقینی (Uncertain) ہوتا ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخابرہ ـــــ جو مزارعت ہی کی ایک شکل تھی ـــــ کی نہی (Prohibition) بھی ثابت ہے۔ البتہ حضرت امام رحمہ اللہ کے دونوں شاگرد ـــــ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ ـــــ مزارعت و مساقات کے جواز کے قائل ہیں۔ اور انہی کی رائے پر فقہاء احناف کا فتویٰ اور عمل ہے۔

=

انفرادی ملکیت کے جواز کو مان لینے کے باوجود اسلام کے معاشی نظام میں کیا زمینداری سسٹم (Land Lordism) کی موجودہ ظالمانہ روش کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ اسلام موجودہ زمینداری سسٹم کے ظالمانہ اور غلط طریقہ ہائے کار کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے جبکہ وہ مباح زمینداری (Permissible Landlordism) کو بھی غیر پسندیدہ سمجھتا ہے جو انصار اور مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان اجارہ اور مزارعۃ کی صورت میں رائج تھی۔

مزارعت اور زمینداری کے عدم جواز کی احادیث:

❶ عن رافع بن خديج رضي الله تعالىٰ عنه قال: نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أمر كان لنا نافعا، إذا كانت لأحدنا أرض أن يعطها ببعض خراجها أو بدراهم وقال: إذا كانت لأحدكم أرض فليمنحها أخاه أو ليزرعها.[1]

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] نے فرمایا: رسول اللہ

دیگر آئمہ کرام حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ بھی جواز مزارعت و مساقات کے حق میں ہیں۔

(۱) صحيح الامام البخاري ج ۲ ابواب الحرث والمزارعة، باب ما كان اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يواسي بعضهم بعضا في الزراعة. نسائي: كتاب الايمان والنذور، باب من الشروط فيه المزارعة

(۲) حضرت رافع بن خدیج انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ولادت ہجرۃ نبوی سے ۱۲ سال قبل اور وفات ۷۴ھ میں ہوئی۔ مدینہ منورہ کے انصار باوفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے تھے۔ ان کا خاندان کاشتکار اور زمیندار تھا۔ لہٰذا زراعت، زمیندارہ اور کاشتکاری کے مسائل سے متعلق اکثر احادیث آپ سے مروی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ آپ کے پاس ایک چڑا پر لکھی ہوئی تھیں۔ حضرت نافع بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک دن مروان خلیفہ اموی نے خطبہ دیا اور اس میں مکہ مکرمہ اور اس کی حرمت کا ذکر کیا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود تھے آواز دے کر فرمایا: اگر مکہ مکرمہ حرم ہے تو مدینہ منورہ کو بھی نبی کریم نے حرم ٹھہرایا ہے اور یہ ہمارے پاس خولانی چڑا پر درج ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: الاصابة، پیراگراف نمبر ۲۵۲۶۔ مزی: تهذيب، ۲۲۹/۳. داكٹر حميد الله: الوثائق السياسية ص ۴۷، ۴۸

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے منع فرمادیا جو (بظاہر) ہمارے لیے نفع بخش تھا وہ یہ کہ ہم میں سے کسی شخص کے پاس زمین ہو تو وہ نہ اس کو بٹائی پر دے اور نہ نقد لگان پر اور فرمایا: اگر تم میں سے کسی کے پاس زمین ہو تو وہ خود کاشت کرے یا اپنے مسلمان بھائی کو کاشت کے لیے احسان کے طور پر مفت دے۔

❷ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كانت له أرض فليزرعها أو ليمنحها فإن أبىٰ فليمسك أرضه.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس زمین ہو اس کو چاہیے کہ وہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کے لیے مفت احسان کے طور پر دے دے اور اگر دونوں میں سے کوئی بات کرنے کو آمادہ نہیں تو اپنی زمین کو یونہی روکے رکھے۔

❸ عن جابر بن عبدالله رضي الله تعالىٰ عنهما قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يؤخذ للأرض أجر أو حظ.[2]

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما[3] فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

---

(۱) امام مسلم: صحيح كتاب البيوع، باب كراء الأرض. یہاں روایت حضرت جابر سے مروی ہے. صحيح الامام البخاري، ابواب الحرث والمزارعة، باب ما كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم يواسي بعضهم بعضا في الزراعة.

(۲) نسائي: السنن، ج ۲، كتاب الايمان والنذور، باب من الشروط فيه المزارعة

(۳) حضرت جابر بن عبد اللہ بن عمرو بن حرام انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۶ قبل از ہجرت مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث اور فقہ کا وافر حصہ پایا۔ آپ اپنے زمانہ میں مدینہ منورہ کے مفتی تھے۔ آپ نے مسائل واحکام پر ایک رسالہ "منسک صغیر فی الحج" تحریر فرمایا۔ آپ سے روایت حدیث

اللہ علیہ وسلم نے اسی بات سے منع فرمایا ہے کہ زمین کے ذریعہ سے عیوض کا یا اجارہ کا فائدہ اٹھایا جائے۔

۴ وكان إبن عمر رضى الله تعالىٰ عنهما يكرى مزارعة على عهد النبى صلى الله عليه وسلم وأبى بكر و عمر و عثمان رضى الله تعالىٰ عنهم وصدرا من أمارة معاوية رضى الله تعالىٰ عنه، فلما سمع حديث رافع رضى الله تعالىٰ عنه ترك ذلك خشية أن يكون النبى صلى الله عليه وسلم قد أحدث فى ذلك شيئا لم يكن يعلمه فترك كراء الأرض.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی زمین کو عہد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابتداءِ امارت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کاشت کاروں کو لگان پر دیتے رہے مگر جب انہوں نے رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سنی تو اس عمل کو اس خوف سے ترک کر دیا کہ شاید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر مبارک میں یہ فیصلہ دیا ہو جسے انہوں نے نہ سنا ہو لہذا زمین کو بٹائی پر دینا ترک کر دیا۔

یہ روایت الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے شہرت کے اونچے درجہ تک پہنچ گئی ہے اس روایت کے الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

کرنے والوں میں امام حسن بصری، سلیمان بن قیس، عامر الشعبی، عطا ابن ابی رباح، قتادہ اور وہب بن منبہ رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے نامور فقہاء اور محدثین شامل ہیں۔ آپ نے ۷۸ھ میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں آپ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں آخری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ جنہوں نے وفات پائی۔ (محمد مصطفی اعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، ج۱، تذکرہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعۃ، باب مذکورہ بالا

وسلم، زمین کو نقد لگان یا بٹائی پر دینے کو جائز قرار نہیں دیتے اور اس طرح زمینداری کے نفسِ جواز کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ زمین کی انفرادی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے یا خود کاشت کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں اور یا دوسرے بھائی کے ساتھ حسنِ سلوک کی۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہی ہے کہ زمین کو نہ نقد لگان پر دینا جائز ہے اور نہ بٹائی پر اور یہ کہ زمینداری کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

مزارعت کے جواز کی روایات:

دوسری روایات بھی ہیں جو الفاظ اور معانی کے اعتبار سے پہلی روایت ہی کے برابر شہرت کا درجہ رکھتی ہے۔ ان روایات میں صاحب زمین کو نقد لگان اور بٹائی دونوں پر دینے کی اجازت نکلتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے خلفاءِ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے زمانہ تک صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور امت کے افراد کے عملی تواتر سے بھی یہی ثابت ہے کہ وہ زمین کو نقد لگان اور بٹائی پر دیتے رہتے ہیں۔

❶ عن حنظلة بن قيس رضی اللّٰه تعالٰی عنه قال: سألت رافع بن خديج رضی اللّٰه تعالٰی عنه عن كراء الارض، فقال: نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عنه. فقلت: أبالذهب والورق؟ قال: فلا بأس له.[1]

ترجمہ: حنظلہ بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن

(۱) صحيح بخاری، ابواب الحرث والمزارعة، باب كراء الأرض بالذهب والفضة. نسائی: السنن، ج ۲، كتاب الايمان والنذور، باب الشروط فيه المزارعة

(۲) حنظلہ بن قیس الزرقی انصاری کبار تابعین میں سے ہیں۔ بعض محدثین نے انہیں صحابی قرار دیا ہے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ پایا اور ان دونوں بزرگوں سے روایت بھی کیا ہے۔ مدینہ منورہ میں ہی وفات پائی۔ (دیکھئے: مظاهر حق، تتمه ربع الرابع، واسماء الرجال، تذکرہ حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زمین کو اجارہ پر لینے کی بابت دریافت کیا، انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ تب میں نے کہا کہ چاندی اور سونے کے بدلے یعنی نقد لگان پر بھی منع ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

❷ عن إبن عمر رضى الله تعالىٰ عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطى خيبر اليهود على أن يعملوها و يزرعوها ولهم شرط ما خرج منها.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو خیبر کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کریں اور جو پیداوار ہو وہ نصف بٹائی پر ہو۔

❸ عن سعد بن أبي وقاص رضى الله تعالىٰ عنه أن المزارع فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم كانوا يكرون مزارعهم الخ.[2]

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مالکانِ زمین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی زمینوں کو کرایہ پر دیا کرتے تھے۔

❹ عن أبي جعفر رضى الله تعالىٰ عنه قال: ما بالمدينة أهل بيت هجرة إلّا يزرعون على الثلث والربع وزارع على وسعد بن مالك، وعبدالله بن مسعود رضى الله تعالىٰ عنهم وعمر بن عبدالعزيز والقاسم وعروة وآل ابى بكر وآل على وابن سيرين رحمهم الله تعالىٰ (وقال عبدالرحمٰن بن الأسود رحمه

---

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعہ، باب المزارعة مع اليهود

(۲) نسائی: كتاب الايمان والنذور، باب من الشروط فيه المزارعة

اللّٰہ تعالیٰ: کنت أشارك عبدالرحمٰن بن یزید رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه فی الزرع. وعامل عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه علی أن جاء عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه بالبذر من عنده فله الشطر، و إن جاؤ ابالبذر فلهم کذا.)(۱)

ترجمہ: ابو جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ کی بٹائی پر زمین کی کاشت نہ کرتا ہو اور حضرت علی، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، آل ابوبکر، آل عمر، آل علی، اور ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سب اپنی زمینیں اسی طرح کاشت پر دیا کرتے تھے۔

(حضرت عبدالرحمٰن بن اسود (تابعی رحمہ اللہ) کہتے ہیں: میں نے حضرت عبدالرحمٰن بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شرکت میں مزارعت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں سے اس شرط پر معاملہ (مزارعت) کیا کرتے تھے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیج (Seed) اپنے پاس سے دیں گے تو (پیداوار کا) نصف حصہ ان کا ہو گا اور اگر بیج وہ

---

(۱) صحیح بخاری، ابواب الحرث والمزارعة باب المزارعة بالشطر

(۲) ابو جعفر، اس کنیت کے دو بزرگ تابعی ہیں: ابو جعفر عمیر بن یزید الخطمی رحمہ اللہ اور ابو جعفر القاری المدنی المخزومی رحمہ اللہ۔ ابو جعفر یزید بن القعقاع انصاری المدنی رحمہ اللہ مولی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ محدث، فقیہ اور مہموز قرأت کے قاری تھے۔ ثقہ اور معتبر تھے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حدیث سنی اور آگے ان سے حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کی۔

دوسرے ابو جعفر عمیر بن یزید الخطمی رحمہ اللہ ہیں۔ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت سے سماعت حدیث کی اور ان سے امام شعبہ، امام حماد اور یحییٰ بن سعید رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔
(دیکھئے: الکمال فی اسماء الرجال ذیل مشکوۃ المصابیح، ترجمہ ابو جعفر رحمہ اللہ تعالیٰ)

(دوسرے فریق) لوگ دیں گے تو پیداوار اس کے مطابق ان کا (نصف یا تہائی یا چوتھائی) حصہ ہو گا۔)

۵ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جو بات سب سے بہتر ہم نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کو نصف تہائی یا چوتھائی بٹائی کے ہر طریق پر دینا جائز ہے یہی منقح (Verified) اور صحیح ہے اور میرے نزدیک زمین کا یہ معاملہ "مال مضاربۃ" کی طرح کا معاملہ ہے (یعنی جیسا کہ وہ باتفاق جائز ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے) اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بٹائی ان تمام صورتوں کو ناجائز فرماتے ہیں (اور صرف نقد لگان پر جائز سمجھتے ہیں)۔[1]

یہ تمام روایات حدیثی و فقہی (Juristic) اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ صاحبِ زمین اگر خود کاشت نہ کرے تو دوسرے کو نقد لگان یا بٹائی پر دے سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

متضاد روایات کی تطبیق:

دونوں قسم کی احادیث میں جو تضاد اور تخالف (Contrasty & Controversy) ہے جب تک وہ صاف نہ ہو جواز و عدم جواز کا فیصلہ ناممکن ہے۔ چنانچہ تین جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے اس تضاد کو دور کرنے کے لیے جو ارشاد فرمایا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:

۱ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو عدمِ جواز کی روایت کے روای ہیں، فرماتے ہیں کہ زمین کو اجارہ پر دینے کی یہ ممانعت اس بات سے متعلق ہے کہ مزارعۃ (بٹائی) میں زمیندار اور کاشتکار کے درمیان زمین کے حصص (Parts) متعین ہوں کہ اس جانب کے حصہ کی پیداوار ہماری ہو گی اور اس دوسرے حصہ کی کاشت کار کی۔ کیونکہ یہ معاملہ مناقشہ (Controversy) کا باعث ہے، نہیں معلوم کہ زمین کے کس حصہ میں پیداوار ہو جائے اور کس حصہ میں بالکل نہ ہو۔ اور یہ بات اس سے

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی اجارۃ الارض البیضاء وذات النخیل

بھی متعلق ہے کہ صاحبِ زمین یہ شرط لگائے کہ نہر سے متصل حصہ زمین کی پیداوار میری ہوگی اس لیے کہ اس میں بھی کاشت کار کے حق میں سخت نقصان کا اندیشہ ہے اور معاملہ مجہول (Unknown) ہو جاتا ہے۔

عن رافع بن خديج رضى الله تعالٰى عنه قال: حدثني عماي أنهم كانوا يكرون الأرض على عهد النبى صلى الله عليه وسلم بما ينبت على الأربعاء أو شي يستثنيه صاحب الأرض. فنهى النبى صلى الله عليه وسلم عن ذالك الخ.[1]

ترجمہ: رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم سے ہمارے چچا (حضرت زہیر بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا: وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اور یہ شرط لگایا کرتے تھے کہ نہر کے قریب کے حصۂ زمین کی پیداوار ہماری ہوگی یا اس معین حصۂ زمین کی پیداوار ہماری رہے گی، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زمینداری کی ممانعت سے متعلق جو روایت بیان کی ہے وہ اسی قسم کے مناقشات کے پیشِ نظر ہے نہ کہ نفسِ مسئلہ کی ممانعت کی بناء پر۔

❷ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ معاملہ حرام یا ناجائز ہے بلکہ ازراہِ اخوت و مواساۃ باہمی (Brotherhood & Fratinity)، آپ کی رغبت یہ ہے کہ زمین سے متعلق اجارہ یا مزارعۃ کا معاملہ نہ ہو بلکہ مسلمان یا تو خود کاشت اور یا باہمی رفاقت

(۱) امام بخاری: صحیح، ج ۲، ابواب المزارعه والحرث، باب كراء الأرض بالذهب والفضة

و مروت کے پیشِ نظر دوسرے ضرورت مند بھائی کو کاشت کے لیے مفت دے دیں اور اس طرح حسنِ سلوک کریں۔ اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس کو نہی[1] تنزیہ وارشاد (Prohibition for Purity & Guidance) سے تعبیر کیا ہے۔

❶ قال إبن عباس رضی اللہ عنهما: أن النبی صلی اللہ علیه وسلم لم ینه عنه، ولکن قال: أن یمنح أحدکم أخاه خیر له من أن یأخذ شیئا معلوما.[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو جارہ پر دینے کو ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ یہ پسند فرمایا کہ اپنے بھائی (کاشتکار) سے معاوضہ لینے کی بجائے مفت حسنِ سلوک کے طور پر دے دے۔

❷ أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لم یحرم المزارعة ولکن أمر أن یرفق بعضهم ببعض الخ.[3]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعۃ کو حرام نہیں کیا مگر یہ ترغیب دی کہ باہم حسنِ سلوک اور رفق کا معاملہ کریں، لین دین کا معاملہ اس بارہ میں نہ کریں۔

❸ اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ[4] فرماتے ہیں چونکہ آپ کے زمانہ میں زمین

(۱) ایسی نہی (روک) جس کا مقصد کسی معاملہ کو ازروئے شریعت صاف و شفاف بنانا ہو نہ کہ اس معاملہ کو حرام قرار دینا ہو۔ یوں کہیے کہ زراعت اور مزارعت کا معاملہ کے لیے نہی (روک) نہیں ہے بلکہ اس میں قدیم اور جدید بعض ناجائز شرائط و رسوم کی موجودگی میں اس کے لیے نہی ہے۔ جب یہ ناجائز شرائط اور استحصالی حربے ختم کر دیئے جائیں "نہی" نہ رہی گی، ایسی نہی کو "نہی تنزیہ" (پاکیزگی کے لیے نہی) کہتے ہیں۔

(۲) بخاری، ابواب المزارعة والحرث

(۳) ابن ماجه: السنن، باب الرخصة فی المزارعة بالثلث والربع. صحیح مسلم، سنن ابی داود اور جامع ترمذی میں دیکھئے کتاب المزارعة

(۴) حضرت زید بن ثابت انصاری (م ۴۵ھ) فقیہہ، محدث، علم الفرائض کے عالم اور قاری تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں یہود کی زبان صرف پندرہ دن میں سیکھ لی۔ آپ نے علم الفرائض =

سے متعلق بہت سے مناقشے اور قضیے پیش ہوتے اور اس معاملہ میں کثرت سے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص وقت تک کے لیے مصلحۃً ممانعت فرمادی ورنہ بذاتہ اس کو حرام نہیں کیا۔

أو علی مصلحة خاصة بذلك الوقت من جهة كثيرة مناقشتهم فی هذه المعاملة حینئذ وهو قول زید رضی الله تعالٰی عنه الخ.[۱]

ترجمہ: یا یہ ممانعت اسی وقت کے لیے خاص تھی اور اس لیے تھی کہ اس معاملہ میں اس زمانہ میں کثرت سے مناقشات پیش آتے رہتے تھے اور یہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔

حضرت رافع، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ توجیہات اگرچہ اس باب میں متفق ہیں کہ زمین کو اجارہ اور مزارعہ پر دینا اصل معاملہ کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے لے کر خیر القرون کے پورے دور کا "متواتر تعامل" (Continuous Practice) بھی اس عدمِ ممانعت کا مؤید ہے تاہم حدیثِ ممانعت نے اس سلسلہ میں فقہاء اسلام پر جو اثر ڈالا وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ ہے

(وراثت کی تقسیم کے مسائل) پر سب سے پہلی کتاب تحریر کی۔ امام زہری رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: اگر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "علم الفرائض" پر کتاب نہ لکھی ہوتی تو شاید یہ علم لوگوں سے غائب ہو جاتا۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر آپ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد پر قرآن مجید کی تدوین کی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں اسے مصحف شریف کی صورت میں نقل کیا۔ دراصل یہ آپ پر پوری امت کا اعتماد تھا اور یہ اسی اعتماد کا ثمرہ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ پر فرمایا اور آپ کو کاتب وحی مقرر کیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامه ذهبی: تذكرة الحفاظ. ابن سعد: طبقات، ۱۱۵/۲، محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه، تذکرہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالٰی عنه)

(۱) بحواله شاه ولی الله رحمه الله تعالٰی: حجة الله البالغه، ج ۲، باب البر والتقوی، ص ۱۱۷

کہ افراد امت کے درمیان زمین کا اجارہ اور اس کی مزارعۃ دونوں ناجائز ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نقد لگان (اجارہ پر دینا درست ہے اور مزارعۃ و بٹائی) نادرست اور طاؤس رحمہ اللہ [۱] اور ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بٹائی (مزارعۃ) پر زمین کا دینا جائز ہے اور نقد لگان (اجارہ) پر نادرست اور جمہور علماءِ امت فرماتے ہیں کہ زمین کو نقد لگان اور بٹائی دونوں صورتوں میں اجارہ پر دینا جائز ہے اور یہی سلف و خلف (Forerunners and their Successors) کا تعامل رہا ہے گویا اس مسئلہ میں جس قدر بھی عقلی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی کسی نہ کسی فقیہہ کا مختار (Option) ہیں اور اس پر مستزادیہ ہے کہ نقد لگان کے جواز سے متعلق جو روایت کتبِ احادیث میں مذکور ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں وہ جملہ کہ جس سے صراحۃً نقد لگان پر زمین کا دینا ثابت ہوتا ہے "مدرج" (Included by Someone other than the Original Narrator) ہے اور سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔ [۲]

اسی طرح زمین کو بٹائی پر دینے کے جواز میں جو فقہاء، یہود خیبر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان "مخابرہ" معاملہ خیبر کو وجہِ استدلال (Base of Argumentation) قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کے متعلق یہ جواب دیتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ "یہود" خیبر کی زمینوں کے مالک تسلیم کیے گئے اور اس لیے مخابرہ (مزارعۃ) کا یہ معاملہ دراصل حکومت اور ذمی رعایا کا معاملہ تھا اور یہ خراج مقاسمہ (بٹائی کے ذریعہ خراج) کہلاتا ہے اور معاملہ زیر بحث افرادِ امت کے درمیان زمینداری و کاشت کاری سے متعلق ہے اور اس کے لیے حدیث میں صریح ممانعت ہے۔

(۱) طاؤس بن کیسان رحمہ اللہ کا تعارف باب ۱۱ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ: فتح الباری و شرح صحیح بخاری، مطبوعہ مصر، ج ۵، باب المزارعۃ

خلاصہ: اسلام کے اقتصادی نظام میں جاگیردارانہ نظام کی گنجائش نہیں:

❶ ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ نبوت سے زمانۂ خلافتِ راشدہ تک زمین کو نقد لگان یا بٹائی پر دینا اگرچہ معمول بہ رہا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوضاحت اس کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ زمینداری کے اس معمولی اور سادہ طریق کو بھی ناپسند فرماتے اور اخلاق مروت سے نازل (گری ہوئی) سمجھتے ہیں یا ایسے حالات میں کہ اس سلسلہ میں باہمی مناقشات کی کثرت افرادِ امت کے درمیان بغض و عداوت اور جنگ و جدل کی صورت پیدا کر دے، امام کو اس کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں کہ وہ اس سسٹم کو مصلحۃً ایک مدت کے لیے ممنوع قرار دے دے۔(۱)

❷ پس اسلام کے اقتصادی نظام میں زیادہ سے زیادہ ایسی زمینداری کے جواز کی شکل تو پائی جاتی ہے جس میں "زمیندار اور کاشت کار" معاملہ زمینداری میں دو شریک کار کی حیثیت سے شمار ہوتے ہوں مگر دنیا کے دورِ قدیم اور دورِ جدید کا یہ جاگیردارانہ سسٹم جس میں زمینداری تعلقہ داری، جاگیرداری، اسٹیٹس اور ریاستوں (Empires) کی شکل میں نظر آتی یا بڑے بڑے زمیندار کاشت کاروں کی جان و مال تک پر متصرف نظر آتے ہیں، اسلامی معاشی نظام سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا اور اسلام کا اقتصادی قانون اس سسٹم کو قطعاً حرام اور ناجائز قرار دیتا ہے۔

❸ علاوہ ازیں اسلام کے نظامِ حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی نظام میں اسلام کا نمایاں امتیاز یہ رہا ہے کہ زمین کے متعلق اقطاع (جاگیر) اور عطیہ (مربعہ جات) کے ثبوت کے باوجود مملکتِ مفتوحہ کی زمینوں کا بہت بڑا حصہ حکومت کے ہاتھ میں تھا پبلک کے ہاتھ میں نہیں تھا چنانچہ اس زمانہ میں انصار اور مہاجرین رضی

---

(۱) اگر خلیفۂ اسلام مصلحتِ عامہ یا اسلامی مصلحت کے پیشِ نظر خود کاشت مملوکہ زمینوں کو مستثنیٰ کر کے زمینداری سسٹم کو ممنوع قرار دینا چاہے تو خرید کردہ زمینوں کے متعلق از بس ضروری ہے کہ مالکِ زمین کو زمین کی واجبی قیمت بیت المال سے ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ عنہم کے صاحبِ املاک و جائیداد ہونے کے صرف یہ معنی تھے کہ بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عطیہ "جاگیر" کے طور پر کچھ زمین دے دی تھی جو ان کی سادہ گذر کے لیے کام دے یا انہوں نے محنت کر کے بنجر زمینوں کو پیدوار کے قابل بنا لیا تھا جو پیمائش کے اعتبار سے آج کی طرح بڑے بڑے گاؤں نہ تھے بلکہ مزروعہ زمینیں تھیں۔ انہی کو بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم دوسروں کو اجارہ پر دیتے تھے اور بعض خود کاشت کیا کرتے تھے اور ان ہی کے درمیان خرید و فروخت کا سلسلہ جاری تھا باقی ممالک مفتوحہ کی تمام تر آراضی حکومت کی جانب سے اصل باشندوں کے قبضہ میں رہیں اور ان کی مالگذاری شخصی ملکیت کی بجائے بیت المال کا مال قرار پایا۔

۴ یہ شکل کہ دیہات کے دیہات اور رقبے کے رقبے اشخاص و افراد کے قبضہ میں اس طرح ہوں کہ ان کے ساتھ کاشتکاروں اور انسانی ہستیوں کی بھی ایک طرح کی بیع و شری ہوتی ہو اور وہ غلاموں اور محکوموں کی طرح زمینداروں کے اغراض کا آلۂ کار بنتے ہوں تو اس قسم کی جائیدادوں اور زمینداریوں کا اسلامی نظامِ حکومت میں کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا، بلکہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رومیوں کے اس طرزِ زمینداری کو ظالمانہ کہہ کر بالکل ختم کر دیا تھا۔ اور ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا تھا، بلکہ دورِ فاروقی میں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ جو ممالک ایران، روم، مصر، شام، عراق فتح کیے گئے ان میں ایرانی بادشاہ کی مختصر ذاتی املاک کے علاوہ جو مسلمانوں کو جاگیر میں دے دی گئیں۔ عام کاشت کاری ان ہی لوگوں کی رہی جو سابق میں اس کے مالک تھے اور خراج کے نام سے غیر مسلموں کی زمینوں سے اور عشر کے نام سے مسلمانوں کی مملوکہ زمینوں سے "حکومت" لگان و مالگذاری وصول کرتی رہی اور ان کا حقِ زمینداری حکومت کے علاوہ افراد و اشخاص کو نہیں بخشا گیا۔

عراق و شام کی مفتوحہ آراضی سرکاری ملکیت رہیں:

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں عراق اور شام فتح ہوا تو صحابہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مطالبہ کیا کہ ان ملکوں کے زمینوں کو ہم پر تقسیم کر کے ہمیں ان کا مالک بنادیا جائے۔ حضرت بلال اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خصوصیت کے ساتھ اس پر اصرار تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ اگر ان زمینوں کا تم مجاہدین کو زمیندار بنا دیا جائے تو سرحدوں کے انتظامات شہروں اور ملکوں کے انتظامات، لشکروں کی ضروریات، بعد میں آنے والے مسلمانوں کی حاجات اور دیگر غرباء کی ضروریات کے لیے اس قدر کثیر آمدنی کہاں سے آئے گی لہذا یہ ہرگز نہ ہو گا بلکہ یہ سب حکومت کے ہاتھ میں ہی رہیں گی اور ان کی آمدنی تمام مسلمانوں کی ضروریات اور مذکورہ بالا حاجات کے لیے وقف ہو گی۔

استصواب رائے عامہ:

اراضی کے متعلق یہ ایک خاص قسم کا معاملہ تھا اس لیے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ اس بارہ میں اختلاف ہے تو اول جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مجلسِ مشاورت منعقد کر کے اس مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کیا اور بعد میں استصواب رائے عامہ کے لیے مجلسِ عام منعقد کی اور فرمایا:

> فإني واحد كأحدكم. وأنتم اليوم تقرّون بالحق. خالفني من خالفني ووافقني من وافقني وليست أريد أن تتبعوا الذى هو هوأى. معكم من الله كتاب ينطق بالحق. فو الله لئن كنت نطقت بأمر أُريده ما أردتُ به إلا الحق.[1]

ترجمہ: میں تمہاری ہی طرح ایک فرد ہوں اور تم کو آج حق کا فیصلہ کرنا ہے بعض میری رائے کے مخالف ہیں اور بعض موافق اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کی پیروی کرو، تمہارے پاس خدا کی دی ہوئی سچی کتاب ہے جو حق کو واضح کرتی ہے۔ بخدا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس میں بجز حق کے ارادہ کے میرا کوئی دوسرا ارادہ ہرگز نہیں ہے۔

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی الفیئ والخراج ص ۶۹

اس کے بعد مسطورہ بالا تقریر فرمائی اور اپنے دعوی کو قرآنی دلائل سے مدلل کیا۔ ان دلائل کو سن کر سب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

فقالوا جميعا: الرای رایك. فنعم ما قلت وما رأيت.[۱]

ترجمہ: ان سب نے کہا رائے وہی صحیح ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ جو آپ نے فرمایا اور مناسب سمجھا ہے وہی بہتر اور خوب ہے۔

اس طویل واقعہ کو نقل کر کے امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ انہوں نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان اراضی کو تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی رائے کی موافقت میں قرآن عزیز کے دلائل پیش کیے یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق کا نتیجہ تھا۔ اور دراصل اس ہی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی۔ اور خراج کا جمع ہونا اور اس کا مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہونا جماعتی مفاد کے اعتبار سے تقسیم آراضی کے مقابلہ میں بدرجہا مفید تھا۔''[۲]

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جس قدر ممالک بھی فتح کیے گئے، ان کی اراضی کا معاملہ بیشتر حکومت ہی کے ہاتھ میں رہا اور کاشتکاروں سے حاصل شدہ لگان (خراج) حکومت کے ذریعے بیان کردہ ضروریات پر صرف ہوتا رہا اور باوجود مجاہدین و فاتحین کے اصرار کے ان کا کوئی حصہ بطورِ جائیداد کے فاتحین کو نہیں دیا گیا۔

اور ایک زمانہ تو ایسا گذرا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام مسلمانوں کو زمینداری اور کاشتکاری دونوں سے یک قلم روک دیا اور فرمایا کہ جب کہ مسلمانوں، ان کے اہل و عیال اور ان کے غلاموں تک کا وظیفہ بیت المال سے دیا جا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب حکومت (خلافت) کے کارآمد

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) حوالہ بالا

پرزے نہ ہیں اور جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ کے رضا کار (Volunteers) ہونے کی بجائے بیلوں کی دم سے لگے پھریں۔ چنانچہ "نظام العالم والامم" میں "طنطاوی" میں تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے فرماتے ہیں:

"جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں مال بہت بڑھ گیا اور لوگوں کے روزینے مقرر ہوگئے اور رجسٹر مرتب ہوگئے تو عاملوں اور قاضیوں کے مشاہرے بھی مقرر کر دیئے گئے اور پونجی جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی، زمینداری کو ممنوع کر دیا گیا اور زراعت اور مزارعۃ دونوں ہی کی ممانعت کر دی گئی اس لیے کہ ان کے اور ان کے اہل و عیال اور ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں تک کے وظائف بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ہر وقت ایک لشکری (Soldier) کی حیثیت سے کوچ کے منتظر رہیں اور ان کو نہ کھیتی کا انتظار روک سکے اور نہ خوش عیشی اور عیش کوشی اس سے باز رکھ سکے۔ اور یہ حکم یہاں تک آگے بڑھا کہ اگر ملک کا کوئی قدیم ذمی باشندہ بھی مسلمان ہو جاتا تو اس کی تمام جائیداد و املاک اس کی بستی کے ذمیوں میں تقسیم کر دی جاتی اور وہی ان املاک کا خراج ادا کرتے اور صرف اس کا مال اور حیوان اس کے سپرد کر دیئے جاتے تھے اور خلافت کی جانب سے اس کا وظیفہ (ماہانہ) بیت المال سے مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور اس حکم کو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے بھی اپنی خلافت کے دور میں جاری کیا کیونکہ وہ ہر معاملہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیروی کے عادی تھے۔"(۱)

عن عبد اللہ بن هبيرہ رحمه الله تعالیٰ قال: ان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه أمر مناديا أن يخرج إلى امراء الأجناد يقدمون الى الرعية أن عطاؤهم قائم وأن الرزق عيالهم سائل

(۱) علامه طنطاوی رحمه الله تعالیٰ: نظام العالم والامم، مطبع رحمانیه، قاهرة، ۱۸۳/۲، ص ۱۸٤

فلا یزرعون. [1]

ترجمہ: عبداللہ بن ہبیرہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر میں تمام اسلامی لشکر کے سرداروں میں یہ منادی کرادی کہ تمام مسلمانوں کے وظائف مقرر ہیں اور ان کی اولاد کے بھی لہذا کوئی مسلمان نہ کاشت کاری کرے اور نہ زمینداری۔

شریک بن سمی غطفی رحمہ اللہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ عذر کر کے کہ وظیفہ میری معاش کی پوری کفالت نہیں کرتا بغیر اجازت کاشتکاری شروع کر دی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی اطلاع کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دربارِ خلافت میں بلا بھیجا اور فرمایا: میں تجھ کو ایسی سزا دوں گا کہ آئندہ کے لیے یاد رہے گا۔ شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں تائب ہوتا ہوں، آپ معاف فرما دیجئے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معافی دی۔ [2]

---

(۱) علامہ سیوطی، جلال الدین: حسن المحاضرۃ، ص ۷

(۲) حوالہ بالا: ص ۹۳ اسی طرح یزید بن ابی حبیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ملی کہ حضرت عبداللہ بن حر عنسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام میں کھیتی باڑی شروع کر دی ہے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے وہ زمین لے کر دوسروں کو دے دی اور فرمایا: جو ذلت اور خواری ان بڑے لوگوں (زمینداروں) کی گردن میں پڑی ہوئی تھی تم نے جا کر اپنی گردن میں ڈال لی۔ (ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ: اصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۸۸/۳، ترجمہ عبداللہ بن حر عنسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس دور اندیشانہ فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غیر قوموں کے ساتھ انصاف کرنے میں اپنی قوم کی حق تلفی کی کہ ان کو زراعت اور فلاحت (کاشتکاری) سے روک دیا۔ درحقیقت اس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بڑی انجام بینی کا ثبوت ملتا ہے۔ عرب کے اصلی جوہر دلیری، بہادری، جفاکشی، ہمت و عزم اس وقت تک قائم رہے جب تک وہ کاشتکاری اور زمینداری سے الگ رہے، جس دن انہوں نے زمین (کاشتکاری وغیرہ) کو ہاتھ لگایا اسی دن یہ تمام اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے۔ (شبلی: الفاروق، حصہ دوم، عنوان: قانون مالگذاری میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اصلاحات)

مباحث کا خلاصہ:

الحاصل، اسلام میں ''زمینداری'' کے ناپسندیدہ ہونے اور بیشتر حصۂ زمین کے حکومت (خلافت) کے قبضہ میں رہنے کے باوجود سلف و خلف (Forerunners & Successors) کے تعامل اور علماءِ امت کے اجماع کے پیشِ نظر یہ مسلم ہے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کو کرایہ پر دے سکتا ہے اور ''زمیندار'' کی اصطلاح بھی اس پر صادق آسکتی ہے مگر یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے اس حکم جواز میں زمیندار کا وہ تصور جو آج ظالمانہ نظام میں پایا جاتا ہے مطلق نہیں ہے اور نہ اس میں موجودہ تعلقہ داری اور اسٹیٹ کی کوئی گنجائش ہے جو کہ ''اکتناز'' کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے۔ اس لیے کہ علاوہ ان تمام مظالم و مفاسد کے جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے ان دونوں کی بنیاد تقسیمِ دولت (وراثت کی بجائے جمع دولت اور مخالف تقسیمِ وراثت) پر قائم ہے۔

بلکہ وہاں لگان پر زمین دے کر زمیندار کہلانے کے صرف اس قدر معنی تھے کہ سادہ اور ضروری معاش کو حاصل کرنے کے زیادہ بہتر اور عمدہ طریقہائے کار کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ بعض اصحاب زمین خود کاشت کرنے کی بجائے اپنی زمین کو لگان یا بٹائی پر اس طرح اٹھا دیتے تھے جس طرح تجارت میں ''مضاربت'' کا معاملہ کیا جاتا تھا اور بس۔ وہاں آقائی اور غلامی تھی نہ حاکمی و محکومی اور نہ یہ حالت تھی کہ زمیندار صرف زمین کے لگان سے عیش و راحت کی اونچی کرسی پر صدر نشین ہو اور زمین میں محنت کرنے والا کاشت کار معمولی معاش کے لیے بھی تباہ حال رہے۔

اسی قسم کی زمینداری اور کاشت کاری کا معاملہ اسلام کے دورِ اول میں مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان بھی رہا ہے جب کہ بیشتر مہاجرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کاشت کار اور انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم صاحبِ زمین و املاک تھے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں (ذمیوں) کے مابین بھی رہا ہے۔ اور کسی ایک معاملہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہاں زمیندار اور کاشت کار کے یہ معنی تھے جو آج کے

ظالمانہ دور میں پائے جاتے ہیں۔

اور جس طرح اسلام ”تعلقہ داری“ (Ermpire) اور ”جاگیر داری“ کے موجودہ جابرانہ سسٹم کو جائز نہیں رکھتا اسی طرح کاشتکار کو بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ صاحبِ زمین کی زمین میں اشتراکِ عمل کے بعد زبردستی قابض ہو جائے اور اس کو اپنی ذاتی ملکیت کی طرح سمجھنے لگے، اس لیے کہ اس قسم کی تمام شرکتوں میں اصل مال صاحبِ مال ہی کا ہے اور صاحبِ محنت کی شرکت منافع میں ہے نہ کہ اصل شے میں۔ چنانچہ ایسے شخص کے بارے میں جو کسی کی مملوکہ شے پر زبردستی قبضہ کر لے اور عدالت میں جا کر حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لے، سخت وعید آئی ہے:

عن أم سلمة رضی اللّٰہ تعالٰی عنها أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: إنّما أنا بشر و أنكّم تختصمون إلیّ، ولعل بعضكم أن یكون الحسن بحجته من بعض، فأقضی له علی نحو ما أسمع فمن قضیت له بحق أخیه شیئا فلا یأخذه، فأنا أقطع قطعة من النار.[1]

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا[2] روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لاتے ہو اور ایسا ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کے

(۱) صحیح امام بخاری رحمه اللّٰہ تعالٰی: كتاب الحیل، باب ١٠. صحیح مسلم، كتاب الأقضیة، باب الحكم لا یغیر الباطن

(۲) ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المؤمنین ام سلمہ ہند بنت حذیفہ ابی امیہ بن مغیرہ قرشیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے اور مسلمانوں کی ماں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد کا شرف پانے سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد ابو سلمہ عبد اللہ ابن عبد الرحمٰن بن ہلال رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔ ان کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف پایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حبشہ اور مدینہ منورہ دونوں طرف ہجرت کی۔ آپ نے ۵۹ یا ۶۲ یا ۶۹ میں وفات پائی۔ اسد الغابة: ٧/ ٣٤٠، ٣٤٣. ابن قتیبه: المعارف، ص ١٣٦. ابن كثیر: الفصول فی اختصار سیرة الرسول صلی اللّٰہ علیه وسلم، مطبوعه دار القلم، دمشق. بیروت، ص ٢١٩، ٢٢٠

مقابلہ میں کوئی اپنے معاملہ کی دلیل کسی زیادہ خوبی اور چرب زبانی سے
بیان کرے اور میں اس کی دلیل سن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔
پس جس شخص کے لیے میں اس کے فریق بھائی کا حق دلاؤں وہ ہرگز اس
کو نہ لے، اس لیے کہ میں اس کو آگ (جہنم) کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔

البتہ حکومت کی ملکیت کے علاوہ خرید کردہ اراضی کے مالکوں کی اکثریت کی وجہ سے اگر پیداوار کی زمینوں پر قبضہ ہو چکا ہو اور بعض غریب کاشتکار زمین کے لیے محتاج ہوں تو اس حالت میں امام (خلیفہ) اور حکومت دو طریقے اختیار کرنے کے مجاز ہوں گے:

❶ غیر مملوکہ (Un - Occupied) افتادہ اور غیر مزروعہ (Waste & Uncultivated) زمینیں کاشتکاروں میں مفت تقسیم کر دیں۔

❷ جاگیرداروں کے پاس اگر ایسی زمینیں موجود ہوں جو زراعت کے کام نہ آرہی (Unarable) ہوں وہ ان کے قبضہ سے نکال کر کاشت کاروں میں تقسیم کر دے اور ان پر سرکاری (لگان) مقرر کر دے۔



باب ــــــ ⑨

تجارت، صنعت وحرفت

(الف) تجارت

وسائلِ معیشت میں سے دوسرا اہم وسیلہ "تجارت" ہے اس لیے اس کے ذرائع کی توسیع بھی اقتصادی نظام کا جزوِ اعظم ہے اور حکومت کے فرائض میں داخل۔ چنانچہ فقہائے امت فرماتے ہیں:

فالبیع والشراء من أکبر الوسائل المباعثة علی العمل فی هذه الحیوة الدنیا وأجلّ اسباب الحضارة والعمران.[1]

ترجمہ: تجارت اس دنیا میں معاشی اعمال میں سب سے بڑا وسیلۂ معاشی ہے اور تمدن وحضارت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ہے۔

لہذا اسلام نے بھی اپنے معاشی نظام میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے ① صحیح (Valid) اصولِ تجارت ② فاسد (Invalid) اصولِ تجارت۔ پہلے حصہ کے بارہ میں وہ افرادِ ملک وملت کو ترغیب بھی دیتا ہے اور ان اصول کے ماتحت ذرائع اور وسائلِ تجارت کی توسیع کے لیے آئین وقوانین بھی ذکر کرتا ہے اور دوسرے حصہ کی مذمت بھی کرتا ہے اور ان کے انسداد کے لیے احکام بھی بیان کرتا ہے۔

---

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، قسم المعاملات، ۲۰۲/۳

تجارت کی ترغیب

تجارت کی معاشی اہمیت:

اقتصادی نظام کی ترقی و برتری کا راز سب سے زیادہ تجارت میں مضمر ہے جو قوم یا ملت جس قدر اس سے دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر اپنی اقتصادی بہبود کی زیادہ کفیل بنتی ہے اور جس قوم یا جس ملک کے باشندے تجارت سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ اقتصادی نظام میں ہمیشہ دوسروں کے دستِ نگر رہتے ہیں اور اسی راہ سے دوسری اقوام ان کے تمدن، تہذیب معیشت اور سیاست بلکہ "مذہب" پر قابض ہو جاتی اور ان کو غلام بنا کر مطلق العنانہ حکومت (Absolute Dictatorship) کرتی ہے۔

ہندوستان جیسا بڑا ملک اور ایشیا و یورپ کے دوسرے چھوٹے بڑے ملک آج غیروں کے استبداد اور مظالم کے شکا اسی راہ سے ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے ہاتھ میں ہندوستان تجارت ہی کی راہ سے آیا۔ مصر پر اسی اجارہ داری کے نام سے قبضہ کیا گیا ایران کی سابقہ غلامی تیل کی تجارت ہی کی رہین منت تھی اور آج بھی اسی راہ سے اس پر پنجہ استبداد (Clutch of Dispotism) گاڑا جارہا ہے عراق و شام پر قبضہ کی تہہ میں یہی اصول کارفرما ہے موصل میں چشمے اور دمشق میں کانیں ظاہر ہونے سے پہلے "ماہرین دریافت" کی سیاحانہ (Exursionistic / Touristic) تگ و دو کا نتیجہ آخر وہی ہوا جو معاشی دستبرد کی صورت میں ظالم طاقتوں کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔

جرمنی اسی تجارت کے فروغ اور اپنی قوم کی اقتصادی و معاشی ترقی کی خاطر نو آبادیات کا بھوکا ہے اور آہستہ آہستہ ان کو ہضم کرتا جاتا ہے۔ اٹلی نے حبشہ کو اسی کی خاطر تباہ و برباد کیا اور ہسپانیہ کی تباہی و بربادی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ مشرق بعید میں جاپان کے چین پر بے پناہ مظالم اسی داستان کا ایک ورق ہیں اور فلسطین میں برطانیہ کے سفاکانہ مظالم کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

غرض شرق و غرب اور ایشیا و یورپ کی موجودہ جنگ دپیکار اور ہوسِ ملک گیری

غیر مہذب ممالک کو مہذب بنانے کے لیے وجود پذیر نہیں ہوئی بلکہ تجارتی منڈیوں کے اضافہ اور اپنے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لیے مظلوموں پر معاشی دستبرد کی خاطر عمل میں لائی جارہی ہے جس قوم میں تجارت نہیں ہے وہ آج نہیں تو کل ضرور غلام بن کر رہے گی، اور جو ملک تجارت کی برکتوں سے محروم ہے وہ صبح نہیں تو شام تک ضرور قعر ہلاکت میں گر کر تباہ ہو جائے گی۔[1]

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے طاقت ور تجارتی ممالک کا معاشی طور پر کمزور ممالک پر جبر و استبداد کا یہ نقشہ تقریباً ۷۰، ۸۰ سال پہلے کھینچا تھا، مگر آج دنیا کے معاشی و سیاسی حالات پر نگاہ ڈالیں تو صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نہیں صرف ظالم اور مظلوم کے چند نام ہی بدلے ہیں۔ برطانیہ، فرانس تو کوئی تعجب کی بات نہیں، انہوں نے امریکہ کو اپنا رہبر و رہنما مان کر ظلم کے سارے دھندے اس کی ہدایت اور منظوری سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پھر جو ظالمانہ کارروائی وہ نہ کر سکیں یا امریکہ ان سے کرانا چاہے وہ خود ظلم کے تمام سابقہ ریکارڈز کو مات دے کر ظلم و جبر کی ایک نئی تاریخ رقم کرتا ہے۔ وہ تجارت اور ظلم دونوں کا عالمی چمپئن ہے۔ جرمنی، اٹلی، جاپان کا دیو استبداد اگر آج پوری طرح پائے کوب نہیں ہے تو برصغیر میں ہندوستان نے اپنی پوزیشن بدل لی ہے وہ مظلوم کی بجائے ظالم بن کر کشمیری مسلمانوں پر اپنا آہنی پنجہ گاڑے ہوئے ہے اور تجارتی طور پر ترقی کر کے دنیا کی ایک دوسری سوپر طاقت (Super Power) بننے کے خواب دیکھ رہا ہے مشرق بعید (Far East) میں چین نے تجارت میں اپنا لوہا منوا کر جاپان کو مات دے دی ہے۔ حبشہ اٹلی سے گو آزاد ہے، ہسپانیہ (Spain) آزاد اور تجارتی ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے مگر ایک مظلوم قوم —— جو مسلمان نام سے جانی جاتی ہے اس —— نے اپنی جگہ کسی دوسرے کے لیے خالی نہیں کی، حیرت ہے مدتوں سے مسلسل ظلم برداشت کر رہے ہیں مگر اپنی حالت بدلنے کو تیار نہیں۔ متواتر امریکہ اور اس کے حواریوں کے استحصال کا شکار مگر ٹلنے کو تیار نہیں، نقصان پہ نقصان اٹھا رہے ہیں، مگر ظالموں سے وفاداری کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں، لگتا ہے ظالم سے سمجھوتہ اور ظلم سے نبھا کا ارادہ کر کے بیٹھے ہیں۔

اگر مصنف رحمہ اللہ کے تحریر کے وقت (یعنی آج سے ۷۰، ۸۰ سال قبل) فلسطین، عراق، ایران، شام، مصر، ترکی، یمن ۱۹۴۶ء کا پاکستان تجارتی استحصال اور مظلومیت کا شکار تھے تو آج بھی مظلوم ہیں، حالانکہ یہ ترقی کر کے اپنے ظالموں کے برابر ہو سکتے تھے، جس طرح چین، جاپان وغیرہ نے کیا ہے۔ اللہ کریم نے معاشی وسائل، معاشی ترقی کے ذرائع اور معاشی ترقی کے مواقع سے انہیں مالا مال کر رکھا ہے، یہ تیل اور دیگر معدنیات کی دولت میں بڑے امیر ہیں۔ دنیا کی تمام تجارتی آبی گذر گاہیں (مثلاً باب المندب عدن میں، نہر سویز مصر میں، ہرمز کی گذر گاہ خلیج میں، مراکش کے سرے پر جبل الطارق کی آبی گذرگاہ، ترکی میں آبنائے باسفورس پر درّہ دانیال، مالدیف میں زیبۃ المنہل کی گذر گاہ، ملا کا کی گذر گاہ اور جزیرہ مالٹا) مسلمانوں کے علاقوں میں ہیں، میں نے ''قبضہ میں ہیں'' یہ حقیقت جان کر نہیں لکھا کہ مسلمان اتنے کمزور ہیں کہ ان کے علاقوں میں بھی =

تجارت کی اہمیت و فضیلت قرآن و حدیث کی روشنی میں:

اسلام نے اسی لیے بار بار تجارت کی ترغیب دی، اس کے فضائل و برکات سنائے دنیوی فوائد بتائے اور دینی بشارتیں سنائیں۔

❶ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُواْ فِي ٱلْأَرْضِ وَٱبْتَغُواْ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ﴾ (۱)

ترجمہ: جب نماز پوری ہو جائے، تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال تجارت و رزق) کو تلاش و حاصل کرو۔

یہاں "فضل" سے مراد طلبِ رزق و مال ہے اور آیت کا شانِ نزول ترغیبِ تجارت پر مبنی ہے۔

❷ ﴿لَا تَأْكُلُوٓاْ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ (۲)

ترجمہ: اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضا کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔

❸ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم خرچ کرو ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

ان کا قبضہ قبضہ نہیں۔ نہ وہ اپنے وسائل اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں، نہ اپنی مرضی سے اپنا بجٹ تیار کر سکتے ہیں نہ اپنی بیرونی تجارت کی پالیسی طے کر سکتے ہیں۔ بھلا وہ تجارت میں ترقی کیونکر کر سکتے ہیں؟

(۱) القرآن الکریم، سورۃ الجمعۃ (٦٢): ١٠

(۲) سورۃ النساء (٤): ٢٩

(۳) سورۃ البقرہ (٢): ٢٦٧

مشہور تابعی مفسر مجاہد رحمہ اللہ [1] آیت کے جملہ "مَا كَسَبْتُمْ" کی تفسیر میں کسب سے مراد تجارت لیتے ہیں۔ [2]

❶ (عن أبي سعيد الخدری رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال:) قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: التاجر الصدوق الأمین مع النبیین والصدیقین والشهداء. [3]

ترجمہ: (حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچے اور امانت دار تاجر کا حشر نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔

کنز العمال کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص تجارت کرتا ہے اس کے یہاں خیر و برکت اور رفاہیت پیدا ہوتی ہے۔

❷ عن اسمعیل بن عبید بن رفاعة عن أبیه عن جده رضی اللّٰه تعالٰی عنه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: التجار یحشرون یوم القیمة فجارا إلا أن اتقی وبرّ وصدّق. [4]

ترجمہ: حضرت اسماعیل بن عبید بن رفاعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد اور دادا رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تاجر فاسق و فاجر اٹھیں گے مگر یہ کہ انہوں نے پرہیز گاری، بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا ہو۔

تجارت کے بنیادی اصول:

اسلام کے اقتصادی نظام میں تجارت اور باہمی کاروبار کی صحت اور درستی کا مدار

---

(۱) حضرت مجاہد تابعی رحمہ اللہ کا تعارف باب ۳ کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) امام بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین: السنن الکبری، ج ۵، کتاب البیوع

(۳) ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی: الجامع، ج ۲، باب البیوع

(۴) علی المتقی: کنز العمال، الفصل الثالث فی انواع الکسب وآدابه. بیهقی: شعب الایمان

حسبِ ذیل اصول پر مبنی ہے:

باہمی تعاون:

❶ تجارت کا جواز چونکہ باہمی تعاون پر قائم ہے اس لیے تمام معاملات سے تجارت میں جانبین سے تعاون (Mutual Co- Operation) کا وجود ضروری ہے یعنی یہ نہ ہونا چاہیے کہ متعاقدین (Contractors) (دو معاملہ داروں) میں سے ایک کا زیادہ سے زیادہ نفع دوسرے کے زیادہ سے زیادہ نقصان پر موقوف ہو۔

﴿وَتَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا۟ عَلَى ٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ ۚ﴾ (۱)

ترجمہ: بھلائی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم پر ہرگز کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

حقیقی رضا:

❷ معاملہ میں جانبین سے حقیقی رضا (Real Consent) کا وجود ضروری ہے اضطراری رضا معتبر نہیں یعنی یہ نہ ہو کہ ایک شخص برضاء ورغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ نہیں ہے مگر اس کی اضطراری کیفیت اس کی رضاء کی قائم مقام بن گئی ہے۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَـٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَـٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ﴾ (۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل کی راہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ ہو۔

اہلیت معاہدہ:

❸ اہلِ معاملہ، معاملہ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں، یعنی عاقل، بالغ یا ممیز

---

(۱) سورة المائدة (۵): ۲

(۲) سورة النساء (٤): ۲۹

(Discriminator) اور آزاد ہوں یعنی ناسمجھ بچہ، مجنوں (Insane) معتوہ (Idiot) اور مجبور و مکروہ (Coerced) نہ ہوں۔

❶ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: رفع القلم عن ثلثة: عن المجنون المغلوب حتی یئبر، وعن النائم حتی یستیقظ، وعن الصبی حتی یحتلم. الحدیث.[۱]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین شخصوں پر تکلیف شرعی (Sharia Obligation) عائد نہیں ہے: ایک مجنون و مغلوب (جس پر دیوانگی غالب ہو خواہ عارضی بذریعہ نشہ وغیرہ) یہاں تک کہ اس کی عقل لوٹ آئے یا بحال ہو جائے۔ دوسرے سونے والا یہاں تک کہ بیدار (ہو کر ہوشیار) ہو جائے کہ تیسرا چھوٹا بچہ حتیٰ کہ بلوغت (Puberty) کو پہنچ جائے۔

❷ نهی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن بیع المضطر.[۲]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔

❹ معاملہ میں کسی قسم کا دھوکہ، خیانت اور معصیت کا دخل نہ ہو یعنی ان اشیاء کا کاروبار نہ ہو جن کا استعمال شریعتِ اسلامی نے معصیت اور حرام قرار دیا ہے۔

❶ قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: أفضل الکسب بیع مبرور وعمل الرجل بیده.[۳]

---

(۱) ابوداؤد: السنن، ج ۲، کتاب البیوع، باب النهی عن بیع المضطر

(۲) حوالہ بالا. اس ضمن میں سنن ابن ماجہ میں ہے:

انما البیع عن تراض. (ابن ماجه: السنن، کتاب التجارات، باب ۱۸)

ترجمہ: بیع باہمی رضا (Mutual Consent) سے ہوتی ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس طرح نقل کیا ہے:

لا تتفرقن عن البیع الا عن تراض. (جامع ترمذی، ابواب البیوع، باب ۲۶)

ترجمہ: بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں آپس کی رضامندی کے بغیر جدا نہ ہوں۔

(۳) مشکوۃ المصابیح، باب الکسب وطلب الحلال، حدیث ۵

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہترین کسب "بیع مبرور" ہے اور دستکاری سے معاش پیدا کرنا۔

❷ والبیع المبرور هو البیع الذی یبر فیه صاحبه، فلم یغش، ولم یخن، ولم یعص الله فیه الخ.[۱]

ترجمہ: اور بیع مبرور ایسی بیع و شرا کو کہتے ہیں کہ جس میں متعاقدین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں یعنی نہ اس میں دھوکہ ہو نہ خیانت اور نہ خدا کی معصیت لازم آتی ہو۔

❸ قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا ضرر ولا ضرار.[۲]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔

ناجائز اور باطل اصولِ تجارت:

اور ان اصول کے خلاف حسبِ ذیل اصول تجارت کے مقصد کو فاسد (Vitiate) اور باطل (Voidable) کرتے ہیں اور اس لیے اسلام کے معاشی نظام میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ ان اصولوں کے ماتحت کاروبارِ تجارت کو فاسد اور باطل قرار دیتا ہے (مثلاً):

❶ مثلاً جوا (میسر) لاٹری اور سٹہ (Gambling) کے تمام انواع و اقسام۔ اس لیے کہ ان کی بنیاد و اساس بے شبہ ایسے معاملہ پر مبنی ہے کہ متعاقدین میں سے ایک جانب سے نفع دوسری جانب کے سر تا سر نقصان کا سبب بنتا ہے۔ (اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں):

❶ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة، ج ۲ قسم المعاملات، ص ۲۰۲

(۲) احمد ابن حنبل: مسند، ۲۱/۲۱۲

كَبِيرٌ﴾[1]

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار (Gambling) کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے ان دونوں باتوں میں بڑا گناہ ہے۔

۲ ﴿إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝٩٠﴾[2]

ترجمہ: بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے (Arrows) کارِ شیطان ہیں، پس ان سے بچو، تاکہ تم کو فلاح نصیب ہو۔

مالی نمو (Increase) اور حصولِ نفع کا وہ معاملہ جس میں جانبین سے کسی ایک جانب میں حقیقی رضا نہ پائی جاتی ہو بلکہ اضطراری اور جبری (Coercive) رضا کو حقیقی رضا کے قائم مقام رکھا گیا ہو۔ مثلاً سود (بیاج) یا کسی اجیر کی اس کی محنت کے مقابلہ میں غیر واجبی اجرت۔ (اسی طرح ارشاد ہے):

۳ ﴿وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰا۟﴾[3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے بیع (جائز تجارت) کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

(مجبوری اور اضطرار (Duress) کی نہج کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے):

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع المضطر.[4]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضطرار سے مجبور کی خرید وفروخت (معاملہ) کو منع فرمایا ہے (یعنی اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے)۔

حضرت شاہ ولی اللہ (رحمہ اللہ) جبری واضطراری رضا کو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر

---

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۱۹

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۰

(۳) سورۃ البقرہ (۲): ۲۷۵

(۴) ابوداود: السنن، ج ۲، ابواب البیوع

معتبر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

فأن المفلس يضطرّ إلى أن إلتزم مالا يقدر على إيفائه، وليس رضاه رضا فى الحقيقة فليس من العقود المرضية ولا الأسباب الصالحة و إنّما هو باطل وسحت الخ.[1]

ترجمہ: اس لیے کہ مفلس مضطر اور مجبور ہوتا ہے کہ جس چیز کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اس کو اپنی بے چارگی کی وجہ سے اپنے ذمہ کر لے اور یہ رضا ہرگز حقیقی رضا نہیں ہے۔ لہذا ایسا معاملہ (مثلاً ربوا جیسا) معاملہ نہ پسندیدہ معاملات میں سے ہے، اور نہ کاروبار کے صالح اور درست معاملات میں سے ہے اور بے شبہ اس قسم کا ہر معاملہ باطل اور ظلم ہے۔

۳ ایسا کاروبار جو اسلام کی نگاہ میں "معصیت" ہو۔ مثلاً شراب، مردار، اصنام (بت) خنزیر وغیرہ کی بیع و شراء یا ان اشیاء کی خرید و فروخت جو اپنی ذات میں نجس اور ناپاک ہوں۔ (اللہ کریم کا ارشاد مبارک ہے):

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةُ وَٱلدَّمُ وَلَحْمُ ٱلْخِنزِيرِ﴾[2]

ترجمہ: اے مسلمانو! تم پر مردار خون اور خنزیر کا گوشت حرام کر دیا گیا ہے۔

(اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے):

عن جابر رضى الله تعالىٰ عنه: أنه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: أن الله حرم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام الخ.[3]

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، من ابواب ابتغاء الرزق

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۳

(۳) الشوکانی، محمد بن علی بن محمد رحمہ اللہ تعالیٰ: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کر دیا ہے۔

❹ وہ معاملات کہ جن میں جانبین سے عقد ہو جانے کے باوجود بھی نزاع (Tussel) اور مناقشہ (Controversy) کی صورتیں باقی رہیں اور کسی بھی فریق کے لیے ضرر ونقصان کا باعث ثابت ہوں کیونکہ یہ مقصد تجارت کے منافی ہے۔ مثلاً بیع یا ثمن (Sale & Price) یا دونوں میں ابہام (Ambiguity) رکھا گیا ہو اور تصریح نہ کی گئی ہو کہ کس قیمت میں خریدا ہے۔ یا ایک معاملہ کو دو معاملے بنالے۔ یعنی یہ کہے اگر نقد خریدے گا تو اس شے کی قیمت سو روپیہ ہے اور اگر ادھار لے جائے گا تو دو صد روپیہ اس کی قیمت ہے۔ یا جن معاملات میں بیع (مال) کو دیکھنا ضروری ہے اس کو دیکھے بغیر سودا کر لیا۔ یا بیع وشرا میں ایسی شرط لگادی جو معاملہ کا جزء یا رکن (Essential) نہیں ہے یا بیع مجہول کر لی یعنی دونوں جانب صرف باتیں ہی رہیں اور بیع و ثمن (Sale & Price) دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، تو یہ اور اسی قسم کے معاملات میں تعاون باہمی کے بجائے نزاع اور مناقشہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ (اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات موجود ہیں، مثلاً):

❶ عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ بیع کو دو معاملات بیع بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

باب ماجاء في بيع النجاسة الخ، حديث نمبر ١

(١) رواه مالك والترمذي وابوداود والنسائي، كتاب البيوع. مشكوة المصابيح، باب المنهي عنها من البيوع، حديث نمبر ٣٤

❷ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ (اضافی) شرط لگانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

❸ عن حكيم بن حزام رضى الله تعالىٰ عنه قال: نهانى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أبيع ما ليس عندى.[2]

ترجمہ: حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ[3] سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو منع فرمایا ایسی شے کے فروخت کرنے سے جو بیع کے وقت میری ملکیت میں نہیں ہے۔

❺ وہ معاملہ جس میں دھوکہ اور فریب مضمر ہو مثلاً ایک شے کی خرید یا فروخت منظور ہے مگر خاص غرض کے ماتحت معاملہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا اور ایک دوسری شے کے ضمن میں اس کو لے لیا گیا ہے اس طرح کہ اگر ضمنی شے جو بہت ناقص ہے یا سب سے بہتر ہے اس معاملہ کے اندر شامل ہو گئی تو معاملہ کر لیا ورنہ معاملہ کے تمام شرائط مکمل ہو جانے کے بعد معاملہ سے انکار کر دیا۔

---

(۱) الهيثمى، نورالدين على بن ابى بكر: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، مكتبه القدسى، قاهرة، ۱۳۵۲ھ، ۸۵/۴

(۲) نسائى، كتاب البيوع. ترمذى، كتاب البيوع. مشكوة المصابيح، كتاب البيوع، حديث نمبر ۳۲. طبرانى: معجم الاوسط

(۳) حکیم بن حزام بن خویلد ابو خالد القرشی الاسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھتیجے ہیں۔ آپ عام الفیل سے ۱۳ سال قبل بیت اللہ شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ اللہ کریم نے آپ کو جاہلیت اور اسلام دونوں حالتوں میں وجاہت عطا فرمائی تھی آپ نے فتح مکہ کے موقع پر دولت اسلام پائی۔ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ رہائش اختیار کر لی۔ آپ نے ایک سو بیس (۱۲۰) سال عمر پائی۔ ۶۰ سال جاہلیت میں اور ۶۰ سال اسلام کے سایہ عاطفت میں گزرے۔ بڑے بلند پایہ کے عاقل، فاضل اور متقی تھے۔ جب کبھی قسم کھانا پڑتی تو کہتے: اس عظیم و جلیل اللہ کی قسم! جس نے مجھے بدر میں بچا لیا آپ کی روایات صحاح ستہ میں منقول ہیں۔ آپ نے مدینہ منورہ میں ۵۴ھ میں وفات پائی۔ (علامہ ولی الدین خطیب رحمه الله تعالىٰ الكمال فى اسماء الرجال، مشكوة المصابيح كے ذيل ميں اسد الغابه، تذكره حكيم بن حزام رضى الله تعالىٰ عنه)

❶ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وبيع الغرر.[۱]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکے کے معاملہ کو بھی حرام قرار دیا ہے اور کنکری پھینک کر کسی شے کی خریداری کرنے کو بھی۔

❷ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الملامسة والمزابنة.[۲]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع ملامسۃ (یعنی جب مشتری یا خریدار شے کو چھو لے تو اس پر اس کی بیع لازم ہو جائے) اور منابذہ (یعنی جب بائع فروخت کرنے والا) مشتری کی طرف کپڑا پھینک دے تو بیع لازم ہو جائے) سے منع فرمایا۔

❸ نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن النجش.[۳]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ لین دین میں کھوٹ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

چونکہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے معاملات میں یا قمار کے جرائم پائے جاتے ہیں اور یا متعاقدین (Contractors) میں سے کسی ایک کے ضرر و نقصان کا باعث بن کر

(۱) صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب بطلان بیع الحصاة الخ. الشوکانی: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع، باب النہی عن بیوع الغرر

(۲) صحیح بخاری، ج ۱ کتاب البیوع، بیع الملامسة، باب بیع المنابزة. صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب ابطال بیع الملامسة الشوکانی، حوالہ بالا

(۳) صحیح بخاری، ج ۲، البیوع، باب النجش. الشوکانی: حوالہ بالا باب عن النجش. نجش کے فقہی اصطلاحی معنی ہیں صرف مبیع (Good or Property for Sale) کی قیمت بڑھانے کے لیے بولی دینا تاکہ ضرورت مند صارف یا خریدار زیادہ دام دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس طرح ضرورت مند کو زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کر کے اس کی ضرورت اور حاجت سے غلط فائدہ اٹھایا جائے۔

بد معاملگی، رنجش اور مناقشہ کا باعث ہوتے ہیں اس لیے معاشی نظام نے اس قسم کے تمام معاملات اور کاروبار کو فاسد و باطل کہہ کر ممنوع قرار دیا ہے۔

نهى رسول الله من تلقى الركبان.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے نکل کر باہر تجارت کے قافلہ سے جا ملنے کو منع فرمایا ہے۔

تلقی الجلب یا تلقی الرکبان اور اس ممانعت کی وجہ:

اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی شہر میں قحط پڑ رہا ہے اور لوگوں کو مثلاً غلہ کی سخت حاجت ہے۔ یہ دیکھ کر چند ارباب دولت شہر سے باہر نکل کر کسانوں، کاشت کاروں اور سادہ لوح تاجرین غلہ کے پاس پہنچے اور غلہ کو سستی قیمت پر خرید لیا تاکہ شہر میں اس کو من مانی گراں قیمت پر فروخت کریں یا ناواقف کاشت کاروں اور تاجروں کو شہر کے نرخ کا پتہ نہ دیتے ہوئے باہر ہی سستے سے سستے داموں غلہ خرید لیا، اور جب وہ فروخت کرنے والے شہر میں داخل ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ فریب کیا گیا۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی اصطلاح میں اس کو ''تلقی جلب'' اور ''تلقی رکبان'' کہتے ہیں اور اس کے نزدیک یہ طریقہ خرید و فروخت چونکہ بیجا نفع خوری پر مبنی ہے اس لیے ممنوع ہے۔

اس ممانعت کی حکمت:

حنفی فقہ نے اس ممانعت کی حکمت و علّت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ یہ ممانعت جب مؤثر ہوتی ہے کہ ایسے کاروبار سے یا شہر اور کسب کو نقصان پہنچتا اور بازار کے نرخ پر برا اثر پڑتا ہو یا فروخت کرنے والوں کو دھوکے میں ڈالا اور بازار کے نرخ کے بارے میں ان کو مغالطہ دیا گیا ہو اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر یہ بیجا نفع خوری میں داخل نہیں ہوگا اور اسی قسم کی ایک شکل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ

---

(۱) حوالہ بالا

وسلم نے ان جملوں میں ظاہر فرمایا ہے۔

عن جابر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لا یبیع حاضر لباد[1]

---

(۱) بخاری، کتاب البیوع، باب من کرہ ان یبیع حاضر لباد بأجر. الشوکانی: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع، باب النھی ان یبیع حاضر لباد. حضرت مصنف رحمہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حدیث مبارکہ پر اکتفا کیا کیونکہ مقصد کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ مگر اس اہم معاشی موضوع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وافر تعلیمات امت کر دی ہیں دراصل یہ موضوع قیمتوں کی میکانیت (Prices Mechanism) طلب اور رسد کی قدرتی قوتوں (Natural Forces of Demand & Supply) کو متاثر کرتا ہے اور مصنوعی قلت (Artificial Scarcity) کو جنم دیتا ہے جو مصلحت عامہ کے لیے ضرر رساں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استحصالی عمل سے روکنے کے لیے بہت زور دار انداز اختیار فرمایا ہے۔ یہ ارشاد گرامی پڑھیے:

عن انس رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ قال: نھینا أن یبیع حاضر لباد ولو کان اخاہ لأبیہ وامہ. (بخاری، کتاب البیوع، باب بیع حاضر لباد)

ترجمہ: حضرت انس (بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے کہ ہمیں اس سے منع کر دیا گیا کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت کرے، خواہ وہ اس کا (باپ اور ماں کی طرف سے) سگا بھائی ہی ہو

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مصلحت عامہ (Public Welfare) انفرادی مفاد اور ذاتی تعلقات سے بھی زیادہ عزیز تھی اور اس میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جا سکتی ہے۔ اس مصلحت عامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

لا یبیع حاضر لباد. دعو الناس یرزق اللّٰہ بعضھم من بعض. (صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الحاضر للباد)

ترجمہ: کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اللہ کریم ان کو ایک دوسرے کے ذریعہ رزق دیتا ہے۔

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس ممانعت کے بعد کیا دلالی (Agency Brokerage) کا پیشہ جائز ہے؟ دراصل یہ سوال اس وقت ذہن میں آتا ہے جب ہم بیع حاضر لباد اور دلالی کو ایک ہی عمل کے دو نام یا ایک ہی سکہ کے دو رخ قرار دیں "بیع حاضر لباد" دراصل احتکار (Hoarding) کا ذریعہ ہے، یہ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ (Prices Flactuation) کا سبب بن کر گرانی اور مصنوعی قلت اور بعض اوقات قحط کے حالات پیدا کرتا ہے جبکہ اسلامی معاشیات میں دلال (Broker / Agent) کا کام فریقین بیع یعنی بائع اور مشتری (Saler & Buyer) میں واسطہ بن کر عادلانہ قیمت (Equitable Price) کا تعین کرنا ہے بلکہ ناواقف اور اناڑی (Unfamiliar) فریق کو نقصان سے بچانا ہے۔ موجودہ معاشی معاملات کی پیچیدگی (Complexity) میں دلّال کا کردار بہت اہمیت کا =

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شہری، گاؤں والوں کے لیے بیع و شراء کا معاملہ نہ کرے۔

بیع حاضر للبادی:

اسلام کے اقتصادی نظام کی اصطلاح میں ”بیع حاضر للبادی“ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا تجارتی مال شہر میں موجود ہے مگر وہ بیجا نفع خوری کے لیے شہر والوں کی حاجت و ضرورت کے باوجود ان کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا بلکہ سادہ لوح دیہاتیوں میں جا کر گراں قیمت پر فروخت کرتا ہے یا شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان خرید و

حامل ہو گیا ہے۔ عام بازار کے خوردہ فروش (Ratailer) اور تھوک فروش (Whole Saler) سے لے کر بین الاقوامی تجارت میں درآمدات و برآمدات (Imports & Exports) تک دلال کا عمل دخل ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا علم معاشیات کے ایک عام طالب علم کو بھی ہوتا ہے۔ دلالی کا مفید عمل کہیں ایجنٹ، کہیں مڈل مین (Middle Man)، کہیں بروکر (Broker) اور کہیں مرکزی بنک (Central Bank) کے ذریعہ سر انجام پاتا ہے۔ اس خدمت (Service) کے نتیجہ میں دلال جو فیس یا اجرت جا کمیشن کے نام سے لیتا ہے وہ جائز ہے۔ اس ضمن میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں لکھا ہے۔

ولم یر ابن سیرین و عطاء وابراهيم والحسن (رحمهم الله تعالیٰ) بأجر السمسار بأسا. وقال ابن عباس (رضی الله تعالیٰ): لا باس ان يقول: بع هذا الثوب فما زاد على كذا كذا فهو لك. وقال ابن سيرين رحمهم الله تعالیٰ: اذا قال: بعه بكذا فما كان من الربح فهو لك أو بيني وبينك، فلا بأس به. وقال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم.
(صحیح بخاری کتاب الاجارات، باب اجرة السمسرة)

ترجمہ: حضرت ابن سیرین، ابراہیم (نخعی) اور حسن (بصری) رحمہم اللہ تعالیٰ کے مطابق دلال کی اجرت یا فیس یا کمیشن میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: (ایجنٹ یا بروکر کو) یہ اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ کپڑا (یا کوئی سامان) فروخت کر دو اور اس (جو قیمت میں لینا چاہتا ہوں) سے اوپر جو کچھ وصول ہو گا وہ تمہارے لیے ہو گا۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ مزید کہتے ہیں: (ایجنٹ یا بروکر کو) یہ اختیار دینے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اس سامان کو فلاں قیمت پر فروخت کر دے اس پر جو منافع ہو گا وہ تمہارے لیے ہو گا یا میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
المسلمون عند شروطهم.
ترجمہ: مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں۔

فروخت میں مانع ہو کر دیہاتیوں کی جانب سے خود ذمہ دار بن جاتا اور گراں قیمت پر اشیاء خرید کراتا ہے، پس اگر یہ معاملہ جانبین میں سے کسی کے لیے بھی نقصان اور ضرر کا باعث ہے تو اس قسم کا کاروبار ممنوع ہے ورنہ اگر محض سمسار (دلال) کی حیثیت سے حصول نفع مقصود ہے اور متعاقدین کے لیے باعث مضرت نہیں ہے تو درست ہے۔

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام میں ایسے تمام تجارتی کاروبار کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جن میں یا قمار کی صورت بن جاتی ہو یا سود کی، اور اگر یہ دونوں امور نہ ہوں تو پھر وہ نزاع اور مناقشہ (Tussel & Controversy) کی شکلیں پیدا کرنے کا باعث اور سبب بنتے ہوں جن سے تعاونِ باہمی اور ہر دو جانب میں جائز نفع کا فقدان لازم آتا ہو اور بے جا نفع خوری کے لیے راہیں پیدا ہوتی ہوں۔

(ب) صنعت و حرفت

اہمیت:

❶ وسائل معیشت کے شعبوں میں تیسرا اہم شعبہ "صنعت و حرفت" ہے اور بے شبہ تمدن و حضارت (Civilization) کی ترقی میں صنعت و حرفت کو بھی نمایاں دخل ہے اور تجارت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی برکات بھی بہت زیادہ ہیں بلکہ یہ خود تجارت کا ہی ایک اہم حصہ ہے اور تجارت کا بہت بڑا مدار اسی کی ترقی پر ہے۔

❷ اسلام کا ابتدائی دور مشینوں کا دور نہ تھا اس لیے اس ذریعہ سے صنعت و حرفت کی جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان کا تذکرہ ملوں اور کارخانوں کی بحث میں آئے گا، مشینیں جن صنعتی اغراض کے لیے بھی استعمال کی جائیں اور آئندہ ایجادات میں کام میں لائی جائیں اور ان کے استعمال کے جو طریقے بھی بن پڑیں اسلام کے اقتصادی نظام میں ان سے متعلق اساسی و بنیادی احکام بھی آئندہ صفحات میں بیان ہوں گے لیکن دستی مصنوعات اور دستی کاروبار کے لیے اسلام نے ترغیبات کا سلسلہ بھی رکھا ہے اور اس

کی انواع و اقسام اور بعض جزئی تفصیلات تک کا بھی ذکر کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ معاشی زندگی کی ترقی میں یہ ایک نہایت مرغوب اور پسندیدہ عملی جد وجہد ہے۔

عن المقدام عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ما اکل أحد طعاما قط خیرا من أن یأکل من عمل یده وأن بنی اللّٰه داود علیه السلام کان یأکل من عمل یده۔ (۱)

ترجمہ: حضرت مقدام رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا کسی نے نہیں کھایا ہے اور اللہ کریم کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام ”زرہ بناتے تھے اور جنگ کے لیے لوہے کی قمیص کی صنعت کا کام کرتے تھے، حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

”خالد کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ انسان کے لیے کسبِ معاش کا کون سا ذریعہ بہتر ہے؟ فرمایا: دستکاری۔“ (۳)

اور مستدرک حاکم (۴) میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بسند

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعمله بیده

(۲) حضرت مقدام بن معدیکرب الکندی ابو کریمۃ شامی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ہیں۔ نامور بزرگ، محدث اور مجاہد تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ احادیث روایت کی ہیں جو صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث میں منقول ہیں۔ آپ نے شام میں ۸۷ھ میں ۹۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (اکمال فی اسماء الرجال از شیخ ولی الدین خطیب رحمه اللّٰه تعالٰی مؤلف مشکاۃ المصابیح تذکرہ مقدام رضی اللّٰه تعالٰی عنه)

(۳) ابن ماجه: السنن، ابواب التجارات، باب الحث علی المکاسب. مشکوۃ المصابیح، باب الکسب وطلب الحلال، فصل اول، حدیث نمبر ۱

(۴) حاکم، حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری معروف بابن البیع رحمہ اللہ کا بڑے حفاظ حدیث صحیح احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والوں اور مصنفین حدیث میں شمار ہوتا ہے۔ آپ نیشاپور میں پیدا ہوئے، تحصیل علم کے لیے عراق، خراسان اور ماوراء النہر کا سفر کیا۔ بڑے ہو کر اپنے ملک نیشاپور کے جج (قاضی) =

منقول ہے۔

کان داؤد زرّادا، وکان آدم حراثا، وکان نوح نجارا، او کان إدریس خیاطا وکان موسیٰ راعیا.(۱)

ترجمہ: حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے، آدم علیہ السلام کاشتکاری کرتے تھے، نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے، حضرت ادریس درزی کا پیشہ کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کا کام کرتے تھے۔

اسلام سے پہلے "قریش" اگرچہ تجارت کے خوگر تھے اور سورہ "ایلاف"(۲)

بنے۔ آپ نے بہت سی کتب تصانیف کیں جن میں "المستدرک علی الصحیحین" "تاریخ نیشاپور" اور "الاکلیل" مشہور ہیں۔ آپ نے ۴۰۵ھ میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: الزرکلی، خیرالدین: الاعلام، مطبوعہ مکتبہ عربیۃ، دمشق حاکم نیشا پوری، حافظ ابوعبداللہ بن محمد بن عبداللہ، المستدرك، عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما)

(۱) ابن حجر عسقلانی: فتح الباری ج ٤ کتاب البیوع

(۲) اس سورۃ میں اللہ کریم نے قریش پر اپنے احسان و کرم کا تذکرہ کیا ہے، جس میں انہوں نے اس وقت کی دنیا میں عزت و امن عطا فرمایا، جب دیگر اقوام کے تجارتی قافلے لٹتے تھے۔ اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے اسفار جاری نہیں رکھ سکے، جنہیں اپنے تجارتی قافلوں کو چلانے کے لیے بقاعدہ مسلح دستے رکھنا پڑتے تھے، پھر ایک قوم کو دوسری قوم سے تجارت کرنے کے لیے بڑی سیاسی اور معاشی مشکلات درپیش تھیں، مگر قریش مکہ کے تجارتی قافلے پرامن ہر جگہ آتے جاتے تھے، تمام اقوام نے ان سے تجارتی معاہدے (جنہیں ایلاف کہا جاتا تھا) کر رکھے تھے، اور ہر مقام پر انہیں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہاشم بن عبد مناف بن قصی وہ پہلے سردار قریش تھے جنہوں نے روم کے بادشاہ قیصر اور پھر قیصر کی سفارش پر حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے تجارتی معاہدات کیے۔ اسی طرح وہ فلسطین تک سفر کرتے اور غزہ سے ہو کر مکہ مکرمہ واپس آتے۔ وہ سردیوں میں یمن کا پرامن تجارتی سفر کرتے اور گرمیوں میں شام کا۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر: تاریخ، ص ۱۰۸۹۔ ابن سعد: طبقات ۷/۲۔ یعقوبی احمد بن ابی یعقوب: تاریخ، مطبوعہ نجف، ۱۳۵۸: ۲۰۱/۱

یہ سب بیت اللہ شریف کے ہمسائے اور متولی ہونے کی وجہ سے تھا، جس کا ذکر اللہ کریم نے بطور اپنے احسان عظیم کے فرمایا ہے۔ لیجئے سورۃ کی تلاوت کیجئے:

﴿لِإِيلَٰفِ قُرَيْشٍ ۝١ إِۦلَٰفِهِمْ رِحْلَةَ ٱلشِّتَآءِ وَٱلصَّيْفِ ۝٢ فَلْيَعْبُدُوا۟ رَبَّ هَٰذَا ٱلْبَيْتِ =

میں سردی اور گرمی کے کاروانِ تجارت کی آمد و رفت کا اسی لیے تذکرہ کیا گیا ہے، تاہم اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے ذرائع آمدنی ان کی معاش کا ذریعہ تھے، بلکہ بعض اوقات وہ ان کو تجارت پر بھی ترجیح دیتے تھے، یعنی "جوا" غارت و لوٹ اور سودی لین دین۔

اسلام نے ان غلط راہوں کو بند کر کے صرف جائز طریقہ، تجارت کو باقی رکھا، اس کی ترغیب دی اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصریٰ کی منڈی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا[1] کے مال کی خرید و فروخت فرمائی اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اسوۂ حسنہ بن کر ان کو با اخلاق تاجر بنایا، بننے، سینے، جوتیاں بنانے، برتن بنانے اور اسی قسم کی گھریلو ضروریات کو خود تیار کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی، عورتوں کو کاتنے کی ترغیب دی تو مردوں کو بننے کی تلقین کی اور اس طرح دستکاری سے

﴿٣﴾ ٱلَّذِىٓ أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَءَامَنَهُم مِّنْ خَوْفٍۭ ﴿٤﴾ (سورۃ القریش (١٠٦): ١، ٤)
ترجمہ: چونکہ قریش کو خوگر بنانا تھا، وہ خوگر ہو گئے، گرمی اور سردی کے سفر کے۔ لہٰذا (اس خوگر بننے کے لیے ہماری طرف سے دی گئی سہولتوں اور عزت و احترام کی نعمت کے شکریہ میں) ان کو چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے (عظیم و جلیل) پروردگار کی عبادت کریں، جس (کریم) نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور (سفر کے) خطرہ سے امن میں رکھا۔

(۱) ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خویلد المخزومیۃ القریشیۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت ذی وجاہت و وقار اور مالدار خاتون تھیں۔ ۴۰ سال کی عمر میں اللہ کریم کے کرم و احسان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور فضائل پسندیدہ اور بالخصوص آپ کی تاجرانہ دیانت داری سے متاثر ہو کر آپ کی زوجہ محترمہ بننے کی سعادت پائی، اس وقت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پچیس (۲۵) سال تھی۔ پھر زندگی بھر آپ کے دکھ سکھ، مشکلات و مصائب اور خوشی و غمی کا ساتھی بن کر رہیں۔ آپ کی دولت نے بظاہر فقیر (دراصل شاہِ کون و مکان) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی دکھ کم کر دیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آپ سے ہوئیں۔ آپ کی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح نہیں کیا کیونکہ آپ ایسی ستودہ صفات، غم گسار اور خیر خواہ بیوی محض اللہ کریم کے کرم ہی سے ممکن تھی۔ آپ نے ۱۰ سن بعثت میں وفات پائی اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تین دن قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غمخوار، باوفا اور محسن چچا ابو طالب نے وفات پائی۔ ان کا صدمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا کہ تاریخ نے اس سال سانحہ غم کا نام ہی عام الحزن رکھا۔

روزی کمانے کو دنیوی فلاح بھی بنایا اور اخروی شاد کامی کی بشارتوں سے بھی نوازا۔[۱]

اسلام نے اس بارہ میں بھی صرف ترغیبات اور ضروری اصلاحات ہی تک اپنی رفتار کو محدود نہیں رکھا، بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ذرائع کو وسیع کیا اور خلافتِ راشدہ اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دورِ حکومت میں عرب سے باہر ایران، شام، عراق، مصر اور روم میں تجارتی منڈیاں قائم کی گئیں اور ان کی ترقی کے لیے بہتر سے بہتر سہولتیں مہیا کی گئیں۔

(ج) تجارت و صنعت کے عملی وسائل

مادی ترقی کے اس دور میں تجارت و صنعت کی ترقی و کامیابی میں دو چیزوں کا بہت دخل ہے۔ ① شرح تبادلہ (Rate of Exchange) ② محصولات درآمدات و برآمد (Custom Duties)

شرح تبادلہ:

اسلامی اقتصادی نظام کے دورِ اول میں ان میں سے پہلی چیز کا وجود نہیں تھا اس لیے کہ اس زمانے کی تجارت بیشتر اشیاء کے بدلے میں اشیاء (Barter System) ہی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی اور کہیں کہیں ٹکسالی سکہ اور چاندی، سونے کی غیر مسکوک

---

(۱) انہی ایمان افروز بشارتوں اور ہاتھ سے کما کر کھانے کی عظمت کا احساس دلانے کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دستکاریوں اور صنعتوں کو بطورِ پیشہ اپنا کر جہاں اپنے روزگار کے مسئلہ کا حل کیا، وہاں رہتی دنیا تک انسانوں کو یہ سبق دے گئے کہ دستکاری اور صنعت معاشی تگ و تاز کا ضروری جزو ہے، اور کوئی بھی ہنر اپنی ذات میں حقیر نہیں ہوتا، غلط انسانوں کی غلط سوچ اسے برا بناتی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پارچہ باف تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیر ساز تھے، حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد محترم حضرت عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ خیاط (درزی) تھے، کعبہ کے کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی درزی تھے، حضرت ابو سفیان بن صخر بن حرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ چمڑا کی دستکاری کرتے تھے، حضرت عقبہ بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑھئی تھے، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوہار تھے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم الدینوری: کتاب المعارف، عنوان صناعات الاشراف)

(Uncoined) ڈلیوں کے ذریعے بھی لین دین ہو جایا کرتا تھا، اس لیے تبادلہ سکہ جات کے جو اثرات آج کل کی تجارت پر پڑتے ہیں اور اقتصادی فلاح و بہبود یا تباہی و بربادی لاتے ہیں اس زمانے میں ان کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

محصولات درآمد و برآمد:

درآمد و برآمد پر محصول کا سسٹم اسلام کے اقتصادی نظام کے دور اول میں بھی رائج تھا۔ ایک قومی و ملکی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی تجارتی ترقی کے لیے شرح مبادلہ اور محصولات کو اس طرح قائم کرے جس سے نقصان کی بجائے فائدہ اور ناکامی کی جگہ کامیابی کے ساتھ ملک مالا مال ہو، چاہے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام کو اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

لیکن چونکہ اسلام عالمگیر پیغام ہے اور وہ اخوتِ عالم کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس لیے اس معاملہ میں وہ ایسے ترجیحی سلوک کا قائل نہیں ہے جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیان تجارت کے نام سے معاشی دستبرد اور تجارتی حسد و بغض پیدا ہو اور نتیجہ میں ایک کی غلامی اور دوسرے کی آقائی، یا ایک کی خوشحالی اور دوسرے کی تباہی ظاہر ہو اس لیے اس نے تجارت کے محصولات کے بارے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے اور درآمد برآمد پر اس قسم کی پابندیاں عائد نہیں کیں جو اس مہذب دور کی حکومتوں نے استحصال بالجبر (Exploitation By Force) کے لیے نکال رکھی ہیں، اس نے تو فطری تقاضا کے مطابق یہی فیصلہ دیا ہے کہ ''تجارت'' معاشی ذرائع میں سے ایک بہترین ذریعہ ہے لہذا اس کو اپنے اور پرائے کا فرق کیے بغیر ٹیکسوں اور محاصل سے معاف رکھا جائے تاکہ خدا کی کائنات کے مختلف حصوں کی مخصوص اشیاء دوسرے حصوں میں آسانی کے ساتھ لی دی جا سکیں اور خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق محبت اور پریم کے ساتھ ایک دوسرے کا تعاون حاصل کر سکے اور خالقِ کائنات کی یہ ساری کائنات ایک برادری اور ایک ہی کنبہ بن جائے،

لیکن جب تک یہ صورتِ حال پیدا نہ ہو اس وقت تک اپنی جماعتی زندگی کی فلاح کے لیے مساویانہ سلوک پر عملدر آمد کیا جائے، لہٰذا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب عراق اور شام کے گورنروں نے یہ اطلاع دی کہ نصاریٰ و یہود کے ممالک میں جب مسلمان تاجر جاتے ہیں تو ان سے مالِ تجارت پر محصول لیا جاتا ہے، تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی یہ حکم دیا کہ اگر وہ ہمارے ملکوں میں مالِ تجارت لے کر آئیں تو جس حساب سے وہ ہمارے تاجروں سے محصول لیتے ہیں اسی حساب سے ان سے بھی محصول لیا جائے اور اس کا اصطلاحی نام عشور رکھا گیا۔

وكان مذهب عمر رضي الله تعالىٰ عنه فيما وضع من ذلك أنه كان يأخذ من المسلمين الزكوة، ومن أهل الحرب العشر تاما لأنهم كانوا يأخذون من تجار المسلمين مثله إذا قدموا بلادهم.[1]

---

(۱) ابو عبيد: كتاب الاموال (مطبوعه قاهرة، ۱۳۵۲ھ) ص ۵۳۱۔ امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فیصلہ —— کہ مسلمان تجار سے جو لیا جائے گا وہ ان کے اموال تجارت کی زکاۃ ہوگی البتہ ذمی اور حربی سے تجارتی محصول لیا جائے گا —— کی وضاحت اس طرح کی ہے:

كتب عمر بن الخطاب (رضي الله تعالىٰ عنه) الى عمّاله أن يأخذوا من المسلم ربع العشر، ومن الذمي نصف العشر ومن الحربي العشر وما يؤخذ من المسلم من ذلك فهو الزكاة المفروضة الواجبة، تعتبر فيها شرائط وجوبها من حول، ونصاب، وصحة الملك، فان لم تكن الزكاة قد وجبت لا تؤخذ منه. (احكام القرآن: ج ۲، مطبوعه مصر ۱۳۳۵ھ، ص ۱۵۵

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ وہ مسلمان (تجار) سے چالیسواں حصہ، ذمی سے بیسواں حصہ اور حربی سے دسواں حصہ وصول کریں۔ مسلمان (تاجر) سے جو کچھ لیا جائے گا یہ وہی مقررہ زکاۃ ہوگی جو (شرعاً) واجب ہے، اس ضمن میں وجوب زکاۃ کی شرائط مثلاً سال کا گزرنا، (مال کا بقدر) نصاب ہونا، صحیح ملکیت (یعنی عاقل، بالغ مسلمان) ہونا ملحوظ رکھا جائے گا۔ ہاں اگر کسی مسلمان پر زکاۃ واجب نہیں (بنتی) ہے تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔

اسی طرح یہی امام جصاص رحمہ اللہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

كتب عمر بن عبدالعزيز —— رحمة الله عليه —— إلى عمّاله أن يأخذوا مما يمّر به =

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مذہب ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لیتے تھے اور اہل حرب سے عشور وصول کرتے تھے اس لیے کہ حربی حکومتوں کا دستور تھا، کہ جب مسلمان تاجر ان کے ملکوں میں جاتے تو اسی طرح کا محصول وہ ان سے وصول کرتی تھیں۔"

اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فیصلہ تھا کہ ایک تاجر سے سال میں صرف ایک ہی مرتبہ لیا جائے، خواہ وہ سال کے اندر متعدد بار مال درآمد برآمد کیوں نہ کرے، نیز پھلوں پر محصول معاف تھا۔

(د) تجارت وصنعت کو ترقی دینے کے طریقے:

مسطورہ بالا امور کے علاوہ خلافتِ اسلامیہ نے اور دوسرے طریقوں سے بھی تجارت وصنعت کو فروغ دیا اور اقتصادی حالت کو ترقی دینے کی راہ اختیار کی۔ مثلاً:

المسلم من التجارات من كل عشرين دينارا نصف دينار، ومما يمّر به الذمي يؤخذ منه من كل عشرين دينارا دينار، ثم لا يؤخذ منه شئ إلا بعد حول، أخبرني بذلك من سمع النبي صلى الله عليه وسلم. (حواله بالا)

ترجمہ: حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کیا کہ جو اموال تجارت مسلمان (تجار) لے کر گزرے اس سے (اگر وہ) بیس دینار (کا ہو تو) نصف دینار وصول کیا جائے۔ اور جو مال ذمی لے کر گزرے اس کے بیس دینار میں سے پورا ایک دینار لیا جائے۔ پھر سارا سال اس سے اس مال سے کچھ بھی وصول نہ کیا جائے۔ مجھے اس (عمل اور اس پر حکم) کی خبر ایسے شخص نے دی ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ رزیق بن حکیم رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے گورنروں کو لکھا تھا: مسلمانوں کے اموال تجارت سے چالیس دینار پر ایک دینار (یعنی ۴۰/۱ حصہ) لیا کرو اس سے آگے اگلے چالیس دینار پر اسی حساب سے وصول کرو اور اگر (چالیس دینار سے) ایک تہائی بھی کم ہو تو اسے چھوڑ دیا کرو۔ اور ٹیکس کلکٹر یہ خوب نوٹ کرے گا تاکہ سال گزرنے پر اس (مال) کی زکاۃ وصول کر سکے گا، اور جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس مال پر سال گزر چکا ہے، ان تجار سے کچھ نہ لے گا۔ (کتاب الام: ۲/۳۹)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان تاجروں سے جو عاشور (Customs) کے نام پر لیا جاتا تھا وہ ان کے اموال تجارت پر زکاۃ ہوتی تھی، مگر ذمی اور حربی کافر سے محصول لیا جاتا تھا۔ البتہ سال میں صرف ایک بار اور بس۔

❶ اسلام سے پہلے عرب کی تجارت کا بہت بڑا تعلق مصر، روم، ایران اور ہندوستان کے ساتھ تھا، اور اس کے لیے انہوں نے حسبِ ذیل مقامات میں منڈیاں قائم کر رکھی تھیں۔

دومۃ الجندل، مشقر، ہجر، صحار، ریا، شحر، عدن، صنعاء، رابیہ، حضر موت، عکاز، ذوالمجاز اور بصری۔"(۱)

(۱) کرد علی محمد: الاسلام والحضارة العربية، مطبوعه قاهرة، ۱۳۳۹ھ، ۱۱۶/۲۔ یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب رحمہ اللہ: تاریخ، مطبوعہ نجف، ج ا۔ ان تجارتی بازاروں میں سے بعض کا تذکرہ کتب تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، البتہ بعض کا ذکر ماضی کا قصہ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ مثلا

❶ دومۃ الجندل شام اور مدینہ منورہ کے درمیان عرب کے شمال میں واقع ہے۔ بڑا تجارتی مرکز اور تجارتی کاروانوں کی گذر گاہ بھی رہا ہے۔ عرب اسی راستہ سے شام سے تجارت کیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد عرب کا مشہور قبیلہ بنو کنانہ یہاں آباد تھا۔ اس کا آج کل نام "جوف" ہے۔ یاقوف حموی: معجم البلدان، مطبوعه مصر: ۱۰۷/٤

❷ صنعاء اور عدن کے بازار موجودہ مسلم ملک یمن میں ہیں اور آج بھی مشہور تجارتی مراکز ہیں۔ عدن تجارتی شہرت کے ساتھ ساتھ عالمی بحری گزر گاہ بھی تھا اور ہے بھی۔

❸ رابیہ، حضر موت، شحر موجودہ مملکت سعودی عرب اور یمن کی سرحد پر واقع تھے، البتہ حضر موت دور جاہلیت اور ابتداء اسلام میں یمن کا شہر تھا۔ (یاقوت حموی: معجم البلدان)

❹ ہجر بحرین ہی کا دوسرا نام تھا، شقر بھی بحرین کا ایک مشہور تجارتی مرکز تھا۔ (سید محبوب رضوی: مکتوبات نبوی علی صاحبها الصلوة والسلام، مکتوب بنام منذر ساوی گورنر بحرین)

❺ صحار اور ریا بھی یمن اور عرب کے درمیانی علاقہ میں تھے۔ البتہ گردش ایام نے ان کے نام اور مقام بدل دیئے۔

❻ عکاز کا بازار جاہلیت کا سب سے بڑا بازار تھا۔ یہ وادی نخلہ اور طائف کے درمیان میدان عرفات میں لگتا تھا۔ یہ وسط ذوالقعدہ سے شروع ہو کر ۲۰ روز تک لگا رہتا تھا۔ یہ بازار ۱۲۹ھ تک باقی رہا۔ (کتاب الامکنة الازمنة، مطبوعه حیدر آباد، هند)

❼ ذوالمجاز کا بازار مکہ مکرمہ کے قریب یکم ذوالحجہ سے لگتا تھا اور ۸ ذوالحجہ کو یہاں سے منیٰ منتقل ہو جاتا، گویا یہ حجاج کرام کا بازار تھا۔ (حواله بالا. یاقوت حموی: معجم البلدان)

❽ بصری شام کی مشہور تجارتی منڈی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ اور دوسری بار حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سامان تجارت لے کر تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت، شرافت، معاملہ فہمی اور لیاقت کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے حضرت خدیجہ

اسلامی خلافت نے بھی ان کو باقی رکھا اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خود بھی کاروبار کیا اور قرآن نے ''وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ'' کہہ کر اس کو اور زیادہ مضبوط بنا دیا، مدینہ طیبہ کے مقام سُنح میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کپڑے کا گودام اور کارخانہ تھا،[1] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تجارت کا تعلق ایران تک وسیع تھا۔[2] حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی کپڑے کی تجارت تھی اور شام کے ساتھ بیوپار کرتے تھے، خاص حجاز میں ''عکاظ'' کی منڈی ۱۲۹ھ تک قائم رہی۔[3]

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمارہ بن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تجارتی کاروبار حبشہ میں نجاشی اور اس کے اعیانِ سلطنت کے ساتھ چلتا

رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام میسرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں آنے کا شرف حاصل کیا۔ (شبلی نعمانی: سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۱، عنوان: سفر شام، تزویج خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

(۱) ابن سعد: طبقات، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۷ء، ۱۳۸/۳، ذکر ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) احمد بن حنبل: مسند، ۶۰۲/۱، ۳۴۷/۳

(۳) ابن حجر عسقلانی: فتح الباری: ۲۶۹/۳

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نوآباد شہر کوفہ میں ایک بڑی تجارتی منڈی قائم کرائی۔ جس میں دور دراز سے آنے والے تجار اور مقامی کاروباری حضرات مخصوص ایام میں سودوں کے طے کرنے میں اس قدر غل پڑتا کہ گورنر کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ــــ جن کا مکان اس منڈی کے قریب واقع تھا ــــ کو اپنے مکان کے سامنے ایک ڈیوڑھی تعمیر کرنا پڑی۔ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لمحہ برداشت نہ ہوئی کہ سائلوں اور گورنر کے درمیان آڑ بن رہی ہوگی، اسے آگ لگوا دی۔ (ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ: البدایۃ والنہایۃ: ۷۵/۷) اس منڈی سے خلافت کو اس قدر آمدن ہوتی کہ بعد کے ایام میں اس سے اس علاقہ میں موجود اسلامی لشکر کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ (یعقوبی: کتاب البلدان، ۱۸۹۱ء، ص ۳۱۰، ۳۱۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گورنر ابن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ کی اجازت سے بصرہ میں ایک تجارتی بازار قائم کیا۔ اس بازار نے تجارتی مرکز کا درجہ حاصل کیا۔ جس کے تین شعبہ جاتے تھے، ایک شعبہ صرف اونٹوں اور دیگر حیوانات کی خرید و فروخت کے لیے مخصوص تھا۔ (ابن سعد: طبقات، ۳۳/۵. یعقوبی: کتاب البلدان، ص ۳۱۰، ۳۱۱)

تھا،[1] اور اس طرح بیشتر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تجارتی کاروبار میں مشغول تھے۔

اسی طرح مدینہ طیبہ میں یہود کی تجارتی منڈیاں اور صنعت و حرفت کے کارخانے تھے، انصار مدینہ نے صنعت و حرفت کا کام ان ہی سے سیکھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد پھر انہی کے ہاتھ میں یہ کام آگیا، یہود نے ان کو کپڑا ابنا، رنگ سازی، تلواریں بنانا، زرہ بنانا آلات جنگ بنانا اور کاشت کاری کا کام سکھایا۔[2]

بحری تجارت:

بری تجارت کے علاوہ بحری تجارت کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے زمانے میں اہل عرب کی تجارتی برآمد میں سونا، چاندی، تانبا، موتی، لوہا، جواہرات خوشبوئیں، کھانے کا مصالحہ، چمڑا، کھال، زین پوش، بھیڑ اور بکری تھے اور درآمد میں دوسرے ملکوں سے کپڑا، غلہ، ہتھیار، آئینہ اور دوسری آرائش کی چیزیں، مشک، سیاہ مرچ، عود ہندی، قسط ہندی، کافور، زنجبیل، صندل، ناریل اور لونگ وغیرہ اشیاء تھیں، قرآن عزیز نے بحری تجارت کے متعلق ایک جگہ اس طرح ترغیب دی ہے:

﴿وَتَرَى ٱلْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا۟ مِن فَضْلِهِۦ﴾[3]

ترجمہ: اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ سمندر میں پانی پھاڑ کر چلتی ہیں تاکہ تلاش کرو اس کے فضل (تجارت) کو۔

ان تفصیلات کے ذکر سے یہ مقصد ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت جو اقتصادی نظام کی جان ہے، اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کو فروغ دینے اور کامیاب بنانے میں امکانی کوشش کی، بلکہ اسلامی حکومت نے کہ جس کا ابتدائی مرکزِ حکومت سرزمینِ حجاز تھا، تجارت و صنعت و حرفت ہی کو اقتصادی زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ تسلیم کیا اور اسلامی روایات نے

---

(۱) حوالہ بالا

(۲) کرد علی، محمد: الاسلام والحضارة العربية، ۱/۱۲۰

(۳) سورة الفاطر (۳۵): ۱۲

مذہبی بشارات کے ساتھ اس کی پرزور تائید کی۔

حاصلِ کلام یہ کہ اسلام کے معاشی نظام نے تجارت کے بارے میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ تجارت و صنعت اصولاً محاصل کی پابندی سے آزاد ہوں ورنہ کم از کم سخت پابندیوں، سخت ڈیوٹیوں اور سخت محصولات سے آزاد ہونی چاہئیں تاکہ دنیا میں عام خوشحالی اور فارغ البالی پیدا ہو اور ہر شخص کو سامانِ معیشت مہیا کرنے میں آسانی ہو لیکن اس کے مقابلے میں تہذیب کے اس دورِ جدید میں دنیا کی خوشحالی اور انسانوں کی فارغ البالی کے لیے کیا کیا سامان فراہم کیے گئے ہیں اور اقتصادیات کو مستقل علم و فن بنانے کے مدعیوں نے دنیا کی اقتصادی بدحالی کو کس حد تک دور کیا ہے اس کا جواب مجھ سے زیادہ آپ دے سکتے ہیں۔

دارالضرب یا ٹکسال (Coinage):

تجارتی کاروبار اور تمام قسم کے لین دین میں سکہ بہت اہمیت رکھتا ہے انسان کے ابتدائی دورِ تمدن میں چیزوں کا لین دین عموماً چیزوں ہی کے ذریعے سے ہوا کرتا تھا، اس کے بعد سونا چاندی، تانبا قسم کی دھاتوں کے ٹکڑوں کے ذریعہ ہونے لگا اور تیسرے دورِ ترقی میں ''سکہ'' نے ان دونوں کی جگہ لے لی، سکہ کے وجود میں آنے کے بعد ترقی کا ایک درجہ یہ آیا کہ دارالضرب کا مطبوعہ کاغذ ''نوٹ'' کے نام سے دھات کے سکہ کا قائم مقام ہو گیا اور اب یہ بحث چھڑ گئی کہ کسی ملک کی اقتصادی ساکھ جب قائم رہ سکتی ہے کہ اس کے دارالضرب میں وہ دھات جو سکہ کا معیار قرار دی گئی ہو، اتنی مقدار میں موجود ہو جس مقدار میں نوٹ جاری کیے گئے ہیں۔

لیکن اس ترقی کے نتائج جس قدر تباہ کن ثابت ہوئے ہیں وہ آفتاب کی طرح روشن ہیں کیونکہ یہ ایجاد نو ایک ایسا حربہ ہے کہ محض اقوام کی اقتصادی حالت ہی کو برباد نہیں کر رہا ہے بلکہ رقیب حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے ان دو حربوں ہی سے کام لیتی رہتی ہیں جو بیجا شرح مبادلہ اور کاغذی سکہ کے نام سے مشہور ہیں، ممکن ہے کہ زمانہ کی بعض ضروریات اس مہلک ایجاد کے جواز کے لیے معقول

دلائل و وجوہ بیان کر دیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اس کا نقصان اور ضررِ عظیم اس کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے۔

"واثمهما اكبر من نفعهما."

ترجمہ: اور ان دونوں کا نقصان ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے۔

اسلامی اقتصادیات میں کاغذی نوٹ کی حیثیت:

اس لیے اسلامی اقتصادی نصام ایسے کاغذ کو سند تو تسلیم کر سکتا ہے لیکن "سکہ" تسلیم نہیں کر سکتا تا کہ کسی وقت بھی اس کاغذ کی اصل سے محروم نہ رہ جائے اور کسی قوم یا ملک کو اس راہ سے تباہ و برباد کرنے کا حیلہ ہاتھ نہ آجائے جیسا کہ آج محکوم قوموں کے ساتھ ہو رہا ہے۔[1]

یہی وجہ تھی کہ جب غلام آباد برصغیر پاک و ہند میں نوٹ رائج ہوا تو علمائے اسلام کے مابین یہ علمی بحث چھڑ گئی کہ یہ سکہ ہے یا اس کی سند ہے اور نوٹ کے ذریعے زکوٰۃ ادا ہو سکتی ہے یا نہیں اور منی آرڈر کے ذریعہ "زکوٰۃ" یا کسی امانت کی رقم کو نوٹوں کی وساطت سے پہنچایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ہندوستان کے مشاہیر علماء عدم جواز کے قائل تھے۔

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے کاغذی نوٹ کے ذریعہ استحصال کا یہ ظالمانہ طریقہ آج سے ۷۰، ۸۰ سال قبل بیان کیا تھا مگر آج جب کہ دنیا ایک عالمی بستی (Global Village) کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، جبکہ اقتصادی تعاون، انسانی حقوق اور بین الاقوامی برادری کا زور سے راگ آلاپا جا رہا ہے۔ دنیا کا مضبوط ترین ظالم امریکہ اور اس کے حواری آج بھی کمزور اور معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں ممالک کے ساتھ یہی استحصالی حربہ (Exploitative Toll) استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جب مرحوم شاہ فیصل رحمہ اللہ نے تمام تیل برآمد کرنے والے مسلمان ممالک کے تعاون سے تیل کی عرب مخالف اور اسرائیل حامی ممالک کو برآمد پر پابندی کو بطورِ ہتھیار جنگ (War Weapon) اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو امریکہ نے اپنے کاغذی نوٹ ڈالر کی شرح تبادلہ گھٹا دی، یوں عربوں کے اربوں ڈالرز جو امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں پڑے تھے، ان کی قیمت ڈالرز سے گھٹ کر کاغذ کے اوراق کے برابر ہو گئی۔

نیز جب یہ ترقی یافتہ ممالک کسی غریب ملک کو اس کی قومی غیرت، خودداری، یا نظریہ کی سزا دینا چاہتے ہیں اس کے کاغذی نوٹ کی شرح تبادلہ گھٹا دیتے ہیں، یہ تماشہ دنیا کے عالمی اقتصادی سٹیج روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

ہمارے روشن خیال حضرات کو جب اس بحث کا علم ہوا تو انہوں نے حسبِ عادت اس کا کافی مذاق اڑایا اور اس جانب مطلق توجہ نہ فرمائی کہ آخر اس بحث و مذاکرہ کی بنیاد کیا ہے؟ تاہم اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے جب اس فیصلہ سے بہت حرج ہونے لگا تو ان علماء نے مجبوراً ''عموم بلوی'' (عام ابتلاء) کی فقہی اصطلاح کے مطابق جواز کا فتویٰ دیا، ورنہ اصل حکم کے اعتبار سے اس کو سکہ تسلیم نہیں کیا۔ (۱)

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ کی یہ رائے آج سے ۷۰ سال قبل (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۸ء میں) تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی نظریات سے وابستہ رکھنے اور انگریزی اقتدار کی شریعت اسلامیہ پر روز افزوں فکری یلغار سے بچانے کے لیے یہی رائے زیادہ درست تھی، علاوہ ازیں ابھی خلافت عثمانیہ کو زوال آئے (۱۹۲۳ء) زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور مسلمان مفکرین اپنے جہاد اور اخلاص کی وجہ سے اس کے احیاء (Revival) کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ اسلام کا پھریرا عالم پر لہرائے گا، اور مسلمان ایک بار پھر اپنی میراث (Heritage) سونا اور چاندی (نقدین) کے سکوں کو بے وقار کاغذی نوٹوں کی جگہ اصل سکہ بنائیں گے، مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مسلمانوں کو مزید معاشی مشکلات سے بچانے کے لیے فقہاء نے کاغذی نوٹوں کو ''زرکاغذی'' (Paper Currency) ہونے کا فتوی دیا اس ضمن میں مجمع الفقہ الاسلامی الہند (Islamic Fiqa Academy of India) کے دوسرے سیمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء نیو دہلی ـــــ میں تمام علماء ہند کا اجتماعی فیصلہ بڑا اہم ہے، لکھتے ہیں:

''موجودہ دور میں سونا چاندی ذریعہ تبادلہ نہیں رہا اور کاغذی نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونا، چاندی کی جگہ لے لی ہے۔ حکومت کے قوانین بھی کاغذی نوٹوں کو مکمل طور پر ثمن (Price) کی حیثیت دیتے ہیں اور بحیثیت ثمن نوٹوں کو قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں، غرضیکہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت عرف اور رواج میں زر قانونی (Legal Currency) کی ہوگئی ہے۔ کرنسی کے اس ہمہ گیر رواج نے شرعی اور فقہی مسائل پیدا کیے ہیں، ان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور غور و خوض کرنے کے بعد شرکاء درج ذیل نکات پر متفق ہوئے:

❶ کرنسی نوٹ سند و حوالہ (Certificate & Transfer) ہی نہیں بلکہ ثمن ہیں اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی و قانونی (Termimolagical & Legal Currency) کی ہے۔

❷ عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ (Medium of Exchange) ہونے کی مکمل طور پر زر خلقی (سونا، چاندی) کی جگہ لے لی ہے، اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اس لیے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمنِ حقیقی (Real Price) کے مشابہ (Similiar) ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔ (سہ ماہی رسالہ ''بحث و نظر'' پھلواری شریف، پٹنہ، ہند جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء، ص ۱۲)

سکہ سازی کی اسلامی تاریخ:

خلافتِ راشدہ کے دورِ خلافت میں دارالضرب موجود تھا اور اس میں سکے ڈھالے جاتے تھے، سونے اور چاندی کے سکے قسم قسم کے رائج تھے، جو درہم و دینار کے نام سے موسوم تھے۔

وضرب الدراهم على الخط الفارسي و زاد في بعضها الحمد لله و في بعضها "محمد رسول الله".[1]

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکومت فارس کے طرز پر سکوں کے لیے دارالضرب قائم کیا اور بعض سکوں پر "الحمد للہ" اور بعض پر "محمد رسول اللہ" کے نقش کا اضافہ کیا ہے۔

مقریزی نے کتاب النقود الاسلامیہ میں تصریح کی ہے کہ دورِ اسلام میں

اس بارے سابق جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی ـــــ جو پاکستان کے علماء احناف کی نمائندگی کرتے ہیں ـــــ کے مضمون "کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" کا یہ اقتباس نقل کرنا نہایت مفید ہے:
نوٹوں کے بارے میں یہ مسئلہ بعینہٖ فلوس (پیسوں) کے سکوں کی طرح ہے، سکّے اصلا دھات کے ہونے کی وجہ سے وزنی ہیں، لیکن فقہاء نے انہیں عددی قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان فلوس کے حصول سے ان کی ذات یا دھات یا تعداد مقصود نہیں ہوتی، بلکہ وہ قیمت مقصود ہوتی ہے، جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔
لہٰذا اگر کوئی بڑا سکہ جس کی قیمت دس فلس (پیسہ) ہو، اس کا تبادلہ ایسے دس چھوٹے سکوں سے کرنا جائز ہے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک فلس ہے، اور اس کے وہ فقہاء بھی جواز کے قائل ہیں جو ایک سکہ کا دو سکوں سے تبادلہ کو ناجائز کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں ایک سکہ کی قیمت بعینہٖ وہی ہے جو دس سکوں کی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دس فلس کا سکہ اگرچہ بظاہر ایک ہے۔ لیکن حکماً وہ ایک ایک فلس کے دس سکے ہیں۔ لہٰذا وہ دس واقعی سکوں کے مساوی ہے، بعینہٖ یہی حکم ان کرنسی نوٹوں کا ہے کہ ان میں بھی ظاہری عدد (Apparent Number) کا اعتبار نہیں، اس عدد حکمی (Ruling Number) کا اعتبار ہے، جو ان کی قیمت (Face Value) سے ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا اس میں مساوات ضروری ہے۔ (ماہوار البلاغ، نومبر ۱۹۸۸ء، عنوان: کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم: ص ۳۱)

(۱) مقریزی، تاج الدین احمد بن علی: النقود الاسلامیه المسمی به شذور العقود فی ذکر النقود، مطبوعه نجف (عراق)، ۱۹۶۷ء، ص ۹، ۱۵، مطبوعه جوائب، ۱۲۹۸ھ، ص ٤،٥

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے چاندی، سونے کی سادہ ڈلیوں کو مدوّر سکوں (Round Coins) میں تبدیل کیا، جو نوشیروانی سکوں کے مشابہ تھی اور بعض پر ''لا اله الا الله وحده''، بعض پر ''الحمد لله'' اور بعض پر ''محمد رسول الله'' نقش کرایا۔ اور یہ کہ ان کے زمانہ میں دس درہم کا مجموعی وزن چھ مثقال کے برابر ہوا کرتا تھا۔[۱]

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے بصرہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۴۰ ھ میں چاندی کا سکہ ڈھالنے کے لیے دارالضرب[۲] قائم کیا اور بستانی کی دائرۃ المعارف میں ہے:

درهم أودرهما أسم لمضروب مدور من الفضة والمشهور ان تدويره فى خلافة الفاروق وكان قبله على شكل النواة بلا نقش الخ.[۳]

ترجمہ: درہم چاندی کے سکہ کو کہتے ہیں جو دارالضرب میں ڈھالا گیا ہو اور مدور ہو مشہور یہ ہے کہ اس کو گول سکہ کی شکل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں دی گئی ہے ورنہ اس سے قبل وہ غیر منقش کھجور کی گٹھلی کی شکل میں تھا۔

اور عام کتبِ سیرت میں عبد الملک بن مروان[۴] کا نام لیا جاتا ہے اور بعض نے

---

(۱) حوالہ بالا۔ نقش بندی، نصیر الدین محمود: الدینار الاسلامی فی المتحف العراقی، بغداد، ۱۹۵۳، ص ۱۱، ۱۵۔ البتہ علامہ ماوردی رحمہ اللہ (ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی رحمہ اللہ) کی رائے میں ایران میں تین طرح کے دراہم کا چلن تھا۔ بغلی (آٹھ دانگ کا) طبری (چار دانگ کا) اور مغربی (تین دانگ کا)۔ ان میں سے پھر بغلی اور طبری زیادہ رواج پذیر تھے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ ان دونوں کو ملا کر نصف اسلامی درہم قرار دیا جائے۔ لہٰذا اس طرح اسلامی درہم چھ دانگ کا ٹھہرا۔ (الاحکام السلطانیہ: ص ۱٦٧)

(۲) حوالہ بالا

(۳) بستامی، معلم بطرس: دائرۃ المعارف، ٦٧/٧

(۴) عبد الملک بن مروان ۲٦ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ مدینہ منورہ میں تربیت پائی اور یہاں کے اہل علم و

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۱] کی جانب ابتداء کی نسبت کی ہے، چنانچہ ماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ'' بلاذری کی فتوح البلدان اور ابن جریر رحمہ اللہ و ابن کثیر رحمہ اللہ کی تاریخ میں تفصیلات مذکور ہیں۔

میرے نزدیک یہ اختلاف حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ شہرت و عدم شہرت پر مبنی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چاندی سونے کو خام سکوں کی شکل میں ڈھالنے کی ابتدا اگرچہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہوئی تھی لیکن سادہ ڈلیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے عبدالملک کے زمانہ میں صرف دارالضرب (ٹکسال) کا سکہ ہی استعمال ہونے لگا، چنانچہ مذہب و اخلاق کی دائرۃ المعارف سے یہی پتہ چلتا ہے۔ [۲]

دارالضرب (ٹکسال) کی حیثیت:

چونکہ سکہ عوام کی کاروباری زندگی کی سہولت کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کے دارالضرب کا مقصد نفع عوام ہے نہ کہ حکومت کا مخصوص شعبہ آمدنی۔ اس لیے اسلامی نظامِ اقتصادی میں ٹکسال کو صرف حکومت کے خزانہ ہی کے لیے

فضل سے فیض پایا۔ بہت بڑے فقیہ، محدث اور سیاست دان تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ کے بقول جب کبھی ان کی ملاقات عبدالملک رحمہ اللہ سے ہوئی انہیں علم کا منارہ پایا۔ عبداللہ بن ابوزناد رحمہ اللہ کے مطابق اس زمانے میں چار محترم شخصیات کو مدینہ منورہ کے فقہاء سمجھا جاتا تھا، جن میں حضرت سعید بن مسیب، قبیصہ بن زویب، عروہ بن زبیر اور عبدالملک بن مروان رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ وہ ۳۵ سال کی عمر میں ۶۵ھ میں تخت نشین ہوئے اور ۸۶ھ میں وفات پائی۔

(۱) حضرت عبداللہ بن زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سن ۲ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (ذات النطاقین) کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بیٹے ہونے کی وجہ سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حقیقی بھانجا تھے۔ سات سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سعادت بیعت پائی۔ بہت سی جہادی مہمات میں شامل رہے۔ طرابلس کی فتح اللہ کریم نے آپ کے ہاتھوں کرائی۔ ۶۴ھ میں خلیفہ بنے۔ امویوں کے مخالف تھے، حجاز، عراق، شام، مصر آپ کے حامی تھے۔ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں امویوں کے محاصرہ کے دوران شہید کر دیئے گئے۔

(۲) Encyclopedia of Raligions & Ethics, vol Ed., P. 1939, 3rd, 709

مخصوص نہ ہونا چاہیے بلکہ عوام کو یہ سہولت ہونی چاہیے کہ اگر وہ اپنی مملوکہ دھات سے مروجہ سکہ سے مسکوک (Coined) کرانا چاہیں تو کرا سکیں، چنانچہ فتوح البلدان میں مروان بن الحکم کے دارالضرب سے متعلق تصریح ہے کہ وہ حکومت اور عوام دونوں کے لیے عام تھا۔[1]

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں:

❶ شرح مبادلہ "امام" اور اس کی "مجلس شوریٰ" کی رائے پر اصول بالا کی روشنی میں موقوف ہے اور وہ عام اقتصادی ترقی کے لیے جو صورت بھی مفید سمجھیں اختیار کریں۔

❷ محصولات یعنی کسٹم ڈیوٹی وغیرہ میں وہ اپنی جانب سے سختی کا قائل نہیں ہے اور اپنے نظام میں تجارت کو وسعت دینے کے لیے "بے قید تجارت" (Free Trade) کا حامی ہے لیکن اس نظریہ کی ہمہ گیری اسی وقت ممکن ہے کہ اس کی تعلیم حق کی طرح اس کا نظامِ حکومت بھی عالمگیر ہو اور جب تک یہ صورت حال موجود نہیں ہے اس وقت تک کے لیے وہ دوسرے ممالک اور اپنے ممالک کے درمیان انصاف کے مطابق معاملہ کو اختیار کرنا پسند کرتا ہے، وہ نہ دوسروں کو نقصان دینے کا خواہش مند ہے اور نہ خود اپنے لیے مضرت قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

علی پاشا مصری رحمہ اللہ[2] اقتصادی بحث میں لکھتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ ان جیسے اقتصادی مسائل میں مشہور و معروف مذاہب دو ہیں: اول مذہب حریت (آزاد تجارت) اس مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ اجنبی برآمد پر کسی قسم کا ٹیکس نہ لگایا جائے اور تجارت کو آزاد چھوڑا

---

(۱) بلاذری، احمد بن یحیی بن جابر: فتوح البلدان، مطبوعه مصر، ص ٤٥٤

(۲) علی پاشا، علی مبارک پاشا مصری ۱۲۴۱ھ (مطابق ۱۸۲۳ء) میں پیدا ہوئے۔ بہت بڑے عالم محقق، مؤرخ اور سیاسی مدبر تھے۔ مصر کے وزیر بھی رہے۔ اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے انہوں نے ہی "دارالکتب المصریۃ" قاہرہ میں قائم کیا، جہاں کئی اسلامی کتب شائع ہوئیں، انہوں نے ۱۳۱۱ھ (مطابق ۱۸۹۳ء) میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ ورحمۃ واسعۃ

جائے۔ اجنبی پیداوار اور حاصلات کی چونکہ انگریزوں کو بہت ضرورت ہے اس لیے ان کے اکثر ممالک کی اقتصادی پالیسی یہی ہے۔ اور جب اس مذہب کے مدعی غیر ممالک کے مال پر ٹیکس کے قابل نہیں ہیں تو اندرون ملک کی مصنوعات پر تو کسی طرح ٹیکس کو جائز نہیں سمجھتے۔ دوسرا مذہب حمایت (Proctection) (ترجیحی تجارت) کا اس مذہب کا دعوی یہ ہے کہ جب کسی ملک میں مصنوعات کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس کی قوت اور نفوذ قوت بہت ترقی کر جاتی ہے اور بہت مؤثر ہو جاتی ہے اس لیے قومی حکومت کا فرض ہے کہ اپنی ملکی مصنوعات کی حفاظت کرے اور ان کو مقدم رکھے اور اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے (یعنی غیر ملکی تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے)۔"[1]

ان میں سے دوسرے نظریہ میں اقتصادی کشمکش اور ملکی و بین الاقوامی عناد و بغض (Retaliation) کی بو آتی ہے اور پہلا نظریہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کو تسلیم کرنے والی اقوام کا عمل اس کے خلاف سخت منافقانہ ہے۔ اور وہ دوسرے نظریئے کے قائلین سے زیادہ محکوم اقوام سے اپنے لیے ترجیحی سلوک کرانے اور ان سے فائدہ اٹھانے بلکہ ان کو تباہ کرنے کے لیے آزاد تجارت کی حمایت کرتی ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی تجارتی پالیسی اس کی روشن مثال ہے۔

اس لیے جب تک تمام دنیا کی قومیں اخلاق کے اس "مثل اعلی" (Highest Description) تک نہ پہنچ جائیں جو بمصداق فرمان مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم):

❶ کلکم بنی آدم وآدم خلق من تراب.[2]

---

(۱) مصری، علی پاشا: خواطر فی القضاء والاقتصاد والاجتماع، مطبوعہ قاھرة، ص ۲۱۱، ۲۱۲

(۲) ابن کثیر تفسیر، سورة الحجرات (٤٩) آیت نمبر ١٣. رواه الترمذی، وابوداؤد وکذا فی المشکوة، باب المفاخرة والعصبیة. الھیثمی: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، باب البر والصلة.

ترجمہ: تم سب ایک باپ آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔

❷ (عن انس وعبداللہ رضی للہ تعالٰی عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) الخلق عیال اللہ (فأحب الخلق إلی اللہ من أحسن إلی عیاله).[1]

ترجمہ: (حضرت انس بن مالک اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالٰی عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مخلوق ساری کی ساری اللہ کریم کی عیال ہے۔ (پس اللہ کریم کو وہ شخص بہت محبوب ہے جو اس کی عیال کے ساتھ احسان کرے۔)

اخوت اور مساواتِ انسانی کا بلند درجہ ہے، اس وقت تک اقتصادی نظام کے لیے بہتر طریق کار یہ ہے کہ ایک طرف اسلام کے معاشی نظام کی جانب سے یہ سعی رہنی چاہیے کہ تجارت جیسی مفید چیز "آزاد" ہو اور اس سے اسلامی حکومت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملے اور اس مبارک وقت کے آنے تک دوسری جانب غیر مسلم اقوام سے عدل و انصاف کے ساتھ مساویانہ تجارتی تعلقات قائم ہوں، فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ کا فرمان ذی شان ہمارے اس دعوی کی روشن مثال ہے۔"[2]

(س) تجارتی بد عنوانیوں کا انسداد:

تجارت کو اقتصادی نظام کا اہم جزو قرار دینے اور اپنے نظام میں تجارتی سہولتیں اور جائز آسانیاں بہم پہنچانے کے باوجود اسلام کا اقتصادی نظام ان تمام بد عنوانیوں کا سد باب کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے جو درحقیقت "اقتصادی نظام" کے مقصد اور نصب

---

(۱) رواه البیهقی فی شعب الایمان کذا فی المشکوة، باب الشفقة والرحمة علی الخلق، الفصل الثالث.

(۲) ابو عبید: کتاب الاموال (۱۳۵۲ھ)، ص ۵۳۱.

العین کو تباہ و برباد کرنے کا باعث بنتی ہیں اور تجارت کے نام سے عام بدحالی اور قابلِ نفرت سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں، اقتصادی نظام کو برباد کرنے اور اس کو کھوکھلا بنانے میں بدعنوانیوں کی جس قدر بھی تفصیلات و جزئیات ہو سکتی ہیں وہ صرف دو بنیادوں پر قائم ہیں، اسلام نے اپنی اصطلاح میں ان کو دو خصوصی ناموں سے موسوم کیا ہے:

1. احتکار (Hoarding)
2. اکتناز (Concentration)

احتکار سے مراد یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محصور و محدود ہو جائے اور اکتناز کے معنی یہ ہیں کہ دولت کے عظیم الشان خزانے چند افراد کے پاس جمع ہو جائیں اور ان کے پھیلاؤ اور تقسیم (Circulation & Distribution) کی کوئی راہ باقی نہ رہے، اسلام نہ اس کو منظور کرتا ہے اور نہ اس کو، اس لیے وہ ہر معاشی و اقتصادی شعبہ میں ان دونوں کے خلاف قانون سازی کے ذریعے جہاد کرتا اور دونوں ملعون راہوں کو بند کرتا ہے، احتکار کے سلسلہ میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ ہو:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من أحتكر فهو خاطئ وفی روایة المحتكر ملعون۔[1]

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقات والمزارعة، باب تحریم الإحتكار فی الأقوات. ابن ماجه: السنن، ج ۲، ابواب التجارات، باب الحكرة والجلب. جامع الترمذی، کتاب البیوع. مشكوة المصابیح، کتاب البیوع، باب الاحتكار. دراصل معاشیات کی دنیا میں احتکار (Hoarding) ایک نہایت ہی مضر اور مکروہ فعل ہے نہ صرف اسلامی معاشیات بلکہ جدید لادینی معاشیات (Secular Economic) نے بھی اسے اجتماعی مفاد (Social Welfare) کے خلاف قرار دے کر اسے رد کیا ہے۔ مگر اسلام نے روز اول سے اس عمل کو ناجائز قرار دیا اور اس کو بالکل ممنوع قرار دیا۔ اللہ کریم نے قرآن کریم میں محتکر یا ذخیرہ اندوز (Hoarder) کی مذمت کرتے ہوئے ایک پوری سورہ نازل فرمائی آپ بھی تلاوت کر لیں:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝١ ٱلَّذِى جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُۥ ۝٢ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُۥٓ أَخْلَدَهُۥ ۝٣ كَلَّا ۖ لَيُنۢبَذَنَّ فِى ٱلْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا ٱلْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ ٱللَّهِ ٱلْمُوقَدَةُ ۝٦ ٱلَّتِى تَطَّلِعُ عَلَى

ٱلْأَفْـِٔدَةِ ۝٧ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِى عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩﴾ (سورة الهمزة (١٠٤): ١، ٩)

ترجمہ: خرابی (عذاب اور ذلت) ہے ہر بہتان طرز، چغل خور کے لیے (یہ عذاب اور ذلت میں اس شخص کی مانند ہے) جس نے مال (روپیہ اور اشیاء کو) اکٹھا کیا اور اسے شمار کرتا رہا۔ اور وہ (نادان، انسانیت کا دشمن) یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال (و متاع) اس کو ہمیشہ کی زندگی دے دے گا۔ ہرگز (اس کا گمان پورا) نہیں ہو گا بلکہ (اسے موت آئے گی اور مرنے کے بعد اسے "حطمہ" میں پھینک دیا جائے گا)۔ بھلا تمہیں معلوم بھی ہے کہ "حطمہ" کیا ہے؟ وہ اللہ (عظیم و جلیل) کی دہکائی ہوئی آگ ہے، جس کی گرمی (اور سوزش ان ذخیرہ اندوزوں کے) دلوں تک پہنچ جائے گی۔ پھر یقیناً اسے ان (ذخیرہ اندوزوں) پر بڑے بڑے ستونوں کے ذریعہ بند کر دیا جائے گا (تاکہ اس کی حرارت ٹھنڈی نہ پڑ جائے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکیمانہ ارشادات گرامی میں اس قبیح حرکت کی مذمت فرمائی ہے۔ (حضرت مصنف رحمہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشادات نقل کیے ہیں چند اور قابل توجہ ہیں) مثلاً:

❶ الجالب مرزوق والمحتكر ملعون. (ابن ماجه: السنن، ابواب التجارات، باب الحكرة والجلب)

ترجمہ: بازار میں سامان لا کر (یا درآمد کر کے) بیچنے والا (اللہ کریم کی طرف سے) رزق دیا جانے والا بنتا ہے مگر ذخیرہ اندوزی کرنے والا لعنتی بنتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

❷ لا يحتكر إلا خاطئ. (صحيح مسلم، كتاب البيوع، كتاب المساقاة، والمزارعة، تحريم الاحتكار في الأقوات)

ترجمہ: ذخیرہ اندوزی تو صرف خطا کار کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

ذخیرہ اندوزی کی تہدید آمیز الفاظ میں ممانعت کرتے ہوئے فرمایا:

❸ من احتكر الطعام أربعين ليلة فقد برئ الله منه. (رواه احمد والحاكم وابن ابی شيبه)

ترجمہ: جس نے غلہ (Food Stuff) چالیس رات تک روکے (ذخیرہ کیے) رکھا، اللہ کریم (کی رحمت و شفقت اور وعدہ رزق) کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

یہ وعیدیں اور تہدید آمیز انداز اس حقیقت کا غماز ہیں کہ احتکار انسانیت کی دشمنی ہے۔ یہ انسانوں کو ان کے حق "رزق" سے محروم کرنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا ذریعہ ہے، دراصل محتکر (ذخیرہ اندوز) کی یہ فطرت ثانیہ بن جاتی ہے کہ وہ بھاؤ چڑھنے پر فرحاں و شاداں اور گرنے پر لرزاں و ترساں ہوتا ہے۔ اس کی یہی سوچ اسلام کے کریمانہ نظام میں مذموم اور قابل نفرت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذخیرہ اندوز کی اس مذموم سوچ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

❹ بئس العبد المحتكر إن سمع برخص ساءه، وإن سمع بغلاء فَرِحَ. (رزين بحواله مشكاة المصابيح، باب الاحتكار، الفصل الثالث)

ترجمہ: ذخیرہ اندوزی کرنے والا شخص کتنا برا ہے کہ جب ارزانی ہوتی ہے (جو اللہ کریم کے بندوں کے لیے

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احتکار کرنے والا خطا کار ہے اور ایک جگہ فرمایا کہ اس پر خدا کی پھٹکار ہے۔

"فقہ" میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص "غلہ" وغیرہ کو بہت بڑی مقدار میں اس لیے خریدے کہ بازار گراں ہو جائے اور پبلک میں اس چیز کی مانگ کا "مرکز" صرف وہی بن جائے اور پبلک اس کے مقررہ نرخ پر مجبور ہو جائے اور وہ من مانی گراں فروشی کرے۔

اس احتکار کی مثال کے لیے اس زمانے میں زیادہ کنج و کاؤ کی چنداں ضرورت نہیں ہے مہاجنوں کا وہ گروہ جو کاشت کاروں کو قرض کے نام سے سود پر روپیہ دے کر ان کی کمائی کو "غلہ" کی شکل میں دستبرد کرتا اور ان سے ارزاں نرخ پر خرید کر کھیتوں (غلہ کے خزانوں) میں بھر رکھتا ہے اور اس طرح ارزانی و گرانی کا کفیل بن جاتا ہے، یہ "احتکار" کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اس گروہ کے اس عمل سے کاشتکار اور عوام الناس جس قدر پریشان ہوتے اور بعض موسموں میں اقتصادی بدحالی کے شکار بنتے ہیں اس کا اندازہ ہندوستان کے باشندوں کے سامنے شاہد عدل ہیں۔ سودی لین دین کے بعد اگر کوئی معاملہ عام بدحالی کا باعث ہے تو وہ یہی تجارتی کاروبار ہے جو اجناس و اشیاء کے احتکار کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

قمار یا سٹہ:

"احتکار" کی دوسری جزئی "قمار" ہے اس سے ہماری مراد صرف "جوئے" (Gambleng) کی وہ عام شکل نہیں ہے جو نقد کے ذریعہ کھیلا جاتا ہے بلکہ وہ تمام صورتیں اس میں شامل ہیں جو تجارت کے نام سے کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں قمار ہی کی قسمیں کہلاتی ہیں، مثلاً "سٹہ" آپ اگر کاروبار سے واقف ہیں تو اندازہ لگا سکتے

موجب خوشی ہے) تو وہ مایوس ہونے لگتا ہے۔ اور جب گرانی ہوتی ہے (جو اللہ کریم کے بندوں کے لیے موجب پریشانی ہے) تو وہ خوش ہوتا ہے۔

ہیں کہ یہ "تجارتی جوا" ملک کے اقتصادی نظام کو کس طرح تباہ اور پراگندہ کرتا ہے اور بغیر محنت نفع حاصل کرنے کے لالچ میں کس طرح ہزاروں گھروں کو خانماں برباد کر کے چھوڑتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں اس کی بہت سی شکلیں رائج تھیں، مثلاً ملامسۃ، منابذہ، بیع حصاۃ وغیرہ۔

ملامسۃ کا طریقہ یہ تھا کہ بائع و مشتری کے درمیان یہ طے ہو جاتا تھا کہ بغیر دیکھے اور حقیقت معلوم کیے ہوئے مشتری جس کپڑے یا شے کو چھو دے گا وہ اس کا مالک ہے۔ اور منابذہ میں یہ طے ہوتا تھا کہ جو کپڑا یا شے بائع مشتری کی جانب پھینک دے گا وہ بغیر معاملہ کے مشتری کی چیز سمجھا جائے گا۔ اور بیع حصاۃ یہ ہوتی تھی کہ متعدد اشیاء فروخت کے نام سے رکھ دی جائیں اور لوگ ٹھیکری یا اسی قسم کی کسی شے کو ان کی طرف پھینکیں جس چیز کو وہ ٹھیکری چھو جائے خواہ وہ کسی قیمت کی ہو مشتری کی ملکیت ہو جائے گی، موجودہ دورِ ترقی کے مہذب تجارتی جوئے، لاٹری (Lottery) اور ریس (Race) سب اسی قسم کے معاملات میں داخل ہیں۔

اسلام ان کو "میسر" قمار اور جوا قرار دیتا ہے اور اس قسم کے تمام معاملات کو باصول تجارت کے لیے تباہ کن سمجھتا ہے اور معاشرتی تباہی کا پیش خیمہ یقین کرتا ہے اور ان باتوں کے علاوہ سوسائٹی کے اخلاق اور کیریکٹر کے لیے باعثِ ذلت و رسوائی جانتا ہے۔

کیونکہ یہ معاملات اکثر جنگ و جدل کا باعث بنتے ہیں، مواساۃ، رواداری، ہمدردی اور مروت کو تباہ اور دوسرے کی تباہی میں اپنا فائدہ سمجھنے کی ترغیب دے کر انسانی جوہر کو برباد کرتے ہیں۔ (اسی لیے شریعت اسلامیہ اور اسلام کے عادلانہ معاشی نظام نے ان تمام مضر اشکال کی نفی فرمائی ہے اور اپنے پیرو کاروں کو ان سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد باری ہے):

❶ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ

كَبِيرٌ ﴾[1]

ترجمہ: (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وہ آپ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے: ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔

❷ ﴿إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ ﴾[2]

ترجمہ: بلاشبہ شراب جوا، بت پانسے یا سب سرتاسر نجاست ہیں اور کارِ شیطان ہیں، پس تم ان سے بچو۔

❸ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ فِى ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ وَعَنِ ٱلصَّلَوٰةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ۝٩١﴾[3]

ترجمہ: بلاشبہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی راہ سے تمہارے درمیان بغض و عداوت قائم کر دے اور تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پس کیا تم ان برائیوں سے باز رہو گے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمہ اللہ)[4] اس قسم کے معاملات قمار کی مضرت کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور بساطِ ارض پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور اس سے نفع حاصل کرنے کا ان کو موقع بہم پہنچایا تو انسانوں کے درمیان جنگ و جدل اور کشمکش بپا ہوئی۔ تب خدا تعالیٰ کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی محنت، وراثت یا دوسرے کسی جائز

---

(۱) سورۃ البقرہ (۲): ۲۱۹

(۲) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۰

(۳) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۱

(۴) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

اور صحیح طریق سے کسی چیز کا مالک ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کشمکش کا حقدار نہیں ہے۔ البتہ دوسرے کو بدل (Substitue or Compensation) کے ذریعے خریداری اور معتبر و صحیح رضا مندی کے ساتھ معاملت (Dealing) سے اس چیز کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم و یقین ہو اور فریب چالبازی اور دغل فصل (Hush- Hush Corruption) کا اس میں ہرگز کوئی شائبہ نہ ہو اور جبکہ انسان مدنی الطبع (Social Being) ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو حق تعالیٰ نے باہمی تعاون و معاونت کو بھی ضروری قرار دیا ہے، پس اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا متصور ہو جیسے "قمار" یا اس میں صحیح رضا مندی موجود نہ ہو جیسے سود۔ تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔"[۱]

بہر حال اسلام کے اقتصادی نظام میں اس قسم کے تمام تجارتی کاروبار کے لیے مطلق کوئی جگہ نہیں ہے جو یا صریح "قمار" ہوں اور یا ان کی تہہ میں مالی ترقی کا وہی جذبہ کار فرما ہو جو "قمار" میں پایا جاتا ہے اور اگر علم الاقتصاد اور علم الاخلاق دونوں کے ماہرین سے اس بارہ میں دریافت کیا جائے تو بغیر کسی اختلاف کے وہ بھی یہی رائے دیں گے بلکہ رائے دے چکے ہیں کہ "قمار" کی قسم کے تمام معاملات اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کے لیے تباہ کن ہیں۔[۲]

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ قاہرۃ، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق، ص ۱۰۳

(۲) محمد فرید وجدی: دائرۃ المعارف القرن العشرین، نصف دوم، ج ۷، مطبوعہ حیدر آباد (ہند)، ص ۹۴۳، ۹۴۴

باب ——— (۱۰)

سود اور بنکاری

احتکار (Hoarding) کی سب سے معلوم قسم "سودی لین دین" ہے جس اقتصادی نظام میں اس کا عمل دخل ہے وہ یکسر برباد و تباہ ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس و محتاج بنا کر ایک مخصوص طبقہ میں دولت سمیٹتا اور ان کو اس کا واحد اجارہ دار (Menoplist) بنا دیتا ہے۔

تاریخ انسانی کے دو نظریئے

ابتداءِ عالم انسانی سے دو نظریے کار فرما رہے ہیں: ایک "عادلانہ نظام کار کا نظریہ" دوسرا "سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ"

عادلانہ نظام کا نظریہ:

پہلے نظریہ کا یہ مطالبہ ہے کہ انسانوں میں ایک ایسا اجتماعی نظام (Social Order) قائم ہو جس میں نہ بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں اور نہ مفلس و محتاج طبقے، بلکہ ایک درمیانی حالت ہو جس میں معیشت کے درجات کا فطری تفاوت (Natural Gap) اگرچہ موجود ہو لیکن حقِ معیشت کی مساوات ضرور قائم رہے، وہ اس کا طالب نہیں ہے کہ سب کی معیشت کے سامان ایک ہی طرح کے ہوں لیکن اس کا ضرور خواہش مند ہے کہ سب کو حسبِ ضرورت ملے اور ترقی و سعی کی راہیں سب پر یکساں طور پر کھلی ہوں۔ حق اور خدا کے فرستادہ سچے مذاہب ہمیشہ اسی نظریئے کے داعی رہے ہیں اور اسلام نے اس نظریہ کو کامل اور مکمل نقشہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ:

دوسرے نظریہ کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کے کارخانے میں قدرت کے ہاتھوں نے انسانی مخلوق کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے کچھ خدائی اور آقائی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور کچھ بندگی اور محکومی کے لیے۔ اسی طرح قدرت کا یہ منشاء ہے کہ بعض انسانی گروہ دولت و ثروت کے مستقل اجارہ دار ہوں، جائز و ناجائز طریقوں سے دولت کو فراہم کریں اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص کر لیں۔ اور بعض طبقے مفلس، محتاج، دریوزہ گر (Beggars) اور نان جویں سے ہمیشہ مجبور و مقہور (Forced & Coerced) ہیں اور تفاوتِ درجات کے اس ہولناک فرق (Un-Natural Gap) کو اعتدال پر لانے کا کسی کو بھی حق نہ ہو، یہ نظریہ طاغوتیوں اور آدم رو شیاطین کا ہے اور ان کے اس نظریہ کی عملی کامیابی کی سب سے بڑی بناء یہی مہاجنی سود (Usury) ہے جو مہذب اور غیر مہذب شکلوں میں بڑے بڑے گروہوں اور جماعتوں کا خون چوس چوس کر ایک چھوٹی جماعت کو قارون کا خزانہ بخشتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مخلوق میں سے ایک کو دوسرے کا محکوم بناتا ہے، بہرحال "سود" ملعون سرمایہ داری کے لیے ہمیشہ سے بہت بڑا پشت پناہ رہا ہے۔

اسلام کی دعوت کا مرکز اولین "عرب" بھی اس لعنت میں گرفتار تھا اور مشرکین عرب "تجارت" اور "سود" میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے اور ہندوستان کے مہاجنوں اور دنیا کے سود خوار یہودی گروہوں کی طرح وہ بھی اس لین دین کو اپنی فرزانگی اور بیدار مغزی کا ہنر جانتے تھے (اور اس کاروبار کی حمایت میں جو دلیل دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم اسے یوں بیان فرماتا ہے):

﴿قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡبَيۡعُ مِثۡلُ ٱلرِّبَوٰاْۗ﴾ (۱)

ترجمہ: وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار اسی طرح کی چیز

(۱) القرآن الکریم، سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۵

ہے جیسا سود کا لین دین ہے۔

گویا ان کی نگاہ میں "سود" کا کاروبار ایسا صحیح کاروبار تھا کہ وہ بیع و شرا اور تجارتی لین دین کے جواز کے لیے اس کو دلیل بناتے تھے چہ جائیکہ اس کو ناجائز اور حرام سمجھتے یا معذرت کے طور پر یہ کہتے کہ جس طرح تجارت درست ہے اسی طرح سودی لین دین بھی کیوں درست نہ ہو، اگر آج بھی سود خوار جماعتوں سے سود کے جواز میں دلیل طلب کرو گے تو ساڑھے تیرہ (چودہ) سو برس کے بعد ان کا بھی وہی جواب ہو گا جو ان کے پیشرووں نے دیا تھا۔

ربوا یا سود کی حقیقت

"ربوا" کے لغوی معنی کسی شے کے بڑھنے یا زیادہ ہونے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی شے کے مطلق بڑھنے زیادہ ہونے کو "اصطلاحی ربوا" (Termimological Interest) نہیں کہہ سکتے اور نہ اس پر حرمت کا اطلاق جائز ہو سکتا ہے بلکہ ربوا مال میں ایک خاص قسم کے نفع یا زیادت[1] (اضافہ) کا نام ہے جو کاروباری دنیا کی نگاہ میں بیع و

(۱) ربا ایک ایسی تعریف جس پر تمام مکاتب فکر (All Schools of Thought) کے فقہاء کرام کا اجماع (Consensus of Opinon) ہے۔ وہ علامہ ابن عبدالبر (م ۴۲۳ھ) کے الفاظ میں اس طرح ہے:

وقد أجمع المسلمون نقلا عن نبيهم أن اشتراط الزيادة في السلف ربا ولو كان علف أو حبة. (ابن عبدالبر، حافظ ابن عبدالبر المالكی الاندلسی، التمهيد، مطبوعه لاهور ۱۹۸۳ء: ٦٨/٤)

ترجمہ: مسلمانوں نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی بنا پر اجماع کر لیا ہے کہ ادھار کے اصل زر (Capital) پر اضافہ (یا زیادتی) کی شرط عائد کرنا سود ہے، اگرچہ یہ اضافہ (کم از کم یعنی) ایک مٹھی گھاس یا ایک دانا ہی ہو۔

اس سے ملتی جلتی بات امام ابو بکر الجصاص رحمہ اللہ (م ۳۷۰ھ) نے کی، لکھتے ہیں:

وهو القرض المشروط فيه الأجل و زيادة على المقترض. (احكام القرآن، ج ۱ مطبوعه مصر، ۱۳٤۷ھ، ص ٤٢٩)

ترجمہ: سود قرض کا وہ معاملہ ہوتا ہے، جس میں مدت مقرر کی جاتی ہے، اور قرض لینے والے پر (اصل زر پر) زیادتی کی شرط لگائی جاتی ہے۔

شرا کی طرح ایک جائز معاملہ سمجھا جاتا تھا، مگر اسلام نے کائناتِ انسانی کی فلاح و بہبود اور نظامِ معیشت میں رفعتِ اخلاق اور باہمی اخوت و مساوات کی بقاء کی خاطر حرام قرار دیا ہے اور نہ صرف ان ہی خاص شکلوں کی ممانعت کی ہے جو دعوتِ اسلام سے قبل جاری تھیں بلکہ اپنی جانب سے ایسے اصول بیان کیے جن کے زیر اثر قرض اور بیع و شراء دونوں میں شائبہ سود و ربوا کا کلیۃ انسداد کر دیا تاکہ اسلام کا معاشی نظامِ ربوا اور شائبہ دونوں سے پاک اور بالاتر ہو جائے، کیونکہ اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں اہل عرب ربوا یا سود کو صرف قرض ہی کے اندر محدود سمجھتے تھے، اور بیع و شرا یا تجارتی کاروبار کو غیر مشروط طور پر جائز قرار دیتے تھے، اس لیے جب ان کے سامنے اسلام کا نظریہ ''حرمت سود'' آیا تو کفارِ عرب نے فوراً کہہ دیا کہ بیع (خرید و فروخت) جس سے نفع کی توقع کی جاتی ہے، بھی سود ہی طرح کا ایک معاملہ ہے۔ پس اگر نفع و زیادت سود کو حرام قرار دیتی ہے تو بیع و شرا کو بھی حرام ہونا چاہیے ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ قرض کے سوا کاروبارِ تجارت میں بھی ربوا (سود) کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔

غرض اسلام کے معاشی نظام میں ''اصطلاحی ربوا'' (Termenalogical Interest) کا اطلاق مروجہ مہاجنی سود (Usury) سے زیادہ وسیع اور معاملۂ قرض اور معاملۂ تجارت دونوں سے وابستہ ہے۔

مہاجنی سود (Usury)

ابھی ذکر ہو چکا کہ اہل عرب قرض اور دَین کے ذریعہ جو نفع کماتے تھے اس کو ربوا یا سود سمجھتے تھے اور اس کے جواز کے قائل تھے اور یہ وہی معاملہ ربوا تھا جس کو آج ''مہاجنی سود'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ آج کی طرح مشرکین عرب میں بھی اس لین دین کے مختلف طریقے رائج عاملہ ربوا تھا جس کو آج ''مہاجنی سود'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ آج کی طرح مشرکین عرب میں بھی اس لین دین کے مختلف طریقے رائج تھے۔

❶ ایک طریقہ یہ تھا کہ صاحب ضرورت کو نقد روپیہ قرض دیتے اور ایک مدت معین کر کے فی روپیہ کچھ مقدار سود کی لگاتے تھے۔

❷ دوسری صورت یہ تھی کہ جب معین مدت ختم ہو جاتی تو سود اور اصل قرض (Capital) کو ملا کر اپنی اصل رقم (Capital) قرار دیتے اور پھر اس مجموعہ پر سود شروع کر دیتے، اسی کا نام سود در سود ہے۔

❸ زیور ہتھیار یا اسی قسم کی اشیاء رہن (Pledge) رکھتے اور ان کے عوض قرار دیتے اور اگر معین مدت میں قرض دار قرض ادا نہ کرتا تو روپیہ پر سود لگاتے اور اشیاء کی قیمت کم سے کم قرار دے کر ان کو ہضم کر جاتے۔[1] فقہاء کی اصطلاح میں اس کو ''ربا نسیہ'' کہا جاتا ہے۔

ممانعتِ سود قرآن کریم میں:

اسلام نے سودی کاروبار کی ان تمام اقسام کو حرام قرار دیا اور بے محنت کی اس کمائی کو ظلم و سحت سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ قرآن عزیز نے جس خوبصورت سے اس کی حرمت اور دلائل حرمت کو ادا کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔

❶ ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوٰٓا أَضْعَـٰفًا مُّضَـٰعَفَةً﴾[2]

ترجمہ: مسلمانو! تم سود در سود (Compound Interest) کو ذریعہ معاش ہرگز نہ بناؤ۔

اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا:

❷ ﴿وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰا۟﴾[3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تجارتی خرید و فروخت کو جائز کیا ہے اور سود کو ہر حیثیت سے حرام قرار دیا ہے۔

---

(۱) جصاص ابو بکر: احکام القرآن، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۷ھ، ۵۵۱/۲

(۲) سورۃ آل عمران (۳): ۱۳۰

(۳) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۵

اور حرمت سود کے اعلان کے ساتھ ساتھ گذشتہ واجب الادا سودی رقوم کے متعلق بھی یہ بتادیا کہ اب تک جو کچھ کر چکے ہو وہ کر چکے مگر حرمتِ سود کے بعد اب قرض داروں پر جو سود رہ گیا ہے اس کو چھوڑو اور ہرگز نہ لو اور نہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ مول لو۔

۳ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ﴾[1]

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر واقعی تم مسلمان ہو تو (سود کی حرمت کے بعد) جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس سے درگزر کرو اور اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔

اور اگر باز آجاؤ اور اس "بد کرداری" سے توبہ کر لو تو تمہارا اصل سرمایہ بہرحال واجب الادا ہے۔

۴ ﴿وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾﴾[2]

ترجمہ: اور اگر تم باز آجاؤ تو تمہارا اصل سرمایہ دلایا جائے گا (اللہ کی مرضی یہ ہے کہ) نہ تم لوگوں پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اور یہ سب اس لیے ہے کہ:

۵ ﴿ يَمْحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرْبِي ٱلصَّدَقَٰتِ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴾[3]

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲):۲۷۸

(۲) سورۃ البقرۃ (۲):۲۷۸، ۲۷۹

(۳) سورۃ البقرۃ (۲):۲۷۶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کافر بدکار کو کسی طرح پسند نہیں کرتا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق یہ آخری حد ہے کہ سود کو کفر میں شامل کیا گیا ہے۔

سود کے نقصانات:

(الف) معاشی نقصانات:

﴿ وَمَآ ءَاتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِىٓ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ فَلَا يَرْبُواْ عِندَ ٱللَّهِ ﴾[1]

ترجمہ: اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مالوں میں ترقی ہو تو وہ اللہ کے نزدیک ترقی نہیں پاتا (یعنی پاداش عمل کے قانون کے مطابق آخری نتیجہ گھاٹا اور نقصان ہے۔

گویا تمہاری نگاہوں میں اگرچہ سود سے مال میں ترقی ہو رہی ہے لیکن دنیا میں اس شخص کو عداوتوں کی کثرت اور مال کی بہتات کی وجہ سے دلی بے اطمینانی و بے چینی اور ''هَلْ مِنْ مَّزِيْد'' (Is there any more to Come?) کی مجنونانہ خواہش کی بدولت ''سود'' سے فائدہ کے مقابلہ میں نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس تو اس کے لیے نقصان ہی نقصان ہے اور صدقات میں اس کے برعکس ہے، یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ حرمتِ سود کا حکم دے کر سود کو مٹانا چاہتا ہے، اور صدقات کی ترغیب دے کر ان کی نشو و نما کرتا اور لوگوں میں ان کو عام کرنا چاہتا ہے لیکن ان تمام ہدایات و احکام کے باوجود جو شخص (اس ملعون عمل سے) باز نہیں رہتا، اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ ''بداخلاقی'' کے اس تاریک غار میں گر گیا ہے جہاں وہ انسانیت کی شمع فروزاں اور اس کی شعاعوں سے یکسر محروم ہے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ سود خوار اپنے اس عمل سے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کے

---

(۱) سورۃ الروم (۳۰): ۳۹

لیے چیلنج کر رہا ہے اور اپنی دائمی بد بختی (Ever Wretching) اور خسران مبین (Evident Loss) پر مہر لگا رہا ہے۔ ''فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ''

تم صفحۂ عالم پر مٹے ہوئے اس نقش کو ذرا غور سے دیکھو جو سامنے ایک خش پوش جھونپڑی میں نظر آرہا ہے یہ ایک غریب ونادار بیوہ کا مسکن ہے جس کے پاس دو یتیم وبیکس معصوم بچے شوہر کی زندہ یادگار ہیں، پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کچھ کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے چند برتن اس گھر کے کل کائنات ہیں۔ بچے بلک رہے ہیں، بیوہ آہ وزاری کے ساتھ گڑگڑا رہی ہے، مگر کچہری کا سپاہی وارنٹ قرقی (Inhibition) ہاتھ میں لیے زبان کی گالیوں اور کبھی کبھی ہاتھ کے دھکوں اور مکوں سے بیوہ کی تواضع کرتے ہوئے اپنی سرکاری ڈیوٹی میں مشغول ہے، تھوڑے فاصلہ پر ''زرق برق کار'' میں ایک سفید پوش مہاجن ہنس ہنس کر یہ منظر دیکھ رہا ہے اور بار بار جوش میں آکر منیب جی سے کہتا جاتا ہے، دیکھو تو کس بے حیائی سے دوسرے کا مال مارنے کے لیے سوانگ بنا رہی ہے کہ میرے بچے بھوکوں مر جائیں گے للہ رحم کرو، ان یتیموں پر رحم کرو، ان کا کوئی والی وارث نہیں، جب جھونپڑی اور یہ ٹوٹا پھوٹا سامان بھی نہ رہے گا تو ان بیکسوں کا کیا حال ہو گا؟ جس روز شوہر کو پچیس روپے قرض لینے بھیجا تھا اس دن خیال نہیں آیا تھا کہ کسی کا دینا بھی پڑے گا، منیب جی سود اور سود در سود کے حساب سے پورے چار سو روپے بیٹھتے ہیں، میں نے اکٹھے سو روپے چھوڑ دیئے، مگر یہ بے حیا تو دینا ہی نہیں چاہتی، اب اس سے زیادہ اور کیا ''دیا'' ہو سکتی ہے، ناصاحب میں اپنی محنت کی کمائی اگر اس طرح چھوڑ دیا کروں تو ایک دن خاک ہی چھاننی پڑے۔

آخر جھونپڑی نیلام ہو گئی، برتن کپڑے قرق ہو گئے اور بیوہ کے بچے روتے پیٹتے گھر سے بے دخل کر دیئے گئے۔

سود خوار کی زندگی کا یہ وہ معمولی سا تماشا ہے جو حکایات وقصص کی کتابوں میں نہیں بلکہ دنیا کے اسٹیج پر روزانہ واقعات کی شکل میں کھیلا جاتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی نقصانات:

دراصل سود خوار انسان روپیہ اور دولت کے خمار میں ایسا بد مست ہوتا ہے کہ وہ انسانی اخلاقی مروت، ہمدردی، بلکہ انسانیت کو بے معنی اور مہمل الفاظ سمجھنے لگتا ہے، اور خود غرضی، حرص و طمع اور دوسروں کو برباد کر کے اپنے مفاد کا حصول اس کی زندگی کا نصب العین بن جاتے ہیں، وہ ہر وقت اسی تگ و دو میں پاگل کتے کی طرح مجنون و مخبوط (Insane & Mad) پھرتا رہتا ہے اور مظلوموں اور بے کسوں کی فریاد و حالتِ زار سے اندھا، بہرا اور گونگا بن جاتا ہے، قرآنِ عزیز نے اسی لیے پاداشِ عمل کے قدرتی نتیجہ سے ڈراتے ہوئے عالمِ آخرت میں اس کی اصل کیفیت و حالت کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

﴿ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِى يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيْطَٰنُ مِنَ ٱلْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰاْ ۗ﴾ (۱)

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (آخرت میں خدا کے حضور) ایسی حالت میں کھڑے ہوں گے کہ گویا ان کو بھوت پریت لپٹ گیا ہے اور وہ خبطی ہو گئے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود کے معاملہ ہی کی طرح ہے۔

تجارت اور سود میں فرق:

❶ عن جابر رضی اللہ تعالٰی عنه، قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اکل الربو ومؤکله وکاتبه و شاهدیه. قال: هم سواء. (۲)

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۷۵

(۲) مسلم بن حجاج القشیری: صحیح، ج ۲، باب الربو. نووی: ریاض الصالحین، باب

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خوار، سود دینے والے، سودی دستاویز لکھنے والے اور گواہی دینے والوں پر لعنت کی ہے، اور فرمایا: خدا کی پھٹکار میں یہ سب برابر ہیں۔

❷ عن فضالة بن عبيد — رضي الله تعالىٰ عنه. — صاحب النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: كل قرض جرّ منفعة فهو وجه من وجوه الربا.[1]

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2] روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو قرض بھی نفع کھینچتا ہے، وہ سود ہی کی اقسام میں سے ہے۔

مشرکین عرب نے اپنے خیال میں حلتِ ربوا کے لیے بہتر سے بہتر دلیل یہ بیان کی کہ ربوا اگر قدرِ زائد کی وجہ سے حرام ہے تو پھر بیع کیوں حلال ہے جبکہ کسی نہ کسی شکل میں نفع (قدرِ زائد) یہاں بھی موجود ہے۔ قرآن عزیز نے اپنے معجزانہ اسلوب کے ساتھ اس کا رد کرتے ہوئے کہا ﴿وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ﴾

تغليظ تحريم الربا. ترمذی: الجامع، ج ۱، كتاب البيوع، باب ماجاء فی أكل الربو عن عبدالله بن مسعود رضی الله تعالیٰ عنهما

(۱) امام بيهقی: السنن الكبرى مطبوعه دكن، ج ۳، كتاب البيوع، باب كل قرض جر منفعة، ص ۳۵۰

(۲) حضرت فضالہ بن عبید انصاری اوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ صلح حدیبیہ کے سال ایمان لائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف تمام غزوات میں —— سوائے غزوہ بدر کے —— پایا۔ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ خلافت میں جہاد شام و مصر میں شریک رہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں امیر لشکر، پھر دمشق کے قاضی رہے۔ ایک بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قائم مقام بن کر دمشق میں رہے۔ اکثر روایات کے مطابق ۵۳ھ میں وفات پائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے جنازہ کو اٹھایا (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔ (دیکھئے: ولی الدین خطیب رحمہ اللہ تعالیٰ: الکمال فی اسماء الرجال، تذکرہ حضرت فضالۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

یعنی تم دیکھتے ہو کہ تمام معاملات میں بیع (خرید و فروخت) میں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، جانبین (بائع و مشتری کے مابین) اصول کار فرما ہیں۔

❶ دونوں جانب سے ارادی رضا اور رغبت۔

❷ باہم تعاون و اشتراک۔

❸ دونوں کے لیے منفعت کا حصول۔

اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں اصول قانون، اخلاق اور علم المعیشت کی نگاہ میں صحیح اور درست ہیں اس سے بہتر تعاون و اشتراک باہمی مواساۃ اور حسن سلوک جیسے فضائل کے حامل ہیں جو انسان کی انسانیت کا طغرائے امتیاز ہیں اور ''ربوا'' میں ان کے برعکس تین اصول جاری ہیں:

❶ ایک جانب میں رضا اور رغبت اور دوسری جانب میں اضطرار و اکراہ۔

❷ باہمی تعاون و اشتراک کا فقدان بلکہ کاروبارِ ترقی کے لیے دوسرے کے اضطرار و افلاس کا انتظار۔

❸ ایک کے یقینی ضرر و نقصان پر دوسرے کے نفع کا مدار۔

پس اللہ تعالیٰ کہ جس کی صفاتِ کمالیہ ''رب العالمین'' ''الرحمٰن الرحیم'' ہیں اور جس کی رحمت عام اور ربوبیت تام تمام کائنات انسانی پر محیط ہے وہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی باعقل مخلوق انسان باہمی محبت و مساوات اور تعاون و اشتراک چھوڑ کر خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون چوسنے پر آمادہ ہو جائے اس لیے اس نے بیع کو تو ''حلال'' اور ربوا کو ''حرام'' قرار دیا۔

غرض انسان کے وضع کردہ قوانین اور خدا کے فرمودہ احکام میں یہ بین فرق ہے کہ عام طور پر واضعین قوانین (Laws Givers) کے رجحانات پبلک کے رجحانات کے تابع ہوتے ہیں، کیونکہ وہ پبلک کے نمائندہ کہلاتے ہیں اور چونکہ ان کی عقل بہرحال محدود ہوتی ہے اس لیے وہ ان دور رس نتائج و ثمرات سے اس وقت تک کماحقہ واقف نہیں ہو سکتے جب تک تجربہ یا پبلک کا احتجاج اس کی موافقت یا مخالفت

نہیں کرتے، چنانچہ ربوا کے جواز کا مسئلہ بھی ایک کڑی ہے اس لیے کہ انسان کی حیوانی خواہشات میں سے ایک خواہش طلبِ زر (Demand of Money) بھی ہے اور اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کی یہ خواہش کسی غایت یا قید و بند کو برداشت نہیں کرتی، پس تمام دنیوی حکومتیں اور ان کے واضعین قوانین اپنے اپنے ماحول کے رجحانات کے مطابق ''ربوا کے جواز'' کے لیے قوانین بناتے رہتے ہیں اور اگرچہ وہ اس سلسلہ میں کچھ تحدید و تقید (Limitation and Restriction) بھی کرتے جاتے ہیں، مگر عملاً ربوی معاشرتی نظام بے قید ہو کر افلاسِ عام اور کساد بازار پر مثمر ہوتا اور ایک مخصوص طبقہ میں دولت کی اجارہ داری قائم کر دیتا ہے۔

اس کے برعکس قانونِ الٰہی چونکہ انسانی دسترس سے بالاتر خالقِ کائنات کی جانب سے آتا ہے جو مخلوق کے نفع و ضرر کا حقیقی علیم و خبیر ہے اس لیے وہ حیوانی اوصاف سے پاک اور برتر رہ کر اس حیوانی خواہش کے خلاف فیصلہ صادر کرتا اور ''ربوی معاشی نظام'' کو حرام ٹھہراتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کے بنائے قوانین کی طرح ان کی بے قید خواہشات کے زیر اثر نہیں ہوتا بلکہ حقیقی مصالح عامہ اور فلاحِ عام پر مبنی ہوتا ہے۔

تجارتی سود (CommercialInterest)

مہاجرنی سود کے علاوہ اسلام کے اقتصادی نظام میں صاحب شریعت نے یہ اور اضافہ کیا ہے کہ نہ صرف قرض و دین میں بلکہ تجارتی کاروبار کی بعض اقسام میں بھی سود (ربوا) پایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر سکہ کی بجائے جنس کا جنس کے ساتھ تبادلہ مقصود ہے تو ایسی صورت میں مسطورہ ذیل ہر دو اصول کی پابندی ضروری ہے، ورنہ یہ معاملہ ربوا (سود) میں شامل ہو کر حلال سے حرام کی جانب منتقل ہو جائے گا۔

(الف) اگر ہر دو جانب خرید و فروخت کی شے ہم جنس ہے یعنی سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے (اسی طرح) گیہوں، جو، نمک، کشمش، منقہ وغیرہ اشیاء کا ہم

جنس شے سے بیع و شرا مطلوب ہے تو کھوٹے اور کھرے، منقوش و غیر منقوش (Signed & Un- Signed) کم قیمت و بیش قیمت، عمدہ اور ردی کا لحاظ کیے بغیر دونوں جانب ناپ تول میں مساوات (Equality) بھی واجب ہے اور نقد خریداری بھی واجب وضروری، نہ کمی بیشی درست ہے اور نہ ادھار جائز ہے۔

(ب) اگر جانبین میں ہم جنس شے نہیں ہے یعنی سونے کا چاندی سے یا چاندی کا سونے سے، گیہوں کا جو سے جو کا گیہوں سے وغیرہ وغیرہ تبادلہ مقصود ہے تو ایسی حالت میں کمی و بیشی تو درست ہے مگر ادھار جائز نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ عقدِ بیع کے وقت دونوں جانب سے معاملہ بصورتِ نقد عمل میں آئے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت ارشاد فرمایا ہے:

عن عبادة بن الصامت رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد. فاذا اختلف هذه الأصناف، فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد.[1]

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت[2] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے

---

(۱) متفق علیه، کتاب البیوع، الشوکانی: نیل الاوطار، ج ۵، کتاب البیوع، باب ما یجری فیه الربا. مسلم: الصحیح، ج ۲، کتاب البیوع، باب الربوا. امام ترمذی: الجامع، ج ۱، ابواب البیوع، باب ماجاء ان الحنطة بالحنطة مثلا بمثل و باب ماجاء فی الصرف. ابن ماجه: السنن، ج ۲، ابواب التجارات، باب بیع الصرف وما لا یجوز متفاضلا یدا بید. یہ حدیث صحاح ستہ اور دیگر مجموعات احادیث میں باب البیوع، باب الرباوغیرہ کے تحت درج ہے۔

(۲) حضرت عبادہ بن صامت بن قیس ابو الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سعادت مند ستر (۷۰) انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں شامل تھے جنہوں نے حج کے موسم میں عقبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف بیعت پایا اور ان بارہ نقباء کرام میں شامل تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلیان مدینہ منورہ کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ آپ طویل القامت نہایت خوبصورت انسان تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہے۔

=

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سونے کا تبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جو کا جو سے اور خرما کا خرما سے اور نمک کا نمک سے یکساں برابر برابر درست بدست ہونا چاہیے (یعنی ناپ تول میں بھی مساوی ہوں اور ادھار بھی نہ ہوں) اور اگر ان اقسام کا تبادلہ ہم جنس قسم کے ساتھ نہ ہو تو کمی بیشی کے ساتھ جس طرح چاہو معاملہ کرو لیکن معاملہ ادھار کا نہ ہو بلکہ دست بدست ہونا ضروری ہے۔"

یہ حدیث جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے اور اصطلاحِ حدیث میں مشہور بلکہ تواتر [1] کا درجہ رکھتی ہے۔ مجتہدینِ امت نے اس حدیث صحیح کو

بڑی شان کے صحابی تھے، متقی، عابد، محدث اور فقیہ تھے۔ آپ مسجد نبوی میں اصحاب صفہ —— جن کی تعداد چار سو (۴۰۰) اور سات سو (۷۰۰) کے درمیان تھی —— کو قرآن کی تدریس اور لکھائی سکھانے پر مقرر کیے گئے۔ (دیکھئے: عبدالحی کتانی: التراتیب الاداریة: ۱/۳۴۰)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو صدقات کی وصولی کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ (ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی تحریم منع الصدقة الخ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں شام میں معلم قرآن و حدیث بن کر تشریف لے گئے، پھر انہیں شام کا قاضی (جج) مقرر کیا گیا۔ آپ نے اسلامی فتوحات میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ شام کی فتوحات میں سالار سپاہ اسلام حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آپ ہمراہ تھے۔ حمص کی فتح کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا کنٹرول آپ کے سپرد کیا تھا۔ مصر کے محاذ پر اسکندریہ کی فتح کے دن آپ کو (صرف اللہ کریم کی رحمت و نصرت کے حصول کے لیے) اعزازی سالار بنا کر حملہ کیا گیا اور اللہ کریم نے مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔ آپ نے ۳۴ھ میں رملۃ (موجودہ فلسطین) میں ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (دیکھیں: اسد الغابة، تذکرہ عبادة بن الصامت رضی اللّٰه تعالٰی عنه. ابن سعد: طبقات، ج ۳، تذکرہ عبادة بن الصامت رضی اللّٰه تعالٰی عنه —— شبلی نعمانی: الفاروق، واقعات فتح حمص، اسکندریہ)

(۱) مشہور اور متواتر (Mushhur & Mutawatir) روایت حدیث کی دو قسمیں ہیں:

❶ متواتر (Continuous) ایسی روایت (حدیث) کو کہتے ہیں جس کے راویوں (Narrators) کی تعداد آغاز روایتِ حدیث سے آخر تک (ہر دور میں) اتنی زیادہ رہی ہو کہ ان کا کسی جھوٹی خبر (بات) کے پھیلانے پر اتفاق غیر یقینی ہو۔ محدثین کے نزدیک حدیث متواتر کا تواتر (Tawatur) (Continuity) لفظی (Verbal) اور معنوی =

تجارتی کاروبار میں ربو (سود) سے متعلق ''اساس'' (Base) قرار دیا ہے اور اپنے اجتہاد سے ان وجوہ کی تحقیق و تفتیش کی ہے جن کا وجود اس قسم کے معاملات میں حدیث کی بیان کردہ شرائط کی خلاف ورزی سے ربوا (سود) کا باعث بن جاتا ہے۔[1] فقہاء اس کو ربوا افضل سے تعبیر کرتے ہیں۔

حرمتِ سود کی عالمگیریت:

حدیث ربوا ایک اور حقیقت کا بھی اعلان کرتی ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ''اسلام کے معاشی نظام'' کو وطنی اور ملکی عصبیت سے بالا تر بین الاقوامی اخوت و مواسات پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وحدتِ اسلامی کا پیغامِ حق اس راہ سے بھی بروئے کار اس کے کیونکہ عام طریقۂ بیع و شرا میں اگرچہ کوئی شخص چاندی کو چاندی کے اور سونے کو سونے کے عوض نہیں خریدتا، لیکن علمائے اقتصادیات کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ دورِ حاضر میں تبادلہ سکہ جات (Exchange) کا جو سسٹم جاری ہے وہ اسی ربوا کی ایک قسم ہے جس میں تبادلہ کے وقت دو ملکوں کے درمیان چاندی کے یا سونے کے ہم جنس سکوں میں بھی بٹاون کے نام سے کمی بیشی کا اصول قائم ہے اور ظاہر ہے کہ ''ایکسچینج پالیسی'' ایک ایسا فاسد طریقِ کار ہے جس کے ذریعہ دو ملکوں یا دو قوموں کے درمیان ''معاشی دستبرد'' (Economic Exploitation)

(Meaning) دونوں اعتبار سے ہو یعنی نہ کسی دور میں اس حدیث کے الفاظ کی روایت میں راویوں کا اختلاف رہا ہو نہ اس کے معنی میں کہیں اختلاف ہوا ہو۔

❷ مشہور (Well- Known) ایسی حدیث کو کہتے ہیں جس کی راویوں کی تعداد ابتدا یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ میں حدیث متواتر کے برابر نہ ہو مگر تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ (Tabiein) (Followers, Successors or Stundents of the Compenions of the Holy Prophet صلی اللہ علیہ وسلم) اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ (Followers or Successors or Students of the Successors of the Compenions رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے دور (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بعد دوسری اور تیسری نسل میں ان کی تعداد زیادہ ہو اور وہ آخر تک قائم رہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے اصول فقہ پر مدونہ کتابیں، بالخصوص ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے رسالہ ''نخبۃ الفکر'' کا مطالعہ انتہائی مفید ہو گا)

(۱) ملاحظہ ہوں کتب فقہ و اصول فقہ

کی راہ کھلتی ہے، پس اگر اسلام کے اقتصادی نظام میں اس کو جائز رکھا جائے تو گویا یہ پیش خیمہ ہو گا معاشی دستبرد کے جواز کا جو بلاشبہ حقیقی تجارت اور صحیح نفع اندوزی کے قطعاً خلاف ہے۔ اسی طرح دور نہ جائیے قریب ہی سے اس دور جدید پر نظر ڈالیے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تجارت علمی نظریوں پر قائم اور کاروبار سائنٹفک اصولوں پر چل رہا ہے اس دور میں بنک سسٹم کا سود، تجارتی سود کہلاتا ہے لیکن کیا بین الاقوامی لیگ (League of Nations) کی روئداد اور یورپ و ایشیا کے تجارتی ملکوں کے حالات اس امر کے شاہد عدل نہیں ہیں کہ بنک سسٹم کا موجودہ کاروبار ہی بڑی حد تک ان ملکوں کی کساد بازاری اور عام افلاس کا باعث ہے [1] اور یہ سسٹم بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بے پناہ زر اندوزی اور بے قید نفع خوری کا بہترین ذریعہ ہیں اور ان کی بدولت غیر محسوس طریقہ پر دولت سمٹ سمٹ کر محدود طبقہ میں اس طرح پہنچ جاتی ہے کہ عوام کے لیے قوتِ لایموت کے لیے بھی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

جمیع انواعِ سود کی حرمت اور ان کے دلائل

تجارتی سود کی حرمت:

ممکن ہے کہ ایک فلسفی دماغ آفرینش خیال کرتے ہوئے یہ شبہ پیش کرے کہ سود (ربا) کی وہ خاص شکل جو قرض سے متعلق ہے اور مہاجنی سود کہلاتی ہے اس کی تمام جزئیات بلاشبہ اپنے اندر مسطورہ بالا قبائح اور مفاسد رکھتی ہیں اس لیے اسلام نے اس کو حرام قرار دے کر اخلاقی اور قانونی ذرائع سے جس طرح اس کا سد باب کیا ہے، معاشی نظام کی صلاح و خیر کے لیے از بس ضروری اور کائنات انسانی کی اخلاقی اور معاشی فلاح و بہبود کے لیے احسانِ عظیم ہے، لیکن تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے معاملات میں اس قسم کے حصولِ نفع کو جس کی جانب مسطورہ بالا حدیث ممانعت کے ضمن میں اشارہ کرتی ہے حرام قرار دینا اور ربوا (سود) میں شامل کرنا کس

---

(۱) انور اقبال قریشی: اسلام اور سود، مکتبہ الھانیہ، لاہور کینٹ، لاہور، ص ۱۴۹

مصلحت پر مبنی ہے جبکہ اس میں مہاجنی سود کی طرح کے مفاسد کا فقدان ہے۔

اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ سطحی نظر میں اگرچہ تجارتی اصنافِ سود میں مہاجنی سود کی طرح کے مفاسد محسوس نہیں ہوتے لیکن غائر نظر کے بعد یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے کہ نتیجہ اور ثمرہ کے لحاظ سے تجارتی سود میں بھی وہی اساس کام کر رہی ہے جو مہاجنی سود میں کار فرما نظر آتی ہے، یعنی ایسے معاشرتی نظام کا وجود جو مذموم سرمایہ داری پیدا کر کے دولت اور سرمایہ کو مخصوص افراد میں محصور کرتا اور احتکار و اکتناز کی راہیں کھول کر عام کساد بازاری کا سبب بنتا ہے۔

آپ ایسے دو سرمایہ داروں کا تصور کیجئے جن میں سے ہر ایک کے پاس مثلاً ایک سیر سونا ہو اور دوسرے کے پاس پانچ سیر، پس اگر ہم جنس شے میں کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت دے دی جائے تو زیادہ سونا رکھنے والا قلیل مقدار میں رکھنے والے شخص کو مجبور کرے گا کہ وہ اس کے ہاتھ اپنے ایک سیر سونے کو کمی کے ساتھ فروخت کر دے تا کہ وہ چھ سیر کا مالک بن جائے اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی بے قید قوتِ خرید سے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ سونے کی قیمت گھٹانے یا بڑھانے کا مدار بن جائے اور اس طرح اپنے حرص و لالچ کے پیشِ نظر عام کساد بازاری پیدا کر دے اور اگر ایک سیر سونے کا مالک اس کے ہاتھ اپنا سونا کمی کے ساتھ فروخت کرنے سے انکار کر دے تو بڑی مقدار رکھنے والا شخص اس کو شکست دینے اور اس کا سرمایہ زبردستی حاصل کرنے کے لیے اس کے سونے کی قیمت بڑھا کر خریدے گا اور اپنے چند تولوں کا نقصان گوارا کرے گا تا کہ اس کو آہستہ آہستہ یہ حیثیت حاصل ہو جائے کہ بازار میں اس کا کوئی حریف باقی نہ رہے اور وہ تنہا یا اسی درجہ کے چند سرمایہ دار بازار کے نرخ پر قابض ہو جائیں اور ممکن ہے کہ سونے اور چاندی کو حسبِ منشاء گرانی کے ساتھ فروخت کر کے دوسروں کی قوتِ خرید کو اس درجہ کمزور بنا دیں کہ دولت و سرمایہ سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے اندر محدود ہو جائے، خواہ اس کا نتیجہ بدحالی ہی کیوں نہ ہو۔

غرض سونا چندی اور اجناس کو ہم جنس کے ساتھ خرید و فروخت میں اگر کمی بیشی کی اجازت دے دی جائے تو کثیر المقدار سرمایہ دار، قلیل المقدار سرمایہ دار کو مختلف طریقوں سے شکست دے کر ہل من مزید کا طالب رہے گا، اور خرید و فروخت کا اصل مقصد "باہمی تعاون کے ساتھ رفع حاجات" کی بجائے دوسروں کو نقصان پہنچا کر زیادہ سے زیادہ "نفع اندوزی" ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ "صالح نظام معاشی" میں اس مقصد کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

ربوا الفضل:

البتہ اگر جنس مختلف ہو تو چونکہ دونوں اجناس کی قدر و قیمت جدا جدا ہے اس لیے اس میں کمی اور بیشی دونوں کی گنجائش ہے، تاہم اس صورت میں بھی غبن فاحش [۱] کی اجازت نہ دی جائے گی بلکہ دونوں اجناس کی قدر و قیمت کے توازن کا لحاظ رکھا

(۱) غبن فاحش (Exorbitant rate of Profit) غبن فاحش کے معنی ہیں حد سے منافع خوری یا ناجائز منافع خوری۔ یہ منافع خوری بائع (فروخت کرنے والا) اور مشتری (خریدار) دونوں کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اسلام کے عادلانہ معاشی نظام میں تجارتی کاروبار میں نفع کی نہ صرف اجازت بلکہ کئی صورتوں میں اسے ذریعہ برکت بھی سمجھا گیا ہے، دراصل کاروبار کا بڑا محرک (Motive) بھی جائز نفع کا حصول ہے۔ مگر ایسا نفع جو معقول حد سے زیادہ ہو، جو ضرورت مند خریدار یا تبادلہ کرنے والے کی ضرورت کا استحصال کرے بلکہ کاروبار تجارت کے پھیلاؤ میں رکاوٹ بنے اس کی اجازت نہیں ہے۔
غبن فاحش کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جو عام ہے کہ بائع یعنی فروخت کرنے والا مشتری یعنی خریدار کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جنس (مبیع) کو بہت زیادہ نرخوں پر بیچ کر نفع کمائے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بائع بعض اوقات دوسرے بائعین یعنی فروخت کنندگان کو نقصان پہنچانے کے لیے بازار میں اپنی جنس بہت ہی کم نرخوں پر فروخت کرے۔ تیسری صورت بھی ممکن ہے جب خریدار فروخت کنندہ کو رقم یا دوسری جنس کا نہایت ضرورت مند پا کر اس کی جنس نہایت کم قیمت پر خریدے۔
غبن فاحش کب ہوتا ہے؟ فقہاء مالکیہ اور فقہاء حنابلہ (Malikite & Hanabalite Jurists) کے مطابق جب مال تہائی (۱/۳) قیمت سے زیادہ نقصان پر بکے یا آسان الفاظ میں یوں کہیں کہ جب نفع کی مقدار ایک تہائی قیمت سے زیادہ ہو۔ البتہ فقہاء احناف کی رائے میں غبن فاحش ایسی قیمت کو کہتے ہیں جو قیمت معقول اندازے سے باہر ہو مثلاً ایک شخص نے ایک چیز دس ریال میں خریدی، مگر بعد میں کاروباری نظری سے دیکھنے والوں نے اس کی قیمت تین ریال، چار ریال، پانچ ریال بتائی، مگر کسی نے نو ریال یا گیارہ ریال نہ بتائی تو اس چیز

جائے گا اور جب کوئی شخص اس توازن کے خلاف کمی یا بیشی کو نقصان دہ حد تک لے جانے کی کوشش کرے گا، تو خلیفہ یا نائب خلیفہ اس کا سدِ باب کر دے گا۔ چنانچہ اس قسم کی مداخلت کا ثبوت خلافتِ راشدہ کے دور میں ثابت ہے۔

موطا امام محمد رحمہ اللہ میں ہے:

عن سعيد بن المسيب رحمه الله تعالٰى أن عمر بن الخطاب رضى الله تعالٰى عنه مرّ على حاطب بن ابي بلتعه رضى الله تعالٰى عنه، وهو يبيع زبيبا له بالسوق. فقال له عمر: إما أن تزيد فى السعر و إما أن ترفع من سوقنا.[۱]

ترجمہ: حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر بازار کی جانب ہوا تو وہاں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ منقی فروخت کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یا تو نرخ بڑھاؤ (یعنی ارزاں کرو) ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جانا ہو گا۔

زرِ مبادلہ کا نظام اور ربوا الفضل:

نیز سونے کو سونے یا چاندی کو چاندی کے ساتھ یا اسی نہج کی دوسری اشیاء کو ان کی ہم جنس شے کے ساتھ خرید و فروخت میں کمی اور بیشی ایک ملک کو دوسرے کی اقتصادی برتری کی محکوم بناتی ہے اور اس طرح ملکوں، قوموں اور حکومتوں کے مابین

کا منافع غبن فاحش ہو گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: عبدالرحمٰن الجزیری رحمه الله تعالٰى: كتاب الفقه على المذاهب الاربعة، ج ٢، قسم المعاملات، كتاب البيوع، فصل الغبن الفاحش)

(۱) امام محمد: مؤطا، كتاب البيوع فى التجارات والسلم، باب الرجل يشترى الشئ أو يبيعه فيغبن فيه أو يسعر على المسلمين- ابن تيميه، شيخ الاسلام تقى الدين: الحسبة فى الاسلام (تحقيق محمد زهرى النجار) المسئلة الاولى فى اختلاف العلماء فى بعض صور التسعير، مطبوعه الرياض ١٩٨٠ء، ص ٦١

نفرت کا بیج بوتی ہے، مثلاً ہندوستان اپنے بے پناہ سیم و زر اور خام اجناس کی فراوانی کے باوجود ہندوستانیوں کے لیے محض اس بنا پر افلاس اور معاشی تباہ حالی کا باعث بنا ہوا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اپنے حاکمانہ اقتدار کے بل پر انگلستان کے سکہ کے مقابلہ میں اپنی مبادلہ حکمت عملی (Exchange Policy) کے ماتحت ہندوستانی روپیہ کی قیمت کو صرف چھ آنہ کا باقی رہنے دیا، کیونکہ مال کے لینے اور دینے دونوں صورتوں میں سکوں کے درمیان کمی بیشی (بٹاون) کے اصول پر تبادلہ کیا جاتا ہے اور خود ہندوستان کے اندر حیدر آباد اور برٹش انڈیا کے روپیہ میں حالی اور کلدار کے نام سے دو قسم قائم کر کے بٹاون (ایکسچینج) کا دستور قائم ہے اور بلاشبہ یہ معاشی دستبرد کی واضح مثال ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی رومی سکوں کی قیمت ایرانی سکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی تھی، کیونکہ اسلام کے قرنِ اول میں روم و ایران کی باہمی آویزش نے روم کو فاتح اور ایران کو مفتوح بنا کر ایران کی ساکھ کو گرا دیا تھا، حتیٰ کہ بنی امیہ کے دور میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ روم و ایران پر اسلامی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی اسلامی سکوں کے ساتھ ساتھ رومی سکے تو جاری رہے لیکن ایرانی سکوں کو لوگوں نے قطع و برید کر کے ضروریات میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

پس اس حقیقت کے روشن ہو جانے کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلامی معاشی نظام" اپنے دوسرے شعبوں کی طرح سکہ کے معاملے میں بھی عالمگیر وحدتِ نظام (System of Wrold Unity) کا خواہش مند ہے اور اس لیے وہ اس اصول کو پسند کرتا ہے کہ سکہ جات بین الاقوامی ہونے چاہئیں تاکہ تبادلہ سکہ جات کے ذریعہ معاشی دستبرد رونما نہ ہو سکے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ صاحبِ شریعت کی نگاہ حکمت طراز میں یہ ازبس ضروری ہے کہ نقدین (سونا چاندی) جیسی دھاتیں اشیاء کی خرید و فروخت کا ذریعہ بنی رہیں کیونکہ یہی ان کی تخلیق کا حقیقی مقصد ہے اور

مقصود بالذات یعنی ''مبیع'' (جس کو سکہ دے کر خریدا جائے) نہ بننے پائیں تاکہ ایسا سرمایہ دارانہ معاشی نظام پیدا نہ ہو سکے جس میں دھاتیں ''مبیع'' اور مقصود بالذات قرار دے جا کر دولت و سرمایہ کو محدود طبقہ کی ملکیت بنا دینے کا باعث ثابت ہوں، نیز اجناس میں ہم جنس کی خرید و فروخت پر ناپ تول میں مساوات کی پابندی بھی اس حکمت پر مبنی ہے کہ خرید و فروخت کا حقیقی مقصد جبکہ باہمی تعاون و مواسات کے ساتھ انسان کی مختلف ضروریات کی تکمیل ہے تو بلاشبہ یہ مقصد اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ یا سکہ کے ذریعہ ضروریات کو خریدا جائے اور یا مختلف اشیاء کے درمیان تبادلہ کی صورت اختیار کی جائے، مثلاً ایک شخص کے پاس چار سیر چاول ہیں اور اس کو آٹے کی ضرورت ہے اور دوسرے شخص کے پاس آٹھ سیر آٹا ہے اور اس کو چاول مطلوب ہیں تو یہ دونوں تبادلہ اجناس کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

لیکن خرید و فروخت میں ہم جنس اشیاء کا تبادلہ ظاہر ہے کہ ضروریات زندگی کے پورا پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بیشتر اس غرض سے ہوتا ہے کہ اس تبادلہ کی راہ سے دوسروں کی قوتِ خرید کو اس درجہ کمزور کر دیا ہے کہ اس شے پر صرف ایک شخص یا چند اشخاص کا قبضہ ہو جائے اور پھر وہ اس شے کو من مانی قیمت پر فروخت کر سکیں اور اس طرح احتکارِ ممنوع کی مدد سے محدود حلقہ میں دولت و سرمایہ کو مخصوص کر کے عام کساد بازاری (Commercial Depression) پیدا کر دیں۔

پس صاحبِ شریعت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ربوا الفضل کو ممنوع قرار دے کر ایسی صورتِ حال پیدا کر دی کہ کوئی شخص نقدین اور ہم جنس اشیاء ''مبیع'' نہ بنائے گا، کیونکہ اس صورت میں مساوات کے ساتھ خرید و فروخت ایک عبس کام رہ جائے گا۔

سود بنام نفع (Profit):

اس دور جدید میں ''جوازِ سود'' کے لیے بعض اور بھی علمی اصول قائم کیے گئے ہیں جن کو سودی کاروبار کے لیے بنیاد قرار دیا جاتا ہے، اس علمی تشریح کا خلاصہ یہ ہے

کہ جبکہ سونا، چاندی، بشکل سکہ بھی معاشی نقطۂ نظر سے "اصل" میں شمار ہے تو کیا وجہ اس کو حصولِ نفع کا ذریعہ تسلیم نہ کیا جائے، خصوصاً جبکہ اس سے حصولِ نفع کے وقت وہی علامات و آثار یا نتائج پیدا ہوتے ہیں جو اصل کے لوازمات میں شمار کیے جاتے ہیں یعنی پیدا آوری (Productivity) اور انتظار کشی (Waiting)۔ نیز حقیقتاً سود نقد کے اس نفع کو کہنا چاہیے جو حاجت مندوں اور غریبوں کی اضطراری حالت سے فائدہ اٹھا کر حاصل کیا جائے اور بے شبہ یہ نفع ربا کہلانے کا مستحق اور ظالمانہ طریقِ کار ہے، لیکن نقد کا جو نفع اس طرح وصول کیا جائے اور خود قرضخواہ بھی ادا سود کے بعد قرض دہندہ کے مساوی یا زیادہ فائدہ اٹھا لیتا ہے، جیسا کہ بنک سسٹم یا کواپریٹو سوسائٹوں کے سسٹم میں نظر آتا ہے، تو ایسے نفع سود کو ربا میں شمار نہیں ہونا چاہیے۔

جواز سود کی یہ سب سے بہتر تعبیر ہے جو آج کے علمی دور میں کی جاتی ہے مگر غائر (Deep) نظر سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جوازِ سود کی یہ تشریح بھی درست نہیں ہے اس لیے کہ جو معاشی نظام اپنی بنیاد اس اصول پر قائم کرتا ہے کہ اصل اور محنت کو ایسے اعتدال کے ساتھ متوازن رکھا جائے کہ کسی حال میں بھی "اصل" اس مذموم سرمایہ کی شکل نہ اختیار کر لے جو عام رفاہیت اور افراد ملک و ملت کی عام متوسط یکسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے وہ جواز سود کی ان نکتہ سنجیوں اور علمی کاوشوں کو کوئی وقعت نہیں دے سکتا، اور جبکہ موجودہ دور کے بنک سسٹم اور اس جیسے دوسرے سسٹم کے عملی نقشے بھی سرمایہ داری کے مہلک اثرات و نتائج کو نمایاں خد و خال کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، تو اسلام کا معاشی نظام کس طرح ان علمی کاوشوں کی خاطر ان کے ذریعہ حاصل شدہ نفع (سود) کو ربوا سے خارج کر سکتا ہے۔[1]

---

(۱) جو حضرات اس دور میں مادیت اور لادینیت کے فروغ سے متاثر ہیں وہ عموماً سود (ربا) کے عدم جواز سے متعلق اس لیے متشکک یا منکر نظر آتے ہیں کہ انہوں نے صرف اسی قدر سننے پر اکتفا کر لیا ہے کہ دور جدید کے عقلاء اور علماء معاشیین سود، تجارتی سود (ربا) کو نہ صرف جائز بلکہ سماج کی ترقی کے لیے مستحسن سمجھتے ہیں ان کو یہ

اور کیا جواز (Validity) سود کے اس مجوز (Validater) کی طرح ایک شخص یہ کہنے کا حق دار نہیں ہے کہ جب کہ اصل کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر نقود کے نفع (سود) کو جائز رکھا جاسکتا ہے تو محنت کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر قمار کی ان تمام صورتوں کو بھی کیوں جائز نہ قرار دے دیا جائے جو موجودہ دور میں علمی اصول پر "لاٹری" "سٹہ" اور دوسرے ناموں سے جاری ہیں، کیونکہ قمار کے ان جدید طریقوں میں جائز محنت کی طرح مہذب جواری (Civilized Gambler) کی "عقل و محنت" کو بھی دخل ہے اور جاہلی قمار سے جدا، یہ جانبین کی تباہی کا باعث بھی نہیں ہیں۔ لیکن اسلام کے معاشی نظام کی جانب سے اس کا بھی وہی جواب ہے کہ وہ اصل اور محنت

کون بتلائے کہ جس مسئلہ کو وہ یقینی اور طے شدہ سمجھتے ہیں وہ مسئلہ خود وقت کے ماہرین علم المعیشت کے درمیان سخت اختلافی ہے، بلکہ بیشتر اور اکثر کی رائے یہ ہے کہ سماج کی عام خوشحالی اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتی جب تک شرح سود کو گھٹا کر "صفر" نہ کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور اقبال کی کتاب "اسلام اور سود" لائق مطالعہ ہے، وہ ایک جگہ لارڈ کینس (Keyns) مشہور ماہر معاشیات کا یہ مقولہ نقل کرتے ہیں، چنانچہ لارڈ کینس اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ اشیاء کی پیدائش میں آسانی سے اتنا اضافہ ممکن ہے کہ جس سے اصل کی کارکردگی مختتم (Marginal Productivity) صفر ہو جائے تو نظام اصل داری کے اکثر نقائص کی تلافی کا یہ بہترین اور موثر ترین طریقہ ہو گا۔ ذرا غور و فکر سے ہر شخص اس شدید سماجی تغیرات کا نقشہ کھینچ سکتا ہے جو کہ سود کے نابود ہونے کے باعث رونما ہوں گے، ہر شخص اس کے باوجود بھی آزاد ہو گا کہ اپنی کمائی کو پس انداز کرے اور اسے مستقبل میں صرف کرے۔ (ص ۵۶)

آج (اکتوبر، نومبر ۲۰۰۸ء (شوال، ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ) جب پوری دنیا کو کساد بازاری (Economic Depression / Decline) کے خطرہ نے گھیر رکھا ہے۔ امریکہ، یورپی یونین، جرمنی اور جاپان جیسے ممالک کی معاشی نبضیں ڈوب رہی ہیں، آج (بتاریخ ۱، ۲ نومبر ۲۰۰۸ء) امریکہ اور ترقی یافتہ دنیا کے معاشی ماہرین، بنکار اور پالیسی ساز شرح سود کی کمی کا مشورہ دے کر اس بلائے ناگہانی (کساد بازاری) سے چھٹکارا کی راہ نکالنا چاہتے ہیں اور امریکہ، جاپان اور یورپی یونین کے وفاقی بنکوں نے شرح سود میں کمی کا باقاعدہ اعلان کر کے اس پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا ہے۔ کیا یہ اسلام کی حقانیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے عادلانہ معاشی نظام کی سچائی اور ہر دور میں قابل عمل ہونے اور معاشی پریشانیوں کے حل کی صلاحیت کی منہ بولتی دلیل نہیں ہے؟ (Unequivocal) "فاعتبروا یا اولی الابصار"

ع مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

دونوں کو تجارت میں بنیاد کار تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے ایسے عملی نقشہ کو تسلیم نہیں کرتا جو آہستہ آہستہ اعتدال سے گزر کر مہلک سرمایہ داری کے لیے راہ کھولتا ہے کیونکہ اس سے پیدا شدہ خوشحالی مخصوص طبقہ کے لیے ہے عوام کے لیے نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کے معاشی نظام میں ان دونوں صورتوں کے عدمِ جواز کی گذشتہ صفحات میں بیان کردہ یہ دلیل بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ معاملات میں نقود کی حقیقی حیثیت ثمن کی ہے اور اس کو مبیع (مال خرید و فروخت) بنانا حقیقت کو بدلنا اور منقلب کر دینا ہے، اور ایسا کرنا باہمی تعاون کے عادلانہ طریقوں کا انسداد اور جائز محنت کا استیصال ہے اور اس طرح زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت پر ضرب کاری لگتی ہے اور تمدن و حضارت کا فساد لازم آتا ہے۔

سود اور ربوا:

جدید فن معیشت کی جانب سے جواز سود کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''سود اور ربوا'' کے درمیان فرق ہے جو سود شرح مروجہ یا شرح قانونی (Legal rate of Interest) سے زیادہ اور بھاری ہو اس کا نام ربوا (Usury) ہے اور ایسے سود خوار کو (Usurer) کہتے ہیں اور سود کی وہ شرح جو مروجہ یا قانونی سے سود بمعنی ربا نہیں ہے، بلکہ سود بمعنی ''نفع جائز'' ہے اور اس کو آج کی اصلاح معیشت میں (Interest) کہا جاتا ہے۔

چنانچہ موجودہ سماج کے جدید باطل نظام سے مرعوب مسلمانوں نے بھی قرآنی حقائق سے ناآشنا یا بے پرواہ ہو کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن نے بھی سود کو نہیں ''ربا'' کو حرام قرار دیا ہے۔

جدید فنِ معیشت کا یہ بھی ایک سخت مغالطہ اور فریب ہے اس لیے کہ جب جدید علماء معاشین کے یہاں آج تک یہ طے نہ ہوسکا کہ بھاری سود اور مروجہ قانونی سود کی حدود کیا ہیں تاکہ ربوا اور سود اپنے حقائق کے لحاظ سے باہم ممتاز ہو جائیں؟ اور

جیسا کہ علم المعیشت (Science of Economics) کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کے درمیان سخت اختلاف ہے کہ کون سی ایسی شرح سود ہے جس کو جائز اور گراں شرح سود نہ کہا جاسکے کیونکہ جب بھی قانونی یا رواجی طور پر کسی شرح سود کو نفع یا فائدہ (Interest) کے درجہ میں متیعن کیا جاتا ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ تجربہ ثابت کر دیتا ہے کہ یہ شرح بھی ''انٹرسٹ'' نہیں بلکہ یوزری (Usury) کی حد میں آگئی ہے۔ اور اس طرح شرح سود کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے غیر مختتم اور غیر حقیقی (رسمی) بنا رہا ہے اور آج بھی ہے اور اسی بنا پر سماجی نظام میں معاشی تشویش اور بے چینی کا باعث ہوتا رہا ہے اور اس وقت تک ہوتا رہے گا کہ شرح سود گھٹ کر ''صفر'' (Zero rate of Interest) ہو جائے۔

نیز جبکہ گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا کہ نفس سود (ربا) خواہ کسی شکل میں بھی ہو سماجی زندگی کے لیے تباہ کن اور معاشی وسائل کے لیے حد درجہ مضرت رساں ہے تو اب اس کو ''انٹرسٹ و یوژری'' (Interest or Usury) یا الربا المعتدل اور الربا الفاحش (Moderate Interest or Exorbinant Interest) میں تقسیم کرنا اس وقت تک بے سود ہے جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ انٹرسٹ اور ربا معتدل میں وہ نقصانات موجود نہیں جو ربا فاحش میں ہیں، حالانکہ جدید علماء معیشت اس اعتراف پر موجود ہیں کہ بینک سسٹم ہو یا مہاجنی سسٹم ان کی شرح سود آہستہ آہستہ تمام نظامِ سماجی کو تباہ کرنے کا باعث بن رہا ہے اور تاوقتیکہ شرح سود صفر (Zero rate Interest) کی حد تک نہ پہنچ جائے عام کساد بازاری اور عوام کی معاشی تباہ کاری کا کوئی حل نکالنا ناممکن ہے۔

سود کے بغیر معاشی ترقی ممکن:

(ژولیدہ ذہنیت کا اعتراف کہ سود کے بغیر معاشی ترقی تو کیا چھوٹے پیمانہ (Small Scale) پر کوئی کاروباری ممکن نہیں مگر اسلام اپنے تجربہ کے ساتھ اس اعتراف کا مخالف ہی نہیں بلکہ اس کا داعی بھی ہے کہ سود کے بغیر معاشی ترقی اور

سیاسی و سماجی وقار دونوں ممکن ہیں۔) حقیقت یہ ہے کہ مادیت کے فروغ، آزاد تعیش اور بے قید زندگی کی خواہش نے مادیین (Materialits) کے دماغوں میں ایک ایسے سماج اور ایسی سوسائٹی کا تصور پیدا کر دیا ہے جس میں سود کے بغیر تجارت اور صنعت و حرفت میں عظیم الشان تمدنی ترقی کے امکانات مفقود ہیں اور دنیا کے حصول پر جب ان کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا گیا انہوں نے اس تصور کو عملی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ایک طرف تجارت اور صنعت و حرفت نے بیش از بیش ترقی کی اور بڑی بڑی مشینوں کی ایجادات اور سائنس کے اختراعات نے ان کو بامِ عروج پر پہنچایا تو دوسری جانب اس کا واضح اثر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ عوام کی قوتِ خرید گھٹنے لگی اور سرمایہ دار طبقہ کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دولت و ثروت سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری میں رہ گئی اور کروڑوں عوام معاشی ہلاکت کا شکار ہو کر رہ گئے، اور یہ سب سماج کے اس نقشہ کی بدولت ہوا جس میں سود اور ربا کا فرق بیان کر کے موجودہ بینک سسٹم، مہاجنی سسٹم، سودی تمسکات (Interest bearing Securities) اور تجارتی بانڈ (Commercial Bonds) جیسے معاملات کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس کے برعکس اسلام ایک ایسے سماج کا داعی ہے جس کے اندر ''معیشت'' کی اساس بے قید تعیش (Unlimited Luxury) کی بجائے ضروریات کی جائز تکمیل اور باہمی اخوت و مساوات پر قائم ہے، اس لیے وہ نہ صرف اعتقادی تصور اور نظریہ کی بلکہ عملی نظام کی حد تک ایسے سماج کا تجربہ کراتا ہے جس میں سود کے بغیر ہی تمدنی ترقی زیادہ سے یادہ بامِ عروج تک پہنچ سکتی ہے۔ اور خلافتِ راشدہ کے مقدس دور کے علاوہ اندلس اور بغداد کی ان خلافتوں کے زمانہ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے جو صحیح اسلامی نظریہ حکومت پر گامزن نہ ہونے کے باوجود ''سود'' کی حرمت پر عملاً متفق رہتے ہوئے ہر قسم کی تمدنی اور معاشی ترقیوں میں وقت کی تمام حکومتوں سے برتر رہیں۔

ربا اور سود در سود:

ربا قرآن کریم اور مسئلہ سود میں ''اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً'' کا معاملہ، تو ابھی بصراحت یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ قرآن کریم ایک لمحہ کے لیے مطلق سود کی اباحت کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے اسلوبِ بیان کے لحاظ سے جس قدر شدید وعید سود خوار کے لیے بیان کرتا ہے کسی گناہ پر اس قدر شدید وعید کا اظہار نہیں کرتا ''فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ''

قرآن نے ''اضعافًا مضٰعفة'' (سود در سود) کو اول اس لیے منع کیا کہ زمانہ جاہلیت میں جو رسمِ قبیح جاری تھی اس کا انسداد کیا جائے اور بعد میں مطلق سود کی حرمت کا اعلان فرمادیا اس مقام پر ''ربا'' کو کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا اور اس کی حرمت کو مطلق (Absolute) رکھا گیا ہے لہٰذا قرآن کی نگاہ میں ''سود'' اور ''ربا'' کے درمیان مطلقاً کوئی فرق نہیں ہے اور اس کی حرمت کے تحت میں انٹرسٹ (Interest) اور یو ژری (Usury) دونوں داخل ہیں۔

مشہور مصری عالم عبدالرحمٰن الجریری اپنی تالیف ''کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ'' میں اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض لوگوں نے یہ گمان باطل کر لیا ہے کہ سود میں سے صرف ''اضعافا مضعفة'' ہی رباء حرام میں داخل ہے جیسا کہ آلِ عمران کی آیت میں مذکور ہے ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَـٰفًا مُّضَـٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾ ﴾[1] یہ گمان صریح غلطی پر مبنی ہے۔ اس لیے آیت کریمہ کا مقصد تو درحقیقت سود خوری سے نفرت دلانا اور سود خور کی نظر کو اس جانب پھیر دیتا ہے کہ تیرا یہ سودی معاملہ جو سود در سود کی شکل میں بڑھتا جارہا ہے ایک دن

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۱۳۰ ترجمہ: اے ایمان والو! سود دگنا چوگنا نہ کھاؤ، اور اللہ کریم سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

مقروض کے کل مال کو مستغرق کر لے گا اور ایک مدت گزرنے اور سود در سود کے مسلسل اضافہ ہوتے رہنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مدیون (Indebted) فقیر، مفلس، تنگدست اور بد حال ہو کر رہ جائے گا، اور یہی سودی معاملہ دنیا میں اس کی بد حالی اور تنگی عافیت کا سبب بن جائے گا اور اس فاسد معاملہ کا نظامِ عمرانی پر بہت ہی برا اور مضرت رساں اثر پڑے گا۔

پس آیت کریمہ سے کوئی عقل مند اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے تین گنا سود کھانے کو تو حرام کر دیا ہے مگر دو گنا کھانے کی اجازت باقی رکھی ہے۔ علاوہ ازیں جب قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ صریح ارشاد موجود ہے "فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ" (پس اگر تم اس سے توبہ کرو تمہاری اصل پونجی تمہارے لیے ہے) ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ کوئی عاقل آیت کریمہ کا یہ مفہوم سمجھ سکے کہ مطلق سود کی تو اجازت ہے البتہ سود در سود حرام کر دیا گیا ہے۔"[1]

ربح اور ربا[2]:

قرآن کہتا ہے کہ حکیم مطلق (All Wise) نے ربح (نفع جائز) اور ربا (سود) کے درمیان بہت بڑا فرق رکھا ہے اور وہ یہ کہ ربح میں نفع کا مدار "بیع و شرا" سے متعلق ہے اور ربا میں تاخیر مال اور مدت میں اضافہ نفع کا باعث بنتا ہے، اور جبکہ بیع و شراء میں دونوں جانب سے تعاون کے معاوضہ اور حقیقی رضا کے ساتھ نفع کا وجود ثابت ہوتا ہے تو اس لیے اس قسم کے نفع کو جائز قرار دیا جانا چاہیے "وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ"

(۱) الجزیری، عبدالرحمٰن: کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، ج ۲، قسم المعاملات، ص ۳۲۳

(۲) اس پر مختصر بحث "سود بنام نفع" کے عنوان کے تحت آچکی ہے، مگر مؤلف حرمت سود (Probibition of Interest) کے اہم موضوع کو سمجھانے کے لیے ضروری تکرار (Repetition) سے بھی گریز نہیں فرمایا۔

اور چونکہ قرض دار کی جانب سے اداء قرض میں تاخیر اور قرض خواہ کی جانب سے تاخیر واضافہ مدت پر نفع کا حصول طرفین کی رضا اور باہمی تعاون سے نہیں بلکہ قرضدار کے اضطرار اور قرض خواہ کے بغیر عوض نفع اندوزی پر مبنی ہے، اس لیے اس کو بلاشبہ حرام ہونا چاہیے، ''وَحَرَّمَ الرِّبٰوا''

غرض ربح اور ربوا کو ایک سمجھنا یا ''ربا'' اور ''سود'' کے درمیان فرق قائم کرنا قرآن کی نصوص قطعیہ (Absolute Texts) کے خلاف ہے اور اسلام کے صالح معاشی نظام کی نگاہ میں جدید باطل نظامِ معاشی کی یہ موشگافی کہ انٹرسسٹ (Interest) ''ربا'' نہیں ہے بلکہ صرف یوژری (Usury) ہی ''ربا'' ہے باطل اور فریب ہے اس لیے کہ مذموم سرمایہ داری کے فروغ میں یہ دونوں یکساں ممد و معاون ہیں۔

علماء اسلام اور حرمتِ سود کے دلائل و حِکَم

علمائے اسلام نے عام طور سے مسئلہ سود (ربوا) پر قانونی اور اخلاقی نقطہ نظر سے بحث کی ہے، جو فقہ اصول فقہ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں لیکن محققین نے اس کے معاشی پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کی حرمت کو اس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ ''حرمتِ ربوا'' کے نظریہ کی قدر و قیمت اس جدید معاشری نظام کی ہمہ گیری کے باوجود صرف دفاعی دلائل (Defensive Arguments) پر مبنی نہیں رہ جاتی بلکہ معاشی نقطۂ نظر سے ''جواز سود'' کے نظریہ پر مجوزین (تجویز کرنے والوں) کو چیلنج کرتی ہیں کہ وہ پہلے یہ ثابت کریں کہ سود حقیقۃً معاشی اور عقلی نقطۂ نظر سے تباہ کن نہیں بلکہ معاشی اور معاشرتی نظام کی ترقی کا باعث ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے دلائل:

دنیائے اسلام کے مشہور فلسفی شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] حرمتِ قمار و سود کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کا حاشیہ میں درج ہے۔

واضح رہے کہ جو حرام اور باطل چیز ہے اس لیے ہے کہ دراصل وہ لوگوں کے مال کو زبردستی اچک لینا ہے، اور اس کی تہہ میں جہل، حرص، امید باطل اور فریب اور دھو کا کار فرما ہوتے ہیں اور اس میں امدادِ باہمی اور تمدن کا ادنی سے بھی دخل نہیں ہوتا۔

نقصاناتِ جوا سے مثال:

دیکھئے جوئے میں اگر شکست خوردہ اپنے حریف کے مقابلہ میں خاموش رہتا ہے تو غیض و غضب اور حسرت و ندامت کے ساتھ خاموش رہتا ہے اور اگر ضبط نہیں کر سکتا تو جنگ و پیکار اور قتل و خونریزی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کامیاب حریف اس کی حرماں نصیبی (Deprivation) سے لذت محسوس کرتا ہے اور اس کی تباہی، بربادی اور ہلاکت پر مسرت، خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی حرص و آز بڑھ جاتی ہے اور وہ ہر وقت اس جنون میں سرگرداں رہتا ہے، جوئے کی عادت، مال کی تباہی اور فسادات کی ترقی کا باعث ہوتی ہے اور سب سے زیادہ مضرت یہ ہے کہ اس کی بدولت جو صحیح اقتصادی سہارے ہیں وہ بے کار ہو جاتے ہیں اور جس امداد و تعاون پر تمدن کی بنیاد قائم ہے وہ معطل ہو جاتے ہیں۔ روزمرہ کا مشاہدہ اس کا خود شاہد عدل ہے۔ اسی طرح سود (جو) ایسے قرض پر روپیہ دینے کا نام ہے جس پر نفع کے نام سے زیادتی وصول کی جاتی ہے باطل اور حرام ہے اور سرتاسر ظلم ہے اس لیے کہ اس قسم کے قرض لینے والے عام طریقے سے مفلس اور مضطر (Poor & Coerced) ہوتے ہیں وہ بیشتر مدتِ معین پر رقم ادا کرنے سے کوتاہ رہتے ہیں اور یہ "سود، در سود" کے نام سے بڑھتا رہتا ہے اور کسی حال میں اس سے نجات نہیں ملتی تا آنکہ سب کچھ دے کر برباد ہو جاتا ہے۔ یہ "لین دین" سخت جھگڑوں کا باعث اور خطرناک مناقشوں کا سبب بنتا ہے اور جس قوم یا ملک میں بے محنت روپیہ حاصل کرنے کا رسم و رواج جڑ پکڑ جاتا ہے وہاں عوام کے لیے صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی صحیح راہیں بند ہو جاتی ہیں جو ذرائع آمدنی کے لیے فطری اصول ہیں۔

معاملات میں اس سے زیادہ باریک اور پیچیدہ دوسرا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس میں ظاہری نفع کی صورت میں حقیقی تباہی و بربادی مضمر ہو، دراصل یہ دونوں معاملات خاص قسم کے نشے ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے قانون اور ذرائع آمدنی کے صحیح طریقوں کے استعمال کے خلاف ہر انسان کو آمادہ کرتے ہیں اور تمام نشوں سے زیادہ فسادات، عداوتِ باہمی، انسان کشی کے باعث بنتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے ان دونوں کو ظلم اور باطل قرار دیا۔

سود کی دونوں قسمیں حرام:

اور چونکہ سود کی دو قسمیں ہیں، ایک بیان کردہ صورت جو حقیقی ربا کہلاتی ہے اس لیے اس کو بغیر قید و بند کے حرام کر دیا اور دوسری "رباء فضل" کہلاتی ہے جیسا کہ سونے اور چاندی کا کمی بیشی سے لین دین کرنا وغیرہ اس لیے ان اشیاء کی خرید و فروخت کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے ان تمام صورتوں کو حرام بتایا جن کا نتیجہ سودی لین دین کے موافق نکلتا تھا تاکہ اس غیر فطری کاروبار کا پوری طرح انسداد ہو جائے۔ [1]

بہرحال یہ تمام کاروبار مختلف شکلوں اور صورتوں میں احتکار ہی کی متعدد اقسام ہیں اور یہی احتکار جب قوموں میں ترقی کر جاتا ہے اور عام کاروبار پر مسلط ہو کر اقتصادی نظام پر چھا جاتا ہے تو اکتناز کی مذموم شکل اختیار کر لیتا ہے اور وبائی مرض بن کر عام مخلوق کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے دلائل:

❶ اور حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ [2] نے "احیاء علوم الدین" میں جو کچھ اس

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ مصر، ج ۲، البیوع المنہی عنہا (بیع کی ممنوع اقسام کا بیان)، ص ۱۰۶

(۲) امام غزالی، حجۃ الاسلام ابو حامد محمد الغزالی ۴۵۰ھ میں ضلع طوس کے گاؤں غزالہ میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ رحمہ اللہ علم الاصول، فقہ اور فلسفہ کے امام تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے پیروکار تھے۔ بہت مشہور کتب کے مصنف تھے، جن میں زیادہ شہرت المستصفی، الوجیز، احیاء علوم الدین کو ملی۔

سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے اس کا مفہوم اور خلاصہ بحث یہ ہے:

سونا چاندی ذریعہ قوام حیات:

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ اس نے سونا، چاندی جیسی دھاتیں پیدا کر کے درم و دینار (سکوں) کو وجود بخشا۔ اگر ان دھاتوں کی حقیقت پر غور کیجیے تو حجریات (پتھروں) میں سے ہونے کی وجہ سے انسانی معاشرہ کی ضروریات و حاجات کے لیے بیکار ہیں اور اگر ان کی منفعت پر توجہ دیجیے تو ان پر دنیا کے معاشی نظام کے قوام (Means of Sustenance) کا مدار ہے، کیونکہ ہر شخص اضطراری طور پر ان کا محتاج نظر آتا ہے۔

ذریعہ تبادلہ (Medium of Exchange):

اس لیے کہ ہر انسان اپنے طعام، لباس اور دوسری ضروریات کے لیے بہت سی اشیاء کی حقیقتوں (گیہوں، چاول، گھوڑا، بیل، وغیرہ) کا محتاج ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں ہر ایک کے پاس ضرورت کی ہر شے موجود نہیں ہے۔ مثلاً اس کے پاس زعفران کے گٹھے موجود ہیں مگر اس کی ضروریات اس سے غیر متعلق ہیں اور وہ سواری کے لیے اونٹ کا محتاج ہے جو اس کے پاس نہیں ہے، اسی طرح اس کے برعکس ایک شخص زعفران کا محتاج ہے جس سے وہ محروم ہے مگر اونٹ کا مالک ہے جس کی اس کو قطعاً حاجت نہیں۔ تو معاشی نظام کا تقاضہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں تبادلہ کر کے اپنی اپنی ضروریات پوری کر لیں، لیکن تبادلہ کے وقت عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جب کہ یہ دونوں اشیاء غیر متجانس (Un- Homogeneous) اور مختلف ہیں تو تبادلہ کی باہمی مقدار کا تعین از بس ضروری ہے کہ اونٹ کی خریدری کے لیے کس مقدار میں زعفران ادا کرنی چاہیے یا کس مقدار کے مقابلہ میں اونٹ کو فروخت کیا جائے۔ باہم تناسب نہ رکھنے والی اشیاء کی خرید و فروخت کا یہ سلسلہ اسی کا طالب ہے کہ تعینِ مقدار اور صورتِ ادا کے لیے ایسی چیز کا ہونا از بس ضروری ہے جو دو متضاد

اشیاء کے درمیان ترازو اور کانٹے کا کام دیتے ہوئے یہ ثابت کر سکے کہ فلاں شے اس صورت سے یا اس متعین مقدار سے دوسری شے کے مساوی ہو سکتی ہے ورنہ تو معاملات خرید و فروخت ناممکن ہو جائیں گے۔

ذریعہ عدل و توازن (Means of Justice & Balance):

(ذریعۂ تبادلہ نہ ہونے کی صورت میں) مدنی الطبع (Social Being) انسان کا معاشی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا، تب قدرتِ حق نے مخلوق کو اپنی اس پروردگاری کی جانب راہنمائی فرمائی کہ ان حجریات کو جو اپنی حقیقت کے پیشِ نظر بے کار نظر آتی ہیں اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ انسان کے معاشی نظام کی درست کاری کے لیے متفاوت اور مختلف النوع اشیاء کے درمیان تبادلہ کے وقت باہمی مراتب، تعینِ مقدار اور مساوی و غیر مساوی کا فرق ظاہر کریں اور بیع و شرا میں "ترازوئے عدل" (Balance of Justice) کا کام دیں۔

تو اب درہم و دینار (روپیہ و اشرفی) کے ذریعہ ہم بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ اونٹ مثلاً سو روپے کا ہے اور اس کے مقابلہ میں زعفران کی یہ مقدار سو روپیہ کی قیمت کو پہنچے گی اور اس طرح دونوں کے درمیان بآسانی تبادلہ ممکن ہو سکے گا۔ اب بائع اور مشتری مختار ہیں کہ نقدین (سونے چندی کے سکوں) کے ذریعے جدا جدا دونوں اشیاء کے درمیان معاملہ کریں یا نقدین کے ترازوئے عمل کے مطابق اشیاء کا اشیاء کے ساتھ تبادلہ کریں۔ اور ظاہر ہے کہ اشیاء کے درمیان تبادلہ کا صحیح توازن ایسی شے کے ساتھ ہی ہونا ممکن ہے جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے لائقِ احتیاج نہ ہو اور اس کی ذات ضروریات و حاجاتِ انسانی میں براہِ راست کام نہ دیتی ہو بلکہ وہ ضروریاتِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہو، ورنہ تو یہ دشواری پیش آئے گی کہ جب ایک شخص سونا چاندی (سکوں) کی حقیقت کا محتاج ہے اور مثلاً دوسرا آدمی اس کا محتاج نہیں بلکہ لباس و طعام میں سے کسی شے کا محتاج ہے تو اس صورت میں یہ پہلا شخص (نقدین) سونے چاندی کی اہمیت کو بڑھائے گا اور دوسرا اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرے گا

اور اس طرح کوئی شے ایسی باقی نہ رہے گی جو متفاوت اشیاء کے درمیان صحیح توازن کو قائم رکھ سکے اور ترازوئے عدل بن سکے۔ اور نتیجہ یہ نکلے گا، کہ نظامِ معاشرت غیر منتظم ہو کر رہ جائے گا۔

پس اس حقیقت حال کے پیش نظر کہ سونا چاندی خود مقصود بالذات نہیں بلکہ معاشی اغراض و مقاصد کے لیے ذریعہ اور آلہ ہیں، عقل و فطرت اور نظامِ معاشی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق اس لیے فرمائی ہے کہ یہ لوگوں کے ہاتھوں میں (بشکل سکہ) چلتے پھرتے رہیں اور متفاوت اشیاء کے باہمی تبادلہ میں ''ترازوئے عدل'' (Balance of Justice) کا کام دیں اور خرید و فروخت میں کسی وقت بھی مقصود بالذات نہ بن سکیں۔

مختلف اشیاء میں مساوی قدر کا ذریعہ (Medium of Equall Value):

سونے چاندی کی تحقیق کے اس مسئلہ کو دوسری تعبیر کے ساتھ یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حجریات کو دنیا کے معاشی نظام کے استحکام کے لیے مقصود بالذات نہیں بلکہ معاملات خرید و فروخت میں ''ذریعہ'' (Medium) اور ''وسیلہ'' (Means) بنایا ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ یہ دھاتیں اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہیں کہ جس شخص کے پاس درہم و دینار اور روپیہ یا گنی موجود ہیں اس کے پاس گویا ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ اور جس نسبت سے ان کا وجود کسی جگہ ہے اسی نسبت سے وہ کائنات کی معاشی ضروریات کی حامل ہیں، لیکن اس کے برعکس دنیا کی بہتر سے بہتر شے بھی اگر کسی کے پاس موجود ہے تو وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس بالقوہ ہر ایک شے موجود ہے وجہ یہ ہے کہ یہ حجریات (دھاتیں) اگر سکہ کی شکل میں ہوں یا اپنی سادہ حقیقت پر ہوں اور کسی خاص شکل و صورت (مثلاً زیور، برتن) میں تبدیل نہ ہو گئی ہوں تو ان کی نسبت تمام اشیاء کی جانب مساوی ہی رہے گی، مثلاً اگر کسی شخص کے پاس ایک روپیہ ہے تو متبادل شکل میں گویا اس کے پاس ہر ایک وہ شے موجود ہے جو اس تعداد کے مساوی ہو، لیکن اس کے علاوہ دوسری کسی شے میں یہ قوت موجود نہیں ہے، مثلاً

ایک گز کپڑا ایک گز کپڑا ہی رہے گا، ایک سیر شکر یا دس سیر گیہوں یا ایک سیر گھی کی شکل اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتا جب تک کہ یہی سونا چاندی اس باہمی تبادلے کے لیے ”میزانِ عدل“ بن کر فیصلہ نہ کر دیں۔

سونا و چاندی (نقدین) گردش میں رہیں، کنز (ذخیرہ) نہ بنیں:

تو اب ظاہر ہے کہ ایسی شے جو منفعت عامہ (Public Benefit) کے لیے اس قدر ضروری اور مختلف و متضاد اشیاء کی جانب مساوی نسبت رکھتی ہو ازبس ضروری ہے کہ وہ نہ خود مقصود بالذات ہو اور نہ دوسری اشیاء کی طرح خاص شکل و صورت (زیور، برتن وغیرہ) میں محدود ہو تاکہ کل اشیاء کے درمیان ”وسیلہ“ اور ”ذریعہ“ بن سکے جیسا کہ آئینہ کہ اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں مگر ہر ایک کو ظاہر کر دیتا ہے، یا جیسا کہ حرف اپنی حقیقت میں کوئی معنی نہیں رکھتا مگر تمام معانی کے اظہار کے لیے واحد ذریعہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دھاتوں کی تخلیق اسی لیے فرمائی ہے کہ بیع و شرا میں مقصود بالذات ”مبیع“ نہ بنائی جائیں بلکہ ذریعۂ خرید فروخت (ثمن) قرار دی جائیں اور اسی لیے ان کو ”کنز“ نہ بنایا جائے بلکہ ہاتھوں میں دائر سائر رکھا جائے تاکہ معاشی نظام میں اختلال واقع نہ ہو۔

دراہم و دنانیر (یعنی سونا چاندی) کی تخلیق اس لیے نہیں ہے کہ یہ حجریات انسان کی معاشی ضروریات میں مقصود بالذات ہیں بلکہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور یہ کہ یہ اسی وقت وسیلہ ہو سکتی ہیں جبکہ کنز اور خزانہ نہ بنائی جائیں بلکہ لوگوں کے ہاتھوں میں جاری ساری رہیں تاکہ وہ اشیاء کے مبادلہ میں ”میزانِ عدل“ بن سکیں۔ یہی وہ حقیقت ثابتہ ہے جس کو چشمِ بصیرت ہر ایک لمحہ صفحہ موجودات پر خطِ الٰہی کی ان سطور پر پڑھتی رہتی ہے جن میں نہ حرف ہے اور نہ آواز اور جو آنکھیں اس تحریر کے ادراک سے عاجز ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قرآن حکیم میں اس کو بخوبی واضح فرما دیا ہے، چنانچہ ارشاد مبارک ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾﴾[1]

ترجمہ: جو لوگ خزانہ کرتے ہیں سونے اور چاندی کو اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس ان کو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

سونا چاندی کا نقد کے سوا دوسرا استعمال ناجائز:

اور اسی حقیقت کے پیشِ نظر سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار پایا اس لیے کہ برتن کی جو غرض ہے یعنی اشیاء کو محفوظ رکھنا وہ مٹی، بلور، لکڑی، پیتل، تانبا اور لوہا جیسی چیزوں کے ظروف سے بھی پوری ہو سکتی ہے، لیکن یہ اشیاء سونے چاندی کی طرح مبادلہ اشیاء میں براہِ راست "میزان عدل" نہیں بن سکیں تو اب نقدین (سونا چاندی) کی تخلیق کے مقصد کو باطل کر کے سونے چاندی کے ظروف استعمال کرنے والا بلاشبہ حکمتِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے، پس جو شخص اس حقیقت پر نظر رکھتا ہے، وہ بخوبی اس حدیث کے مضمون کی حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔

من شرب فی انیة من ذهب أو فضة فكأنّما يجرّ فی بطنه نار جهنم.[2]

ترجمہ: جس شخص نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا (کھایا) تو گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔

---

(۱) سورة التوبة: ٣٤

(۲) متفق علیہ۔ احیاء علوم الدین میں اس کو حدیث نہیں کہا گیا، مگر بخاری اور مسلم کی اس حدیث کو اس کی شرح اتحاف میں متفق علیہ کہا ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب تحریم استعمال اوانی الذهب والفضة الخ

سونا چاندی کا تبادلہ معاشی لین دین کی سہولت کا ذریعہ:

پس واضح رہے کہ جو شخص بھی سونے، چاندی (روپیہ اشرفی، درہم و دینار) میں "ربوا" کا معاملہ کرتا ہے یعنی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کی خلاف ورزی کا مرتکب اور معاشی نظام کے اختلال کا باعث ہی بنتا ہے اور ان حجریات کی تخلیق میں فطرتِ الٰہی نے جو قانون وضع کر دیا ہے اس کو توڑ کر ظلم اور کفرانِ نعمت کا باعث ہوتا ہے۔

کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اگر حقیقتِ حال یہ ہے تو اسلام نے سونے کو چاندی اور چاندی کو سونے کے ساتھ کمی بیشی سے اور ہم جنس نقد کو مساوی تعداد کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سونا اور چاندی دو مختلف حقیقتیں ہیں اس لیے قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی دونوں میں نمایاں فرق ہے تو ظاہر ہے کہ مطلوبہ اشیاء کی خرید و فروخت میں ان کے ذریعہ اور وسیلہ بننے میں بھی ضرور تفاوت ہو گا مثلاً سونے کے مقابلہ میں چاندی بکثرت بنتی رہتی ہے، کیونکہ اس سے مطلوبہ شے کم سے کم مقدار میں بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پس اگر ان کے مابین کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کی اجازت نہ ہوتی تو بسا اوقات ان کے وسیلہ اور ذریعہ بننے میں دشواری پیش آجایا کرتی اور لوگوں کو معاشی زندگی میں یسر اور آسانی کی جگہ عسر اور دشواری کا منہ دیکھنا پڑتا، مثلاً اگر کسی کے پاس فقط سونا ہے اور اس کو معمولی اشیاء خرید کرنی ہیں جو سونے کے دینار یا اشرفی کی قیمت سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتیں تو اس کے لیے خریداری کی صورت کیا ہوتی؟ پس سونے کا چاندی کے ساتھ اور ایک دینار کا درہم اور ایک اشرفی کا چند روپوں کے ساتھ اگر تبادلہ جائز نہ ہوتا تو اس کو مطلوبہ شے کی خریداری میں سخت دشواری پیش آجاتی۔

ہم جنس (Homogeneous) سکوں کا تبادلہ مساوی ہو:

نیز ایک درہم کا ایک درہم کے ساتھ اور ایک دینار یا اشرفی کے ساتھ تبادلہ اس

لیے جائز قرار پایا کہ اس عمل سے معاشی نظام پر مطلق کوئی برا اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ اگر یہ دونوں یکساں حیثیت میں ہیں اور کچھ کھوٹے کھرے کا فرق نہیں ہے تو تبادلہ ایک عبث حرکت ہو گی۔ گویا ایسا ہو گا کہ ایک شخص نے ایک درہم یا ایک روپیہ زمین پر رکھ دیا اور پھر ایک منٹ کے بعد اس کو زمین سے اٹھالیا اور ظاہر ہے کہ کوئی عاقل ایسا نہ کرے گا، اور اگر باہم کھرے اور کھوٹے کا فرق ہے تو مساوات کی صورت میں تو کھرے درہم کا مالک فروخت کرنے پر راضی نہ ہو گا، کیونکہ ان کا کھلا نقصان ہے اور عدم مساوات کی صورت میں اسلام کا نظامِ معاشی اجازت نہیں دے گا، کیونکہ ایسی صورت میں ان حجریات کی تخلیق کا جو مقصود ہے وہ فوت ہو جاتا ہے اور جو "حقیقت" اشیاءِ مقصودہ مطلوبہ کے حصول میں ذریعہ اور وسیلہ بننے کے لیے مخلوق ہوئی ہے وہ مقصود بالذات بن کر معاشی نظام کے نظم میں اختلال کے باعث اور حکمتِ الٰہیہ کے خلاف سبب بن جاتی ہے، جیسا کہ سطورِ بالا میں واضح ہو چکا ہے۔

اور یہی صورتِ حال ہے اجناس میں ہم جنس کے باہم تبادلہ کی اور اس لیے ان میں بھی مسطورہ بالا حکمِ عدم جواز ہی نافذ ہو گا۔

یہ تبادلہ نقد ہو ادھار نہ ہو:

اور اگر سونا چاندی کا ہم جنس تبادلہ ادھار کی شکل میں بشرطِ مساوات ہو تو (معاشی وجوہ کے علاوہ) اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ممنوع ہے کیونکہ حقیقت میں یہ تبادلہ اور خرید و فروخت کا نہیں بلکہ قرض کا معاملہ ہے اور قرض کی بنیاد بغیر معاوضہ حاجت مند کی حاجت پورا کر دینے پر ہے جو سر تا سر اخلاقی مسئلہ ہے اور موجبِ اجر و ثواب ہے۔ پس جو شخص اس کو اخلاقی وصف سے نکال کر معاوضہ اور مبادلہ کی شکل دیتا ہے دراصل وہ اخلاق کے ایک اہم مسئلہ کی تخریب کے درپے ہے جو مذہب کی نگاہ میں سخت معیوب ہے اس لیے اس اخلاقی مسئلہ کو قانانی مسئلہ بنانا ضروری سمجھا گیا اور عدمِ جواز کا حکم دیا گیا اور اجناس میں اسی طرح کا معاملہ اس لیے بھی ممنوع ہے کہ جو شخص اس قسم کا کاروبار کرتا ہے وہ جب ہی کر سکتا ہے کہ اس کے پاس

غلہ یا دوسری کوئی جنس وافر مقدار میں موجود ہو اور وہ اس سے مستغنی ہو تو ایسی صورت میں وہ احتکار کا مرتکب ہے یعنی جنسِ مذکور کو جو عام حاجات و ضروریات کے لیے ہے جمع اور خزانہ کر کے یہ چاہتا ہے کہ اس جنس کے نرخ (ارزانی و گرانی) کا معاملہ بازار سے قطع ہو کر اس کے ہاتھ میں آجائے اور اس طرح گویا ان اشیاء کی مقصدِ تخلیق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر شریعتِ اسلامیہ میں محتکر (ذخیرہ اندوز) پر لعنت وارد ہوئی، اور اس کے حق میں شدید قسم کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔[1]

امام فخرالدین رازی رحمہ اللہ کے دلائل

امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں:

''علماء اسلام نے رباء حرمت پر متعدد دلائل بیان فرمائے ہیں:

سود بغیر عوض اور مبادلہ کے ہوتا ہے:

❶ جو شخص ایک درم (یا ایک روپیہ) کو دو درہم (یا دو روپے) کے عوض میں فروخت کرتا ہے، نقد کا معاملہ ہو یا ادھار کا تو اس کو ایک اہم درہم (یا ایک روپیہ) مفت ہاتھ آتا ہے جس کے مقابلہ میں اس کی جانب سے کوئی عوض موجود نہیں ہے، حالانکہ خرید و فروخت میں جانبین سے معاوضہ اور مبادلہ ضروری شے ہے، پس جو درہم یا روپیہ بغیر عوض اس نے حاصل کیا اس میں اس کی جانب سے نہ مال متقوم (اصل) کا کوئی دخل ہے اور نہ محنت کا۔ اور چونکہ انسان کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کے لیے ''مال'' ازبس ضروری شے ہے، اس لیے اس کی حفاظت و عزت انسان کے خون (جان) کی برابر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''حرمة مال الانسان كحرمة دمه'' (انسان کے مال کی حرمت اس کے خوان کی

---

(۱) امام غزالی: احیاء علوم الدین، مطبوعه قاهرة، ٤/٧٩، ٨٠. زبیدی: اتحاف السادة المتقین، مطبوعه دار الفکر للطباعة والنشر والتوزیع، قاهرة، ٦٣/٩، ٦٨

حرمت کی طرح ہی ہے)۔ پس جو شخص دوسرے کے مال کو بغیر عوض کے لیتا ہے وہ بلاشبہ سخت اور ظلم ہے اور اس لیے ایسا معاملہ قطعاً حرام ہے اور اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ درہم زائد اس لیے زائد نہیں کہ بائع یا قرض دینے والے نے جو درہم مشتری یا قرض دار کو ایک مدت کے لیے دیا ہے، اگر اس مدت میں وہ اس کے اپنے پاس رہتا تو ممکن تھا کہ وہ اس سے تجارت کے لیے نفع حاصل کر سکتا، اب جبکہ اس مدت میں اس کے پاس نہ رہا تو یہ "قدر زائد" (Surplus Value) اس کا عوض ہے۔ اور راس المال "اصل" قرض دار کے پاس ایک مدت تک مقید رہا اور قرض خواہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا، کیونکہ اگر اس کا مال اس کے پاس رہتا تو تجارت کے ذریعہ سے اس سے فائدہ اٹھاتا۔ اب جبکہ اس نے قرض دار کو دے دیا تو یہ اس درہم سے تجارت کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اس کو اس قدر نفع ہو کہ زائد درہم اس میں سے ادا کر دینے کے قابل ہو جائے۔ لہٰذا اس کو "قدر زائد" کہنا صحیح نہیں، بلکہ یہ بھی درحقیقت عوض اور "اصل" ہی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو درہم (اصل) بائع نے مشتری کو یا قرض دار نے قرض خواہ کو دیا ہے، وہ اگر اس کے اپنے پاس رہتا تو یہ یقینی نہیں تھا کہ اس سے ضرور نفع حاصل ہوتا، بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تجارت میں نقصان پا کر اس اصل کو بھی کھو بیٹھتا، لیکن دو درہم کے مقابلہ میں قرض دینے یا فروخت کرنے کی شکل میں ایک درہم کا زائد یا مفت ہاتھ آجانا قطعی اور یقینی امر ہے۔ پس امر موہوم (Uncertain) کے مقابلہ میں اس یقینی نفع کی اجازت دے دینا معاشی نقطۂ نظر سے ایک جانب کو قصد النقصان پہنچانا ہے اس لیے حرام ہے۔

سود کی کوکھ سے مفت خوروں کا طبقہ جنم لیتا ہے:

❷ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ معاشی نظام کی بنیادیں، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت جیسے ستونوں پر قائم ہیں اور ان ہی کی بدولت کسی ملک میں رفاہیت کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں۔ پس اگر معاشی نظام میں (ربوا) کی اجازت دے دی جائے

جس میں کسب معاش کے ان حقیقی ذرائع کی بجائے بے محنت ایک کے دو اور دو سے بھی زیادہ ہو سکیں، تو اس ملک میں ایک مستقل طبقہ ایسا پیدا ہو جائے گا جو ان تمام صحیح اور حقیقی ذرائع کو چھوڑ کر اسی کو ذریعہ معاش بنا لے گا، اور اس طرح منافع عوام کو نقصان پہنچا کر معاشی نظام کے اختلال کا باعث بن جائے گا اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس طرح دولت پر ایک مخصوص طبقہ کا اجارہ ہو جائے گا اور انجام کار عام کساد بازاری پیدا ہو جائے گی۔

سود محتاج اور مضطر کا استحصال کرتا ہے:

❸ عام طور پر ایک درہم لے کر دو درہم دینے کا معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اضطراری حالت میں ہو اور معاشی حاجت و ضرورت کے لیے نقدین کا محتاج ہو اور وہی شخص اس کاروبار کو چلا سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ بصورتِ اصل (راس المال) موجود ہو۔ یوں کہہ لیجئے کہ قرض لینے والا اکثر غریب فقیر اور مضطر ہو گا جو بوجہ مجبوری اپنی حاجت و ضرورت میں ایک کے دو دینے پر آمادہ ہو جائے گا اور قرض دینے والا غنی اور سرمایہ دار ہو گا، پس اگر اس معاملہ ربویہ (Usurious) کو جائز رکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ صاحبِ ضرورت اور زیادہ فقیر اور محتاج ہو تا چلا جائے اور غنی و صاحبِ دولت آہستہ آہستہ دولت و ثروت پر قابض ہو جائے اور ظاہر ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد رحمتِ عام پر قائم ہو وہ کس طرح ایسے معاملہ کی اجازت دے سکتا ہے۔

سود اخوت و مروت کا قاتل:

❹ ربا (سود) کو اس لیے حرام کیا گیا کہ وہ باہمی ہمدردی اور حسنِ سلوک کا خاتمہ کرتا ہے اس لیے کہ بسا اوقات انسان اپنی ضرورت و حاجت میں قرض پر مجبور ہوتا ہے اس وقت اخلاق کا تقاضا ہے کہ صاحبِ دولت صاحبِ حاجت کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور بغیر کسی معاوضہ کے قرض دے، پس اگر کسی

معاشی نظام میں ربا کی اجازت ہو تو پھر کوئی شخص بھی آسانی کے ساتھ قرض بغیر معاوضہ پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور اس طرح مواساۃ واحسان کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ [1]

اس پر یہ اضافہ کر لیجئے کہ قرض بلا معاوضہ صرف اخلاقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ معاشی مسئلہ بھی ہے، اس لیے علماء معاشین کے نزدیک انسانی معاشرت میں جائز ضروریات کے لیے خواہ وہ حکومت کے سلسلہ کی ہوں یا انفرادی اور شخصی سلسلہ کی، قرض کا معاملہ ناگزیر ہے پس اگر قابلِ اطمینان ضمانت کے ساتھ قرض کا معاملہ ہو تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

1. قرض اس امید پر دیا جائے کہ یہ قدرِ زائد کے حصول کا ذریعہ ہے۔
2. اس لیے دیا جائے کہ ضرورت سے فاضل دولت حاجت مند کی حاجت کو اس طرح پورا کر دے کہ "اصل" (راس المال) کسی حال میں ضائع نہ ہونے پائے۔

تو جس معاشی نظام میں پہلی صورت جائز ہوگی بلاشبہ اس میں قرض کا مقصد فوت ہو کر ایک ایسا بیوپار بن جائے گا جس کے نتیجہ اور ثمرہ میں دولت مند کی دولت کا اضافہ قرض خواہ کے نقصان کے ساتھ وابستہ ہو جائے اور اس طرح انسانی معاشرت میں فاقہ مست محتاجوں کی کثرت، دولت کو سمیٹ کر دولت مندوں کے ایک خاص طبقہ کے اندر محدود کر دے گی اور عام کساد بازاری کا باعث ہوگی، لہذا "صالح معاشی نظام" میں قرض کا معاملہ دوسرے اصول پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔

حافظ ابن قیم جوزیہ رحمہ اللہ کے دلائل:

ربا کی دونوں قسمیں حرام ہیں:

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ [2] تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) رازی، امام فخر الدین: تفسیر کبیر، ج ۲، تفسیر ایات الربا، ص ۳۵۲، ۳۵۳

(۲) ابن قیم رحمہ اللہ، حافظ ابو عبد اللہ محمد بن بکر بن ایوب بن سعد زرعی دمشقی لقب حافظ ابن قیم جوزیہ رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) فقہ حنبلی کے بہت بڑے امام، محدث، فقیہہ اور مناظر تھے۔ اپنے موقف سے وفا اور اس کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا ان کا شعار تھا۔ دمشق کے تاریخی قلعہ میں ایک عرصہ تک قید رہے۔ ان کی

"ربا" کی دو قسمیں ہیں ایک جلی (ظاہر) اور دوسری خفی (مستور) جلی کو اس لیے حرام کیا گیا کہ اس کی حقیقت میں ضررِ عظیم اور مفسدۂ شدید موجود ہے، اور خفی کو اس لیے حرام کیا گیا کہ وہ ربا جلی کے لیے وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے، لہذا ربا جلی کی حرمت مقصود بالذات ہے اور ربا خفی کی حرمت ذریعہ اور وسیلہ کے سد باب کی بنا پر ہے۔ "ربا جلی" ربا نسیہ (قرض و ادھار پر سود کا معاملہ) کا نام ہے اور یہ وہ ربا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں بھی رائج تھا، مثلاً وہ کسی حاجت مند کو قرض دیتے اور جب وہ مدت موجودہ پر ادا نہ کرتا تو اس شرط پر مدت کا اضافہ کرتے جاتے کہ اس قدر زائد دینا ہو گا، اور اس طرح مدت میں اضافہ کے ساتھ زیادتِ مال (سود) کا اضافہ کرتے جاتے، حتیٰ کہ ایک سو کی رقم ہزاروں ہزار تک پہنچ جاتی اور اس قسم کا معاملہ وہی لوگ قبول کرتے تھے جو محتاج، مفلس اور نادار ہوتے اور قرض خواہ کی رقم ادا کرنے سے قاصر رہتے، وہ جب یہ دیکھتے تھے کہ قرض خواہ قرض کی رقم پر اضافہ (سود) کی وجہ سے ادائے قرض میں مہلت دے دیتا ہے تو تقاضہ کی شدت اور عدم ادا کی شکل میں (دیوانی) قید و بند کی مصیبت سے گھبرا کر اور مضطر ہو کر جبراً اس اضافہ کو برداشت کرتے جاتے تھے اور وقت پر وقت گزرتا چلا جاتا تھا، حتیٰ کہ نوبت آجاتی کہ تاخیر کی بدولت اضافہ مال کا نقصان شدید سے شدید تر ہو جاتا، اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا اور قرض کی رقم پر سود بڑھتے بڑھتے اس کی تمام موجودات پر حاوی ہو جاتا، اور اس کی تمام مملوکہ اشیاء پر قرض میں مستغرق ہو کر رہ جاتیں۔ پس ربا کے اس معاملہ نے یہ شکل پیدا کر دی کہ مفلس قرض دار پر رقم کا جو اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے عوض میں اس کو کوئی مالی نفع حاصل نہیں ہوا اور قرض خواہ کو قدرِ زائد اور اضافہ سود دوسرے کو بغیر نفع پہنچائے اور عوض دیئے حاصل ہوتا رہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے

مشہور کتب میں "اعلام المعوقین عن رب العالمین، الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، اور مدارج السالکین بین منازل ایاك نعبد و ایاك نستعین" ہیں۔

بھائی کا مال باطل طریقہ سے کھاتا اور اس کو انتہائی نقصان اور ضرر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس ارحم الراحمین کی رحمت و حکمت اور مخلوق پر احسان کا تقاضا ہوا کہ اس نے ربا کو حرام کر دیا اور ربا کھانے والے، ربا کی دستاویز لکھنے والے اور اس پر گواہی کے دستخط کرنے والے کو معلون ٹھہرایا اور جو شخص اس ملعون معاملہ سے باز نہ رہے اس کو اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ جنگ کا چیلنج دیا، اور بڑے بڑے گناہوں میں سے کسی گناہ پر اس قدر سخت وعید کا نزول نہیں ہوا اور اسی بنا پر یہ (ربا) اکبر الکبائر (بڑے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ) شمار ہوا۔ اور ربا الفضل (ربا خفی) کی حرمت سد وسائل و ذرائع کی بنا پر ہے، جیسا کہ حدیث ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الدرھم بالدرھمین فإنی أخاف علیکم الربا.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک درہم کو دو درہم کے عوض نہ خرید و فروخت کرو کیونکہ ایسی صورت میں مجھے خوف ہے کہ تم ربا میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربا الفضل" (یعنی نقد بیع و شرا میں قدرِ زائد کے حصول کو) اس خوف سے منع فرمایا کہ "ربا الفضل" ربا النسیۃ (ادھار پر سودی لین دین) تک پہنچا دیتا ہے اور یہ اس لیے کہ ایک عقل مند ایک درہم کو دو درہم کے ساتھ اسی صورت میں خرید و فروخت کر سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کھرے اور کھوٹے سکے میں تفاوت یا ہلکے اور بھاری کا فرق جیسی صفات موجود ہوں، پس اگر وہ جنس کی وحدت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صفات کے تفاوت کو معیار قرار دیتا ہے تو یہ تفاوت اس کو نقد معاملہ سے ہٹا کر ادھار کے لین دین تک بآسانی پہنچا دے گا اور اسی کا نام "ربا النسیۃ" ہے (بلکہ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا) کہ مثلاً کھرا سکہ (ثمن، نقد) قرار پا جائے گا اور کھوٹا مبیع، خرید کا مال اور یہ کہہ دینا آسان ہو گا کہ اگر ایک

جانب مال ہو اور دوسری جانب "نقد سکہ" تو جس طرح سکہ کے معاملہ میں ادھار درست ہے اسی طرح یہاں بھی ادھار کیوں جائز نہ ہو اور بالآخر "ربا الفضل" کے کاروباری "ربا النسیہ" کے مرتکب ہو جائیں گے۔ (۱) اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ "ربا الفضل" ربا النسیہ کے لیے قریب سے قریب تر ذریعہ اور وسیلہ ہے، پس شارع (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حکمت نے یہ فیصلہ کیا کہ امت پر اس قریب تر ذریعہ اور وسیلہ کا دروازہ بھی بند کر دیا جائے (۲) اور بلاشبہ یہ حکمت عقل و فطرت کے عین مطابق اور سودی مفاسد کے سدِ باب کے لیے بہترین ہے۔ (۳)

ربا الفضل اور ربا النسیہ کی حکمتیں:

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اور شارع حکیم و دانا ہے وہ انسان کی مصالح اور ضروریات پر پابندیاں اس وقت تک نہیں لگا تا جب تک کہ کسی معاملہ میں ضمنی یا لزومی (Compulsory) طور پر ایسا مفسدہ موجود نہ ہو جو مصلحت و ضرورت کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اور "ربا الفضل" کی حرمت سے متعلق حکمت بہت سے لوگوں پر مستور ہے، حتی کہ بعض متاخرین نے اعتراف کیا ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ "ربا الفضل" کی حرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے حالانکہ گزشتہ سطور میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ربا الفضل کی حرمت شریعت کی عظیم الشان حکمت اور مخلوقِ خدا کی مصالح کی بہترین حفاظت پر مبنی ہے اور یہ کہ ربا کی دو قسمیں ہیں:

❶ "ربا نسیہ" اور اس کی حرمت تحریم المقاصد میں سے ہے (یعنی ان امور میں سے ہے جن کو صاحبِ شریعت حرام قرار دینا شریعت کے اہم مقاصد میں سے سمجھتا ہے) اور

---

(۱) قوسین میں مؤلف کی جانب سے تشریحی اضافہ ہے۔

(۲) قال عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ: دعوا الربا والربیة (ربا اور ربا کی طرح کے مشتبہ معاملات ترک کر دو۔)

(۳) ابن قیم، حافظ: إعلام الموقعین، مطبوعہ قاهرة، ۲/۹۹، ۱۰۰

❷ ”ربا الفضل“ اور اس کی حرمت ذرائع اور وسائل کی حرمت میں سے ہے اس لیے نفوس انسانی کی یہ کمزوری ہے کہ جب ان کو نقد نفع کی راہیں تنگ نظر آتی ہیں تو پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفع مؤخر ہی میسر آجائے اور اس طرح ربا النسیۃ تک پہنچ جاتے ہیں، پس شارع نے ایسے وسیلہ کو بند کر دینا ہی ضروری سمجھا اور اس لیے ربا الفضل پر بھی ممانعت کی باڑھ لگا دی تاکہ ربا النسیہ تک کوئی نہ پہنچ سکے، اب اہل نظر انصاف کریں کہ اس سے بہتر حکمت اور حکم کیا ہو سکتا ہے۔[1]

خلاصہ: غرض اسلام نے ”سود“ کو کسی حالت میں برداشت نہیں کیا اور اس کے اقتصادی نظام کے بنائے ہوئے نقشہ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ معاشرتی اور اخلاقی تباہ کاریوں کے اسباب و علل میں سے بہت بڑا ذریعہ اور اہم سبب یہی ”سود“ ہے۔

نیز اس نے سود کی صرف ان ہی چند اقسام کو ممنوع نہیں قرار دیا جو زمانۂ جاہلیت میں مشرکین عرب کے یہاں رائج تھیں یا آج بھی عام طور پر رائج ہیں، بلکہ اس سے متعلق ”چند اصول“ بیان کر کے ان تمام شکلوں کا بھی سدِ باب کر دیا جن کا آخری نتیجہ ”سود“ کی طرح بغیر محنت کے کمائی نکلتا تھا، اور ان سب کو سود ہی کے احکام میں شامل کر دیا۔

بینک (Bank)

جدید نظام بنکاری کے مقاصد:

اسلام نے حرمتِ سود (ربا) سے متعلق جو اصول قائم کیے ہیں، عام سودی لین دین کے علاوہ دورِ جدید کے بعض وہ ترقی یافتہ ادارے اور کمپنیاں بھی اس حرمت کے تحت آجاتی ہیں جن کا مدار سودی لین دین پر ہے، چنانچہ ان میں سے ایک ادارہ ”بینکنگ سسٹم“ ہے کہا جاتا ہے کہ بڑی بڑی تجارتوں کو آسانی، دولت و ثروت کے

(۱) حوالہ بالا: ۲۰۴/۳

ذخیروں کی حفاظت اور ان سے مزید زرکشی کے لیے اس ترقی یافتہ زمانہ میں ''بینکوں کا وجود'' ازبس ضروری اور نہایت کارآمد و مفید ہے۔

لیکن اس خوش نما رنگ و روپ میں جو ''مار سیاہ'' (Black Snake) پوشیدہ ہے اور اس ظاہر انگبین (Honey) میں جو زہر قاتل مستور ہے اگر اس کی تحلیل کی جائے اور اس کو بے نقاب کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ''بینکوں کا وجود'' اس لیے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ اور پونجی میں بے پناہ اضاہ ہو اور جس دولت و ثروت کے ذریعہ محنت کے اشتراک سے متوسط اور غریب طبقے کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا اس کا انسداد ہو کر وہ دولت سمٹ سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محصور ہو جائے اور تمام تجارتی کاروبار کے نفع و نقصان کی قسمت چند بینکروں کے ہاتھ میں مقید ہو کر رہ جائے اور اس طرح بینکوں کے سودی جال سے نہ کوئی تجارت محفوظ رہے اور نہ زراعت اور نہ روز مرہ کی معاشرت، اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایک طرف بڑے بڑے قارون مثالی سرمایہ دار ہوں اور دوسری جانب کروڑوں مفلس، نادار اور محتاج ہوں، جو بدن کے لیے کپڑا اور پیٹ کے لیے روٹی تک نہ رکھتے ہوں اور موسم سرما کی سردی اور گرما کی گرمی سے حیوانوں سے بدتر حال میں تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہوں یا زار و نزار حالت میں سسکتے رہنے کے عادی ہوں۔

بنکوں کے معاشی نقصانات:

➊ بے شک بینک بہت مفید اور نہایت ضروری چیز ہے لیکن سرمایہ داروں کے لیے، غریبوں کے لیے نہیں اس لیے کہ وہ قارونی دولت کی کاشت کے لیے ابر نیساں (Rainy Cloud) ہے اور غریبوں کی نعشوں پر سرمایہ کی تعمیر کے لیے بہت عمدہ مسالہ۔

➋ اور بلاشبہ بینک نہایت مضر اور تباہ کن شے ہے مگر عوام اور غرباء کے لیے امیروں اور دولت مندوں کے لیے نہیں اس لیے کہ وہ خوب صورت طریقوں سے

دولت کو دولت مندوں میں محدود کرتا اور عوام کی غربت کو ہولناک درجہ تک پہنچا دیتا ہے اور تہذیب نو کا یہ تجارتی حال دراصل دورِ قدیم کی مہاجنی ہنڈیوں کے بیوپار کی نہایت حسین اور شاندار تصویر ہے۔

۳ پس اگر وہ اقتصادی بہتری کے لیے ضروری تھا تو یہ بھی از بس ضروری ہے اور اگر اس نے عوام کی تباہی پر دولت مندی کی بنیادیں رکھی ہیں تو یہ بھی اسی تباہی کا بہترین نقشِ ثانی ہے۔

اسلام اور بنکاری

اقتصادی نظام کا جو نقشہ اسلام نے بنایا ہے اگر دنیا کو اس کے مطابق چلایا جائے تو پھر بینکوں کے اس موجودہ سسٹم کی کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہتی،[1] کیونکہ دولت حاصل کرنے کی بے روک ٹوک آزادی میسر ہی نہیں آسکتی اور نہ ایسے مہلک طریقوں کی اجازت دے سکتا ہے جو اکثریت کو برباد کر کے چند افراد کا فائدہ کراتے ہوں اور نہ وہ ایسے ترقی یافتہ تجارتی ذرائع کو مانتا ہے جو صرف بڑے بڑے سرمایہ داروں کو ہی فروغ دینے کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور غریبوں کے لیے ان میں معمولی سا حصہ بھی نہ ہو۔

پس جبکہ بینک کا موجودہ سسٹم بھی ''سود'' کی طرح کا ایک نظام ہے تو اسلامی نظامِ اقتصاد میں اس کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ۔ بنکوں کی افادیت سے انکار کیوں؟

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ بینک کا قیام خواہ مذموم سرمایہ داری کے ترقی دینے ہی کی غرض سے کیا گیا ہو، لیکن موجودہ زمانے میں اس کے عظیم

(۱) اگر بینک سسٹم کی ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے تو پھر ان کے قیام کی ایسی شکلیں ممکن ہیں جو سود کے بغیر اس سسٹم کے مقصد کو اس حد تک پورا کر سکیں جس کے لیے ایسے اجتماعی ادارہ کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی انفرادی یا اجتماعی ضروریات کے لیے حصولِ زر یا بطورِ امانت روپیہ کا تحفظ۔ چنانچہ آئندہ صفحات میں اس ممکن صورت کا نقشہ پیش ہو گا۔

الشان فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔[1] تو اس کا جواب یہ ہے کہ بینک کی خوبیاں یہ جو کچھ نظر آتی ہیں قطع نظر اس بات کے کہ اس سے زیادہ اس کے عیوب ہیں، محض اس لیے نظر آتی ہیں کہ موجودہ تجارتی سسٹم دراصل مذموم سرمایہ دارانہ نظام پر چل رہا ہے، لیکن جب اس نظام کو تباہ و برباد کر کے صحیح اور مفید عادلانہ نظام قائم کیا جائے گا تو پھر اس نظام میں ترقی تجارت اور اقتصادی بہبودی کی ضرورت کے لیے قرض و امداد کا انتظام "بینک کے سسٹم" کے بغیر بھی نہایت خوبی کے ساتھ چل سکتا ہے۔

متبادل نظام:

اگر بنک سسٹم ناگزیر ہو تو وہ ایسے اصولوں پر قائم رہ کر چلایا جاسکتا ہے جن کے پیشِ نظر نہ قرض و امانت پر "سود" کا لین دین ہو سکے اور نہ تجارتی سود کی گنجائش نکل سکے، بلکہ ایک ایسی کمپنی کی شکل میں منتقل ہو جائے جو روپیہ داخل کرنے والوں اور بینکروں کے درمیان "مضاربۃ" کی طرح کی تجارت کیا کرے جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آنے والا ہے، دراصل جو کچھ نظر آتا ہے سوسائٹی کے غلط نقشہ کی بدولت نظر آتا ہے، اگر یہ بدل جائے تو اس کی ضروریات و واجبات سب ہی بدل جائیں گے اور دنیا امن، ترقی، فلاح، رفاہیت، اخوت اور ہمدردی کے دھارے پر بہنے لگے گی۔

---

(۱) عام نگاہوں میں بینک بہت فائدہ کی چیز نظر آتے ہیں، لیکن جو لوگ اس کی تاریخ اس کے وجود کی غرض اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بھی سود خواروں اور سرمایہ داروں کے افزونی سرمایہ کا ایک ترقی یافتہ آلہ ہے۔ (دیکھو رسالہ "جامعہ" ماہ فروری ۱۹۳۹ء)

نیز اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی کتاب "اسلام اور سود" خصوصیت سے لائقِ مطالعہ ہے، موصوف بینک سسٹم پر بحث کرتے ہوئے ص ۱۵۰ پر یورپ کے ایک مشہور معاشی عالم کا یہ مقولہ نقل فرماتے ہیں: "اس سلسلہ میں مسٹر جافری بیڈ لیپ کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ ایسا سماج جو اپنے بینکروں کے حلقہ اثر میں ہو اور ان کی اخلاقی تلقین کا روادار باقی رہنے کے قابل نہیں ہے، معاشرے کی خرابیوں کے ذمہ دار یہی بینکار ہیں۔

سودی بنکوں کی چند شکلیں:

ہنڈیوں سے لین دین:

بینک کا یہ سسٹم تو زمانہ جدید کا ترقی یافتہ سسٹم ہے لیکن قدیم زمانہ میں یہی کام "ہنڈیوں" سے لیا جاتا تھا، کوئی درشنی ہنڈی کہلاتی تھی کوئی غیر درشنی ہوتی تھی یہ سارا کام بھی سود ہی کے طریقوں پر چلتا تھا۔ جس کو مہاجنوں کی اصطلاح میں "سود بٹہ" کہتے تھے۔

اگرچہ ہندوستان میں بینکوں کا رواج کثرت سے ہو گیا ہے تاہم آج بھی ہنڈیوں کا لین دین بند نہیں ہوا اور کل کی طرح آج بھی ہنڈیوں کا لین دین پایا جاتا ہے اور وہ تجارتی کاروبار میں داخل ہیں۔

کواپریٹو سوسائٹیاں:

بینک کے طریقہ کی ایک دوسری چیز ہے جس کو مجلس امداد باہمی" (Co-operative Society) کہا جاتا ہے، یہ اگرچہ غریب کاشتکاروں، مزدوروں اور متوسط طبقوں کو سستے قرض دینے کے اصول پر چلائی جاتی ہیں، لیکن یہاں بھی چونکہ سود کی نجاست (Dirt) موجود رہتی ہے اس لیے سرکاری طور پر جس قدر بھی ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں وہ نتیجہ میں ان غریب قرض خواہوں کے لیے باعثِ وبال بن جاتی ہیں اور مہاجنی دستبرد کی طرح ان کو اس سے بھی فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچتا ہے، خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں قدیم و جدید طریقہ ہائے ربوا کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور وہ ظاہر و خفی ہر قسم کے معاملہ سود کو حرام قرار دیتا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام میں اجتماعی کمپنیوں کے ذریعہ امداد باہمی کے طریقے

البتہ اسلام نے امداد باہمی کے اجتماعی اداروں کو کلیۃً ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ اس

نے ناجائز اور صحیح طریقوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جو سود کی نجاست سے محفوظ رہ کر اداروں کے حقیقی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور خود بھی اپنی جانب سے ان صحیح وسائل کی جانب راہنمائی کی ہے جن کے ذریعہ سے درحقیقت غریب قرض خواہوں کی تباہ زندگی کے سہارے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے، یعنی ''امداد باہمی'' کے نام سے ایسی مجالس (Societies) قائم کی جائیں جو مفید ہونے کے اعتبار سے وہی کام دیں جو آج کل کے دور جدید میں ''کواپریٹو سوسائٹیوں'' کا کام دیتی ہیں، لیکن ان کے لین دین میں سود کا (خواہ وہ کتنی ہی کم مقدار میں کیوں نہ ہو) ہرگز ہرگز دخل نہ ہو بلکہ سوسائٹی کے اصل سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور عملہ کے اخراجات حاصل کرنے کے لیے ''منافع'' کے ایسے جائز طریقے اختیار کیے جائیں جن کے بعد ایک طرف امدادِ باہمی کی مجالس کا فائدہ حقیقی بن جائے اور دوسری جانب اصل سرمایہ کے تحفظ اور مجلس کے انتظامی کاروبار کے مصارف کا سامان مہیا ہو جائے تاکہ یہ مجالس قائم رہ سکیں۔

مثلاً پبلک سوسائٹیوں کا نظام اس طرح قائم کیا جائے کہ تجارتی، زراعتی، صنعتی وغیرہ ناموں سے ہر ایک جماعت کی جدا جدا مجالس قائم ہوں اور امدادِ باہمی کی رقوم کے علاوہ نظم و انتظام اور بقا و ترقی مجالس کے لیے رائے عامہ کے استصواب کے ساتھ اس جماعت کے افراد پر ایک ہلکا ٹیکس لگا دیا جائے جو سود کے قائم مقام رقم کی کفالت کر سکے اور افراد کی مالی حالت کے تناسب سے لیا جائے۔

اس کو یوں سمجھئے کہ ''تجارتی کواپریٹو سوسائٹی'' میں مثلاً جو رقوم دی جائیں وہ سود کے لالچ میں نہ دی جائیں بلکہ حسن سلوک اور انفاق فی سبیل اللہ کے اصول پر لگائی جائیں اور اس کے نظم و نسق چلانے اور مجلس کے افادہ کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لیے تاجروں پر ایک ایسا معمولی ٹیکس مالی تناسب کے اعتبار سے لگا دیا جائے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے اور ''پبلک ٹیکس'' کے بوجھ سے پریشان بھی نہ ہو، البتہ ایسے قوانین کے لیے استصواب رائے عامہ (Public Franchise) ضروری ہے،[1] امداد

(۱) اس لیے کہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافتِ راشدہ کا اسوۂ حسنہ اسی جانب راہنمائی کر رہا ہے۔

باہمی کے اس طریقہ کے علاوہ چند اور ایسے طریقے بھی ہیں جو آج کل کی سوسائٹیوں کے طریقوں سے ملتے جلتے ہیں مگر سود کی بجائے ان میں ''نفع'' لے کر کام چلانے کا دوسرا ڈھنگ بتایا گیا ہے، فقہ اسلامی کے ابوابِ معاملات میں ان کی بعض جزئیات منقول ہیں اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے وقت علماء محققین کے ذریعہ تفصیلات و جزئیات سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہاں ہم قصداً ان کے بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں اس لیے کہ تفصیلات و جزئیات میں تو خوفِ طوالت ہے اور صرف اصول نقل کر دینے سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان کو دیکھ کر خود عملی پروگرام بنانے میں ایسی غلطی نہ ہو جائے کہ شریعتِ اسلامی کی نگاہ میں وہ سود کی حرمت میں داخل ہو جائے۔[1]

---

(۱) حضرت مصنف رحمہ اللہ نے یہاں نہایت اختصار سے ''بلاسود بنکاری'' کی ضرورت، طریقہ کار اور منصوبہ بندی کا ایک جائزہ پیش کیا ہے اور اس کی تفصیلات کو مسلم فقہا، اور ماہرین مسلم معیشت دانوں پر چھوڑ دی ہیں کیونکہ یہ کام کسی ایک فقیہہ یا ماہر معیشت دان کا نہیں بلکہ اگر ایسا متبادل غیر سودی پروگرام بنا کر کسی ایک شخص —— خواہ وہ کسی لیاقت (Calibre) کا مالک ہو —— کے سپرد برائے عمل (For Implementation) کر دیا جائے تو اس میں بھی خطرہ کا عنصر باقی رہے گا کیونکہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی گود میں پلے بڑھے معیشت دان اور سیاست دان یا فوجی حکمران —— جو سود کو موجودہ ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں —— اسلام کے نام پر سود کا کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور کھلا رکھیں گے، جیسا جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور حکومت میں کہ بیع مؤجل (جس میں مبیع (Commidity for Sale) کی قیمت فوری نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت پر یک مشت (Lump Sum) یا بااقساط (Instalments) ادا کی جاسکتی ہے) اور بیع مرابحہ (جس میں ایک مشتری (Buyer) ایک شے بقاعدہ معاہدہ تجارت سے خریدتا ہے پھر ثمن (قیمت) اول پر کچھ نفع مقرر کر کے اسے آگے کسی دوسرے مشتری کو فروخت کر کے منتقل کر دیتا ہے، مختصر یوں کہیے کہ قیمت یا ثمن اول پر کچھ معلوم نفع لے کر بیچنا مرابحہ ہے) کے نام پر اور مارک اپ (Mark Up) کے نام سے سودی کاروبار خوب کیا گیا۔

مگر مصنف رحمہ اللہ کی بصیرت، رسائی عقل اور خطرات کو بھانپنے کی صلاحیت کی داد دینا پڑتی ہے کہ جو کچھ انہوں نے ۷۰، ۷۵ سال پہلے محسوس کیا، اس کی عملی شکل ضیاء الحق دور میں اسلام کے لاگو کرنے (Islamization) والوں میں سے ایک بہت معتبر شخصیت سابق جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے دیکھی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن شریعۃ ایپلیٹ بنچ سپریم کورٹ کے ممبر اور اس بورڈ کے سرگرم معاون رہے، جس نے غیر سودی نظام پر کونسل کی جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ تیار کی، مگر جب ضیاء الحق مرحوم کے سرکاری پرزوں اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے معیشت دانوں نے اس رپورٹ کی روشنی میں سرکاری

مالیات، سرکاری قرضوں اور بنکوں کے قرضوں اور پالیسیوں کا طریق کار طے کیا اور لاگو کیا تو وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپوٹ سے بالکل مختلف پورے کا پورا سودی نظام تھا۔ سابق جسٹس مولانا تقی عثمانی نے اپنے ایک مقالہ میں اس افسوس ناک صورت حال کا ذکر کس طرح کیا ہے۔

''بلا سود بنکاری پر اب تک جو علمی اور تحقیقی کام سامنے آیا ہے، ان میں احقر کی معلومات کی حد تک سب سے زیادہ جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ وہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے علماء کرام اور ماہرین معاشیات و بنکاری کی مدد سے مرتب کی ہے اور اب منظر عام پر آچکی ہے اس رپورٹ کا حاصل بھی یہی ہے کہ بلا سود بنکاری کی اصل بنیاد نفع ونقصان کی تقسیم پر قائم ہوگی، اور بینک کا بیشتر کاروبار شرکت یا مضاربت پر مبنی ہوگا، البتہ جن کاموں میں شرکت یا مضاربت کار آمد نہیں ہوسکتی، وہاں کے لیے اس رپورٹ میں کچھ اور متبادل راستے بھی تجویز کیے گئے ہیں جنہیں بوقت ضرورت عبوری دور میں اختیار کیا جاسکتا ہے انہی متبادل راستوں میں ایک متبادل راستہ وہ ہے جسے اس رپورٹ میں ''بیع موجل'' کا نام دیا گیا ہے۔''

''اس طریق کار کا خلاصہ اس طرح سمجھئے کہ مثلاً ایک کاشتکار ٹریکٹر خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس رقم نہیں ہے، بحالات موجودہ ایسے شخص کو بنک سود پر قرض دیتا ہے، یہاں سود کے بجائے شرکت یا مضاربت اس لیے نہیں چل سکتی کہ کاشتکار ٹریکٹر تجارت کی غرض سے نہیں بلکہ اپنے کھیت میں استعمال کے کے لیے خریدنا چاہتا ہے —— چنانچہ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بینک کاشتکار کو روپیہ دینے کے بجائے ٹریکٹر خرید کر ادھار قیمت پر دے دے اور اس کی قیمت اپنا کچھ منافع رکھ کر متعین کرے اور کاشتکار کو اس بات کی مہلت دے کہ وہ بنک کو ٹریکٹر کی مقررہ قیمت کچھ عرصہ کے بعد ادا کردے۔ اس طریقہ کو اسلامی کونسل کی رپورٹ میں ''بیع موجل'' کا نام دیا گیا ہے اور اس میں بنک نے ٹریکٹر کی بازاری قیمت پر جو منافع رکھا ہے اسے معاشی اصطلاح میں ''مارک اپ'' کہا جاتا ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم یکم جنوری (۱۹۸۱ء) سے نافذ ہونے والی اسکیم کا جائزہ لیتے ہیں تو نقشہ بالکل برعکس نظر آتا ہے اس اسکیم میں نہ صرف یہ کہ ''مارک اپ'' ہی کو غیر سودی کاؤنٹرز کے کاروبار کی اصل بنیاد قرار دے دیا گیا بلکہ ''مارک اپ'' کے طریق کار میں ان شرائط کا بھی لحاظ نظر نہیں آتا جو اس ''مارک اپ'' کو محدود فقہی جواز عطا کرسکتی تھیں، چنانچہ اس میں مندرجہ ذیل سنگین خرابیاں نظر آتی ہیں:

''بیع موجل'' کے جواز کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ بائع جو چیز فروخت کررہا ہے وہ اس کے قبضے میں آچکی ہو، اسلامی شریعت کا یہ معروف اصول ہے کہ جو چیز کسی انسان کے قبضہ میں نہ آئی ہو اور جس کا کوئی خطرہ (Risk) انسان نے قبول نہ کیا ہو اسے آگے فروخت کرکے اس پر نفع حاصل کرنا جائز نہیں اور زیر نظر اسکیم میں ''فروخت شدہ'' چیز کے بنک کے قبضے میں آنے کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ یہ صراحت کی گئی ہے کہ بنک ''مارک اپ اسکیم'' کے تحت کوئی چیز مثلاً چاول اپنے گاہک کو فراہم نہیں کرے گا بلکہ اس کو چاول کی بازاری قیمت دے گا، جس کے ذریعے وہ بازار سے چاول خرید لے گا اور اسکیم کے الفاظ میں

''جن اشیاء کے حصول کے لیے بنک کی طرف سے رقم فراہم کی گئی ہے ان کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ وہ بنک نے اپنی فراہم کردہ رقم کے معاوضے میں بازار سے خرید لی ہیں، اور پھر انہیں نوے دن کے بعد واجب الادا

زائد قیمت پر ان اداروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے (جو اس سے رقم لینے آئے ہیں)۔ (اسٹیٹ بنک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۹)

اس میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ وہ اشیاء بنک کی ملکیت اور اس کے قبضے میں کب اور کس طرح آئیں گی؟ اور محض کسی شخص کو کوئی رقم دے دینے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ جو چیز وہ خریدنا چاہ رہا ہے وہ پہلے بنک نے خریدی اور پھر اس کے ہاتھ بیچ دی ہے؟ صرف کاغذ پر کوئی بات فرض کر لینے سے وہ حقیقت کیسے بن سکتی ہے، جب تک اس کا صحیح طریق کار اختیار نہ کیا جائے" —— "بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ۲۸ مارچ کو چاول وغیرہ کی خریداری کے لیے بنکوں نے جو رقمیں رائس کارپوریشن کو پہلے سے دی ہوئی تھیں، ۲۸ مارچ کو یہ سمجھا جائے گا کہ کارپوریشن نے وہ رقمیں سود کے ساتھ بنک کو واپس کر دی ہیں اور پھر بنک نے اسی روز وہ رقمیں دوبارہ کارپوریشن کو مارک اپ کی بنیاد پر دے دی ہیں اور جس جنس کی خریداری کے لیے وہ قرضے دیئے گئے تھے، یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بنک نے خرید لی ہے اور پھر کارپوریشن کو مارک اپ کی بنیاد پر بیچ دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ جن رقموں سے کارپوریشن پہلے چاول وغیرہ خرید چکی ہے اور شاید خرید کر آگے فروخت بھی کر چکی ہے اس کے بارے میں کون سی منطق کی رو سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ بنک نے خرید کر دوبارہ کارپوریشن کو بھیجی ہے؟"

"اس سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ "بیع موجل" کا طریقہ حقیقی طور پر اپنانا پیش نظر نہیں بلکہ فرضی طور پر اس کا صرف نام لینا پیش نظر ہے اور انتہا یہ ہے کہ اس جگہ یہ نام بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ بلکہ بینک کی دی ہوئی رقم کو قرض (Advance) اور اس عمل کو قرض دینے (Lend) سے تعبیر کیا گیا ہے۔" (اسٹیٹ بنک نیوز یکم جنوری ۱۹۸۱ء ص ۷)

"اس اسکیم کی ایک سنگین ترین غلطی اور ہے "بیع موجل" کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ معاہدے کے وقت فروخت شدہ شے کی قیمت بھی واضح طور پر متعین ہو جائے اور یہ بات بھی کہ یہ قیمت کتنی مدت میں ادا کی جائے گی پھر اگر خریدنے والا وہ قیمت معینہ مدت پر ادا نہ کرے تو اس سے وصول کرنے کے لیے تمام قانونی طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر معینہ قیمت میں اضافہ کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ تاخیر کی بنیاد پر قیمت میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو اسی کا دوسرا نام سود ہے، لیکن زیر نظر اسکیم میں اس اہم اور بنیادی شرط کی بھی یہ کہ پابندی نہیں کی گئی بلکہ بعض معاملات میں وضاحت کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے، چنانچہ اس میں کہا گیا ہے کہ امپورٹ بلوں کی ادائیگی میں بنک جو رقم خرچ کرے گا اس پر ابتداً بیس دن کی مدت کے لیے اعشاریہ ۸۷ فیصد مارک اپ وصول کرے گا اور اگر یہ رقم بیس دن میں ادا نہ ہوئی تو مزید چودہ دن کے لیے اعشاریہ ۵۸ فیصد مارک اپ کا مزید اضافہ ہو گا اور اگر ۳۴ دن گذر جانے پر بھی قیمت کی ادائیگی نہ ہوئی تو اس قیمت پر مزید اعشاریہ ۶۲ فیصد مارک اپ کا اضافہ ہو گا اور اگر ۴۸ دن گذر جانے پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو آئندہ ہر پندرہ دن کی تاخیر پر مزید اعشاریہ ۷۹ فیصد کے مارک اپ کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اندازہ فرمائیے کہ یہ طریق کار واضح طور پر سود کے سوا اور کیا ہے؟ اگر "انٹرسٹ" کے بجائے نام "مارک

الحاصل کواپریٹو سوسائٹیاں ہوں یا بینکنگ سسٹم، اسلام کے معاشی نظام میں ان ترقی یافتہ جدید اداروں کے لیے مشروط گنجائش ہے، یعنی وہ شرح سود کو صفر دیکھنا چاہتا ہے اور ان کو قابلِ عمل بنانے کے لیے یا حکومت پر بوجھ ڈالتا ہے کہ وہ رفاہ (Welfare) کے دوسرے اداروں کی طرح ان کو بھی اپنی ذمہ داری پر چلائے اور یا بعض ایسے جائز اور صحیح طریقے بتلاتا ہے جن کے استعمال سے ان اداروں کا مقصد پورا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا کاروبار بھی جاری رہ سکے۔

امداد باہمی کے بعض طریقے:

چونکہ امداد باہمی تو اجتماعی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے جو مذہب، سیاست، معاشرت اور اقتصاد، تمام شعبوں کو یکساں حاوی ہے جیسا کہ قرآن کی نص قطعی کا اعلان ہے:

﴿وَتَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلۡبِرِّ وَٱلتَّقۡوَىٰۖ وَلَا تَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡعُدۡوَٰنِۚ﴾ (۱)

ترجمہ: ہر ایک بھلائی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور برائی و سرکشی میں ہرگز ہرگز ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

اس لیے ترغیب کے ساتھ ساتھ اسلام ان شعبوں کے امداد باہمی کے بعض طریقے بھی بیان کرتا ہے، مثلاً تجارتی شعبہ میں مضاربۃ، معاوضۃ، عنان، شرکت، صنائع وجوہ وغیرہ اور زراعتی شعبہ میں "مزارعۃ"، "معاملہ"، مساقاۃ" وغیرہ۔

(الف) مضاربۃ:

تعریف: امداد باہمی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یہ بہترین طریق تجارت ہے،

اپ" رکھ دیا جائے اور باقی تمام خصوصیات وہی رہیں تو اس سے "غیر سودی نظام" کیسے قائم ہو جائے گا؟" "واقعہ یہ ہے کہ اسلام کو جس قسم کا نظام سرمایہ کاری مطلوب ہے وہ "مارک اپ" کے "میک اپ" سے حاصل نہیں ہو گا، اس کے محض قانونی لیپ پوت کی نہیں، انقلابی فکر کی ضرورت ہے۔"

(۱) سورۃ المائدۃ (۵): ۲

مضاربۃ ایسے تجارتی معاملہ کا نام ہے جس میں ایک جانب راس المال (سرمایہ ہوتا ہے) اور دوسری جانب سے فقط محنت ہوتی ہے اور منافع مثلاً نصف نصف یا کم و بیش طے پاجاتا ہے۔[1]

ضرورت: بہت سے اربابِ دولت وہ ہیں جن کے پاس سرمایہ کافی ہے لیکن تجارتی کاروبار سے وہ قطعاً ناآشنا ہیں اور بہت سے نادار غریب ایسے پائے جاتے ہیں جن کو تجارتی کاروبار کو دیانت کے ساتھ چلانے کا سلیقہ تو ہوتا ہے مگر وہ سرمایہ سے محروم ہیں، لہٰذا دونوں کو جائز دولت کمانے اور خصوصاً سرمایہ سے محروم کو اپنی محنت کا پھل اٹھانے کے لیے حسنِ سلوک اور امداد باہمی کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ صاحبِ مال اپنے مال کو اس دوسرے شخص کو تحفظ سرمایہ کے اطمینان کے ساتھ حوالہ کر دے اور اس کو موقع دے کہ وہ کاروبار کر کے خود بھی فائدہ اٹھائے اور اس کو بھی فائدہ پہنچائے۔

اسی طرح ایک بڑے تاجر کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ تجارتی کاروبار سے واقف ہونے کی وجہ سے افرادِ ملت کو فائدہ پہنچانے کے لیے اپنی پونجی کے ایک حصہ سے مضاربۃ کا کام لے۔

شرعی حیثیت: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بصری (شام) کی منڈی میں خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مال کی تجارت سے اسی مضاربۃ کے اصول پر کی تھی جو مال میں بیش از بیش نفع کی شکل میں انجام پائی، اقتصادی نقطۂ نظر سے دیانت داری اور سمجھدار غریبوں اور کاروباری ضرورت مندوں کی ایسی امداد جو غیور اور باحوصلہ افراد کے لیے قابلِ عمل اور باعثِ تسکین ہو، اس ''مضاربۃ'' سے بہتر دوسرے طریقہ سے ناممکن ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ[2] فرماتے

---

(۱) البتہ خسارہ کی صورت میں سارے کا سارا صاحب مال (Capital) پر آئے گا کیونکہ ایسی صورت میں محنت کرنے والے (مضارب) کی محنت ضائع ہوگئی کیونکہ اسے اپنی محنت کا کوئی صلہ نہ ملا۔

(۲) امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا تعارف باب ا میں درج ہے۔

ہیں:

”معاونت باہمی کی چند قسمیں ہیں ایک ان میں سے مضاربت ہے وہ یہ کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے شخص کی ہو اور رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔“(۱)

سعیدیات میں ہے: مضاربت لوگوں کی ضروریات کے لیے جائز رکھی گئی ہے، اس لیے کہ بعض کاروبار سے ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں اور بعض غریب کاروبار کے ماہر اور مصالحِ تجارت سے خوب واقف ہوتے ہیں، نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی یہ طریقِ تجارت جاری تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بہتر سمجھ کر جاری رکھا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس پر عمل کیا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شرائطِ مضاربت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا، قرآن عزیز میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے ”وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ“ اور ایک جماعت ہے جو زمین میں چل پھر کر اللہ کے رزق کو تلاش کرتی ہے یعنی صاحبِ مال تو مال لگاتے ہیں اور محنت والے اس کے ذریعہ سے ملکوں اور شہروں میں جا کر تجارت کرتے ہیں۔(۲)

گویا اس شکل میں سرمایہ دار کا سرمایہ ”لعنت“ نہیں بلکہ ”رحمت“ بن جائے گا اور نادار کی محنت اور کاروباری ہوش مندی اور استعداد ضائع اور رائیگاں ہونے کی بجائے کارآمد اور نفع بخش ثابت ہوگی، نتیجہ یہ نکلے گا کہ نہ سرمایہ ”کنز“ بن کر احتکار واکتناز کا باعث ہوگا اور نہ اصحابِ ضرورت کے انسدادِ ضروریات پر قفل پڑ سکے گا اور جماعتی زندگی میں نہ فاقہ کش نظر آئیں گے اور نہ قابلِ نفرت سرمایہ دار۔

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ: حجة اللہ البالغة، مطبوعه مصر، ج ۲، باب التبرع والتعاون، ص ۱۱٦

(۲) سعیدیات: ۱۱۲/۲

امداد باہمی کی چند دیگر شکلیں:

اس قسم کے معاملات کے چند دوسرے طریقے یہ ہیں:

1. شرکت معاوضہ یا
2. شرکت عنان
3. شرکت وجوہ
4. شرکت صنائع

(ان کا مختصر تعارف یوں ہے):

معاوضہ (یا شرکت عنان):

"معاوضہ" ایسے تجارتی کاروبار کا نام ہے جس میں کمپنی کے طور پر چند افراد اپنا اپنا راس المال دے کر شریک بن جاتے ہیں اور نفع و نقصان میں بھی شریک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے وکیل و کفیل اور اس معاملہ کے تمام حالات میں ذمہ دار بھی رہتے ہیں، عنان بھی اسی قسم کی ایک خاص شرکت کا نام ہے۔ (۱)

شرکتِ صنائع:

اور شرکتِ صنائع کمپنی کے طرز پر اس قسم کے کاروبار کو کہتے ہیں جس میں چند ہم پیشہ صاحبِ صنعت و حرفت اپنے حرفہ کو شرکت کے ساتھ چلاتے ہیں اور نفع و نقصان کے شریک ہو جاتے ہیں۔ (۲)

---

(۱) کتب فقہ کی کتاب البیوع میں باب المعاملات یا دیگر عنوانات کے تحت ان تمام شرکات کی تفاصیل موجود ہو فاضل مؤلف رحمہ اللہ نے نہایت اختصار سے یہاں تعارف کرایا ہے غالباً انہوں نے ضروری اتنا ہی سمجھا تھا۔ اب یہ کام عملی کام کرنے والوں اور دینی مشیروں کا ہے کہ وہ متبادل سودی نظام کی تجاویز ان بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں مرتب کریں۔

اس سلسلہ میں مجھ ناکارہ کی کتاب "تجارت کے اسلامی قواعد و ضوابط" مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی، کراچی کا مطالعہ انشاء اللہ مفید ہو گا۔

(۲) حوالہ مذکورہ

شرکتِ وجوہ (یا شرکت اعتبار) (Partnership of Creditability):

اور "شرکتِ وجوہ" اس تجارت کا نام ہے کہ بغیر "مال" کے چند افراد کے درمیان مساوی عمل و محنت اور کسب و اکتساب پر شرکت ہو جاتی ہے اور خرید و فروخت اور نفع و نقصان میں بھی شرکت رہتی ہے۔ (۱)

اگر آج یہ تمام صورتیں اپنی پوری آزادی کے ساتھ کسی نظامِ اقتصادی میں رائج ہو جائیں تو بیکاری اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ عام افلاس و بد حالی بڑی حد تک رفع ہو جائے اور خوشحالی کا دور واپس آجائے مگر افسوس کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی نے ان جائز طریقوں کو تباہ و برباد کر دیا اور باہمی تعاون و امداد کے ان سادہ اور آسان طریقوں میں بے اعتمادی کا جال بچھا دیا اور اس کی بجائے "سودی کاروبارِ تجارت" کو فروغ دے کر موجودہ بد حالی پیدا کر دی۔ (۲)

---

(۱) حوالہ مذکورہ

(۲) مضاربت کی برکات و فوائد، اس کی افادیت و عالمگیریت اور سودی نظام بنکاری کے آغاز پر معاصر ماہنامہ "بینات" جو جامعہ عربیہ اسلامیہ کراچی کا دینی و علمی ماہنامہ ہے، جس کی سرپرستی ماضی قریب میں شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے اور مدیر مسئول مولانا محمد ادریس رحمہ اللہ میرٹھی ہوا کرتے تھے، کے شمارہ ۳، جلد ۱۸، ۱۸ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ بمطابق مئی ۱۹۷۸ء میں مولانا ادریس میرٹھی صاحب نے "مضاربت کی عالمگیر مقبولیت" کے عنوان کے تحت جو لکھا ہے اس کی افادیت کے پیشِ نظر یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

مضاربت ہی وہ طریقہ تجارت ہے جس کے ذریعہ مسلمان تاجروں نے اپنے اچھے دور میں اپنی تجارت کا دائرہ ایشیا و افریقہ جیسے دنیا کے براعظموں تک پھیلایا ہے، جبکہ مغربی اقوام اس طریقہ سے واقف نہ تھیں۔ اس لیے کہ سرمایہ دار خود دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنے سرمایہ سے کاروبار کرنے کے لیے نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں مضاربت کے ذریعہ وہ اپنے سرمایہ کو انسانیت کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے اپنے وکلاء، محنتی اور جفاکش مضاربین کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا سکتا ہے، اور دولت (سرمایہ) کی گردش (Circulation) جاری و ساری رہ سکتی ہے۔

مسلمان تاجروں کی اس عالمگیر کامیابی کو دیکھ کر مغربی اقوام نے بھی ایک زمانہ میں اپنے ممالک میں مضاربت کے ذریعہ تجارت کرنا شروع کی ہے خاص کر ان یورپین ـــــ عیسائی ـــــ قوموں نے جو سودی لین دین اور سودی کاروبار کو حرام سمجھتی تھیں مثلاً فرانس، اسپین وغیرہ لاطینی مشرقی ممالک۔ چنانچہ ڈاکٹر یوسف رحمہ اللہ =

سودی کاروبار کی یہ عمومیت جس کا نظارہ صبح سے شام تک ہماری نگاہیں تجارت صنعت و حرفت اور لین دین کے مختلف طرق میں کرتی رہتی ہیں اور جس سے مرعوب ہو کر خود "مسلمان" علماء اسلام سے اباحتِ سود (Permissibility of Interset) کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، یہی وہ صورتِ حال ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ نبوت و رسالت نے مستقبل کے مستور پردہ پر جس کو ملاحظہ فرما کر اس حقیقتِ ثانیہ کا اعلان ساڑھے تیرہ (۱۳۵۰) سو سال قبل ان مقدس جملوں کے ساتھ فرمادیا تھا:

یاتی علی الناس زمان، یأکلون الربوا، فمن لم یأکله أصابه

اپنی کتاب "معاشی نظریے" ج اص ۲۳۳ پر پروفیسر آرنسٹ نیس کی کتاب ہسٹری آف اکنامکس کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

کمندا (قراض) کی اصل عربی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اس کا رواج (عام) تھا۔ مسلمانوں کی پوری تجارت کا یہی سرچشمہ تھا۔ جس وقت عیسائی تاجر قراض (مضاربت) کے ذریعہ کاروباری مہم چلانا جانتے بھی نہ تھے۔ اس وقت مسلمانوں نے ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے علاقوں میں اس کو رواج دیا۔ بحیرہ روم کے عیسائی ممالک خاص کر لاطینی مشرقی ممالک اور اسپین وغیرہ میں بھی اس کا رواج عام ہوا۔ پندرویں صدی عیسوی میں یہ تجارتی کاروبار کرنے کا ایک عالمگیر طریقہ بن گیا۔ خصوصاً سود کو ممنوع قرار دینے کی بنا پر۔ فرانس کے بادشاہ لوئی دہم نے بھی اس کے (متعلق) قوانین وضع کیے۔ (آرنسٹ نیس، ہسٹری آف اکنامکس: ص ۲۸۶)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضاربت کے اس عالمگیر (Universal) اسلامی طریقہ کو ہی شکست دینے اور ناکام بنانے کے لیے کسی خدا دشمن ملعون و مغضوب یہودی نے بنکنگ سسٹم کو اختراع کیا ہے۔ اور دنیا بھر کے ارب پتی اور کھرب پتی سود خور یہودیوں نے —— ان پر خدا کی لعنت —— ہر ایک ملک اور اس کے ہر چپہ میں سود دینے اور سود لینے والے بنکوں کا جال بچھادیا ہے اور سرمایہ دار حکومتوں نے اپنی شخصی اور سیاسی اغراض کے لیے ان بنکوں کو قانونی تحفظ دے کر دنیا کے کاروبار پر چھا جانے کے مواقع بہم پہنچائے ہیں، جس کے نتیجہ میں آج دنیا کی تمام سرمایہ دار ملکوں —— امریکہ، فرانس، برطانیہ وغیرہ —— کی نہ صرف تجارت و صنعت بلکہ سیاست پر بھی یہی مٹھی بھر سرمایہ پرست سود خوار یہودی چھائے ہوئے ہیں اور جونک کی طرح انسانیت کا خون چوس رہے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اربوں، کھربوں ڈالرز سائنسی اور ایٹمی ایجادات و مصنوعات اور مہلک زہریلی گیسوں پر خرچ کر کے آباد دنیا کو عالمگیر ہلاکت یعنی قیامت کے کنارے لا کھڑا کر دیا ہے۔ صرف احکم الحاکمین (اللہ) کے حکم کی دیر ہے۔ (مذکورہ ماہنامہ کا صفحہ ۳۹ تا ۴۱)

عن غبارہ۔[1]

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مستقبل میں پھر ایسا زمانہ آئے گا جب عام لوگ سود خواری کریں گے اگر کوئی شخص باز رہے گا تو سود کے غبار سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔

منشیات

تجارتی کاروبار میں سود اور دیگر بیان کردہ امور کے علاوہ جس تجارت کو اسلام نے مذموم اور ناجائز قرار دیا ہے وہ "مسکرات کی تجارت" ہے، شراب اور اسی قسم کی دوسری منشیات کے استعمال سے جس قدر بد اخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ایک بدیہی مسئلہ ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ "دنیا کی ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور رکھتی ہے اس لیے شراب اور منشیات کے بھی کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہیں، یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کی مضرتیں اور ان کی تباہ کاریاں ان کے منافع سے چند در چند زیادہ ہیں۔"

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ﴾[2]

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کے فائدوں کے مقابلہ میں ان کا نقصان اور ان کی مضرت بہت ہی زیادہ ہے۔

اس لیے اسلام نے ان کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

---

(۱) ابن ماجه: السنن، باب التلغيظ فى الربا. نسائى: السنن عن ابى هريرة رضى الله تعالى عنه

(۲) سورة البقرة (۲): ۲۱۹

﴿إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ﴾[1]

ترجمہ: بلاشبہ شراب جوا، بت اور پانسے سب کارِ شیطان میں سے ہیں سر تا سر نجاست ہیں تم کو ان سے بچنا چاہیے۔

اس نے صرف یہیں تک معاملہ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ان چیزوں کی تجارت کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

عن عائشة رضی اللہ تعالٰی عنها: لما نزلت آیات سورة البقر عن آخرها خرج النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال: حرمت التجارة فی الخمر.[2]

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالٰی عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب شراب کی تجارت حرام کر دی گئی۔

اگرچہ ان غیر مسلموں کے لیے جن کے یہاں مذہبی رسوم یا غیر مذہبی رسوم میں شراب یا منشیات کا استعمال ضروری یا روا ہے، اسلام نے جوازِ استعمال کو قبول کر کے اپنے قانونِ اقتصاد میں کچھ مستثنیات بیان کر دی ہیں تاہم اصل قانون میں ان کی خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار کو قطعاً ناجائز قرار دیا ہے، کتبِ فقہ میں ہے:

"اور اگر کسی شخص نے مردار، خون، مدبر، مکاتب اُمِ ولد، شراب اور سود کی تجارت کی تو اس کی یہ بیع حرام ہے اور باطل ہے کیونکہ تجارت کا ایک رکن یعنی مال کا مال کے ساتھ تبادلہ یہاں معدوم ہے (کیونکہ یہ تمام اشیاء اسلامی نقطۂ نظر سے مال میں شمار نہیں ہیں)۔"[3]

---

(۱) سورۃ المائدۃ (۵): ۹۰

(۲) صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب تحریم التجارۃ فی الخمر

(۳) سعیدیات: ۳۱۴/۱

اس پوری تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تجارت، صنعت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی بے عنوانیوں، مذموم سرمایہ دارانہ ترقی کی بندشوں اور غیر اخلاقی اشیاء کے انسداد کے لیے کیسی اعتدال کی راہ اختیار کی ہے اور اس کو مختلف خلشوں سے پاک رکھنے کے لیے بہترین طریقے استعمال کیے ہیں۔



باب ⑪

انفرادی ملکیت کی تحدید

(Limitation of Individual Ownership)

اسلام لوگوں کو ذاتی ملکیت سے نہیں روکتا اور وہ ایسے اقتصادی نظام کو تسلیم نہیں کرتا جس میں اشخاص و افراد کو اشیاء منقولہ (Movable Goods) کے علاوہ زمین اور ذرائع پیداوار پر کسی حیثیت اور کسی حالت میں بھی حقِ ملکیت حاصل نہ ہو اور وہ اس طریقِ کار کو "غیر فطری" (UN- Natural) اور ایسے نظاموں کو ناقص اور غیر مطمئن "نظام" سمجھتا ہے۔

یقین اور تجربہ کی روشنی میں یہ نظریہ صحیح اور درست ہے یا نہیں، اس کی تفصیل تو دوسرے اقتصادی نظاموں کے ساتھ مقابلہ کے وقت بیان ہوگی، مگر یہاں یہ واضح رہے کہ قرآنِ عزیز نے جن جن مقامات پر انفاق اور خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے ان میں افراد و اشخاص کی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے ترغیب دی ہے۔

انفرادی ملکیت قرآن کریم کی روشنی میں

❶ ﴿وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ﴾[1]

ترجمہ: اور اس نے مال کو باوجود اس کی محبت کے رشتہ داروں، یتیموں

---

(۱) القرآن الکریم، سورۃ البقرہ (۲):۱۷۷

محتاجوں، مسافروں، مانگنے والوں کو اور گردنوں کو آزاد کرانے (یعنی غلام کو آزاد کرانے یا قیدی کو رہا کرانے کا مقروض کو قرض سے نجات دلانے) کے لیے دیا۔

❷ ﴿وَفِىٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَٱلْمَحْرُومِ ﴿١٩﴾﴾[١]

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں سائلوں اور تنگدستوں کا حق ہے۔

❸ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِمَّا رَزَقْنَٰكُم﴾[٢]

ترجمہ: اے ایمان والو! جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس کو خرچ کرو۔

اس نوع کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں اس نے انفرادی ملکیت تسلیم کرنے میں اشیاءِ منقولہ و غیر منقولہ یا ذرائع پیداوار میں سے کسی کی کوئی تخصیص نہیں کی اور ان میں سے کسی کے درمیان بحیثیت "نفسِ ملکیت" کوئی فرق نہیں بیان کیا۔

تاہم وہ ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کی تحدید (Limitation) ضرور کرنا چاہتا ہے اور اس ملکیت میں اس قسم کی وسعت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا جس کی بدولت اس کے اقتصادی نظام کی بیان کردہ اساد و بنیاد پر زد پڑے اور اس کا مقصد اصلی فوت ہو جائے اسی بنا پر اول وہ تمام اشیاء کے بارہ میں بنیادی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ وہ "مباح الاصل" (Originally Permissible) ہیں یعنی وہ کسی کی ذاتی و شخصی ملک نہیں ہیں بلکہ خالقِ کائنات نے ان کو تمام افرادِ انسانی کے لیے یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے مخلوق کیا ہے۔

❹ ﴿هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا﴾[٣]

---

(۱) سورۃ الذاریات (۵۱): ۱۹

(۲) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۵۵

(۳) سورۃ البقرۃ (۲): ۲۹

ترجمہ: خدا تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا ہے جو زمین میں موجود ہے۔

انفرادی ملکیت کی تخصیص (Specification):

اس کے بعد پھر تخصیص کا سوال پیدا ہوتا ہے اور ''بمصداق القران یفسر بعضہ بعضا'' (قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے) دوسری آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور روایاتِ فقہی اس اذنِ عام کی تشریح یا تخصیص (Explaination or Specification) کرتی ہیں، یعنی یہ بتاتی ہیں کہ کون کون سی چیزیں انفرادی ملک نہیں بن سکتیں اور کون کون سی بنتی ہیں اور بن سکتی ہیں۔

مفادِ عامہ کی اشیاء انفرادی ملکیت نہیں بن سکتیں:

ان ہی تشریحات و تخصیصات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اسلام نے اپنے نظام میں بعض اشیاء کو عام فائدہ کی خاطر سب کے لیے یکساں طور پر مباح قرار دیا ہے اور اس لیے ان اشیاء کے متعلق کسی فردِ واحد یا چند افراد جماعت کو یہ حق نہیں ہے وہ ''مفادِ عامہ کے خلاف'' ان کو ان کے تخلیقی مقام پر اس طرح اپنے قبضہ و تصرف میں کر لیں کہ وہ حکومت کو مقررہ منافع یا ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان اشیاء کے مالکِ کل اور اجارہ دار بن بیٹھیں، البتہ ہر ایک فرد یہ حق ضرور رکھتا ہے کہ ان اشیاء کے مقامِ وقوع سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق جس قدر اپنے قبضہ و تصرف میں لے آئے وہ بلاشبہ اس کی ملکیت سمجھی جائے۔

اس کے برخلاف خلافت (حکومت) کا یہ حق ہے کہ وہ ان اشیاء کی افادیت کو عام کرنے کے لیے ان کا نظم و ضبط اپنے ہاتھ میں لے، ان کی درآمد کا انتظام و انصرام کرے اور جمہور کی ملکیت کے نام پر ان میں معاشی نظام کی بہترین کے لیے جس قسم کا تصرف مناسب سمجھے کرے۔

مفادِ عامہ کے اس سلسلہ کی پہلی چیز ''معدنیات'' ہیں۔

کانیں (Mines):

❶ عن أبيض بن حمّال المآربي رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه أنه وفد الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، فأستقطعه الملح الذی بمآرب، فأقطعه أيّاه. فلما ولی قال رجل: یا رسول اللّٰہ! لِما لَهُ الماء العدّ؟ قال فرجعه منه.[۱]

ترجمہ: ابیض بن جمال مآربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۲] کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مآرب میں نمک کی جو جھیل تھی اس کو عطیہ کے طور پر مانگا۔ آپ نے اجازت دے دی۔ ایک شخص نے یہ دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمک کا ہمیشہ جاری رہنے والا خزانہ کیوں اس کے حوالے کیے دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصل حقیقت سے آگاہی کے بعد واپس لے لیا اور دینے سے انکار فرمادیا۔

❷ عن عمرو بن عوف المزنی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه أن النبی صلی اللّٰہ علیه سلم أقطع بلال بن الحارث رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه معاون القبلية جليسها وغوريها، وحيث يصلح الزرع من قدس، ولم يعطه حق مسلم. وكتب له النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم كتابا.[۳]

---

(۱) ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی: الجامع، کتاب البیوع

(۲) ابیض بن حمال مآربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن کے ایک شہر مآرب جو صنعاء کے قریب تھا کے رہنے والے تھے، اپنے قبیلہ کا وفد لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ایمان کی دولت پانے کے بعد اسلام میں ثابت قدم ہو کر رہے۔ آپ نے بہت کم احادیث نقل کی ہیں۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (دیکھیے: شیخ ولی الدین ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ، اکمال فی اسماء الرجال ذیلی مشکوۃ المصابیح، تذکرہ ابیض رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) ابوداود: السنن، ج ۲، کتاب الامارۃ والفیئ والخراج

ترجمہ: عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ[1] راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقام قبلیۃ[2] کے پست و بلند حصوں کی کانیں عطیہ کے طور پر دے دیں اور مقامِ قدس کے ان حصوں کو بھی دیا جو کھیتی کے قابل تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عطیہ میں کسی مسلمان کا حق ان کو نہیں دیا اور اس کے لیے ان کو فرمان لکھ دیا۔

یہ بالترتیب دو صحیح احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو اساس و بنیاد قرار دے کر مجتہدین امت نے اسلام کے معاشی نظام میں معاون کے متعلق احکام بیان فرمائے ہیں، شارحینِ حدیث اور فقہاء نے اس سلسلہ میں جن تفصیلات کو نقل کیا ہے ان کا حاصل یہ ہے:

معدنیات کی قسمیں:

معدنیات کی دو قسمیں ہیں:

1. معدن ظاہر
2. معدن باطن

معدن ظاہر:

ان معدنیات کو کہتے ہیں جن کا خزانہ یا تو سطح زمین پر ظاہر اور موجود ہو اور یا

(۱) حضرت عمرو بن عوف بن زید مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اوائل ہجرت مدینہ منورہ میں ایمان لائے۔ غریب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے تھے۔ اللہ کریم کی راہ میں جہاد کا سامان نہ کر سکتے تو روتے تھے۔ انہی حضرات کے بارے میں قرآن کریم کی آیت ﴿تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (سورۃ التوبۃ (۱۹): ۹۲) ترجمہ: (جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے سامان جہاد مہیانہ کر سکتے تو) وہ لوٹ جاتے مگر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ منورہ یا حوالی مدینہ میں صدقات کا محصل (کلکٹر) مقرر فرمایا تھا۔ مدینہ منورہ میں رہائش پذیر رہے اور مدینہ منورہ میں ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں وفات پائی۔ آپ کی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ (اسماء الرجال ہر کتب میں ان کا ترجمہ)

(۲) "قبلیۃ" مدینہ طیبہ اور ینبوع کے درمیان وادی کا نام ہے۔ (بلاذری: معجم البلدان، ج ۷)

زمین میں اس طرح پائی جاتی ہوں کہ اگر تھوڑی سی محنت یا خرچ کر کے ان کو برآمد کر لیا جائے تو وہ مٹی یا پتھر کے ساتھ ان کے اجزاء کی حیثیت میں مخلوط و مربوط نہ ہوں بلکہ زمین میں خزانہ کی حیثیت میں موجود ہوں، مثلاً نمک، مٹی کا تیل، پٹرول، تارکول وغیرہ۔

معدن باطن:

ان معدنیات کو کہتے ہیں جو زمین اور پہاڑ کی سطح ظاہر پر موجود ہوں اور نہ اجزاء وافر و دائم کی طرح زمین اور پہاڑ کے اندر جدا موجود ہوں بلکہ زمین اور پہاڑ کے اندر ذرات زمین یا پتھر کے اجزاء کی حیثیت میں مستور ہوں اور جن کے حاصل کرنے اور پتھر یا زمین کے اجزاء سے جدا کر کے صاف کرنے میں کافی محنت اور سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہو۔

معدن ظاہر کے احکام:

پس اگر پہلی قسم کی معدنیات ہیں تو وہ کسی حال میں بھی نہ شخصِ واحد یا مخصوص جماعت کی ملک بنائی جا سکتی ہے اور نہ ان کو بطورِ اجارہ کسی کو دیا جا سکتا ہے بلکہ وہ عوام کی ضروریات اور افادہ کے لیے مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں اور ان سے ہر شخص کو بلا معاوضہ استفادہ کا حق ہے گویا اصطلاحی بول چال میں وہ پبلک کی نمائندہ حکومت (خلافت) کی ملکیت اور مفادِ عامہ کے لیے وقف ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [1] حدیث اول کی شرح میں فرماتے ہیں:

لا شك أن المعدن الظاهر الذی لا يحتاج إلى كثير عمل إقطاعه لواحد من المسلمين اضرارهم وتضييق عليهم۔ [2]

ترجمہ: یہ ایک صاف بات ہے جو کانیں "معدن ظاہر" ہیں ان کی درآمد میں زیادہ محنت کی ضرورت پیش نہیں آتی ان کا کسی ایک مسلمان کو بخش

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی الله: حجة الله البالغه (مطبوعه مصر)، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق ص ۱۰۴

دینا عامۃ المسلمین اور ان کی ضروریات کے لیے تنگی اور مضرت کا باعث ہے اس لیے ان کا عطیہ جائز نہیں۔

اور خطابی [1] شرح ابو داؤد میں تحریر ہے:

وهذا يبين ما قلنا من أن المعدن الظاهر الموجود خيرة ونفعه لا يقطعه أحد، والماء العد هو الماء الدائم الذى لا ينقطع. [2]

ترجمہ: اور یہ حدیث (مآربی والی حدیث) اس حقیقت کو واضح کرتی ہے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا کہ "معدن ظاہر موجود" کا نفع اور فائدہ کسی ایک شخص کو عطیہ نہیں کیا جا سکتا اور "ماء عد" [3] ہمیشہ بہتے رہنے اور نہ ختم ہونے والے پانی کو کہتے ہیں۔

اور کتب فقہ میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔ (امام حصکفی رحمہ اللہ [4] تحریر

(۱) خطابی رحمہ اللہ حمد بن محمد بن ابراہیم ابو سلیمان البستی الخطابی رحمہ اللہ کابل کے قصبہ بستہ ـــــ جو غزنی اور ہرات کے درمیان تھا ـــــ میں پیدا ہوئے اس لیے "بستی" کہلائے اور دادا رحمہ اللہ کے خطاب کی وجہ سے "خطابی" مشہور ہوئے۔ بعض مؤرخین کے مطابق آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے دور دراز کا سفر کیا۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں حضرت ابو سعید بن الاعرابی رحمہ اللہ سے، بصرہ میں حضرت ابو بکر بن داستہ رحمہ اللہ سے، بغداد میں حضرت اسماعیل بن محمد الصفار رحمہ اللہ سے اور دیگر اکابر سے اکتساب علم کیا۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں امام ابو عبید اللہ حافظ الحاکم رحمہ اللہ اور ابو الحسین عبد الغافر الفارسی رحمہ اللہ ایسے اکابر علماء شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں "اعلام السنن شرح صحیح بخاری، معالم السنن شرح ابی داؤد، غریب الحدیث، کتاب الشجاع، کتاب شان الدعاء، اصلاح غلط المحدثین" وغیرہا مشہور ہیں۔ آپ نے ربیع الاول ۳۸۸ھ میں اپنے آبائی گاؤں اور جائے پیدائش قصبہ بستہ میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ (برائے تفصیل دیکھیں: امام الحاکم: تاریخ نیسابور (نیشا پور). ابن خلکان: وفیات الأعیان. مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ: التعلیق الممجد علی مؤطا امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ، مطبوعہ مطبع مجتبائی، لاہور ۱۴۰۵ھ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۳ مقدمہ)

(۲) علامہ خطابی: معالم السنن (شرح ابی داؤد)، ۴۳/۳

(۳) ماء عد: یہ نمک کی جھیل تھی جیسا ہندوستان میں سانبھر جھیل ہے۔

(۴) حصکفی رحمہ اللہ، علاؤالدین حسن بن علی الحصکفی رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۸۸ھ) دمشق کے مفتی تھے۔ فقہ حنفی کے نامور امام تھے۔ آپ کی تصانیف میں اہم ترین "الدر المختار" ہے جو ۱۰۷۱ھ میں لکھی گئی یہ کتاب

فرماتے ہیں):

واعلم أنه (ليس لامام أن يقطع ما لاغنى للمسلمين عنه) من المعادن الظاهرة وهى ما كان جوهرها الذى أودعه الله فى جواهر الأرض بارزا كمعادن الملح والكحل والقار والنفط.[1]

ترجمہ: اور جاننا چاہیے کہ امام کے لیے جائز نہیں ہے کہ ایسی چیز کسی کو "عطیہ" کر دے جس کے فائدہ سے عامہ مسلمین مستغنی نہ ہوں یعنی معادنِ ظاہرہ کو کہ جن کا جوہر میٹریل (Material) اللہ تعالیٰ نے زمین کے جوہروں میں سے ظاہر صورت میں ودیعت کیا ہے، مثلاً نمک، سرمہ، تارکول اور مٹی کے تیل کی کانیں (کنویں)۔

غرض مآربی سے متعلق حدیث کے پیشِ نظر جمہور علماءِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ "معدنیاتِ ظاہرہ" مفادِ عامہ کے لیے ہیں اس لیے وہ کسی کو بطور اجارہ کے دی جا سکتی ہیں اور نہ بطور عطیہ کے بلکہ حکومت کے ہاتھوں میں رہیں گی اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کا حق ہو گا۔

معدن باطنہ کے احکام:

اور اگر دوسری قسم کی معدنیات (معدنیاتِ باطنہ) ہیں، جن کی درآمد بہت زیادہ محنت اور کافی سرمایہ کی محتاج ہے، پس ان کے متعلق حکومت (خلافت) مجاز ہے کہ ان کانوں کو مفادِ عامہ کے قابل بنانے کے لیے خواہ اپنے قبضہ و اختیار میں رکھے اور مناسب سمجھے تو اجارہ پر دے کر ان کے فائدہ کو عام بنائے یا شخصِ واحد اور مخصوص جماعت کی ضروریات کی کفالت کے لیے بطور عطیہ کے دے دے، جیسا کہ نبی اکرم

۱۳۰۹ھ میں بمبئی (ہند) سے اور مصر سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۱) حصکی رحمہ اللہ تعالیٰ، محمد علاؤ الدین: الدر المختار، مطبوعہ بمبئی (ہند)، ۱۳۰۹ھ، ج ۳، کتاب الاحیاء

صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبلیہ کی معادن "عطیہ" کر دیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس "عطیہ" کو اپنی ضروریات کے لیے کام میں لائے اور بیکار و معطل نہ چھوڑ دے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو کل یا جزء جس حصہ کو بھی معطل اور بے کار چھوڑتا ہے امام کو اختیار ہے کہ اس کے قبضہ سے وہ حصہ نکال کر دوسرے کو عطیہ کر دے یا عامۂ خلق کے لیے حکومت کے ہاتھ میں واپس لے لے، چنانچہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ "کتاب الخراج" میں حضرت بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے ان "عطایا" سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

حدثني بعض أشياخنا من أهل المدينة قال: أقطع رسول الله صلى الله عليه وسلم بلال بن الحارث المزني رضي الله تعالىٰ عنه ما بين البحر والصخر. فلما كان زمن عمر بن الخطاب رضي الله تعالىٰ عنه قال له: إنّك لا تستطيع أن تعمل هذا، فطيب له أن يقطعها ما خلا المعادن فأنّه استثناها۔[1]

ترجمہ: میرے اہل مدینہ کے شیوخ میں سے ایک شیخ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سمندر اور خشکی کے درمیان وادی کو بطور عطیہ کے دے دیا تھا، مگر جب عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ تم اتنے بڑے علاقہ کو کام میں لا سکو، پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پسند فرمایا کہ معاون (قبلیہ) کو ان کے ہاتھ سے نکال کر باقی حصۂ زمین کو ان کے پاس بطور "عطیہ" باقی رہنے دیں۔

اس جگہ "ما خلا المعاون فأنه استثناها"، خصوصیت سے قابلِ غور ہے

(۱) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب في ذكر القطائع (حكم القطائع)، مطبوعه دار الاصلاح، قاهرة ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۳

کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام جاگیر میں سے واپس لینے کے لیے "معاون" ہی کو کیوں ترجیح دی اور مُستثنیٰ فرمایا؟

یحییٰ بن آدم قرشی رحمہ اللہ کی روایت:

اور یحییٰ بن آدم (۱) کی "کتاب الخراج" میں اس واقعہ کی تفصیلات اس طرح منقول ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا تو انہوں نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل و عریض علاقہ کو بطور عطیہ حاصل کر لیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ وہ کسی سائل کے سوال کو رد نہیں فرماتے تھے، اور کیفیت یہ ہے کہ تم اس علاقہ کو نہیں سنبھال سکے (یعنی اس کا کافی حصہ افتادہ پڑا ہوا ہے) لہٰذا جس قدر حصہ تم کام میں لا سکتے ہو اس کو اپنے پاس رکھ کر باقی حصہ کو میرے حوالہ کرو کہ میں مسلمانوں میں اس کو حسب ضرورت تقسیم کر دوں۔ حضرت بلال (بن حارث) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا جو شے مجھ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور "عطیہ" کے مرحمت فرمائی ہے میں اس کا چپہ بھر بھی واپس نہ دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ

---

(۱) یحییٰ بن آدم، ابو زکریا یحییٰ بن آدم بن سلیمان القرشی الاموی رحمہ اللہ بہت بڑے محدث، فقیہہ مؤرخ اور امام تھے۔ آپ کی تصنیفات میں اسلامی معاشیات پر نہایت اہم تصنیف "کتاب الخراج" ہے جو کہ سرکاری مالیات (Public Finance) اور مالیاتی پالیسی (Fiscal Policy) پر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی "کتاب الخراج" کے بعد اصل منبع و مصدر (Original Source) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے مشہور مشترق (Orientalist) جون بل (John Bull) نے لندن سے ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں شائع کرایا، پھر ۱۳۴۶ھ میں قاہرہ سے مکتبہ سلفیہ نے اور ۱۳۹۵ھ میں مکتبہ علمیہ لاہور سے استاذ احمد شاکر مصری رحمہ اللہ کا تحقیق شدہ نسخہ شائع ہوا اس کا انگلش ترجمہ اے بن شمس (A Ben Shamas) نے کیا ہے۔ آپ نے ۲۰۳ھ میں وفات پائی۔ (دیکھئے: ڈاکٹر نور محمد غفاری: اسلام کا معاشی نظام، مطبوعہ شعبہ تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور، دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۵۵)

تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر فرمایا: قسم بخدا! تم کو واپس دینا ہو گا۔ چنانچہ جس قدر حصہ ان کی طاقتِ عمل سے باہر تھا اس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔"(۱)

علامہ خطابی رحمہ اللہ کی تشریح:

اور خطابی رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"جس علاقہ کو خلیفۂ اسلام نے اسلحہ کی طاقت سے حاصل کیا ہے اگر وہاں کوئی زمین افتادہ بیکار پڑی ہے اور کسی مسلمان (یا معاد) کی ملکیت نہیں ہے تو امام اس کو بطور عطیہ کے دے سکتا ہے۔ پس اگر امام نے کسی کو بطور عطیہ کے زمین کا کوئی حصہ دے دیا اور اس نے اس کو آباد کر لیا یا اس میں کھیتی کر لی تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ملک ہو گیا اور اگر امام نے کسی کو "معدن" کا کوئی حصہ عطیہ کر دیا تو اس کو دیکھا جائے گا۔ اگر وہ معدن ظاہر ہے جیسے مٹی کا تیل یا تارکول وغیرہ تب امام کا عطیہ ناجائز اور واجب الرد ہو گا۔ اس لیے کہ ان اشیاء کے منافع خود بخود حاصل ہیں (یعنی زیادہ محنت کے محتاج نہیں) اور لوگوں کا ان اشیاء کے ساتھ ہر وقت کا واسطہ ہے۔ لہذا جو بھی اس میں سے جس قدر اپنی ضرورت کے لیے حاصل کر لے وہ اسی کا ہے اور کسی کو اس پر تنہا ملکیت کا دعوی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس طرح دوسروں پر ترجیح حاصل کرے۔

اور اگر سونا چاندی، تانبا اور اس قسم کے دوسرے جواہرات کی کانیں ہیں جو زمین میں اس طرح پوشیدہ ہیں کہ مٹی یا پتھر کے اجزاء کی طرح ان میں مخلوق اور پیوست ہیں اور بغیر کافی محنت و مشقت کے ان کا مٹی اور پتھر سے جدا کر لینا ممکن نہیں ہے تو ان معادنِ کا عطیہ درست ہے۔

(۱) القرشی، یحیی بن آدم رحمہ اللہ تعالیٰ: کتاب الخراج، حدیث رقم ۲۹۲

البتہ اگر "جاگیر" حاصل کرنے والا اس کو معطل چھوڑ دے یا اس کو برآمد نہ کرے تو وہ اس کا مالک نہیں رہ سکتا اور نہ دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے روک سکتا ہے، جب تک وہ اس میں کام کر سکتا ہے کرے، ورنہ عامہ مسلمین کے حق میں دستبردار ہو جائے۔"[۱]

"معاونِ باطنہ" یا "زمین کے کسی حصہ" کو بطور جاگیر دینے کے جواز میں شرائط بالا کے علاوہ مجتہدین اسلام نے اس مسئلہ کی روح کو جس انداز میں بیان فرمایا ہے وہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ "کتاب الخراج" میں اقطاع (جاگیر دینے) پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

❶ قال أبو یوسف: أما أنا فأری اذا لم یکن فیه ضرر علی أحد، ولا لأحد فیه خصومة أن إذن رسول الله صلی الله علیه وسلم جائز الی یوم القیامة.. فإذا جاء الضرر فهو علی الحدیث: ولیس لعرق ظالم حق.[۲]

ترجمہ: اقطاع (جاگیر دینے) کے مسئلہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ اگر ایسا کرنے سے کسی فرد یا جماعت کو نقصان نہیں پہنچتا اور نہ اس زمین کے متعلق کسی کا کوئی مناقشہ ہے تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اجازت قیامت تک کے لیے صحیح اور حق ہے اور اگر ایسا کرنا ضرر اور نقصان کا باعث ہو جائے تو اس وقت یہ معاملہ اس حدیث کا مصداق ہو گا "ظالم کو رگ کے لیے کوئی حق نہیں ہے یعنی جو اقطاع عامۃ الناس کے حق میں مضر ہو امام کو اس سے بچنا چاہیے ورنہ یہ

---

(۱) علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ: معالم السنن (شرح ابی داود)، ۳/۴۳

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الارض فی الصلح والعنوۃ وغیرهما، ص ۱۳۸

ظلم ہو گا۔

❷ وللامام أن يقطع كل موات، وكل ما كان ليس لأحد فيه ملك، وليس في يد أحد و يعمل في ذلك بالذي يرى أنه خير للمسلمين وأعم نفعا.[۱]

ترجمہ: اور امام کے لیے یہ جائز ہے کہ افتادہ (مردہ) زمین کو کسی کو جاگیر کے طور پر دے دے بشرطیکہ وہ کسی کی ملک نہ ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو اور امام کو اختیار ہے کہ وہ اس زمین کے بارے میں عامہ مسلمین کے لیے نفع اور خیر کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر جو چاہے کرے۔

ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ کا حوالہ:

اور ابو عبید کتاب الاموال میں نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زمین کا ایک ٹکڑا بطور جاگیر طلب کیا اور ان کو یہ یقین دلایا کہ ایسا کرنے سے عامۃ الناس اور عامہ مسلمین کو کسی کا کوئی ضرر لازم نہیں آتا۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بصرہ کے والی حضرت ابو موسیٰ اشعری[۲] رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ تحریر فرمایا:

إن كانت كما تقول فأقطعها اِيَّاه.[۳]

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۳۱

(۲) ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابو موسیٰ عبد اللہ بن قیس اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہجرت حبشہ کی، پھر واپس آ گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کے لیے انہیں یمن بھیجا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں بصرہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں کوفہ کے قاضی تھے۔ آپ نے جہاد میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اہواز کی فتح اللہ کریم نے آپ کے ہاتھوں کرائی۔ آخر میں مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہو گئے، اور مکہ مکرمہ میں ہیں ۵۲ھ یا ۴۲ھ میں وفات پائی۔ (اسد الغابة، تذکرہ ابو موسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ. الاستیعاب، تذکرہ ابو موسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(۳) ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ تعالیٰ: کتاب الاموال، (ایڈیشن ۱۳۵۳ھ)، ص ۲۷۷، نمبر ۶۸۷

ترجمہ: اگر بات اس طرح ہے جیسا کہ یہ کہتا ہے تو اس کو زمین کا وہ ٹکڑا جاگیر دے دو۔

بلاذری رحمہ اللہ کی روایت:

اور بلاذری رحمہ اللہ نے اس واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد اس طرح نقل کیا ہے:

إن كانت ليست تضر بأحد من المسلمين وليست من أرض الخراج فأقطعها إيّاه.[1]

ترجمہ: اگر اس حصۂ زمین کو بطور جاگیر دے دینا نہ تو کسی مسلمان کے لیے باعث مضرت ہے اور نہ یہ زمین "خراجی" ہے (یعنی مفتوحہ علاقہ کی ایسی زمین جس سے سرکاری مالگذاری آتی ہے) تو اس کو جاگیر کے طور پر اس شخص کو دے دو۔

شرائط اقطاع:

ان تمام حوالجات کا حاصل یہ ہے کہ معادِن تو الگ رہے اگر معمولی زمین بھی بطور جاگیر کسی کو دی جائے تو حسبِ ذیل شرائط کا پیشِ نظر رہنا ازبس ضروری ہے، ورنہ تو یہ عمل اسلامی احکام میں ظلم اور ناجائز ہو گا:

1. وہ زمین نہ کسی مسلمان کی اور نہ کسی معاہد کی ملک ہو، اور نہ ان میں سے کسی کے قبضہ میں ہو۔
2. نہ اس میں زراعت کے اور نہ تعمیر کے آثار پائے جاتے ہوں اور نہ کسی اہل بستی کے مفادِ عام کے لیے "فِنَاء" ہو، نہ چراگاہ ہو نہ قبرستان کی زمین ہو، نہ سوختہ حاصل کرنے کی جگہ ہو اور نہ ریوڑوں کے بیٹھنے یا چرنے کے کام آتی ہو۔[2]
3. اس سے مفادِ عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔

---

(۱) بلاذری، ابو الحسن: فتوح البلدان، مطبع ازہر، قاھرۃ، ۱۹۳۲ھ، ص ۵

(۲) ابو یوسف: کتاب الخراج، باب فی موات الأرض الخ، ص ۱۳۷

وجوہ اقطاع:

اور امام کو اس عمل اقطاع کی اجازت صرف اس لیے دی گئی کہ کوئی زمین بنجر (مردہ) باقی نہ رہے اور معطل رہنے کی وجہ سے محصولاتِ زمین کم نہ ہوں کہ بیت المال گھاٹے میں رہے۔

فإنّ ذلك أعمر للبلاد وأكثر للخراج.[1]

ترجمہ: یہ اقطاع اس لیے جائز ہے کہ اس سے بستیوں کی آبادی ہوتی ہے اور خراج (محصول زمین) میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور ان شرائط کے ساتھ امام کے لیے "اقطاع" (جاگیر دینا) صرف جائز ہے اور مقامِ عام کی خاطر ہے نہ کہ اس کو مضرت پہنچانے کے لیے اس لیے وہ دینے نہ دینے میں مختار ہے۔

اور "جواز مع شرائط" کا یہ معاملہ بھی عام مردہ افتادہ زمینوں کے متعلق ہے لیکن یہ زمین اگر معادنِ باطنہ کی حامل ہیں تو ان میں مفادِ عامہ کے پیشِ نظر امام کے رجحانات کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اسوۂ حسنہ کافی ہے۔

إن يقطعها ما خلا المعادن فأنّه استثناها.[2]

ترجمہ: حضرت بلال (بن حارث) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اجازت دی کہ معادن کے علاوہ حصص زمین کو بطورِ جاگیر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں زمینوں کا کافی حصہ یونہی معطل پڑا ہوا تھا، اور اگر کسی جگہ "کان" بھی موجود ہوتی ہے تو اس کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ ایک شخص بمشکل شدید محنت سے معمولی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھالیتا تھا۔ لہذا ضروری ٹھہرا کہ ایسی بنجر اور افتادہ زمینوں کو کارآمد بنانے

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۳۱

(۲) حوالہ بالا، باب حکم القطائع، ص ۱۳۳

کے لیے ''اقطاع'' (بطور جاگیر دینا) کی صورت اختیار کی جائے۔[1] پس جب تک یہ صورتِ حال رہے کہ عامۃ الناس اور حکومت (خلافت) کا مفاد ''اقطاع'' میں ہو تو یہ عمل نہ صرف درست بلکہ مستحسن و ضروری ہو گا، اور جب کبھی صورت حال بدل جائے اور مفادِ عامہ اور مفاد مسلمین کے پیشِ نظر ان کا حکومت کے ہاتھ میں رہنا مفید ہو اور کسی ایک شخص یا جماعت کے قبضہ میں دے دینا مضرتِ عام کا باعث بن جائے، جیسا کہ موجودہ مشینوں کے دور میں ''معادِن'' کے مفاد کا معاملہ ہے، تو اس صورت میں ''معادن باطنہ'' کا جاگیر کے طور پر دینا خود حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ''لیس لعرق ظالم حقٌّ'' اور ''أنّما اقطعه الماء العد قال فرجعه'' کے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسطورہ بالا فیصلوں کے مطابق نادرست ہو گا۔

''معادن'' (کانوں) کے معاملہ میں ان احکاماتِ حدیثی و فقہی کے بعد صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ حقہ کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جن میں ''معادن'' کو بیجا استعمال کرنے پر اظہارِ نفرت اور وعید کا اظہار پایا جاتا ہے تاکہ بآسانی یہ معلوم ہو سکے کہ اس خاص مسئلہ میں صاحبِ شریعت کی ''بالغ نظری'' کن رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔

کانوں پر طاقتوروں کا ناجائز قبضہ:

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نورِ نبوت کی روشنی میں مستقبل کا مطالعہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ زمانہ بھی آنے والا ہے جب ''معدنیات'' پر شریروں کا قبضہ ہو جائے گا۔

عن رجل من بنی سلیم عن جده انه أتٰی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فقال: هذه من معدن لنا. فقال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: سیکون معدن یحضرها شرار الناس.[1]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کچھ چاندی لایا اور

(۱) الهیثمی: مجمع الزوائد منبع افوائد، مکتبہ القدسی، قاهرة، ۱۳۵۳ھ: ۶۵/۴

کہنے لگا: یہ ہماری معدن (کان) سے نکلا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے کہ معادن (کانوں پر) شریر لوگ قابض ہو جائیں گے۔

ان شریر انسانوں سے وہ انسان مراد نہیں ہیں جن کی شرارت انفرادیت لیے ہوئے ہے بلکہ وہ ظالم قومیں اور جابر حکمران مراد ہیں جو معاون پر قابض ہو کر عام انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ان کو انسانی دنیا کی تباہی اور سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کا آلہ کار بنا کر دنیا کو اپنی شرارت اور شیطنت سے بھر دیں گے۔ چنانچہ اس کی تائید ابو داؤد کی مشہور حدیث بھی کرتی ہے۔

”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میرے ذمہ ایک شخص کے دس دینار واجب تھے ایک روز آکر وہ چمٹ گیا کہ اپنی رقم لیے بغیر نہ ٹلوں گا یا کوئی ضامن دو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر ضمانت کر لی۔ کچھ وقفہ کے بعد ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرے قرض کی مقدار سونا لے کر آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے دریافت فرمایا:

من أين أصبت هذا الذهب؟ قال من معدن: قال: لا حاجة لنا فيها، ليس فيه خير. فقضاها عنه رسول الله صلى الله عليه وسلم.[1]

ترجمہ: یہ سونا تم نے کہاں سے حاصل کیا؟ اس نے عرض کیا کان سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم کو یہ نہیں چاہیے اس میں خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور پھر قرض خواہ کو اپنے پاس سے رقم ادا فرما دی۔

مشہور محدث خطابی رحمہ اللہ اس جملہ کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپ

(۱) ابوداؤد: السنن، کتاب الامارة والفیئ والخراج، کتاب الزکاة، باب الرجل یخرج من ماله

صلی اللہ علیہ وسلم نے ''لیس فیہ خیر'' اس لیے فرمایا کہ اس قسم کے سرمایہ میں اکثر سرمایہ دار حریص اور طامع ہو جاتے ہیں اور ایسے مال پر عائد شدہ جو زکوٰۃ (خمس) واجب ہوتا ہے وہ قطعاً نہیں نکالتے یا حیلہ بہانہ بنا کر اس کو کم ظاہر کرتے ہیں اور عامل زکوٰۃ کو پوری زکوٰۃ نہیں ادا کرتے ہیں۔ اس لیے ایسا مال اکثر مشتبہ رہتا ہے، دوسرے یہ کہ چونکہ کان کنی سخت محنت اور مصیبت کا کام ہے اور مزدور اس محنتِ شاقہ کے لیے بمجبوری آمادہ ہوتے ہیں اس لیے کان کا مالک یا اجارہ دار سخت گیری برتتا اور مزدوروں کو محنتِ شاقہ برداشت کرنے پر مجبور کرتا ہے، لہٰذا ایسے مال سے کہ جس میں غریبوں پر تشدد کیا گیا ہو برکت اور رحمت مفقود ہو جاتی ہے۔[1]

یہ ہیں وہ کلمات طیبات جو نورِ نبوت کے آئینہ میں حال اور مستقبل کا نقشہ دیکھ کر زبان وحی ترجمان سے نکلے اور جن کا ایک ایک حرف زمانۂ ماضی سے بھی زیادہ آج صادق آرہا ہے۔

معدنیات میں انفرادی ملکیت کے نقصانات:

❶ غرض چاندی، سونا، لوہا، کوئلہ پٹرول وغیرہ قسم کی کانیں اقتصادی نظام پر بہت زیادہ اثر انداز ہیں اور وجوہِ معیشت کی جان ہیں اس لیے موجودہ دور میں اسلام کے معاشی نظام سے متعلق احکام کی روشنی میں یہ دعویٰ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ ان سب کو شخصی ملکیت نہیں بلکہ جماعتی یعنی حکومت (خلافت) کی ملکیت ہونا چاہیے تاکہ مفادِ عامہ باطل ہو کر مفادِ خاصہ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

❷ کون نہیں جانتا کہ اسٹیمر، ریلوے، دخانی جہاز، ہوائی جہاز، موٹر، شہر کی روشنی وغیرہ جیسے اہم کاروبار بغیر کوئلہ، پٹرول، لوہا، پیتل کے نہیں چل سکتے، چاندی، سونا اور تانبا زیورات و ظروف کے علاوہ سرکاری سکوں کے قیام اور تجارتی کاروبار کی ترقی کے لیے کس قدر اہم ہیں، سب کو معلوم ہے۔ پس اگر اقتصادی نظام میں قدرت کی یہ بخشی ہوئی ''دولت'' ایک یا چند خاص افراد کے ہاتھ میں دے دی جائے اور حکومت

(۱) علامہ خطابی: معالم السنن (شرح سنن ابی داود)، ج ۳، شرح حدیث مذکورہ بالا

اور ان کے درمیان اس سرمایہ داری کی تقسیم اجارہ داری کے نام سے کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ ملک کی باقی آبادی اس کے انتفاع سے بڑی حد تک محروم رہ جائے گی اور یقیناً اس راہ سے ایک خاص جماعت میں "دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ" اور "يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ" کا منظر نظر آنے لگے گا۔

❸ جس دور میں بھی اصول کے خلاف ان کانوں کو کسی ملّی یا وطنی حکومت نے اجارہ داری کے سسٹم پر چلانے کی سعی کی اس کو نہ صرف اپنے اقتصادی نظام میں شدید نقصان اٹھانا پڑا، بلکہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجنبی اجارہ داروں نے اس قوم کو تباہ کرنے اور غلامی کی لعنت میں گرفتار کرنے کا بہترین ذریعہ اکثر اسی کو بنایا اور صدیوں تک اس کو ان سے نجات نہ مل سکی۔ ہندوستان، مصر، عراق، ایران عہد جدید میں اور امریکہ و وسطی یورپ عہد قدیم میں اسی غلط روی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور اس زمانہ میں یورپ و ایشیا کی حکومتوں کے بیشتر کروبار اسی قسم کے مٹھی بھر انسانوں کے رحم و کرم پر چل رہے ہیں اور اقتصادی خوشحالی و بدحالی، حتی کہ ملکوں کے عروج و زوال ان ہی خود غرض اور حریص سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔

❹ منڈیوں میں ارزانی، گرانی، سکوں کے طلائی و نقرئی معیار (Gold & Silver Standard) اور درآمد برآمد کے معاہدات پر انہی کا قبضہ و تسلط ہے اور حکومتوں نے جابرانہ و قاہرانہ استعماریت کی طمع میں مفاد عامہ کو ان کے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور اگر تاریخ کی شہادت غلط نہیں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مہاجنوں کی اس دستبرد کی ابتداء اسی قسم کی اجارہ داری اور ملکیت کی رہینِ منت ہے۔

پس اسلام اس قسم کی عام بدحالی کو اپنے نظام میں کس طرح برداشت کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

رُکاز / دفائن (Treasure Troves) میں انفرادی ملکیت کی اجازت:

البتہ اس سلسلہ میں اسلام کا معاشی نظام اس قدر انفرادیت کو ضرور تسلیم کرتا ہے کہ اگر کسی شخص کے ذاتی مکان یا صحرائی زمین میں کوئی دفینہ نکل آیا یا کان کا کوئی حصہ برآمد ہو گیا اور اس نے محنت کر کے اس سے کچھ حاصل کر لیا، تو یہ اس کی ملکیت شمار ہو گی۔ اور اس کو دولت (سرمایہ) قرار دے کر اس پر زکوٰۃ یا خمس (پانچواں حصہ) عائد کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ فقہائے اسلام نے اس کی تفصیلات اس طرح بیان فرمائی ہیں۔

دفینہ اور لقطہ:

دفینہ اگر اسلامی دور سے تعلق رکھتا ہے یعنی سکہ پر اسلامی سکہ کی علامات پائی جاتی ہیں تو اس کا حکم "لقطہ" (گری پڑی یا گمشدہ چیز جو کسی کے ہاتھ آگئی) کا ہے جس کے تفصیلی احکام کتبِ فقہ میں درج ہیں، اور اگر غیر اسلامی دور کی علامات موجود ہیں یا کسی قسم کی علامت نہیں ہے تو وہ ذاتی مکان یا زمین میں برآمد ہوا ہو یا عشری، خراجی یا افتادہ صحرائی زمین میں، پہاڑ میں نکلا ہو اس پر "خمس" (پانچواں حصہ) واجب ہو گا، کیونکہ حدیث میں ہے:

وفی الرکازۃ الخمس.[1]

ترجمہ: مال بدفون پر خمس واجب ہے۔

اور معدنیات میں تین قسم کی حاصلات ہوتی ہیں:

1. سیال نہ ہوں، لیکن آگ پر رکھنے سے پگھل جائیں، مثلاً، سونا، چاندی، پیتل اور تانبا وغیرہ۔
2. سیال ہوں، مثلاً پٹرول، مٹی کا تیل اور تارکول وغیرہ۔
3. نہ سیال ہوں اور نہ آگ پر رکھنے سے پگھل سکتی ہوں، مثلاً زمرد، ہیرا، یاقوت سرمہ وغیرہ۔

---

(۱) صحیح بخاری: ج ۱، کتاب الزکاۃ

پس اگر یہ ذاتی زمین یا ذاتی مکان میں برآمد ہوئیں تو ان پر حکومت (خلافت) کا کوئی مطالبہ نہیں [1]، اور اگر عشری، خراجی زمین یا صحراو جبال (پہاڑوں) میں برآمد ہوئی ہیں تو پہلی قسم پر خمس (پانچواں حصہ) واجب ہے اور باقی دونوں قسموں پر کوئی مطالبہ نہیں ہے۔[2]

دفینہ اور معدن میں فرق کی وجہ:

فقہاء اسلام "دفینہ" اور "معدن" کے مسائل زکوٰۃ میں فرق کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں کہ "دفینہ" زمین کے اجزاء میں سے نہیں ہے، بلکہ زائد از زمین ایک شے ہے، بخلاف "معدن" کے کہ وہ اجزاءِ زمین میں سے ہے، مثلاً سونا یا چاندی مٹی ہی کے وہ اجزاء ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ ارض کے وقت سے اس میں ودیعت کر دیئے ہیں اس لیے "دفینہ" اور "معدنیات" میں زمین و مکان اور صحرائی یا عشری و خراجی زمین کے سلسلہ میں جو فرق نظر آتا ہے وہ فطری اور معقول ہے۔

معادن کی ملکیت کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ:

اور امام مالک رحمہ اللہ [3] نے تو "معادن" کے بارے میں یہاں تک فرمادیا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت نے قاہرانہ حیثیت سے کسی ملک پر قبضہ کیا ہے اور مفتوح پبلک سے مصالحت اور معاہداتِ خصوصی کے ذریعہ قبضہ نہیں کیا تو اس ملک میں اگر کانیں

---

(۱) البتہ اگر وہ اشیا ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے تو حولانِ حول یعنی سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۲) اور اگر ان کی تجارت کرے گا تو مال تجارت کی طرح زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۳) امام مالک رحمہ اللہ، مالک بن انس اصبحی عربی رحمہ اللہ ۹۵ھ (مطابق ۷۱۳م) میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ساری زندگی میں صرف ایک بار حج کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے، اور مدینہ منورہ میں ہی ۱۷۹ھ (مطابق ۷۹۵م) وفات پائی۔ آپ مذہب مالکی کے بانی ہیں۔ آپ نے حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰن عرف ربیعہ رائی رحمہ اللہ سے فقہ، حضرت نافع بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے غلام زہری، ابو الزناد اور یحییٰ بن سعید انصاری رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حدیث حاصل کیا، موقف پر ثابت قدم رہ کر اس کی خاطر تکالیف برداشت کرنے والے تھے، اس بنا پر حاکم مدینہ منورہ جعفر بن سلیمان نے آپ کو کوڑے پٹوائے۔ آپ نے حدیث میں کتاب "موطا" ترتیب دی، جس نے بہت مقبولیت پائی، اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، مشہور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی "تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک رحمہ اللہ" ہے۔

برآمد ہوں تو اس زمین کی شخصی ملکیت ساقط ہو کر سلطان (خلیفہ) کی جانب لوٹ جائے گی، اور حکومت کو اس پر قطعی اختیار حاصل ہو گا کہ وہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے کرے، خواہ اس کی برآمد کو اپنے انتظام سے کرائے اور خواہ اس کو عطیہ کے طور پر یا اجارہ پر دے دے۔

قال وما افتتحت عنوة فظهر فيها معادن، فذلك إلى السلطان يصنع فيها ماشاء، ويقطع بها لمن يعمل فيها، لأن الأرض ليست للذين أخذوا عنوة.[1]

ترجمہ: امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: جس زمین کو خلیفہ نے قاہرانہ فتح کیا ہے اگر اس میں کانیں نکل آئیں تو وہ زمین سلطان (خلیفہ) یعنی حکومت کی جانب لوٹ جائے گی۔ وہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور (فرد واحد یا جماعت) جو اس میں کان کنی کا کام کرنا چاہے اس کو دے دے یہ اس لیے کہ جن مجاہدین نے اس کو جہاد کر کے فتح کیا ہے زمین ان کی ملکیت نہیں بن جاتی۔

مگر عطیہ اور اجارہ میں یہ شرط ملحوظ رہے گی کہ عامۃ الخلق کے حق پر زد نہ پڑتی ہو۔ چنانچہ اندلس کے مشہور فلسفی وفقیہ ابن ارشد رحمہ اللہ[2] امام مالک رحمہ اللہ کے اس ارشاد پر اصولی بحث کرتے اور دو قول میں سے ایک قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"معادن پر خلیفہ ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے اور عطیہ کے طور پر بھی دے سکتا ہے، اس کی مثال عہدِ نبوت میں موجود ہے کہ نبی اکرم (صلی

(۱) امام مالک بن انس: المدونة الكبرى، (مطبوعہ مصر)، ۳۴۹/۱

(۲) ابن ارشد، ابن ارشد الحفید، مالکی فقہ کے پانچویں صدی کے مشہور فقہاء —— ابو الولید الباجی رحمہ اللہ، ابوالحسن لخمی رحمہ اللہ اور ابن عربی رحمہ اللہ —— کے ہم عصر تھے۔ آپ کا شمار اندلس کے مشہور فلاسفہ اور فقہاء میں ہوتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں "بداية المجتهد ونهاية المقتصد" اور "كتاب المقدمات و المهدات على المدونة الكبرى" مشہور ہیں۔

اللہ علیہ وسلم) نے بلال بن حارث مزنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو قبلیّہ کی کان کا ایک حصہ بطور عطیہ دے دیا تھا۔ اور دو قول میں سے پہلے قول (کہ معادن زمین کے تابع نہیں ہیں) کی دلیل یہ ہے کہ سونا چاندی جو کانوں کے اندر ہیں زمین پر کسی کے بھی مالکانہ قبضہ سے قبل جوف زمین (Depth- Belly of Land) میں موجود ہیں اس لیے زمین کی ملکیت سے معدن کی ملکیت ہرگز لازم نہیں آتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ وہ جس کو چاہے زمین کا اور زمین کے اندر جو کچھ موجود اس سب کا مالک بنادے بلکہ صرف زمین کے مالک بنادینے کا ذکر فرمایا ہے:

فوجب بنحو هذا الظاهر أن يكون ما فى جوف الأرض من ذهب أو ورق فى المعادن فئاً لجميع المسلمين۔[1]

ترجمہ: لہٰذا آیت کے اس ظاہر مفہوم کے پیشِ نظر ازبس ضروری ہے کہ جوفِ زمین میں از قسم معاون سونا چاندی جو کچھ بھی ہے اس پر تمام مسلمانوں کا یکساں حق ہے۔

اجارہ داری کی کمپنیاں

نقصانات:

❶ معدنیات سے متعلق اجارہ داری کا معاملہ عموماً کمپنی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور ملک کا وہ بہترین سرمایہ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں بلکہ حکومت کی تمام آبادی کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت ہو سکتا تھا اس طرح افراد کے اندر محدود ہو جاتا اور آخر کار عام بدحالی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

---

(۱) ابن رشد: کتاب المقدمات والمهدات على المدونة الكبرى، ۱/۲۴۲، ۲۴۳

❷ عہدِ جدید وقدیم میں جس ملک میں بھی اس قسم کی اجارہ داری پائی جاتی ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بدولت کا خانہ دار اور مزدور یا سرمایہ اور محنت کے درمیان میدانِ کارزار گرم ہوگیا ہے اور بعض اوقات حکومتوں کی تباہی وبربادی پر ختم ہوا ہے۔ کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت (Karl Marx's Theory of Socialism) اسی کا رہینِ منت ہے اور روس کا دور اشتراکیت اسی کی جدید پیداوار۔ پس اگر معدنیات کے لیے کمپنی اور شیئرز (حصوں) کا یہ حرص انگیز سسٹم بطور اصول اور تجارتی بنیاد کے تسلیم نہ کرلیا جاتا اور ان امور کو مفادِ عامہ کے اصول کے پیشِ نظر حکومت کے اختیارات مجازی کے سپرد کر دیا جاتا تو افراط وتفریط کی راہ سے الگ اسی اعتدال کی راہ پیدا ہو جاتی، جس کی جانب اسلام نے اپنے نظام میں توجہ دلائی ہے، اور پھر نہ اشتراکیت سے ابتری پھیلتی اور نہ سامراجی نظام سے بدحالی وتباہ کاری۔

❸ لہٰذا عام حالات میں وہ ایسی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تیار نہیں ہے اور بعض مخصوص حالات میں عطیہ یا اجاری داری کے جواز واباحت کی شکل میں بھی اس بنیادی اصول کو فراموش کرنا نہیں چاہتا جس سے مفادِ عامہ خطرہ سے محفوظ رہے اور مذموم سرمایہ داری کو سر اٹھانے کے لیے بہانہ ہاتھ نہ آجائے کیونکہ اس قسم کی کمپنیاں جب اپنے تجارتی نظام کو وسیع کرنے کے لیے بین الاقوامی حالات پر نگاہ ڈالتی ہیں تو اپنے خصوصی مفاد کے پیشِ عام افادہ اور عام لوگوں کے نفع سے آنکھ بند کرکے ملک اور حکومت کے تمام سیاسی، اقتصادی معاشرتی رجحانات کو اسی ایک رخ پر چلانے کی سعی کرتی ہیں، جن سے ان کا ذاتی مقصد فروغ پاسکتا ہے، خواہ اس کی بدولت ملک کی عام حالت یا انسانوں کی عام زندگی خطرہ ہی میں کیوں نہ پڑ جائے اور یہی وہ زہر ہے جو اگرچہ اپنی ابتدائی شکل میں نہایت حسین، شیریں اور مفید اور حیات پرور نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر خدا تعالیٰ کی مخلوق کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور بالآخر خدا کی اس مخلوق پر موت کی نیند طاری کر دیتا ہے۔

❹ آپ شاید اس بیان کو حیرت سے پڑھیں کیونکہ جدید ترقی پذیر دنیا نے تو

کمپنیوں کے اس سسٹم ہی سے ترقی اور اقتصادی سربلندی حاصل کی ہے لیکن اگر آپ فلسفہ اجتماع اور انسانی نشو و ارتقاء کے مقصدِ عظیم ''اخوت عامہ'' کے پیش نظر باریک بینی سے مطالعہ کریں گے تو اندازہ ہو گا کہ یہ سب دھوکہ اور فریب ہے۔ اسی سسٹم نے قوموں کو باہمی عداوت اور استحصال بالجبر کی بنیاد ڈالی، اسی نے خود اپنے ملک کی عام آبادی کو چند مخصوص سرمایہ داروں کا غلام بنا کر تباہ کیا اور اسی نے ''اقتصادی ترقی'' کے نام سے دنیا کے ہر گوشہ میں بے اطمینانی، خود غرضی اور مہذب ڈاکہ زنی کو عام کر دیا ہے۔

اور اگر ان اشیاء کو ''مفادِ عامہ'' کی ملک قرار دیا جاتا اور اسی مقصد کے اندر محدود رہ کر حکومت ان کا انتظام کرتی یا پبلک کے افراد کے ذریعے کمپنی کی شکل میں مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے فروغ دیتی تو یہ صورت کبھی پیدا ہونے نہ پاتی اور ملک میں ایک عام متوسط زندگی کا دور ہوتا اور اطمینان کی زندگی نصیب ہوتی۔ قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ اگر یہ کہا جائے کہ کانوں (معادن) سے متعلق اگر اسلام کا معتدل اقتصادی نظام تسلیم کر لیا جائے جو مخصوص حالات میں بعض بنیادی شرائط کے ساتھ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے حقیقتاً اجتماعی ملکیت کو اساس سمجھتا اور اس طریقِ عمل کو مفادِ عامہ کے لیے ضروری مانتا ہے تو نہ صرف پبلک میں عام خوشحالی کا دور پیدا ہو جائے گا بلکہ اس طرح عام رفاہیت، تجارت کی فراوانی اور زراعت کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ ''ذرائع'' مہیا ہو سکیں۔

۵ مثلاً جب پٹرول کی کانیں ملک میں برآمد ہوں اور اجارہ دارانہ سسٹم کی کمپنیوں کے بجائے خود حکومت کی سرکاری کمپنی اس کی برآمد کا انتظام کرے تو ظاہر ہے کہ درمیانی ایجنٹ کی من مانی زیادہ ستانی سے اس کی قیمت میں موجودہ دور کی طرح ناقابل برداشت گرانی نہیں ہو سکے گی اور اس طرح اس کا فائدہ صرف مخصوص سرمایہ داروں ہی تک محدود نہ رہے گا، بلکہ عام اور متوسط طبقہ بھی بلند ہو سکے گا، جس پر ملک کی بہتری کا بہت کچھ مدار ہے اور اس طرح استعمال کے لیے بھی اس کا فائدہ عام ہو جائے

گا۔

❻ کیا کوئی کاروباری آدمی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر آج کوئلہ درمیانی کمپنیوں کے ذاتی منافع کے شکار سے نکل کر براہِ راست خود حکومت کے ہاتھوں ملک تک پہنچے تو ضروریات کی ہزاروں اشیاء جن کی ارزانی اور گرانی کا مدار کوئلہ کی ارزانی اور گرانی پر ہے اس قدر ارزاں ہو جائیں کہ دولت مندوں کی طرح عوام اور متوسط بھی ان اشیاء سے کافی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

جہازوں اور ریلوے کے ٹکٹ، محصولات اور آلاتِ حمل و نقل کی فراوانی وغیرہ اس ترقی کے دور میں بڑی حد تک اسٹیم اور بجلی کی قدر و قیمت کے ساتھ وابستہ ہیں اور اسٹیم و بجلی کا آدھا وجود کوئلہ پر موقوف ہے، پس اگر کوئلہ ارزاں ہے تو اس کا اثر مذکورہ بالا تمام اشیاء پر پڑتا ہے اور اگر گراں ہے تو یہ تمام اشیاء پر اثر انداز ہے، لہٰذا اقتصادی نظام کے مسطورہ بالا نظریہ کا یہ پہلو اس قدر صاف ہے کہ کوئی صاحبِ عقل و خرد اس کی صحت کا انکار نہیں کر سکتا۔

ملیں اور کارخانے

غریب مزدوروں پر سرمایہ دار کی آقائی کا جال:

جب صنعت و حرفت انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشینوں اور کلوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے تو ''سرمایہ دار'' کے لیے جنت کی ایک کھڑکی کھل جاتی ہے اور وہ ملیں اور کارخانے قائم کر کے خدا کے اپنے ہی جیسے بندوں ''غریبوں اور مزدوروں'' پر آقائی بلکہ العیاذ باللہ خدائی کرتا ہے، وہ مزدوروں کے نام سے ان کی جان و مال اور آبرو پر قابض ہو جاتا ہے اور ان انسانوں کو غلاموں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح اپنے مفاد کی قربان گاہ پر چڑھانے کا عادی بن جاتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے۔

دے رہا ہوں مزد کی صورت میں اس کو زکوٰۃ
درحقیقت اس کی محنت کا صلہ کچھ بھی نہیں

اس کی کم ظرفی نے فطرت کا بگاڑا ہے مزاج
رفتہ رفتہ ہو رہی ہے وہ خسیس و خشم گیں
سیم وزر لے کر بھی میں راضی نہ تھا روزِ ازل
بن گیا مزدور جھٹ جاروب و تیشہ کار ہیں

اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس دورِ تہذیب و تمدن کے موجد جو غلامی کو لعنت کہتے اور اس کے خلاف بڑھ بڑھ کر لیکچر دیتے رہتے ہیں غلامی کے اس اقتصادی جال کو نہ صرف جائز رکھتے بلکہ اپنی حکومتوں اور شہنشاہیتوں کی ترقی کے لیے بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کو ہر وقت سراہتے اور سرمایہ دار کے اس جال کی بندشوں کو قوانین کی راہ سے اور زیادہ مضبوط کرتے رہتے ہیں اور اس جال کی بندشوں کا حسن و نکھار اس وقت اور زیادہ قابلِ دید ہوتا ہے جب اس کے جواز کے لیے دھرم اور مذہب کے نام پر غلط حمایت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ محنت کی زیادتی حقِ محنت کی کمی اور عام حقوق انسانی سے محرومی کے بعد اس ریوڑ کی زبوں حالی دیکھنی ہو تو بمبئی، کلکتہ، کراچی، مدراس، دہلی، کانپور اور شولا پور جیسے تجارتی مقامات میں جا کر دیکھئے۔ پہلے ''مل آنرز'' (Mill Owners) کی چمن زار کوٹھیوں اور جنت نظیر بنگلوں پر ایک نظر ڈالیے اور اس کے بعد پھر ان غلیظ اور نجس چالوں اور کواٹروں کو ملاحظہ فرمائیے جس میں بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح مزدور آباد ہیں، لیکن قانونِ فطرت انتقام لیے بغیر کب باز رہتا ہے، آخر مزدور و سرمایہ دار کی جنگ کے نام سے وہ شعلے بھڑک اٹھے ہیں جس نے ''سرمایہ دارانہ'' نظام کو بھسم کر کے بالآخر ایک قدیم مگر عادلانہ نظام کے لیے زمین ہموار کر دی ہے۔ ''لعل اللہ یحدث بعد ذٰلك امرا''

سرمایہ اور محنت میں توازن

اسلام چونکہ خود دینِ فطرت ہے اور اس کا نظام کسی انتقام یا ردِ عمل پر مبنی نہیں ہے بلکہ اپنے وجود ہی میں کائناتِ انسانی کی عام فلاح و بہبود کا ہمہ گیر نظام اور انسانی

ضروریاتِ دینی و دنیوی کے ہر شعبہ میں مستقل انقلابی پیغام ہے اس لیے اس نے اپنے اقتصادی نظام میں اس جگہ بھی مذموم سرمایہ داری کی حمایت نہیں کی بلکہ سرمایہ اور محنت میں ایک ایسا معتدل توازن قائم رکھا ہے۔ اس کے بعد اس جنگ کے لیے کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ اسے یہ معلوم ہے کہ ''سرمایہ دار'' مزدور کو کن راہوں سے تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ سو اگر وہ راہیں بند کر دی جائیں تو پھر تعاون اور امدادِ باہمی کا وہ قانون جو انسان کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے یہاں بھی بغیر افراط و تفریط کے صحیح نقشہ کے مطابق کس طرح باحسن وجوہ نافذ ہو سکتا ہے۔

چالاک اور ظالم سرمایہ دار کی استحصالی چالیں

اجرت کی کمی:

پہلی گرہ جو اس جال میں مزدور کو پھنسانے کے لیے لگائی گئی ہے وہ ''اجرت کی کمی'' ہے، وہ نادار ہے مفلس ہے، بے چارہ ہے فاقہ کش ہے، اس لیے اس کی محنت کا صلہ ایک روپیہ ہونے کے باوجود سرمایہ دار اس کو چار آنے پر راضی کر لیتا ہے اس لیے کہ وہ بھوکا ہے، تن پیٹ دونوں کے لیے عاجز و درماندہ ہے، سرمایہ دار خوش ہے کہ اس نے جبر نہیں کیا بلکہ مزدور اپنی خوشی سے اس پر آمادہ ہو گیا اور مزدور یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ اس ناواجب اجرت کو اضطراری طور پر قبول نہیں کرتا تو فاقوں کی بدولت موت کا استقبال لازمی ہے۔ اور یہ کہ دوسرا مزدور مجھ سے زیادہ بدحالی اور اضطرار کی وجہ سے اس سے بھی کم اجرت پر کام کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ کام پر مزدور کی مجبوراً رضامندی:

دوسری گرہ یہ لگائی گئی ہے کہ کم سے کم مزدوری میں مزدور سے کام زیادہ سے زیادہ لیا جائے اور اس کو بھی وہ اپنے افلاس اور تنگ حالی بلکہ فاقہ کشی کی خاطر منظور کر لیتا ہے اور اپنی بے چارگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر نو، دس گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ محنت کر کے سرمایہ دار کو خوش کرتا ہے، تب جا کر بمشکل چار آنے کا حقدار ہوتا

ہے۔

لیکن اسلام اپنے نظام میں مفلس اور صاحبِ حاجت کی اس رضا مندی کو "مرضی" نہیں تسلیم کرتا اور سرمایہ دار کے ان دونوں پھندوں کو ظلم قرار دے کر اس طلسم کو پاش پاش کر دیتا ہے، فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [۱] فرماتے ہیں:

"پس اگر مالی نفع ایسے طریقہ پر حاصل کی اجائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور عملی محنت کو دخل نہ ہو جیسے قمار یا زبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو، جیسے سودی کاروبار، تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داری عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی وہ رضا مندی حقیقی رضا مندی نہیں ہوتی، تو اس قسم کے تمام معاملات رضا مندی کے معاملات نہیں کہلائے جا سکتے اور ان کو نہ پاک ذرائع آمدنی کہا جا سکتا ہے، بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکمتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث ہیں۔" [۲]

عن ابی هريرة رضی الله تعالٰی عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: قال الله عزوجل: ثلثة أنا خصمهم يوم القيامة ومن كنت خصمه خصمته (الی) ورجل استأجرا أجيرا استوفی منه ولم يوفه. [۳]

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ: حجة الله البالغه، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق

(۳) امام بیہقی: السنن الكبرى، ج ٦، كتاب الاجارة. صحيح الامام البخاری ج ۲، کتاب الاجارات، باب اثم من منع اجر الأجير. امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالٰی نے اپنی صحیحین میں ایک ایسی حدیث نقل کی ہے جس سے مزدور کی مزدوری کی اہمیت، اسے وقت پر مزدور کا کسی عذر قید و بند، بیماری، سفر، رکاوٹ وغیرہ ـــــ کی وجہ سے وصول نہ کر سکنا۔ آجر (مزدور سے کام لینے والے) کا مزدور کی

اس اجرت سے سرمایہ کاری کرنے اور یوں اجرت کے مال کو بڑھنے اور اس کی آمد اور مطالبہ پر آجر کا اجرت کو اس کے اضافہ اور منافع جات کے ساتھ واپس کرنے کو ایک بہت بڑا کار خیر، دعاؤں کے قبول ہونے کا ذریعہ اور بلاؤں اور مصائب کے دور ہونے کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔

حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تین آدمی سفر پر تھے راستہ میں بادوباراں نے انہیں آن گھیرا، انہوں نے ایک پہاڑ کی تنگ غار میں پناہ لی۔ ہوا کے تھپیڑوں نے پہاڑ سے ایک پتھر گرایا جو اس غار کے منہ پر آگرا اور وہ غار میں محصور ہو گئے، تینوں نے اپنے نیک اعمال ——— جو صرف کریم کی رضا کے لیے کیے تھے ——— کو یاد کر کے دعائیں کیں، پہلے نے رات بھر جاگ کر والدین کو دودھ پلانے، مگر ان کو بے آرامی سے بچانے کے لیے نہ جگانے مگر خود بیداری کی تکلیف اٹھانے کا وسیلہ بنا کر دعا کی، اور ایک حصہ پتھر کا ہٹ گیا۔ دوسرے نے بڑی تگ ودو سے ایک حسین وجمیل عورت کو برائی کے لیے آمادہ کرنے مگر اس کے صرف اتنا کہنے پر کہ اللہ کریم سے ڈر، گناہ سے باز رہنے کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور پتھر کا دوسرا حصہ بھی غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اب تیسرے نے کیا ذریعہ بنایا کہ سارا پتھر ہٹ گیا۔ وہ مزدور کی مزدوری کی ادائیگی کے بارے میں ہے۔ آئیے پہلے مصطفی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ پڑھئے، پھر اردو میں معانی:

وقال الثالث: أللهم استاجرتُ أجراء وأعطيتهم أجرهم غير رجل واحد ترك الذى له وذهب. تثمرت أجره حتى كثرت منه الأموال فجاء نى بعد حين فقال: يا عبدالله! إدإلىّ أجرى. فقلت: كل ما ترى من أجرك من الإبل والبقر والغنم والرقيق. فقال: يا عبدالله! لا تستهزى بى فقلت: لا أستهزى بك. فأخذه كله فأستافه فلم يترك منه شيئا. أللهم إن كنت فعلت ذلك ابتغاء وجهك فافرج عنا ما نحن فيه. فأنفرجت الصخرة، فخرجوا يمشون. (بحواله رياض الصالحين، باب الاخلاص واحضار النية، حديث نمبر ۱۲)

ترجمہ: اور تیسرے نے (اللہ کریم سے دعا کرتے ہوئے) عرض کیا: اے اللہ کریم! میں نے مزدوروں کو اجرت پر رکھا، میں نے ان سب کی مزدوری ادا کر دی مگر ان میں کا ایک (کسی وجہ سے) اپنی مزدوری لیے بغیر چلا گیا۔ میں نے اس کی مزدوری کی رقم کو سرمایہ کاری میں لگا دیا اور اس سے بہت سارے مال بڑھ گئے، وہ ایک زمانہ کے بعد میرے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کریم کے بندہ! میری اجرت مجھے ادا کر دو۔ میں نے کہا: یہ جو کچھ تو دیکھ رہا ہے سارا تیری مزدوری (کا بڑھا ہوا مال) ہے، یہ اونٹ، یہ گائیں بیل، یہ بکریاں بھیڑیں اور یہ غلام (سب تمہارے ہیں)۔ اس نے (تعجب سے) کہا: اللہ کریم کے بندہ! مجھ سے مزاح نہ کر۔ میں نے عرض کیا: میں تجھ سے مزاح نہیں کر رہا۔ لہٰذا وہ سارے کا سارا لے گیا اور اس نے (میرے پاس) کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اے اللہ کریم! اگر میں نے یہ سب کچھ محض تیری رضا کے لیے کیا تو ہمیں اس تنگی سے نکال دے، جس میں ہم مبتلا ہیں۔ پتھر ہٹ گیا اور وہ پاؤں چلتے باہر آ گئے۔ (سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم)

آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ اللہ کریم کے ہاں اس کمزور طبقہ مزدوروں کی کس قدر عظمت واہمیت ہے کہ ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے والے کے ذریعہ اللہ کریم محیر العقول کرامات ظاہر فرماتے ہیں، دعاؤں کو

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں گا اس کو مغلوب و مقہور کر کے ہی چھوڑوں گا، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے مگر اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔

(امام ابن حزم رحمہ اللہ مزدور سے کام (جسمانی یا ذہنی) لینے کا ایک حکیمانہ اُصول بتاتے ہیں:)

ولیستعملهما فیما یحسّانه و یطیقانه بلا اضرار بهما.[1]

ترجمہ: کام لینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ (آزاد ہو یا غلام) دونوں قسم کے اجیروں سے اس حد تک کام لے کہ وہ اچھی طرح کام انجام دے سکیں اور بقدرِ طاقت کام لینا چاہیے اور یہ نہ ہو کہ ان کو اتنی محنت کرنی پڑے کہ ان کی صحت وغیرہ کو نقصان پہنچے۔

اجرت معین کیے بغیر کام لینا:

سرمایہ دار کی جال کی گرہوں میں سے تیسری گرہ یہ ہے کہ مزدور کی اجرت معین نہ کرے اور اس کی غربت سے فائدہ اٹھا کر یونہی کام پر لگائے اور کام مکمل کرانے کے بعد جو اجرت چاہے دے دے۔ اسلام نے اس کو بھی ناپسند اور ناجائز کہا ہے اور ایسے معاملہ کو خیانت سے تعبیر کیا ہے۔

عن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالیٰ عنه: أن رسول الله صلی الله عليه وسلم نهی عن استئجار الأجير حتی يبين له أجره.[2]

قبول فرماتے ہیں اور جاں گسل گھاٹیوں سے نکال دیتے ہیں۔

(۱) ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ تعالیٰ: المحلی، ج ۸ احکام الاجارات

(۲) ترمذی: الجامع، ج ۱، کتاب الایمان والنذور، باب الشروط فیه المزارعة والوثائق

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگالیا جائے۔

ادائیگی اجرت میں بلاوجہ تاخیر:

چوتھی گرہ یہ ہے کہ حقِ محنت تو مقرر کر دیا جائے لیکن ادائیگی میں من مانی رکاوٹ پریشان کن ترکیبیں اور جبر و ظلم کے طریقے اختیار کیے جائیں اور مزدور کو وقت پر اس کے معمولی حقِ محنت سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔

اسلام نے اس کا بھی سد باب کیا ہے اور ایسا کرنے کو بد معاملگی "ظلم" اور بڑا گناہ قرار دیا ہے اور وہ اپنے اقتصادی نظام میں ایک لحہ کے لیے بھی سرمایہ دار کے اس ظلم سے درگزر نہیں کرنا چاہتا۔

عن أبي هريرة رضى الله تعالىٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مطل الغني ظلم.[1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالدار کا مالداری کے باوجود دوسرے کے ادائے حق میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إعط الأجير أجره قبل ان يجف عرفه.[2]

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مزدور کی مزدوری اس کے پسینے کے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

بیهقی: السنن الكبرى: ج ٦ كتاب الاجارات، ص ۱۲

(۱) صحيح الامام البخاری رحمه الله تعالىٰ، كتاب الحواله، باب فی الحواله الخ. نووی: رياض الصالحين، باب تحريم مطل الغنی الخ

(۲) امام بیهقی: السنن الكبرى، ج ٦، باب الاجارات

مزدور کا حق تلف کرنے کے لیے بہانہ سازی:

پانچویں گرہ یہ ہے کہ "مزدور" کے حق تلف کرنے اور بہانہ سازی سے "سرمایہ داری" کو فروغ دینے کے لیے مزدور پر کام خراب کر دینے کا الزام لگا کر دیئے ہوئے چند ٹکے بھی جرمانہ کے نام سے واپس لے لیے جائیں، گو بزعم خود یہ ظالم سرمایہ دار اپنے نقصان کا تاوان "انصاف" کے نام سے وصول کرتے ہیں۔

اسلام نے اس کو بھی افراط و تفریط سے الگ اعتدال کی حالت پر لانے کی کوشش کی ہے اور عدل و انصاف کے صحیح اصول پر یہ فیصلہ کیا ہے:

"اور اجیر مشترک ہو یا خاص یا کاریگر ہو اس پر مال میں نقصان ہو جانے یا ہلاک ہو جانے سے کوئی تاوان نہیں آتا تاوقتیکہ اس کا ارادی قصور یا ضائع کر دینا ثابت نہ ہو۔ اور ان تمام امور میں جب تک اس کے خلاف گواہ موجود نہ ہوں اسی اجیر کا قول معتبر ہے قسم کے ساتھ۔"[1]

اور ان تصریحات کے بعد اسلام اپنے اقتصادی نظام میں مزدوروں اور پیشہ وروں کو بھی ارباب رأس المال کے ساتھ زیادتی اور بے جا تعدی کرنے سے روکتا ہے اور نہیں چاہتا کہ ایک طرف سے افراط اور دوسری طرف سے تفریط ہو۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: خیر الکسب کسب

---

(۱) ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ: محلی: ۲۰۱/۶ اور فقہاء حنفیہ کے نزدیک اجیر خاص کا اگرچہ یہی حکم ہے مگر اجیر مشترک ضامن ہوتا ہے، اور اجیر مشترک اس اجیر کو کہتے ہیں جو اپنا ایک مستقل فنی کاروبار کرتا ہے اور ہر شخص اس کام کے سلسلے میں اس سے خدمت لیتا ہے۔ مثلاً سینے، کپڑا بننے وغیرہ کا کام لینا اجیر خاص سے مراد وہ اجیر ہے جو اپنی خدمات کسی ایک شخص کے لیے بعوض وقف کر دے، مثلاً گھر کا ملازم، بیرہ اور باورچی وغیرہ۔ اور اجیر خاص پر ضمان نہ آنے کی دلیل یہ دیتے ہیں۔

لأن یدہ ید أمین والعین فی یدہ، لہ حکم الأمانۃ إلا إذا تعمد الفساد. فأنہ یضمن للتعدی..

ترجمہ: اس لیے کہ مستاجر کی شے اجیر کے ہاتھ میں امانت ہے اس لیے اس کا حکم امانت ہی کا رہے گا مگر یہ کہ جان بوجھ کر چیز کو برباد یا خراب کرے تو اس صورت میں ضمان آئے گا۔

العامل إذا نصح.[1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے بشرطیکہ وہ خیر خواہی اور بھلائی کے ساتھ کام والے کا کام انجام دے۔

ان تمام احکامِ عدل و انصاف کے بعد وہ مستاجروں اور اجیروں دونوں کے لیے ایک عام قانون بیان کر کے میزان عدل کو مساوی رکھنے کی سعی کرتا ہے، شرعۃ الاسلام میں ہے:

"اسلام کی سنت یہ ہے کہ لوگوں (اجیر و مستاجر، بائع و مشتری وغیرہ) کو آپس میں مہربانی رحم اور باہم یک و دیگر خیر خواہی کے ساتھ معاملات کرنے چاہئیں اور وہ یہ کہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، یعنی معاملات میں صرف اپنے فائدہ ہی کا پہلو پیش نظر یہ نہ ہو بلکہ فریقِ ثانی کا بھی خیال رہے۔"[2]

یہی وجہ ہے کہ فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ[3] نے اجارہ کو تعاون اور معاونت میں شمار کیا ہے، یعنی ایسے کل معاملات اور کاروبار جو دو فریق کے باہم دگر مدد و اعانت سے نفع بخش ثابت ہوتے ہیں "بابِ تعاون" ہی میں داخل ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"معاونت کی چند اقسام ہیں اور اجارہ بعض لحاظ سے مبادلہ اور بعض لحاظ سے معاونت ہے۔"[4]

لیکن اگر ان حقوق میں تصادم پیش آئے اور ایک دوسرے کے حقوق پر دستبرد کرنے لگے تو اس قسم کے تمام معاملات میں یعنی تعیین مدتِ عمل، تعیین مقدار

(۱) الهيثمي: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ۹۸/۸

(۲) حنفي، سيد علي زاده: شرح شرعة الاسلام، فصل في طلب الحلال، ص ۲۳۲

(۳) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

(۴) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ: حجة الله البالغه، ج ۲، ابواب ابتغاء الرزق

اجرت آسائش و راحت کے انسانی حقوق وغیرہ میں "حکومت" کو دخل اندازی کرنی چاہیے، اور خود عدل و انصاف کے ساتھ ان معاملات کو اس طرح طے کر دینا چاہیے کہ جانبین کے واجبی حقوق میں ظلم کا شائبہ تک باقی نہ رہے، چنانچہ نرخ کی گرانی کی بحث میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ضررِ عام ہو اور جماعتی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس وقت حکومت کو مداخلت کا حق ہے۔

ولا يسعر حاكم إلا إذا تعدّى الأرباب عن القيمة تعديا فاحشا فيسعر بمشورة أهل الراى.[1]

ترجمہ: حاکم نرخ میں اس وقت تک مداخلت نہ کرے جب تک "اربابِ نرخ" قیمت کی گرانی میں زیادتی پر نہ اتر آئیں اس وقت امام کو اہل الرائے کے مشورہ سے نرخ مقرر کر دینا چاہیے۔

یعنی امام کو متعلقہ امر کے ماہرین کی مجلس شوری یا سب کمیٹی مقرر کر کے اس کے مشورہ سے اقدام کرنا چاہیے۔

مباحث کا خلاصہ

الحاصل اسلام اگرچہ اپنے اقتصادی نظام میں صنعت و حرفت اور تجارت پر بہت زور دیتا ہے اور جگہ جگہ ایماندار تاجروں کو خدا کی رضا اور جنت کی بشارت سناتا اور اس کو خوش عیشی اور رفاہت کی راہ بتاتا ہے، نیز انبیاء کے پیشے اور کسبِ معاش کے واقعات سنا کر صنعت و حرفت کی ترغیب دیتا اور گھریلو اور دستی کاریگری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے عوام کی بے روزگاری دور ہوتی ہے اور عام متوسط خوش حالی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ بایں ہمہ "ملوں اور کارخانوں" کی جدید ایجادات کے سلسلہ میں بھی اس کا قانونِ اقتصاد جماعتی فلاح و بہبود کے قوانین سے عاجز و درماندہ نہیں ہے اسی لیے وہ حکم دیتا ہے کہ اس کے نظام میں ان ملوں اور

(۱) حصکفی رحمہ اللہ تعالٰی، محمد علاؤالدین: درمختار مع (فتاوی) الشامی، مطبوعہ بمبئی (ہند) ۱۳۰۹ھ، ج ۵، باب الخطر والإباحة

کارخانوں کا استعمال صحیح طور پر تو جب ہی ہو سکتا ہے کہ حکومت رفاہِ عام اور مفادِ عامہ کی خاطر ان سے کام لے اور اربابِ دولت کو ایسے مواقع مہیا نہ ہونے دے کہ وہ غریبوں کو اپنی مشینوں کے پرزوں ہی کی طرح سمجھ کر اپنی اغراض کا آلہ کار بنالیں۔ اور اس طرح عام فقر و فاقہ کے ساتھ مخصوص افراد یا گروہ میں دولت ''کنز'' بن کر جمع ہو جائے۔ اور اگر پبلک میں سے دولت مند حضرات ملک کی دولت میں اضافہ کرنے اور اپنی رفاہیت میں جائز بہتات پیدا کرنے کے لیے حکومت سے اجازت کے خواہ ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ مندرجہ بالا شرائط و حدود کے ساتھ ان کو اجازت دے تاکہ افراط و تفریط سے الگ اس بارہ میں ایسا توازن قائم ہو جائے کہ ارباب سرمایہ مذموم سرمایہ داری تک نہ پہنچ سکیں اور اجیر و مزدور حیوانوں اور غلاموں کی طرح نہیں بلکہ باہمی اشتراک و تعاون کے ساتھ اپنی معاشی زندگی کو باحسن وجہ حاصل کر سکیں، کیونکہ یہ اگر حاصل ہو جائے تو پھر مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کے امکانات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ رہے مزدوروں اور غریبوں کے حفظان صحت، خوراک و لباس کی آسائش، بچوں کی تعلیم وغیرہ معاملات، سو ان کے لیے اسلام کا ایک ہی فیصلہ ہے کہ حکومت (خلافت) بغیر امتیاز امیر و غریب پبلک کی تمام قسم کی جائز اور واجب ضروریات کی کفیل اور ذمہ دار ہے۔

انفرادی عیش و تنعُّم

(Individual's Extravagent & Ostantat Consumption)

یوں تو ہر شخص اپنے روپے پیسے اور ذرائع آمدنی کو انفرادی ملکیت کی بنا پر اپنی راحت اور اپنے عیش پر صرف کرنے میں مختار و مجاز (Authorized) ہے لیکن اگر یہی اختیار و اجازت حدِ اعتدال سے نکل کر اس غلط راہ پر پڑ جائے کہ عورتوں میں زیور کی کثرت، زیب و زینت کی گراں قیمت اشیاء کی خریداری، فیشن کی دلدادگی اور مردوں میں اسراف و نمائشی اخراجات اور ضروریات انسانی سے الگ خارج از اعتدال تفریحی

اخرجات کا ایسا ہمہ گیر شوق و ذوق پیدا ہو جائے کہ قوم کی قوم اس میں مبتلا نظر آنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچ جائے کہ بازاروں میں عام حاجات کی اشیاء کے مقابلہ میں بناوٹی حسن اور زیبائش کی اشیاء کا لین دین بڑھ جائے، اہل صنعت و حرفت کی نظر ان ہی امور کی دیدہ ریزی اور لطافت آفرینی میں محو اور مصروف ہو جائے، تجار کی تجارت کا فروغ صرف اسی پر رہ جائے، مردوں کی محنت کا ثمرہ دولت اسی پر صرف ہونے لگے اور عام ضروریات کی تجارت، خام اجناس کی زراعت اور رفاہِ عام کے سلسلہ کی صنعت و رفت کساد بازاری کی نظر ہونے لگے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم کا اقتصادی جہاز گرداب ہلاکت میں گھر چکا ہے اور آج نہیں تو کل اس کے لیے محنت کی جگہ تختہ، اور زربفت و کم خواب کی جگہ ٹاٹ و پلاس بھی میسر نہ آئے گا۔

پس ملک کی ایسی خستہ حالت کو روکنا اور اس کے انفرادی اختیارات کی اس آزادی پر اخلاقی اور آئینی پابندیاں عائد کرنا اور اس ملک کی اقتصادی زندگی کو تباہی و بربادی سے بچانا حکومت کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اسی لیے اسلام نے اگرچہ ”ذرائع آمدنی“ اور ”آمدنی“ کی بہت سی شقوں میں انفرادی حقِ ملکیت کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ منشاء اور یہ خواہش ہے کہ اختیار کی یہ باگ اس قدر ڈھیلی نہ رہنے دی جائے جس کی بدولت عام انسانی دنیا اقتصادی بدحالی میں گرفتار ہو جائے، اور صرف چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسانوں کی سرمایہ دارانہ عیش پسندی کی مرضیات میں ڈوب کر خدا کی عام مخلوق ہلاکت و تباہی کے گھاٹ اتر جائے۔ اسلام کے مایۂ ناز فلسفی شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ [1] نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمدن و معیشت کے فساد کی راہوں میں یہ بہت بڑی راہِ فساد ہے، لکھتے ہیں:

> ”اسی طرح تمدن کی تباہی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ امت کے مالدار زیورات۔ لباس، مکانات، خورد نوش اور عورتوں کے حسن و

---

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ا کے حاشیہ میں درج ہے۔

زیبائش وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مبتلا ہو جائیں اور حاجات وضروریات سے زیادہ عیش و تنعُّم کی زندگی میں مشغول و منہمک رہنے لگیں۔"(۱)

اور آخر کار نتیجہ یہ نکلے کہ:

"لوگوں پر اس کی وجہ سے سخت مصیبت آن پڑے، مثلاً لوگوں کے لیے جو زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کے مختلف کاموں کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور آخر اس ایک شہر یا ملک کا یہ ضرر آہستہ آہستہ ایک عضو اجتماعی سے دوسرے عضو میں سرایت کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ تمام مخلوق ایک عام تباہی میں گرفتار ہو جاتی ہے۔"(۲)

لہٰذا اسلام نے ایسے تمام ذرائع کا سد باب بھی ضروری سمجھا ہے اور اس کی اصلاح کے لیے بھی مختلف قدم اٹھائے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہو چکا اور بعض قانونی حیثیات کا ذکر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان سطور میں کیا ہے:

"اور یہ مرض عجمی تمدن پر چھایا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اس مرض کا اس طرح علاج کریں کہ اس فاسد تمدن کا مادہ ہی ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے۔ اس لیے آپ نے دیکھا کہ اس تمدن کی زیادہ تر بنیاد گانے والی عورتوں کے شوق، مردوں کو طرح طرح کے ریشمی اور حریر کے لباس کی نزاکت کے ذوق اور سونے کے زیورات کی چمک دمک کے شوق میں سونے کا سونے کے ساتھ کمی زیادتی کے لین دین پر قائم ہے لہٰذا آپ نے ان کی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی ممانعت کر دی اور حکم دے دیا کہ اس مصنوعی اور تباہ

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ البالغہ، ج ۲، باب من ابتغاء الرزق

(۲) حوالہ بالا

کن عیش پسندی کو ختم ہونا چاہیے اور سادہ زندگی کو اختیار کرنا چاہیے۔"(۱)

انفرادی ملکیت کو بے قید ہونے سے روکنے کے اقدامات

زکوٰۃ:

تجارتی بد عنوانیوں کے انسداد کی بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں "اکتناز" اور "احتکار" دونوں حرام ہیں، یعنی چونکہ یہی دو راہیں سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کو نشو ونما کرتی ہیں اس لیے ان کا استیصال ضروری ہے۔ احتکار کی بحث تو بعض گوشوں کے لحاظ سے صفحاتِ گذشتہ میں آچکی، اب بعض وہ احکام قابل ذکر ہیں جو انفرادی ملکیت کو بے قید ہونے سے روکتے اور اکتناز سے محفوظ رکھتے ہیں۔

دولت کے جمع اور ذخیرہ کی وہ تمام صورتیں جن میں دولت کی تقسیم سے انکار کیا گیا ہو، اکتناز میں داخل ہیں، لہٰذا اسلام کے معاشی نظام کا اعتدال اس کے مقابلہ میں یہ حکم دیتا ہے کہ دولت جمع اور ذخیرہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تقسیم اور گشت کے لیے ہے تاکہ افراد کے درمیان دولت کا توازن صحیح رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم قانون "زکوٰۃ کا قانون" ہے اور اس لیے اس کی ادا صرف رضا کارانہ اصول پر نہیں بلکہ قانون فرض کی شکل پر قائم ہے اور جو لوگ اس فرض کی ادا میں کوتاہی کرتے اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے قانونی سزا کے علاوہ آخرت کے سخت عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي

(۱) حوالہ بالا

سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾[1]

ترجمہ: اور جو لوگ خزانہ بناتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی اس کی زکوٰۃ اور دیگر حقوق واجبہ مالیہ ادا نہیں کرتے) تو آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔

﴿يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾[2]

ترجمہ: جس دن کہ آگ دھکائیں گے اس مال پر دوزخ کی، پھر داغیں گے اس مال سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پشت (اور کہا جائے گا): اب چکھو مزہ اس مال کے خزانہ کرنے کا۔

علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ اور حقوق واجبہ ادا نہ کرنے کی وعید میں نازل ہوئی ہے اور اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ "ایتاء الزکوٰۃ"[3] کا ذکر تو قرآن عزیز میں بہت زیادہ ہے۔

---

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): ۳۴

(۲) سورۃ التوبۃ (۹): ۳۵

(۳) انسان جب خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کا قلب اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اس لیے ایمان میں تازگی، روح میں پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی قربت کے لیے زکوٰۃ کو فرض کیا گیا جو درحقیقت ایمان باللہ کا عنوان اور عطاءِ نعمت شکر الٰہی کا مظہر ہے، نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت، ایک شخص کی بدنی عبادت کا مظاہرہ اگر خلوص و صداقت پر مبنی ہے تو مالی عبادت اس کے لیے صحیح کسوٹی ہے تاکہ معاملہ اس طرح کا ثابت نہ ہو ؎

گر زر طلبی سخن دریں است

گر جان طلبی مضائقہ نیست

(اگر زر —— روپیہ پیسہ —— مانگو گے تو اس میں کچھ کلام ہے (سوچنا پڑے گا کہ مال ہے بڑا پیارا ہے، مشکل سے کمایا ہے) البتہ اگر (اس کے مقابلہ میں) جان بھی مانگو تو کوئی پرواہ نہیں (حاضر ہے)۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں، چونکہ یہ دولت کو نجس اور ناپاک سرمایہ داری سے بچاتی اور باز رکھتی ہے اور انسان کے دل و دماغ اور ذہنیت کو غرورِ مال اور قارونیت سے پاک کرتی ہے اس مناسبت سے اس کا نام "زکوٰۃ" ہے، حقیقتِ زکوٰۃ دو اصول پر مبنی ہے۔

❶ مذموم سرمایہ داری سے روکنا اور غرباء کی حاجات کو پورا کرنا۔

❷ اقتصادی بہتری کے لیے جدوجہد کا جذبہ پیدا کرنا۔

پہلا اصول تو واضح ہے اس لیے کہ اسلام کی نظر میں ایسا شخص بھی سرمایہ دار ہے، جس کے پاس صرف ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونا[1]

---

(۱) سونا اور چاندی کا نصاب جدید اوزان میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث مبارکہ سونے کا نصاب ۲۰ مثقال ـــــ جسے پاک و ہند کے علماء اسلام نے ساڑھے سات تولے کے برابر قرار دیا ـــــ اور چاندی کا نصاب ۲۰۰ درہم ـــــ جسے ان علماء اسلام نے ½۵۲ تولے چاندی کے برابر قرار دیا ـــــ مقرر فرمایا، البتہ جدید عالمی نظامِ اوزان (New International System of Weight) میں درہم (جو چاندی کا گول سکہ تھا کا وزن ۲٫۹۷۵ گرام کے مساوی ہوتا ہے، اور دینار جو سونے کا گول سکہ ہوتا تھا اور جسے مثقال (Mithqal) بھی کہا جاتا ہے کا وزن) ۴٫۲۵ گرام کے مساوی ہے، اس طرح درہم اور دینار یا مثقال کی وزن میں نسبت ہم اس طرح نکالیں گے۔

$\frac{۲٫۹۷۵}{۴٫۲۵} = \frac{۷}{۱۰}$ یعنی وزن میں ۱۰ درہم ۷ دینار (مثقال) کے برابر تھے۔ البتہ قیمت کے اعتبار سے ان میں بہت فرق تھا، کیونکہ دینار سونے کا سکہ تھا اور درہم چاندی کا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید، خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد مبارک اور بنو امیہ اور بنو عباس کے ادوار میں بھی ایک دینار قیمت میں سات درہم کے برابر تھا، گویا کہ قیمت میں نسبت ۷:۱۰ (اوپر بیان کردہ نسبت وزن) سے گھٹ کر ۱:۷ تھی۔ اب سونے کا نصاب جدید اوزان میں نکالنا آسان ہو گیا، یعنی سونے کے نصاب کو نصاب کے جدید وزن کی ایک اکائی سے ضرب دے دیں = ۲۰ (مثقال) × ۴٫۲۵ (سونے کے ایک مثقال کا وزن) = ۸۵ گرام

اب چاندی کا جدید اوزان میں نصاب نکال لیں بطریقہ چاندی کے نصاب کو اس کے نصاب کے ایک یونٹ یا ایک اکائی کو جدید نظام میں گرام کے برابر ہے ضرب دے دیں، یعنی:

۲۰۰ × ۲٫۹۷۵ = ۵۹۵ گرام

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ:

۸۵ گرام سونا = ۵۹۵ گرام چاندی

اب دونوں اوزان کی آپس میں نسبت نکال لیں: $\frac{۵۹۵}{۸۵}$ = ۷ یا ۱:۷

یوں کہہ لیجئے کہ قیمت میں ا گرام سونا = ۷ گرام چاندی، یعنی دونوں کی قیمت میں آپس میں نسبت ہوئی ۱:۷ اب اوپر ان دونوں سکوں (یعنی درہم اور دینار) کی بیان کردہ نسبت یعنی ۷ مثقال سونا = ۱۰ درہم چاندی یا ۷ : ۱۰ یا $\frac{7}{10}$ کو ذہن میں لائیں۔ جب وزن میں درہم اور دینار (یا مثقال) کی نسبت $\frac{7}{10}$ ہے تو ان دونوں کی قیمت میں نسبت حاصل کی جاسکتی ہے دونوں کی وزن کی نسبت ($\frac{7}{10}$) × دونوں کی قیمت کی نسبت یعنی = $\frac{7}{10}\times\frac{1}{7}=\frac{1}{10}$

یا یوں کہئے قیمت میں ا مثقال / دینار سونا = ۱۰ دراہم چاندی ہو گا۔

اب ایک بار پھر پلٹئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ نصاب سونا و چاندی کی طرف کہ جب سونا کا وزن ۲۰ مثقال (دینار) ہو یا چاندی ۲۰۰ دراہم ہو اور کسی کے پاس سال بھر رہیں تو ان پر زکاۃ ہوگی۔

اب اوپر ریاضی کے حساب سے سونا اور چاندی کی قیمت میں نسبت ۱: ۱۰ کو ذہن میں رکھیں پھر ۲۰ مثقال سونا = ۲۰۰ دراہم چاندی حاصل کریں۔

اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی خبر پر ایمان پختہ کرلیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

(ان اوزان کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ابراہیم البنا، استاد و جامعہ ازہر کی تحقیق سے بھی مدد لی گئی ہے۔ دیکھئے: ابو یوسف کتاب الخراج، مطبوعه دار الاصلاح، قاهرة، ۱۹۸۱ء، ص ٦٣، ٦٤)

یہاں مکرر ایک حقیقت کی طرف محترم قاری کی توجہ دلانا ضروری ہے کہ دینار (مثقال) اور درہم اپنی ذات میں قیمت بھی تھے اور وزن بھی تھے یعنی ۲۰ دینار (مثاقیل) اگر سونے کا نصاب تھا تو زکاۃ میں بھی دینار ہی دیئے جاتے تھے کیونکہ دینار سونے کا ہوتا تھا جب اس کی تعداد (یا وزن) ۲۰ (بیس) دینار ہو جاتا تو ان پر زکاۃ فرض ہو جاتی اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی دینار (یعنی سونا) میں ہی جاتی تھی، گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے اسلامی ادوار میں دینار وزن بھی تھا، قیمت (سکہ) بھی تھا اور زکاۃ کا نصاب بھی بنتا تھا۔

یہی صورت حال درہم (چاندی کا سکہ) کا تھا، وہ سکہ بھی تھا، وزن بھی اور قیمت بھی اور ۲۰۰ پر پہنچ کر نصاب زکاۃ بھی بن جاتا تھا۔

نصاب زکاۃ کے وزن میں سونا اور چاندی کی نسبت ۷: ۱۰ تھی، یعنی ۷ دینار (مثقال) ۱۰ دراہم چاندی کے برابر تھے اور نصاب زکوٰۃ کی قیمت میں (چونکہ دینار سونے کا تھا اور درہم چاندی کا لہذا گھٹ کر) یہ نسبت ۱ اور ۱۰ کی ہو جاتی یعنی قیمت سے ا دینار = ۱۰ درہم تھا۔

پاک و ہند، بنگلہ دیش وغیرہ میں جدید نظام میں نصاب: ان مذکورہ ممالک میں ماشہ، رتی اور تولہ کا نظام اوزان چلتا تھا، مسلمان فقہاء کرام اور علماء اسلام نے یہاں سونے کا نصاب (۲۰ مثقال یا دینار کے مساوی) $7\frac{1}{2}$ (ساڑھے سات تولہ سونا) اور چاندی کا نصاب (۲۰۰ دراہم کے مساوی) $52\frac{1}{2}$ (ساڑھے باون تولہ چاندی) مقرر کیا۔

اب مروجہ اعشاری نظام میں ا تولہ ۱۱٫۶۶۴ گرام کے مساوی ہے۔ لہذا سونا اور چاندی کا نصاب اس طرح ہو گا:

سونے کا نصاب وزن میں: $7\frac{1}{2}\times 11.664 = \frac{15}{2}\times 11.664 = 87.480$ گرام

چاندی کا نصاب: $52\frac{1}{2}\times 11.664 = \frac{105}{2}\times 11.664 = 612.360$ گرام

موجود ہو یا ضروریاتِ زندگی سے فاضل ایسی اشیاء موجود ہوں جن کی قیمت اسی نصاب تک پہنچ جاتی ہو، چنانچہ ان اشیاء پر اگر ایک سال گزر جائے تو مالکِ اشیاء سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ اجتماعی حقوق کی تکمیل کے لیے چالیسواں حصہ ”زکوٰۃ“ کے نام سے سرکاری بیت المال میں داخل کرے۔

اسلام نے ادائے زکوٰۃ کو ”فرض“ قرار دے کر درحقیقت صاحبِ ثروت اور نادار انسانوں کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کر دیا ہے کہ اگر مسلمان بحیثیتِ جماعت اس فرض کو پورا کریں تو ایک جانب مذموم اور مطلق العنان سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے اور دوسری جانب فاقہ مست اور خانماں برباد فقر اور مساکین کا وجود باقی نہ رہے۔ اور دنیائے انسانی کی تمام زندگی میں ایسا اعتدال پیدا ہو جائے اور موجودہ طبقاتی جنگ اور معاشی رقابت کے نام سے گروہ بندی مفقود ہو کر رہ جائے جیسا کہ خلافتِ راشدہ خصوصاً دور صدیقی و فاروقی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روشن تاریخ شاہدِ عدل ہے۔

یمن کے باشندے جب نور اسلام کی روشنی سے منور ہو کر مشرف باسلام ہو گئے، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ ھ میں حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)[۱] کو ان پر والی اور معلم بنا کر بھیجا اور ان کو وصیت فرماتے ہوئے ارشاد

اب ان دونوں کے نصاب کی نسبت = $\frac{۶۱۲،۳۶۰}{۸۷،۴۸۰}$ = ۷ یا ۱:۷ (یعنی ۱ گرام سونا = ۷ گرام چاندی

اب چونکہ دینار (مثقال) اور درہم کی قیمتیں مقرر تھیں کیونکہ وہ تو اپنی ذات میں قیمت تھے، گرام سونا اور گرام چاندی کی قیمتیں موجودہ قیمتوں کے نظام میں روزانہ بدلتی ہیں اور اگرچہ گرام سونا یا گرام چاندی اپنی ذات میں اصلی قیمتیں ہیں، مگر بطور قیمت ان کا چلن نہیں۔ لہذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں مقرر کردہ سونا اور چاندی کی قیمتوں کی نسبت کو لے لیں جو $\frac{۷}{۱۰}$ یا ۷ (دینار) : ۱۰ (درہم) تھی، لہذا موجودہ اعشاری نظام کے حساب سے بھی نصاب (یعنی ۲۰ دینار، مثقال سونا اور ۲۰۰ درہم چاندی) حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حدیث مبارکہ میں سونا اور چاندی کی نسبت ۷:۱۰ یا $\frac{۷}{۱۰}$ کو موجودہ اعشاری نظام میں نسبت $\frac{۷}{۱}$ سے تقسیم کر لیں = $\frac{۷}{۱۰} \div \frac{۷}{۱} = \frac{۷}{۱۰} \times \frac{۱}{۷} = \frac{۱}{۱۰}$ یا ۱:۱۰ یعنی سونا ۱ (دینار یا گرام یا تولہ) = ۱۰ (درہم یا گرام یا تولہ) چاندی اب حاصل کر لیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ نصاب ۲۰ مثقال یا دینار سونا اور ۲۰۰ درہم چاندی۔ اوپر ۱:۱۰ کی نسبت ذہن میں رکھیں اور ۲۰ مثقال سونا = ۲۰۰ درہم چاندی۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۱) معاذ بن جبل، حضرت معاذ بن جبل (بن عمرو بن اوس بن عائذ بن عدی بن کعب بن عمرو بن ادی بن سعد اخی
=

فرمایا:

”کہ تمہارا سابقہ اہلِ کتاب (یہود) سے پڑے گا، تم اول ان کو شہادتین ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ کی تلقین کرنا اور جب وہ قبول کرلیں تو پانچ وقت کی نماز کی فرضیت کی تلقین کرنا اور جب وہ اس کو بھی تسلیم کرلیں تب ان سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال پر ”زکوٰۃ“ بھی فرض کی ہے (زکوٰۃ کیوں فرض ہے اور اس کی کیا حکمت و مصلحت ہے) تو ان کو بتلانا کہ اس لیے کہ:

تؤخذ من أغنيائهم فترد إلى فقرائهم.(۱)

ترجمہ: ان کے اہلِ ثروت سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر تقسیم کردی جائے گی۔

سلمة بن سعد) انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ والدہ محترمہ حضرت ہند بنت سہل قبیلہ جہینہ سے تھیں۔ آپ کے ایک بھائی حضرت عبد اللہ بن الجد بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بدر میں شرکت کی سعادت پائی۔ دو بیٹے تھے ایک کا نام عبد الرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا اسی لیے آپ کنیت ابو عبد الرحمٰن رکھتے تھے۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا عامل (گورنر) اور معلم بنا کر بھیجا اور پاپیادہ چل کر مدینہ منورہ کے باہر چھوڑ کر آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال تک آپ یمن میں ہی رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں آپ شام، حمص میں گورنر، معلم اور مشیر رہے۔ آپ نے ۱۸ھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں عمواس کی وبا (جس سے اسلام کی بہت سی اعلیٰ وارفع نشانیاں چھپ گئیں) میں تقریباً تمام اہل خانہ کے ساتھ ۳۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ نہایت حسین و جمیل، باصلاحیت اور کریم النفس انسان تھے اس لیے اکثر مقروض رہتے تھے، ایک بار گھر کا سارا اثاثہ نیلام کر کے قرضہ اتارا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أعلم أمتي بالحلال والحرام معاذ بن جبل.

ترجمہ: میری امت میں حلال و حرام کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: الإصابة، نمبر ۸۰۳۳۹، اسد الغابة: ۳۷۶/۴، طبقات ابن سعد: ۴۳۷/۳، ۴۴۳)

(۱) بخاری ج ۱ کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکاۃ

یہ پر از حکمت جملہ مبارک دراصل ''زکوٰۃ'' کی حقیقت کا ترجمان ہے اور جانِ حکمت بن کر اعلان کرتا ہے کہ صاحبِ ثروت و دولت کو ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ دولت تنہا اس کی اپنی ملکیت ہے اس لیے یہ خدا کا فضل ہے جس کے لیے اس کو منتخب کیا گیا لہٰذا اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اس حقیقتِ حال کو کبھی فراموش نہ کرے ''جو جس قدر کماتا ہے اسی قدر اس پر اجتماعی حقوق کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔''

سرمایہ دار کی نفسیات قارون کے حوالہ سے:

اور جو اس حقیقت کا منکر ہو کر غرور اور تکبر سے یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کی اپنی محنت کی کمائی عطاءِ الٰہی نہیں بلکہ اس کی عقل و محنت کا ثمرہ ہے تو وہ خدائے برتر کی دی ہوئی نعمت کا کفران کرتا ہے اور اس طرح تاریخِ ماضی سے آنکھیں بند کر کے گویا خدا کے عذاب و عتاب کو چیلنج کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کا واقعہ تاریخ کی نگاہ میں کل کا واقعہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی قوم نے جب قارون جیسے سرمایہ دار (Capitalist) کو اس کا یہی فرض زکوٰۃ یاد دلایا تو اس نے نہایت غرور و تمکنت سے اس کے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

﴿إِنَّ قَـٰرُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَءَاتَيْنَـٰهُ مِنَ ٱلْكُنُوزِ مَآ إِنَّ مَفَاتِحَهُۥ لَتَنُوٓأُ بِٱلْعُصْبَةِ أُو۟لِى ٱلْقُوَّةِ﴾ [1]

ترجمہ: قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پس وہ ان کے مقابلہ میں اترانے اور شرارت کرنے لگا۔ بات یہ تھی کہ ہم نے اس کو دولت کے اتنے خزانے بخشے تھے کہ اس کے نقل و حمل سے طاقتور مزدور بھی تھک جاتے تھے (یا اس کی کنجیوں کے نقل و حمل سے بھی مزدور تھک جاتے

---

(۱) سورۃ القصص (۲۸): ۷۶

تھے۔)

قارون کی قوم نے خدا کی نعمتیں یاد دلاتے اور فساد و تکبر سے بچنے کی نصیحت کرتے ہوئے قارون سے جب یہ کہا:

﴿إِذْ قَالَ لَهُۥ قَوْمُهُۥ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَٱبْتَغِ فِيمَآ ءَاتَىٰكَ ٱللَّهُ ٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ ٱلدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَآ أَحْسَنَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ ٱلْفَسَادَ فِى ٱلْأَرْضِ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾﴾ (۱)

ترجمہ: جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ شیخی نہ کر، بلاشبہ: اللہ تعالیٰ شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے تجھ کو اس کے ذریعہ سے آخرت کا سامان کر اور اس کو نہ بھول کہ دنیا میں تجھے کیا کچھ ملا ہوا ہے اور لوگوں کے ساتھ اسی طرح بھلائی کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر بھلائی کے دروازے کھول دیئے ہیں اور زمین میں فساد کا خواہش مند نہ بن اللہ تعالیٰ مفسدوں کو ناپسند کرتا ہے۔

تو قارون نے جواب دیا:

﴿قَالَ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ۚ﴾ (۲)

ترجمہ: یہ مال تو مجھ کو میرے اس ہنر کی بدولت ملا ہے جس کا میں واقف کار ہوں (یعنی میری سرمایہ داری میری قابلیت و ہنر مندی کا نتیجہ ہے) نہ کہ خدا کا عطیہ، اس صورت میں میں دوسروں کو اس میں شریک نہیں کر سکتا۔

قارون کی قوم اور قارون کے سوال و جواب کے بعد اللہ تعالیٰ نے غافل، سرکش

(۱) سورۃ القصص (۲۸): ۷۶، ۷۷

(۲) سورۃ القصص (۲۸): ۷۸

اور مغرور انسان کو اس کے زعم باطل پر زجر و توبیخ کرتے ہوئے حکیمانہ انداز میں کتاب کائنات کے ان صفحات کی جانب پرزور توجہ دلائی ہے جن پر اقوام ماضی کے مغرور سرکش اور صاحبِ ثروت و قوت، اقوام و افراد کے نتائج بد منقوش و مکتوب ہیں، اور جو بلاشبہ صاحبِ بصیرت کے لیے صد ہزار سرمایۂ عبرت و موعظت ہیں، چنانچہ وہ اسلوبِ حکیم اعجازِ بلاغت و فصاحت اور علی الاطلاق قاہرانہ قدرت کے ساتھ کہتا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا﴾ (۱)

ترجمہ: کیا اس کے علم میں یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ ایسی کتنی ہی جماعتیں تباہ کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت والی اور سرمایہ دار تھیں۔

اور جب اس نے اس عبرت اور بصیرت پر بھی کان نہ دھرا اور صفحاتِ عالم کے ان ابھرے ہوئے نقوش ماضی سے بھی سبق حاصل نہ کیا تو آخر کار سنت اللہ کے ہمہ گیر قانون گرفت نے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو اگلوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔

﴿فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ﴿٨١﴾﴾ (۲)

ترجمہ: پس ہم نے اس کو اور اس کے خانۂ دولت کو تہ زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی جماعت اس کی مدد کے لیے سامنے نہ آئی جو اللہ کے مقابلہ میں ہوتی اور نہ وہ خود مدد لا سکا یعنی خدا کا انقلابی ہاتھ جب ایسے سرمایہ

---

(۱) سورۃ القصص (۲۸): ۷۸

(۲) سورۃ القصص (۲۸): ۸۱

داروں کو ہلاک کرتا ہے تو پھر کوئی نصرت ومدد ان کو بچا نہیں سکتی۔

زکاۃ وصدقات کی ادائیگی کا اہم فرض:

اسی طرح ادائے صدقات وزکوٰۃ کے اہم "فرض" اور نظامِ معاشی کے اس بنیادی اصول سے غفلت برتنے والوں کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے سورہ برأت میں سخت وعید کا اعلان سنایا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مال ناحق کھاتے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بناتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سوان کو خوشخبری سنادے دردناک عذاب کی۔

صحیح حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں کو بہت شاق گزرا اور انہوں نے خیال کیا کہ شاید ضرورت کے لیے معمولی پس انداز کرنا بھی اس کے تحت میں آتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس کام کو میں انجام دوں گا اور اس مشکل کو میں حل کروں گا، چنانچہ انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صرف اس لیے فرض کیا ہے کہ تمہارے باقی مال کو زکوٰۃ کے ذریعہ پاک کر دے یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ اجتماعی حقوق ادا کرنے کے بعد اس کے پاس اپنی ضرورت کے لیے جو پس انداز ہو وہ بھی "کنز" میں داخل ہے، حضرت عمر رضی اللہ

(۱) سورۃ التوبۃ (۹):۳٤

تعالیٰ عنہ نے جب زبان مبارک سے یہ سنا تو بہت مسرور ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔"[۱]

یہاں ادائے فرض کا نام "انفاق فی سبیل اللہ" رکھا اور اس سے غفلت برتنے والے دولت مند کی دولت کو "کنز" بتلا کر متنبہ فرمایا کہ یہی وہ سرمایہ داری ہے جو اسلام میں قابلِ لعنت ہے، اور خدا کی عام مخلوق میں اقتصادی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ آخر انسان ثروت و دولت کے نشہ میں اس درجہ کیوں غافل ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے کہ اس نے اپنی عقل و محنت سے ہی اگر دولت کمائی ہے تب بھی انسانوں کے باہمی تعاون و مواسات سے ہی کمائی ہے، ورنہ تو بغیر دوسرے انسانوں کے تعاون و اشتراک کے اس کو تجارت یا صنعت و حرفت وغیرہ میں کامیابی ناممکن تھی۔

پس کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ اگر ان ہی انسانوں میں بعض انسان مرض، اعضا کی کمزوری، ضعفِ پیری یا دوسرے نامساعد اسباب کی بنا پر افلاس اور احتیاج تک پہنچ جائیں تو یہ ان کی مدد کرے اور ان کے مال میں ان کا حصہ محض تبرع اور احسان کے طور پر نہ ہو بلکہ فرض کی حیثیت میں ہو۔ زکوٰۃ مسلمانوں کو اقتصادی جدوجہد میں فلاح و بہبود کی راہ دکھلاتی ہے۔ اس اصول کی تشریح یہ ہے کہ جو کاہلی اور دونِ ہمتی کی بنا پر بیکاری کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور تھوڑی بہت پونجی رکھنے کے باوجود ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کے خوگر ہیں، یہ اجتماعی ٹیکس ان کے لیے مہمیز کا کام دے اور وہ یہ سوچیں کہ ہمارا یہ مال جس کو قدرت نے نشوونما کی صلاحیت دی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دو چار سال میں ذاتی ضروریات اور "زکوٰۃ" کی نذر ہو کر رہ جائے بمصداق حدیث:

الید العلیا خیر من الید السفلی.[۲]

---

(۱) ابوداؤد: السنن، ج ۱، کتاب الزکوۃ

(۲) صحیح الامام البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسئلۃ بحوالہ ریاض الصالحین، باب القناعۃ ...... ذم السوال

=

مصنف رحمہ اللہ نے جس حدیث کا یہ ایک حصہ نقل کیا ہے، وہ حدیث بہت سی مفید معاشی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ جس کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے افراد کو محنت، جد وجہد، غیرت مندی اور عزتِ نفس کا درس دیتے ہیں۔ آئیے یہاں پوری حدیث پڑھ لیتے ہیں:

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ (وعن حکیم بن حزام رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ) ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الید العلیا خیر من الید السفلی، وابدا بمن تعول وخیر الصدقۃ ما کان ظھر غنی ومن یستعفف یعفہ اللّٰہ، ومن یستغن یغنہ اللّٰہ. (رواہ بخاری و مسلم. یہ الفاظ بخاری رحمہ اللہ کے ہیں، حوالہ اوپر درج ہے)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں) سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

❶ اوپر والا (یعنی دینے والا) ہاتھ نیچے والے (یعنی سوال کر کے لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

❷ اور (جب صدقہ یا خرچ کرنا چاہو تو) اس سے شروع کرو جس کا نان نفقہ تمہارے ذمہ ہو۔

❸ اور بہتر صدیقہ وہ ہے جو تونگری چھوڑ کر دیا جائے (یعنی دینے والا خود قلاش نہ ہو کر رہ جائے) (اور پھر تنگدست ہو کر لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا پھرے یہ ہدایت دنیوی امور میں خرچ کرنے کے لیے ہے)۔

❹ اور جو کوئی (سوال کرنے سے) پاکدامنی اختیار کرے گا، اللہ کریم اسے پاک دامن بنائیں گے (یعنی سوال کرنے سے بچائیں گے)

❺ اور جو کوئی استغناء (مخلوق سے بے پرواہی) اختیار کرنا چاہے گا، اللہ کریم اسے تونگر بنا دیں گے۔

دیکھئے یہ حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کتنی ہی اہم عملی تعلیمات کا خزینہ ہے۔

❶ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے میں ایک طرف اگر گداگری کی حوصلہ شکنی اور خود کار کمانے کی ترغیب سے وہاں حقیقی سائل کی مدد کرنے والے کی حوصلہ افزائی بھی ہے کہ وہ اپنا ہاتھ اونچا یعنی عطا کرنے والا رکھے گویا بہتر معاشی حالت کو مستقل (Consistant) رکھنے کا درس ہے۔

❷ صدقہ اور صرف (Consumption) کرتے وقت ترجیح (Priorty) ان افراد پر خرچ کو دے جن کی کفالت (Maintenance) اس کے فرائض میں شامل ہے مثلاً اہل خانہ اور ذوی الفروض پھر ذوالارحام پھر ہمسایہ پھر اہل محلہ اور پھر آگے درجہ بدرجہ۔

❸ بہتر صدقہ وہ ہے جو تونگری چھوڑ جائے یعنی صدقہ دینے والا صدقہ دے کر بعد میں خود خوش حال رہے۔ محتاج نہ بن جائے کہ خود سائل بن کر ننگ انسانیت ہو جائے بلکہ اپنے پاس اتنا رکھے کہ خود بھی محتاج بن کر دوسروں پر بوجھ نہ بن جائے بلکہ اوروں کا بوجھ بانٹنے والا بنا رہے۔ یہاں خرچ اور آمدن میں توازن (Balance) کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

البتہ اللہ کریم کی رضا، اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کو زوال سے بچانے کے لیے سارا مال بھی خرچ کرنا پڑے تو یہ نہ صرف قابل ستائش بلکہ دینی مالی فریضہ (Religeo- Financial Obligation) بھی ہے جیسے حضرت

ترجمہ: (دینے والے کا) ہاتھ بلند (لینے والے) کے پست ہاتھ سے بہتر ہے۔

دوسری طرح ہمیں بھی ایک روز غیر کا دست نگر نہ بننا پڑے، یہ سوچ کر وہ آگے بڑھیں اور ترقی مال کے لیے جائز سعی کریں اور اس طرح ہر شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بن جائے، یہاں تک کہ یہ اجتماعی ٹیکس ایک روز ''رفاہِ عام'' ہی کی ضروریات کے لیے رہ جاتے اور ہر جگہ دینے والے ہاتھ ہی باقی رہ جائیں اور مانگنے والا ہاتھ ایک بھی نہ رہے۔

زکاۃ کے مصالح:

فرضیتِ زکوٰۃ میں اسلام نے کن مصالح کا لحاظ رکھا ہے، فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] اس کے متلق ارشاد فرماتے ہیں:

''واضح رہے کہ زکوٰۃ میں دو مصلحتوں کی رعایت پیشِ نظر رکھی گئی ہے ① تہذیب نفس ② مدنی و اجتماعی حاجات کا انسداد، تہذیبِ نفس سے مراد یہ ہے کہ ''مال'' بخل، خود غرضی، جنسی عداوت، جنسی بداخلاقیاں پیدا کرتا ہے اور ان بداخلاقیوں کے انسداد کا بہترین علاج ''انفاق'' یعنی حسبۃً للہ صرفِ مال اور سخاوت

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کیا کرتے تھے کیونکہ یہاں تو

ع زوال بندہ مومن کا بے زری میں نہیں

والا معاملہ ہے۔

④، ⑤ جو شخص سوال کی ذلت سے دامن بچانا چاہے اللہ کریم اس کے دامن کی لاج رکھیں گے اور جو استغناء (یعنی مخلوق سے بے نیازی) اختیار کرنا چاہے، اللہ کریم اسے غنی کر دیں گے میں پھر محنت کر کے کمانے کی اہمیت اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ دراصل اسلام وقار والے (اللہ کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا باوقار طریقہ زندگی اور طرزِ معاش ہے، یہاں محنت کی عظمت تو ہے بے کار رہ کر محتاج بننے اور دوسروں کے اموال پر پلنے کی امید رکھ کر جینے کی عزت نہیں بلکہ اپنے معاشی وسائل کا موزوں استعمال (Optimum use of Economic Resources) کر کے غنی بننے اور بوقت ضرورت اسلام اور امت مسلمہ کے کام آنے کو مومن کی شان قلندری کہا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ۱ کے حاشیہ میں درج ہے۔

ہے اس سے بخل کا خاتمہ ہو جاتا ہے، خود غرضی مٹ جاتی ہے اور عداوتِ جنسی کی بجائے جنسی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی جنسی محبت ان تمام اخلاق کریمانہ کی اساس و بنیاد ہے جو انسان کو حسنِ معاملات کا خوگر بناتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "انسان" اخلاقِ حسنہ کا پیکر بن جاتا ہے اور اسی کا نام تہذیب نفس ہے اور زکوٰۃ مدنی و اجتماعی حاجات کے انسداد کا بہترین علاج ہے، اس لیے کہ نظامِ مدنی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس نظام میں مضبوط "مالی نظام" موجود نہ ہو تا کہ اس کے ذریعے سے مدنی نظام کے اعلیٰ ادنیٰ اعمال اور رعایا "پبلک" کے مناسبِ حال حاجات و ضروریات کو پورا کیا جا سکے، نیز فقراء مساکین ضعفاء، یتامیٰ، بیوگان اور اسی قسم کے دیگر حاجت مند دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ذلیل و رسوا ہونے سے محفوظ رہیں اور حکومت ان کی پوری کفالت کر سکے اور یہ تمام مشترک ذمہ داریاں اس طرح پوری ہو سکتی ہیں کہ منجملہ دیگر ذرائع آمدنی کے حکومت کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ اہل سرمایہ سے وصولِ زکوٰۃ کی شکل میں حاصل ہو۔"

اموالِ زکاۃ:

یہی وجہ ہے کہ فطرت و عقل سلیم کے تقاضہ کے مطابق اسلام نے اس ٹیکس کو چار اصناف میں تقسیم کیا ہے۔

❶ اس مال سے "زکوٰۃ" لی جائے جس میں نمو اور ترقی کی استعداد ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں: (الف) وہ جانور جو چراگاہوں میں اضافہ نسل کے لیے پالے جا رہے ہوں (ب) زراعت (ج) تجارت۔

❷ ان اشخاص سے لی جائے جو شریعت کی نگاہ میں اہل سرمایہ شمار ہوتے ہیں، جن کو قرآن عزیز میں "اَلَّذِیْنَ یکنزون الذھب والفضۃ" کہہ کر پکارا گیا ہے (یعنی نقد چاندی یا سونا رکھنے والے)۔

❸ ان اموال میں لی جائے جو لوگوں کو بغیر محنت و تعب کے آسانی سے حاصل ہو گئے ہوں جیسے خزانے کی دریافت یا جواہرات کی دریافت میں وہ اپنا مقررہ حصہ پائیں۔

④ اہلِ صنعت و حرفت کی صنعت و حرفت پر مقرر کی جائے۔

پھر اسلام نے موسمی حالات، اتفاقی حادثات، عام معاشی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے لیے ایک مدت معین کی،(۱) مقدار معین (۲) کی، نیز ضروریات و حاجات عامہ کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا۔

اس تفصیل سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام نے اپنے اس فریضہ میں مدنی و اجتماعی اور اقتصادی حالات کی بہتری کا کس قدر خیال رکھا ہے، بلکہ اس کی بنیاد ہی صرف دو امور پر قائم کی ہے انفرادی تہذیبِ نفس اور اجتماعی اقتصادی فلاح و بہبود۔ (۳)

زکاۃ کا فریضہ اسلام کا امتیازی نشان:

دنیا کے تمام مذاہب، ابناءِ جنس کی خدمت اور حاجت مندوں کی اعانت کی ترغیب و تعلیم دیتے ہیں لیکن یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے محض تلقین و تعلیم ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک سالانہ ٹیکس کا آئین قائم کر دیا جو اس ضرورت کو پورا کرے اور اس کو اس درجہ اہم قرار دیا کہ نماز کے بعد اس کا ہی درجہ رکھا گیا اور قرآنِ عزیز میں دونوں کو ایک ہی فہرست میں گنا کر اس کو بھی ایمان کی علامت قرار دیا۔

﴿ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝٢ ٱلَّذِينَ يُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ ﴾ (۴)

ترجمہ: ہدایت اور بشارت کا پیغام ہے ان کے لیے جو مومن ہیں کہ جن کے ایمان کی علامت یہ ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

---

(۱) حولانِ حول، یعنی ایک سال پورا ہو جانا ضروری ہے تاکہ مختلف موسموں اور حوادثات کے گزر جانے کے بعد جو آمدنی ہو اس پر زکوٰۃ لی جائے اور یہی انصاف کا تقاضہ ہے۔

(۲) چاندی ۵۲½ تولہ اور سونا ۷½ تولہ، گویا اسلام کی نگاہ میں اس قدر مختصر پونجی رکھنے والا بھی سرمایہ دار ہے۔

(۳) شاہ ولی اللہ: حجۃ البالغہ، ج ۲، مختصرا ابواب الزکاۃ

(۴) سورۃ النمل (۲۷): ۲، ۳

اسی لیے، مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عظیم الشان مجمع میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ فرمایا تھا اور جمہور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس پر صاد کیا تھا:

واللہ لأقاتلن من فرّق بین الصلوۃ والزکوۃ۔ [1]

ترجمہ: بخدا میں ضرور ان سے جہاد کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کر رہے ہیں یعنی نماز تو پڑھتے ہیں مگر زکوٰۃ دینے پر آمادہ نہیں۔

نیز اس بارے میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فرضیتِ زکوٰۃ کی عِلّت کو ان صاف الفاظ میں بیان کر کے

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ [2]

ترجمہ: تاکہ یہ نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں کے گروہ ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔

یہ بھی بتا دیا کہ اس کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ دولت سب میں تقسیم ہوتی رہے اور کسی ایک گروہ کی اجارہ داری میں ہو کر ہی نہ رہ جائے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت کے لیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب میں اپنے نامۂ مبارک میں اس حقیقت کو آشکارا فرمایا ہے:

تؤخذ من أغنیائهم فترد إلی فقرآئهم۔ [3]

ترجمہ: (زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ) ان کے مالداروں سے وصول کی جائے اور ان کے محتاجوں پر تقسیم کر دی جائے۔

---

(۱) صحیح بخاری، ج ۱، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ

(۲) سورۃ الحشر: ۷

(۳) متفق علیه، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ. ریاض الصالحین، باب تاکید وجوب الزکاۃ الخ

زکاۃ اور انکم ٹیکس:

غرض اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "زکوٰۃ" عام خیرات کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ سرکاری "انکم ٹیکس" کی طرح ایک "ٹیکس" ہے جو موجودہ ٹیکسوں سے کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے یعنی وہ صرف کاروبار کی آمدنی کی کمی و بیشی ہی پر واجب نہیں ہوتا بلکہ اس اندوختہ پر بھی واجب ہوتا ہے جس پر سالِ موجودہ میں کسی آمدنی کا اضافہ تک نہ ہوا ہو، اور اس قسم کی تمام چیزوں پر عائد ہوتا ہے جن میں (نمو) بڑھنے کی استعداد موجود ہو۔

بہرحال زکوٰۃ اجتماعی نظام کا ایک خاص اور اہم مالی جزء ہے اسی لیے اس کے وصول کرنے کا حقیقی اور اصولی طریقہ حکومت کے نظم و انتظام کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے وصول کا معاملہ حکومت کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، حکومت اپنے گورنروں اور تحصیلداروں کے ذریعہ سے اس کو وصول کرے اور بیت المال میں داخل کر کے اس کے صحیح مصارف کے مواقع میں خرچ کرے۔

ظالم حکمران اور زکاۃ کی ادائیگی:

عن إبن عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: إدفعوا الزكوة إلى الأُمراء. فقال له رجل: أنّهم لا يضعونها مواضعها. فقال: و إن. ابن عمر قال: ما أقاموا الصلوة فأدفعوها إليهم۔[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ زکوٰۃ امراء کو ادا کرو۔ ایک شخص نے کہا کہ امراء و خلفاء تو اس کو صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے۔ آپ نے جواب دیا: اس کے باوجود بھی ادا کرو، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جب تک خلفاء نماز

---

(۱) ابن ابی شیبہ عبداللہ بن محمد: مصنف ج ۲ کتاب الزکاۃ، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی، بیہقی. ابوعبید: کتاب الاموال، باب ۸۲، نمبر ۱۷۸۳، ۱۷۹۰، ۱۸۰۳

ادا کرتے رہیں تم انہی کو زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

ابو صالح [1] کہتے ہیں میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری، عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے پوچھا کہ یہ حاکم جو بے عنوانیاں کر رہے ہیں آپ کے پیشِ نظر ہیں کیا اس حالت میں بھی ہم انہی کو زکاۃ ادا کریں؟ سب نے متفقہ آواز سے کہا کہ ضرور ان ہی کو ادا کرو (اس لیے کہ اجتماعی زندگی کے لیے یہی از بس ضروری ہے)۔ [2]

اور امام حدیث وفقہ ابوبکر جصاص [3] حنفی احکام القرآن میں مصارفِ زکوٰۃ کی

(۱) ابو صالح، ابو صالح رحمہ اللہ کنیت کے مدینہ منورہ کے نو (۹) موالی طبقہ (آزاد شدہ غلام) کے تابعین کرام رحمہم اللہ گزرے ہیں یعنی ابو صالح السمان، ابو صالح باذام، ابو صالح سمیع، ابو صالح مولی عثمان، ابو صالح غفاری، ابو صالح میسرۃ، ابو صالح مولی ضباعۃ، ابو صالح مولی السفاح عبید اور ابو صالح مولی سعد بین رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ان میں سے پہلے تین ابو صالح کنیت کے بزرگوں سے حدیث روایت کی گئی ہے۔ لہٰذا ان کا تذکرہ درج ہے۔

ابو صالح السمان الزیات ذکوان رحمہ اللہ غطفان یا جویریۃ قبیلہ قیس کی خاتون کے آزاد کردہ غلام ابو صالح (یعنی ابو سہیل بن ابو صالح مدنی رحمہ اللہ) مراد ہیں۔ ان کی روایات مدینہ منورہ اور کوفہ کے علماء حدیث نے نقل کی ہیں، انہیں ثقہ اور کثیر الروایات عالم سمجھا گیا ہے۔ کوفہ سے مدینہ منورہ آکر رہائش کی سعادت پائی اور مدینہ منورہ میں ہی ۱۰۱ھ میں وفات پا کر آسودہ خاک ہو گئے۔

دوسرے ابو صالح باذام حضرت ام ہانی بنت ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم کے آزاد کردہ غلام تھے ان سے حضرت سماک، محمد بن سائب کلبی اور اسماعیل بن ابی خالد رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

تیسرے ابو صالح سمیع رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے احادیث نقل کی ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: طبقات ابن سعد رحمہ اللہ تعالیٰ، ج ۵، تذکرہ ابو صالح رحمہ اللہ تعالیٰ)

(۲) ابن ابی شیبہ عبداللہ بن محمد: مصنف، ج ۲، کتاب الزکاۃ، مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی. بیہقی حوالہ ابوعبید: کتاب الاموال، باب ۸۲ نمبر ۱۷۸۳، ۱۷۹۰، ۱۸۰۲

(۳) امام جصاص رحمہ اللہ، امام ابوبکر احمد بن علی (متوفی ۳۷۰ھ / ۹۸۱ء) مشہور محدث، فقیہ اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کا شمار فقہاء احناف کے اساطین میں ہوتا ہے۔ آپ کی کتب میں مشہور "احکام القرآن" ہے جو قرآن کریم کی فقہی انداز پر تفسیر ہے، یہ تفسیر ۱۳۵۵ھ / ۱۹۱۶ء میں استنبول (ترکی) سے شائع ہوئی۔ آپ کی کتاب "اصول جصاص" ـــــ جو اصول فقہ پر ہے ـــــ ۱۹۸۹ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

اس بحث میں "کہ جو صدقہ واجبہ ہے وہ امام ہی کے حوالے کیا جائے وہ غیر مسلم پر خرچ نہیں کیا جا سکتا ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فان قیل فزکوٰة المال لیس أخذها إلی الإمام ولا یجوز أن تعطی أهل الذمة. قیل أخذها فی الأصل إلی الإمام وقد کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یأخذها، وکذالك أبو بکر و عمر رضی اللّٰه تعالٰی عنهما. فلما کان عثمان قال للناس: ان هذا شهر زکاتکم فمن کان علیه دین فلیؤده ثم لیزك بقیة ماله. فجعل أرباب الأموال وکلاء له فی أدائها. ولم یسقط فی ذلك حق الإمام. ذلك حق الإمام فی أخذها. (۱)

ترجمہ: اور اگر یہ کہا جائے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰة پر امام کا یہ حق نہیں ہے کہ ضرور اس کے ہی حوالے کی جائے اور پھر اس کو ذمی (غیر مسلم معاہد) پر خرچ کرنا جائز نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل قانونِ شریعت میں اموالِ (باطنہ) کے لیے بھی یہی ضروری ہے کہ امام (خلیفہ) کو دی جائے اور اس کی وصول یابی امام ہی کا حق ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ برابر وصول فرماتے تھے، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے فرمایا: لوگو! یہ زکوٰة کا مہینہ ہے پس جس شخص پر تم میں سے قرض ہو پہلے وہ اس کو ادا کرے۔ اور اس کے بعد باقی مال کی زکوٰة ادا کرے۔ تو اس اعلان کی وجہ سے اصحابِ اموال، امام کی جانب سے ادائے زکوٰة میں وکیل قرار پائے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ اموال (باطنہ) پر امام کا یہ حق جاتا رہا کہ وہ خود وصول کرے۔

(۱) ابو بکر جصاص: احکام القرآن، ۲/۵۴

لہٰذا زکوٰۃ کا موجودہ طریقۂ اور طریقۂ وصول ان ہی مجبوریوں کی ایک کڑی ہے جو ''اسلامی نظام امارت'' کے فقدان سے پیدا ہوتی ہیں اور جس کا دفع کرنا ہر مسلمان کا دینی و مذہبی فریضہ ہے، اس لیے اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت کا وجود اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے ناممکن الحصول ہو گیا تھا تو یہ تو ہر وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا کہ وہ بیت المال کے قیام اور اجتماعی مذہبی امور کے انتظام کے لیے اپنا ایک امیر مقرر کر لیتے، مگر افسوس کہ ہندوستان میں یہ اسلامی فریضہ اس وقت شرمندہ معنی نہیں ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ افراد کی سخاوتیں اور ان کی فیاضیاں، وقتی طور پر کتنی ہی بیش از بیش کیوں نہ ہوں، امت اور قوم کے اجتماعی نظام کی تکمیل کو ہرگز پورا نہیں کر سکتیں، کیونکہ اگر سرمایہ دار اور مال دار افراد کے عطیات اور انجمنوں کے قیام و نظام سے اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا تو امریکہ اور یورپ میں کبھی کا حل ہو گیا ہوتا، جہاں دولت مندوں کی دولت کے بے شمار انبار ہیں اور جنہیں قومی نظام کے لیے انجمن سازی کا بہتر سے بہتر شعور ہے، مگر حقیقت سامنے ہے کہ ان کا قومی نظام اور قومی سرمایہ کسی طرح بھی پست و متوسط طبقوں کی بیکاری اور افلاس کا انسداد نہ کر سکا اور نہ عملی طور پر اس کا کوئی حل سوچ سکا۔

پس اس صورتِ حال کا اگر کوئی بہترین اور صحیح علاج ہو سکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کو اسلام نے تجویز کیا ہے کہ قانون کے ذریعے متمول افرادِ قوم کی پوری کمائی کا ایک معین حصہ کمزور اور پست افراد کی اجتماعی اور اقتصادی بہتری کے لیے مخصوص کر دیا، اسی کا نام ''زکوٰۃ'' ہے۔

صدقاتِ واجبہ (Obligatory Charities):

زکوٰۃ کے علاوہ ''صدقات'' کی اسلامی اصطلاح اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اسلام دولت مند کو زکوٰۃ لینے کے بعد بھی قومی و اجتماعی انفاق کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ انفاق کے لیے دوسری راہیں بھی کھولتا ہے اور

ان کو صدقات سے تعبیر کرتا ہے، صدقات کی یہ ذمہ داری دو حصوں پر تقسیم کی گئی ہے۔

صدقات کی دو نوع ہیں: ایک نافلہ دوسری واجبہ، پہلی نوع کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے کہ وہ حسبِ مرضی جس کارِ خیر میں چاہے حصہ لے، اور دوسری نوع پھر دو حصوں میں منقسم ہے، ایک انفرادی، یعنی کسی متمول فرد کا کسی حاجت مند کی روائی پر بذاتِ خود خرچ کرنا، مثلاً صدقۃ الفطر، غریب والدین کا نفقہ، غریب اولاد کا نفقہ پس اگر کوئی شخص اس انفرادی انفاق میں کوتاہی کرتا ہے تو امام کو حق حاصل ہے کہ اس کو اس انفاق کے لیے مجبور کرے، دوسرا اجتماعی یعنی زکوٰۃ کی طرح قوم کی اجتماعی اقتصادی حالت کی بہتری اور حاجت مندوں کی حاجت کے انسداد کے لیے بذریعہ حکومت خرچ کرنا، مثلاً جہاد اور رفاہِ عامہ کے اہم مواقع پر "زکوٰۃ عشر" اور خراج کے علاوہ اور اربابِ دولت و ثروت سے حسبِ تقاضا حقوقِ اجتماعی وصول کرنا۔

دولت و سرمایہ پر زکوٰۃ کے علاوہ حقوق واجبہ کا مطالبہ:

اس مقام پر یہ بحث بھی خاص اہمیت رکھتی ہے کہ زکوٰۃ، عشر اور خراج کے علاوہ بھی کیا مال پر مزید حقوقِ واجبہ ہیں؟ بعض علماء نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے، مگر یہ ان کے قلتِ فکر و تدبیر کا نتیجہ ہے اس لیے علمائے مُحققین کا مسلک یہ ہے کہ بلاشبہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حقوقِ واجبہ ہیں اور ان کا وجوب اس حد تک اہمیت پذیر ہے کہ اگر کوئی شخص ان حقوقِ واجبہ سے گریز کرے تو بلا تامل امام کو اس ادائے حقوق پر مجبور کر سکتا ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ کی وقیع رائے:

مغرب (اندلس) کے مشہور محدث و فقیہہ ابو محمد ابن حزم[1] نے کہ جن کو

(۱) ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ کے تعارف کے لیے دیکھیں اس کتاب کے باب ۲ کے حوالہ نمبر ۱۱ کے بعد حاشیہ میں درج ہے۔

بعض علماء نے قرن خامس کا مجدد کہا ہے، اس مسئلہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے بلکہ نفقاتِ نوافل و فرائض پر بحث کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں قرآنِ حکیم اور احادیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں اسلام کے معاشی نظام کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ موجودہ دورِ ترقی کے مقبول نظامہائے اقتصادی کے علمی دقیق مباحث سے قطع نظر ان کے عملی ثمرات و نتائج اور عملی پہلوؤں کے نقطہ ہائے نظر اس نقشہ سے بہتر معاشی حل پیش کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں۔

ابن حزم رحمہ اللہ نے دو ورق میں جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ اپنی تفصیل و تفسیر میں ضخیم جلدوں کا محتاج ہے تاہم اس مقام پر شرح و بسط سے گریز کرتے ہوئے حرف بحرف اس کا ترجمہ پیش کر دینا ہی کافی ہے کیونکہ اہلِ بصیرت اور دقیقہ رس حضرات کے لیے اس مختصر متن ہی میں "معاشی حل" کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے۔

اغنیاء پر معاشرہ کے محتاجوں کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت کی ذمہ داری:

ابن حزم اپنی شہرہ آفاق کتاب المحلی میں تحریر فرماتے ہیں:

(مسألة) قال أبو محمد و فرض على الأغنياء من أهل كل بلدأن يقوموا بفقرائهم ويجبرهم السلطان على ذلك إن لم تقم الزكوة بهم ولا فئ سائر اموال المسلمين بهم، فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذى لا بد منه ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك ويمسكن يكنّهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة

برهان ذلك قول الله تعالى ﴿وَءَاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ﴾ ﴿ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْجَارِ ٱلْجُنُبِ وَٱلصَّاحِبِ بِٱلْجَنۢبِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُكُمْ ۗ﴾

فأوجب الله تعالٰی حق المساکین وابن السبیل وما ملکت الیمین مع حق ذی القربی وافترض الاحسان إلی الأبوین وذی القربی والمساکین والجبار وما ملکت الیمین و الإحسان تقتضی کل ما ذکرنا ومنعه أساءة بلاشك الخ.

ترجمہ: اور ہر ایک شہر کے ارباب دولت پر فرض ہے کہ وہ فقراء اور حاجت مندوں کی حاجت رائی کا سامان کریں اور (اگر نہ کریں) تو ان کو اس ادائیگی پر خلیفہ اور امام مجبور کر سکتا ہے (مگر ایسا اس وقت کرنا پڑے گا) اور اگر زکوٰۃ اور فیٔ (اموال بیت المال) ان کی کفالت کے لیے کافی نہ ہوں۔

پس ایسی صورت میں ان کی ضروریات کی کفالت سے متعلق از بس ضروری ہے کہ بقاء حیات کے لیے خورد و نوش، گرمی اور سردی کے موسموں کے مناسب لباس، رہنے سہنے کے لیے ایسے مکان کا انتظام ہر فرد کے لیے مہیا کیا جائے، جو بارش، دھوپ تپش اور سیلاب جیسے حوادثات سے محفوظ رہ سکے۔ (یا آنے جانے والوں کی نگاہوں سے محفوظ (Privacy) رکھے)

اربابِ دولت پر اس فرض کے عائد ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ہے:

﴿ وَءَاتِ ذَا ٱلْقُرْبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلْمِسْكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ ﴾(۱)

ترجمہ: اور قرابت والوں کو اور مسکین اور مسافر کو ان کا حق دو۔

نیز اللہ کریم کا فرمان ہے اور اس کے لیے برہان ہے:

﴿وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَٰنًا وَبِذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ

(۱) سورۃ الاسراء (۱۷):۲۶

وَٱلْجَارِ ذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْجَارِ ٱلْجُنُبِ وَٱلصَّاحِبِ بِٱلْجَنۢبِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُكُمْ ﴾ [1]

ترجمہ: اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور قرابتی ہمسایوں اور اجنبی پڑوسیوں اور مسافروں اور ماتحتوں پر بھی احسان کرو۔

پس یہ آیات ہیں جن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دولت مندوں پر مساکین، مسافروں اور افرادِ ملک یمین (غلام اور ماتحت) کا حق واجب مقرر فرمایا ہے اور ساتھ ہی قرابت والوں کا حق بھی اور والدین کے اور اہلِ قرابت، مساکین ہمسایہ اور افراد ملک یمین کے ساتھ حسن سلوک کو فرض کیا اور احسان کا اولین تقاضا ان حقوق کی ادائیگی ہے۔ جن کو ہم نے ابھی خوراک لباس اور مکان کے سلسلہ میں بیان کیا ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو شخص ان حقوق کے ادائے فرض سے باز رہتا ہے وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

محتاجوں کی کفالت کی اہمیت:

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾﴾ [2]

ترجمہ: (اہل جنت دریافت کریں گے) تم کو جہنم تک کس عمل نے پہنچایا؟ تو جہنمی کہیں گے اس بات نے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین اور حاجت مند کی ضروریات خورد و نوش کو پورا نہیں کرتے تھے۔

(۱) سورۃ النساء (٤):٣٦

(۲) سورۃ المدثر (٧٤):٤٢

پس اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے مسکین کے خورد و نوش کی کفالت کو نماز کی وصیت کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ غایتِ صحت بہت سے طریقہ ہائے روایت سے یہ منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ [1]

ترجمہ: جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا۔

میں کہتا ہوں کہ جو شخص مالدار ہو اور وہ مسلمان بھائی کو بھوکا ننگا دیکھے اور اس کی مدد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس نے اس بھائی پر قطعاً رحم نہیں کیا اور یہ حدیث بہت پختہ ہے کیونکہ اس کو نافع بن جبیر [2] بن مطعم رحمہ اللہ اور قیس بن [3] ابی حازم رحمہ اللہ اور ابو ظبیان اور زید بن وہب رحمہ اللہ نے حضرت جریر [4] بن عبد اللہ (جلیل القدر صحابی) سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور زہری رحمہ اللہ [5] نے بھی اس مطلب کی حدیث ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ

---

(۱) امام بخاری، صحیح ج ۱۳ (جدید مصری ایڈیشن) نمبر ۲۰۳۔ صحیح مسلم (جدید مصری ایڈیشن) نمبر ۲۳۱۹۔ امام ترمذی: الجامع، ج ۱، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ الناس بحوالہ ریاض الصالحین، باب تعظیم حرمات المسلمین الخ

(۲) حضرت نافع بن جبیر بن مطعم القرشی الحجازی رحمہ اللہ عالی مرتبت تابعی ہیں۔ انہوں نے اپنے والد حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا اور ان سے امام زہری رحمہ اللہ نے روایت کیا۔ (الکمال فی اسماء الرجال، ترجمہ نافع بن جبیر رحمہ اللہ تعالیٰ)

(۳) حضرت قیس بن ابی حازم الاحمسی البجلی رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی نیت سے حاضر ہوئے مگر پتہ چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے بشمول عشرہ مبشرہ (سوائے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیا اور آپ سے بھی تابعین اور تبع تابعین کی بڑی تعداد نے روایت کیا۔ نہروان کی لڑائی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھے ۹۸ھ میں سو (۱۰۰) سے زیادہ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۴) حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات باب ۶ کے حاشیہ میں درج ہیں۔

(۵) زہری، محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہری رحمہ اللہ ۵۱ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ امام، حافظ الحدیث والقرآن، محدث اور فقیہہ تھے۔ آپ نے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی ترغیب

عنہ [۱] سے عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ [۲] کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

اور مجھ سے عبد الرحمٰن [۳] بن عبد اللہ بن خالد رحمہ اللہ نے بسلسلہ سند حضرت عبد الرحمٰن [۴] بن ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت کی ہے کہ

پر با قاعدہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کرنے کا مبارک کام شروع کیا۔ آپ علم حدیث میں منبع و مصدر کا درجہ رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ پھر شام چلے گئے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے اپنے تمام گورنروں کو لکھا کہ وہ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کا دینی امور میں اتباع کریں کیونکہ ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔ تقریباً تمام بڑے محدثین، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ سے روایت کیا ہے، جن میں بڑے بڑے فضلاء کے اسماء گرامی شامل ہیں مثلاً ابراہیم بن ولید اموی، ایوب سختیانی، ایوب بن موسیٰ، ربیعہ الرائی، رزیق بن حکیم، سفیان بن سعید ثوری، سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد، مالک بن انس، محمد بن اسحاق، معمر بن راشد، موسیٰ بن عقبہ، ہشیم بن بشیر، یزید بن یزید، یونس بن یزید رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ آپ نے ۱۲۳ھ میں گاؤں شغب (فلسطین اور حجاز کے درمیان) میں وفات پائی۔ (برائے تفصیل ملاحظہ ہو: مزی: تہذیب تاریخ ابن ابی خیثمه، الکامل فی التاریخ، ابن سعد: طبقات ج ۷ تاریخ النسوی علامہ زرکلی: الاعلام: ۳۱۷/۷)

(۱) ابو سلمہ، عبد اللہ ابن عبد الاسد بن ہلال بن عبد اللہ بن مخزوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد تھے، آپ نے شروع شروع میں اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر اور غزوہ احد دونوں میں شرکت کی سعادت پائی۔ غزوہ احد میں گہرا زخم کھایا جس کی بدولت ۳ھ میں وفات پائی۔ بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ (اسد الغابة: ۱۵۲/۶)

(۲) ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن ممتاز تابعی تھے۔ بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ سن ۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴ھ میں وفات پائی، ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ایک نوجوان ان کے ساتھ کتاب اٹھائے ہوئے ہوتا، اسے اپنے گھر لے جاتے اور اس سے احادیث املا کراتے۔ آپ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کرتے تھے۔ آپ کی روایت کردہ احادیث یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ نے نقل کی ہیں۔ (برائے تفصیل دیکھیں: مذی: تهذیب ۱۲: ۱۱۶. خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۲۱۸/۱. محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه، تذکرہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ)

(۳) حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن خالد رحمہ اللہ والدہ محترمہ کا نام ام الحکم تھا جو حضرت ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔

(۴) حضرت عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی ابن صحابی یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل صحابی کے سب سے بڑے صاحبزادے اور خود بھی صحابی تھے۔ یہ فضیلت صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ =

"اصحاب صفہ" حاجت مند لوگ تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلسلہ میں یہ ارشاد فرما دیا تھا: جس شخص کے یہاں دو آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ (ان میں سے کسی کو) تیسرا بنا کر شریک طعام کرے اور جس کے یہاں چار آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ پانچویں اور چھٹے کو شریکِ طعام کرے۔[1]

پس ہم اسی ارشاد کے حرف بحرف قائل ہیں۔

اور بطریق لیث[2] بن سعد رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المسلم اخو المسلم لایظلمه ولایسلمه.[3]

تعالیٰ عنہ اور ان کی اولاد کے حصہ میں آئی کہ ان کی چار پشتیں صحابی ہیں۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حقیقی بھائی تھے فتح مکہ مکرمہ کے وقت اسلام لائے۔ نہایت شجاع، جری اور ماہر تیر انداز تھے۔ جنگ یمامہ میں اللہ کریم نے مسلمانوں کو فتح انہی کی تیر اندازی کی وجہ سے دی۔ یزید کی بیعت سے انکار پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ چلے آئے۔ رات سوتے میں آپ کی روح پرواز کر گئی۔ یہ سن ۵۳ھ یا ۵۴ھ تھا۔

(۱) ترمذی الجامع، ابواب الاطعمة، باب ماجاء فی طعام الواحد یکفی الاثنین بحوالہ ریاض الصالحین، باب الایثار والمواساة

(۲) لیث بن سعد الفہمی رحمہ اللہ امام محدث، فقیہہ اور مفسر تھے۔ آپ کا شمار کبار فقہاء اسلام میں ہوتا ہے آپ ۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔ ایک بار آپ رحمہ اللہ سے ان کے عقیدت مندوں نے دریافت کیا، ہم آپ سے ایسی احادیث بھی سنتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں نہیں ہیں آپ نے فرمایا: کیا وہ تمام جو میرے سینہ میں ہے وہ میری کتابوں میں بھی ہو؟ اگر وہ سب کچھ جو میرے سینہ میں ہے وہ لکھ دوں یہ سواری اس کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ (مزی، تہذیب:۸/٤٦٤)

آپ سے آپ کے کاتب ابو صالح رحمہ اللہ کے سوا خالد مدائنی، ابو قتادہ الحرانی، قتیبہ بن سعد اور یحییٰ بن بکیر رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ (مزی، تہذیب:۸/ ٣٦٠، الکامل فی التاریخ:١/ ١.٢٢٢)

(۳) ریاض الصالحین، باب قضاء حوائج المسلمین. جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشفقة المسلم علی المسلم.

یہ اس جامع حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس میں مسلمانوں کے مسلمانوں پر حقوق کا ذکر ہے، علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی رحمہ اللہ نے اس کا ایک ٹکڑا نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے جبکہ تمام حدیث ہی کفالت مسلمان کے اہم موضوع پر روشنی ڈالتی ہے، آیئے ہم پوری حدیث پڑھتے ہیں اور اس فرمودہ مضامین کو بھی ذہن نشین

ترجمہ: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس لیے چاہیے کہ نہ مسلمان، مسلمان پر ظلم کرے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

ابو محمد (ابن حزم) کہتا ہے کہ اگر ایک شخص ننگا بھوکا ہے اور دوسرا شخص اس کو کھلانے پہنانے پر قادر ہے اور پھر اسی حالت میں اس کو چھوڑتا ہے تو بلاشبہ اس نے حدیث کے فرمان ''لا یسلمه'' کی خلاف ورزی کی اور اس کو بے مدد چھوڑ دیا۔

ضرورت سے زائد مال پر محتاج کا حق:

مجھ سے عبداللہ بن یوسف رحمہ اللہ نے بہ سلسلہ سند حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ حدیث بیان کی ہے:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان معه فضل

کرتے ہیں:

عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلم أخو المسلم، لا يظلمه ولا يسلمه من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته، ومن فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے کسی ظالم کے سپرد (یعنی بے یار و مددگار) کرتا ہے (یہ اس لیے ضروری ہے کہ) جو کوئی اپنے (مسلمان) بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگے گا، اللہ کریم اس کی حاجت روائی کریں گے۔ (اسی طرح) جس کسی نے کسی مسلمان سے کوئی تنگی دور کی اللہ کریم اس کے بدلے قیامت کی تنگیوں میں سے تنگی دور فرمائیں گے، اور جس کسی نے مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ کریم اس کی (لغزشوں اور خطاؤں کی) پردہ پوشی فرمائیں گے۔

اس حدیث مبارکہ میں صرف دنیوی ہی نہیں اخروی حاجات پورے کرنے کا اللہ کریم نے ذریعہ دنیا میں اس کے کسی محتاج، پریشانی اور مجبور بندہ کے کام آنے کو بنایا ہے اور اس کی ستر پوشی کا حکم دے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کو سبق دے رہے ہیں کہ محتاج کی محتاجی دور کرتے وقت اس کی خطاؤں پر نظر نہ ہو بلکہ اس کی محتاجی کے دکھ پر نظر ہو، اسی لیے تو کریم کا وعدہ ہے:

والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه. (رواه مسلم، رياض الصالحين، باب قضاء حوائج)

اللہ کریم بندہ کی مدد و نصرت میں رہتے ہیں جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد و نصرت میں لگا رہتا ہے۔

ظهر فليعد به على من لا ظهر له، ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لازاد له. قال: فذكر من أصناف المال فاذكر حتى رأينا أنه لاحق لأحد من في فضل.[1]

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے پاس ضرورت سے فاضل سواری ہو اس کو چاہیے کہ جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو دے دے۔ اور جس کے پاس اپنی اصل حاجت سے زائد (زاد) خورد و نوش وغیرہ کا سامان ہو اس کو چاہیے کہ جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو دے دے۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اقسامِ اموال کو شمار کر کے اسی طرح فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ حاجت سے زائد مال پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے (بلکہ وہ جماعت کے ان دوسرے افراد کا حق ہے جو اس کے محتاج ہیں)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کا اجماع ہے جس کی اطلاع حضرت ابو سعید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) دے رہے ہیں، اور اس حدیث میں جو حکم ہے ہم اس کے حرف بحرف قائل ہیں، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

إطعموا الجائع وفكوا العانى.[2]

---

(۱) ابوداؤد، السنن، ج ۱، كتاب الزكاة، باب فی حقوق المال - رياض الصالحين، باب الايثار والمواسات

(۲) صحيح الامام البخارى، ج ۱، كتاب الجهاد، باب فكاك الأسير. رياض الصالحين، كتاب عيادة المريض. پوری حدیث اس طرح ہے:

عن ابى موسى رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عودوا المريض، واطعموا الجائع، وفكو العانى.

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (امت کو

ترجمہ: بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کو رہائی دلاؤ۔
غرض نصوصِ قرآنی اور احادیث صحیحہ اس بارے میں بکثرت موجود ہیں۔
اور عبد الرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ کے سلسلۂ سند سے ہم کو یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا:

لو أستقبلت من أمری ماأستدبرت لأخذت فضول أموال الأغنیاء فقسمتها علی فقرآء المهاجرین۔ (۱)

ترجمہ: جو بات مجھ کو بعد میں معلوم ہوئی اگر پہلے سے معلوم ہوتی تو میں دولت مندوں کی فاضل دولت کو ان سے لے کر فقراء مہاجرین پر تقسیم کر دیتا۔

اس روایت کی سند اپنی صحت اور وقعت کے لحاظ سے بہت رفیع المرتبہ ہے۔
(وهذا اسناد فی غایة الصحة و الجلالة)

اور سعید بن منصور رحمہ اللہ کے سلسلہ سند سے مجھ کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت پہنچی کہ وہ فرماتے تھے:

ان اللّٰه تعالٰی فرض علی الاغنیاء فی أموالهم بقدر ما یکفی فقراء هم. فإن جاءوا أوعرو أو جهدوا فبمنع الأغنیاء. وحق علی اللّٰه تعالٰی أن یحاسبهم یوم القیامة و یعذبهم علیه. (۲)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ دولت و ثروت پر اس قدر مال کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے جو ان کے فقراء اور حاجت مندوں کی حاجت کی کفایت کر سکے، پس اگر لوگ بھوکے اور ننگے اور تکالیف و شدائد میں

نصیحت کرتے ہوئے) فرمایا: مریض کی عیادت کرو، بھوکے کو کھانا کھلاؤ، اور قیدی کو رہا کرو (کراؤ)۔

(۱) ابن حزم: المحلی: ۱۶۷/۶

(۲) کذا فی الدر، طبرانی فی الاوسط، ابو بکر الشافعی فی الغیلانیات، مشکوة المصابیح، باب فضل الصدقة، فصل ثانی

مبتلا رہیں تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اصحابِ دولت نے اپنا فرض ادا نہیں کیا، اور اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ قیامت میں ان سے اس عدم ادائیگی فرض پر محاسبہ اور عذاب میں مبتلا کرے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے:

فی مالك حق سوی الزکوة [1]

ترجمہ: تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المؤمنین، حسن بن علی اور ابن عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے جب کوئی اس سلسلہ میں سوال کرتا تو فرماتے:

إن کنت تسال فی دم موجّع أو غرم مفظّع أو فقر مدقّع فقد وجب حقك. [2]

ترجمہ: اگر تو اس حالت میں سوال کرے کہ دردناک عذخون کا معاملہ ہے، یا ناقابلِ برداشت تاوان کا اور یا مہلک فقر و فاقہ کا معاملہ ہے تو اصحابِ دولت پر تیرا حق واجب اور فرض ہو گیا (جس کی اداء ان کے ذمہ لازم ہے)۔

---

(١) امام ترمذی: الجامع، ج١، ابواب الزکاۃ، ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃ عن فاطمۃ بنت قیس رضی اللّٰہ تعالٰی عنھا

(٢) اسی مفہوم کی حدیث امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے:

عن أنس رضی اللّٰہ تعالٰی عنه عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أنه قال: المسئلة لا تحل إلا لثلاثة: لذی فقر مدقع أو لذی غرم مفظع أو لذی دم موجع.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوال کرنا تین طرح کے اشخاص کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں: مہلک فقر و فاقہ والا یا ناقابل واپسی تاوان والا یا دردناک خون والا۔ (دیکھئے: الشوکانی رحمہ اللّٰہ تعالٰی: نیل الاوطار، ج ٤ ابواب الاصناف الثمانیۃ)

حضرت ابو عبید بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقاء تین سو صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے یہ بات صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ:

أنّ زادهم فنى، فأمرهم أبوعبيدة رضى الله تعالىٰ عنه فجمعوا أزدادهم فى مزوّدين وجعل يقوتهم ايّاها على السواء.[1]

ترجمہ: جب مجاہدین کی اس جماعت کے پاس کھانے پینے کا سامان قریب بہ ختم ہو گیا، تب حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جس قدر سامان خورد و نوش باقی ہے وہ سب میرے پاس لائے اور جب سب جمع ہو گیا تو بغیر لحاظ کمی بیشی اس کو سب پر یکساں تقسیم کر دیا (یعنی جن حضرات کے پاس بالکل نہیں رہا تھا اور جس کے پاس کم تھا اور جس کے پاس قدرے زائد تھا، ان سب کے درمیان مساوی تقسیم فرما دیا)۔

پس یہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اجماع ہے، جس کے خلاف ایک رائے بھی نہیں ہے۔

فرض زکاۃ کے علاوہ فرد کے فاضل مال پر فقراء کے مالی حقوق:

اور مشہور تابعین شعبی، مجاہد طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ[2] وغیرہ سے منقول ہے کہ وہ باتفاق اس کے قائل تھے کہ "فى المال حق سوى الزكوة" مال میں زکوٰۃ کے

---

(۱) متفق علیه، بخاری ج ۵، نمبر ۹۳. مسلم حدیث نمبر ۲۵۰۰

(۲) طاؤس، ابو عبد الرحمٰن طاؤس بن کیسان الیمانی رحمہ اللہ بہت بڑے فقیہ، محدث اور امام تھے۔ عابد، زاہد اور متقی انسان تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے: "إنى لأظن طاؤس من اهل الجنة" میرا گمان ہے کہ طاؤس رحمہ اللہ جنت والوں میں شامل ہوں گے۔ آپ کے پاس ایک کتاب ہوتی تھی، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ تھیں۔ آپ کی روایت کردہ احادیث لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ آپ نے ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ (برائے تفصیل دیکھیں: مزی: تهذيب: ۳۷۱/٤، ابن ابی خيثمه: تاريخ. محمد مصطفى الاعظمى: دراسات فى الحديث النبوى وتاريخ تدوينه، تذكره طاؤس بن كيسان رحمه الله تعالىٰ)

علاوہ بھی حقِ مفروض ہے۔

مخالف اور موافق روایات پر ابن حزم رحمہ اللہ کا عالمانہ تبصرہ:

❶ میں کہتا ہوں کہ ان حضرات اہل علم میں سے میں نے ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ [1] کے علاوہ کسی کو اس کا مخالف نہیں پایا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اور حقوقِ مال ہیں جو فرض و وجوب کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ تنہا ضحاک رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ فرضیتِ زکوٰۃ نے مال سے باقی حقوق واجبہ کو منسوخ کر دیا اور ضحاک رحمہ اللہ کی رائے تو کیا حجت ہوتی ان کی روایت بھی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس دلیل کے قائل ضحاک رحمہ اللہ خود دلیل کے خلاف اپنا مسلک رکھتے ہیں اور فرضیت زکوٰۃ کے علاوہ اس کے قائل ہیں کہ مالدار کے مال میں غریب والدین کا نفقہ، زوجہ کا نفقہ، غلام کا نفقہ، پالتو حیوان کی خورد و نوش اور قرض و تاوان کی ادا یہ سب حقوق و فرائض ہیں ان کی روایت اور رائے دونوں میں تناقض و تضاد پایا جاتا ہے۔

❷ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کے سلسلۂ سند سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے تم یہ نقل کرتے ہو کہ انہوں نے فرمایا:

من أدى زكوة ماله فليس عليه جناح أن لا يتصدق. [2]

ترجمہ: جس شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو اس پر گناہ نہیں ہے اگر وہ صدقہ خیرات نہ کرے۔

❸ اور اسی طرح تم نے بطریق حکم [3] حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ

---

(۱) ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ محدث، فقیہہ اور امام تھے۔ آپ نے قرآن حکیم کی ایک تفسیر بھی لکھی۔ اسی طرح آپ نے مناسک حج پر ایک کتاب لکھی۔ آپ رحمہ اللہ کی احادیث حسین بن عقیل رحمہ اللہ نے نقل کی تھیں۔ آپ نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی السنن، ج ۱، باب ما أدى زكاته فليس بكنز میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی مفہوم کی حدیث نقل کی ہے: "إذا أديت زكاة مالك فقد قضيت ما عليك" (جب تو نے اپنے مال کی زکاۃ ادا کر دی تو اس کے بعد تو (ان مال فرائض سے) بری ہو گیا جو تجھ پر (فرض) تھا)۔

(۳) ❶ حکم، الحکم بن عتیبہ رحمہ اللہ تابعی ہیں۔ آپ محدث اور فقیہ تھے۔ آپ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵ھ =

روایت کیا ہے کہ ﴿"وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ"﴾ کا حکم عشر اور نصف عشر کے حکم سے منسوخ ہو گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری روایت کو جس کو مقسم [1] نے روایت کیا ہے ساقط الاعتبار اور ضعیف ہے اور اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہمارے خلاف نہیں ہے (کیونکہ آیت میں حقِ واجب کا ذکر نہیں ہے نقل کا تذکرہ ہے)۔

❹ اور پہلی روایت جس کو عکرمہ رحمہ اللہ [2] نے روایت کیا ہے اس کا مطلب تو صاف طور پر یہ ہے کہ اس شخص پر مستحب و نفل صدقہ و خیرات لازم نہیں ہے۔

میں وفات پائی۔ آپ کی روایات کو امام شعبہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

❷ الحکم بن مقسم رحمہ اللہ ایک دوسرے تابعی بھی ہیں، جنہوں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔

(۱) مقسم بن بجرہ رحمہ اللہ نامور تابعی ہیں۔ آپ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بالخصوص اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بالعموم روایت کیا ہے آپ سے محدث الحکم رحمہ اللہ اور عثمان المشاہد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے آپ نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔ (مزی: تہذیب، ۲۸۹/۱۰. محمد مصطفی الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینه، تذکره مقسم بن بجره رحمه الله تعالیٰ)

(۲) عکرمہ مولی ابن عباس رحمہ اللہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے کبار تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہمانے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ قرآن مجید کی تفسیر میں آپ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تمام طلبہ سے فائق تھے۔ مغیرہ رحمہ اللہ نے ایک بار حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے دریافت کیا: کیا کوئی آپ سے بھی بڑا عالم ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! عکرمہ مولی ابن عباس رحمہ اللہ۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: عکرمہ رحمہ اللہ سے بڑھ کر آج کتاب اللہ کا کوئی عالم نہیں۔ ایک بار ابو صالح رازی رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ عکرمہ رحمہ اللہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ میں سے علم تفسیر کا کون بڑا عالم ہے؟ تو انہوں نے کہا: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے تمام اصحاب علم تفسیر میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کے محتاج ہیں۔ آپ کے شاگردوں کی جماعت مشرق سے مغرب تک پائی جاتی ہے۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے بصرہ، کوفہ، یمن، مغرب اور دیگر بہت سے شہروں کا سفر کیا۔

آپ کی احادیث کے راویوں میں حضرت ایوب سختیانی، جابر بن زید، حسین بن زید، سلمہ بن وہرام، عبد الملک بن عبد العزیز، عثمان بن غیاث، عمرو بن عبد اللہ بن اسوار الیمانی رحمہم اللہ تعالیٰ اور اہل یمن اور مشرق کے اہل علم کی بہت بڑی تعداد شامل ہے آپ نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: مزی: تہذیب، ۲۷۱/۷. ابن سعد: طبقات، ۲۱۲/۵. ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ص ۹۶ - تہذیب: ۶۱/۸)

لیکن نادار کی کفالت کا حق تو حقِ واجب اور اس کے ذمہ قرض ہے۔ صدقۂ نافلہ نہیں ہے۔

اگر کوئی ظالم سرمایہ دار یا وڈیرہ محتاج کا حق کفالت دبالے تو محتاج کیا کرے؟

اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ علماء کہتے ہیں جو شخص پیاسا ہو اور پیاس کی وجہ سے موت کا ڈر ہو تو اس پر فرض ہے کہ جس جگہ اور جس طرح سے پانی مل سکے پانی حاصل کر لے اگرچہ اس جدوجہد میں قتال کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے، تو اب فرمائیے کہ یہ فرق کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو موت سے بچنے کے لیے پیاس بجھانے پر قتال تک کی اجازت دی جائے اور اسی شخص کو بھوک یا عریانی سے پیدا شدہ موت کے خوف سے بچنے کے لیے قتال کی ممانعت کر دی جائے، یہ بات تو اجماع کے خلاف قرآن و سنت اور قیاس سب ہی کے خلاف ہے (اور اگر قتال کی اجازت دی جائے تو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ اصل اصحاب مال کے مال پر یہ حق واجب تھا، جس کو حاجت مند شخص زبردستی حاصل کرنے کا مجاز ہے)۔

❷ میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس مثلاً اپنی حاجتِ اصلیہ سے زائد خورد و نوش کا سامان موجود ہے اور دوسرا شخص بھوک سے اس درجہ مضطرب ہے کہ موت طاری ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اس مضطر کو مردار یا خنزیر کھانا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کا حق ہے کہ زبردستی اس پر قبضہ کر کے بقدرِ حاجت استعمال کرے، خواہ وہ مال مسلمان کا ہو یا ذمی (غیر مسلم معاہد) کا اور یہ اس لیے کہ صاحبِ طعام پر فرض ہے کہ وہ بھوکے کو کھانا کھلائے، لہٰذا ایسی صورت میں اس حاجت مند کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خنزیر یا مردار کھانے پر مضطر ہو چکا ہے۔

بہرحال حاجت مند کے لیے درست ہے کہ وہ اس مال دار سے لڑ کر زبردستی ضرورت کی مقدار مال پر قبضہ کر لے، پس اگر اس نے قبضہ کر لیا تو سرمایہ دار مارنے

والے پر قصاص آئے گا اور اگر سرمایہ دار اس آویزش سے مار اگیا تو "الی لعنة اللّٰه" (اللہ تعالیٰ کے پھٹکار کو پہنچا) اس لیے کہ اس نے اس حق کو ادا کرنے سے انکار کیا جو اس کے ذمہ فرض تھا اور اس صورت میں اس مالدار شخص کا حکم "طائفہ باغیہ" (باغی گروہ) کا حکم ہے، چنانچہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنۢ بَغَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا عَلَى ٱلۡأُخۡرَىٰ فَقَٰتِلُواْ ٱلَّتِي تَبۡغِي حَتَّىٰ تَفِيٓءَ إِلَىٰٓ أَمۡرِ ٱللَّهِۚ﴾ [۱]

ترجمہ: اور اگر مسلمانوں میں سے ایک فریق دوسرے پر بغاوت کرے تو باغی فریق سے اس وقت تک جنگ کرتے رہو کہ وہ خدا کے حکم کی وفا پر آجائے۔

اور ظاہر ہے کہ صاحب حق کے مقابلے میں حق و فرض کا منکر باغی ہے، یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے مقابلہ میں جہاد کیا۔ و باللہ التوفیق [۲]

محلی کی اس عبارت کا بغور مطالعہ کیجئے اور پھر فیصلہ فرمائیے کہ اجتماعی نظام اقتصادی کی فلاح و سعادت کے لیے اسلام نے جن بنیادی حقوق کا اعلان کیا ہے اور نظام عمل میں جس طرح اس کی تشکیل کی ہے، عام بدحالی کے انسداد، طبقاتی جنگ کے سدباب اور رفاہیت عام کے لیے قیام کے لیے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور رفاہیتِ عمومی (Social Welfare) کے مدعی نظامہائے معاشی نے فلسفیانہ دلائل و نظریات کی روشنی میں جو حل تجویز کیا ہے، اسلام کا معاشی نظام کیا اس پر اس لیے برتری نہیں رکھتا کہ اس کے پیش کردہ حل میں نہ طبقاتی جنگ کے وجود پذیر ہونے کا اندیشہ ہے اور نہ دولت و غربت کے درمیان موجودہ تصادم کی صورت منصہ شہود پر آسکتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الحجرات (۴۹): ۹

(۲) ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ: المحلی، ۶/۱۵۶، ۱۵۹

قانون وراثت:

مذموم سرمایہ داری اور "اکتناز" کی ایک بدترین شکل یہ ہے کہ دولت ایک جگہ جمع ہوتی رہے اور مرنے کے بعد بھی وہ ورثاء میں تقسیم نہ ہو بلکہ "اسٹیٹ" کی شکل میں ایک ہی جگہ محفوظ رہے، موجودہ زمانہ کے تعلقے اور ریاستیں اگر ورثاء میں تقسیم ہوتی رہتیں تو آج ایک تعلقہ بھی تعلقہ اور ایک ریاست بھی ریاست نظر نہ آتی بلکہ تقسیم ہو ہو کر دولت کے یہ خزانے ہزاروں، لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسانوں کے درمیان چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح نظر آتے۔

"اسٹیٹ"[1] اور تعلقہ کا یہ مذموم طریقہ جو سرمایہ داری کی اصل جڑ ہے اسلام

---

(۱) اس جگہ "اسٹیٹ" سے مراد خلافت (حکومت) نہیں ہے بلکہ تعلقہ داری یا زمینداری کی وہ سب سے اونچی شکل مراد ہے جو بااختیار حکومت کے ماتحت صرف اس لیے قائم ہے کہ اس کا رئیس بے روک ٹوک عیش پسند زندگی بسر کرے اور رعایا کی جان و مال کو اپنی ملکیت سمجھے اور اپنی ہر قسم کی مادی طاقت کو بالا طاقت کے لیے آلہ کار بنانے میں مجبور و مقہور ہو اور مرنے کے بعد اسلامی وراثت کے خلاف کسی ایک فرد خاندان کو تمام دولت کا مالک بنانے میں حکومتِ بالادست کے قانون یا خود ساختہ قانون کی رو سے مجبور ہو۔

(غالباً حضرت مصنف رحمہ اللہ جو یہاں اسٹیٹ (State) کا لفظ یا نام استعمال فرمایا ہے اس کی ان کی مراد ایمپائر (Empire) ہے "اسٹیٹ" سے جو انہوں نے مراد لیا ہے وہ سو فیصد وہی ہے جو ایمپائر (Empire) کی صورت میں قائم ہوتا ہے۔ دراصل ایک ملک کے اندر بڑی بڑی ایمپائرز وہاں قائم ہوتی رہتی ہیں جہاں یا تو حکومت نام کی کوئی چیز نہ ہو یا ہو تو سہی مگر کمزور ہو یا اس حکومت یا ملک کی بنیاد ہی ایسی ایمپائرز کے مالکان کے مفاد پر ہو یا ان مالکان کے سہارے پر قائم ہو۔ ایسے مالکان بڑے زمیندار (Land Lords) جاگیردار (Feudalists) بڑے بڑے کاروباری وڈیرے (Business Magnates)، دنیوی وجاہت والے بڑے گدی نشین اور قبائلی سردار (Tribal Chieftains) ہوتے ہیں، یہی مالکان تمام حکومتی اداروں —— بشمول قانون ساز اسمبلی اور کاروبارِ حکومت وغیرہ —— پر قابض ہوتے ہیں۔ تمام ملک کے غریب شہری —— جو عموماً ۸۰، ۹۰ فیصد ہوتے ہیں —— وہ ان کی رعایا اور ان کے دست نگر ہوتے ہیں۔ ایسے ممالک جہاں ایسا معاشی طریقہ کار رائج ہو وہاں ملک کے باسی دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں، ایک حصہ میں دولت کی ریل پیل اور اقتدار اپنے تمام حسین رنگوں کے ساتھ رقص کناں تو دوسری مفلسی و محتاجی کا دیو پابہ جولاں۔ ایسے معاشی رواجوں میں غریب کی عزت سربازار لٹتی رہتی ہے اور داد رس یا قانون اس کی ہمدردی میں حرکت میں نہیں آتا، وڈیرہ اس کی محتاجی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کی آبرو سے کھیلتا ہے، اسے غلام بنا کر رکھتا ہے اور اس کی انسانیت پائمال کرتا رہتا ہے اس کا معاشی استحصال کرتا ہے، اس کے تمام ذرائع پیدائش اور دولت پر قابض رہتا ہے۔

=

سے پہلے بھی دوسری قوموں میں رائج تھا، اور آج بھی دنیا کے اکثر حصوں میں رائج ہے اس لیے اسلام کے انقلابی پیغام نے دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اصلاح کا فیصلہ کیا اور اس قدیم طریقہ کو اقتصادی تباہی کا پیش خیمہ بتایا اور اس کو مٹا کر اس کی جگہ ''قانونِ وراثت'' کو قائم کیا۔

اسلام نے جب اس سسٹم کا اعلان کیا تو سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اس کے خلاف یہ نعرہ بلند کیا کہ اگر ''اسٹیٹ'' یا تعلقہ میں تقسیم وراثت کا یہ نظام جاری کر دیا جائے تو اس سے دولت و ثروت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑی بڑی جائیدادیں تقسیم ہو کر چند کھیتوں کی صورت میں باقی رہ جائیں گی۔

اس وقت اگر ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ اسلام کا منشاء ہی یہ ہے کہ سرمایہ داری کا یہ نظام اس صورت میں باقی نہ رہے اور دولت تقسیم ہونے کے بجائے ''کنز'' بن کر مخصوص طبقہ میں محدود نہ ہو جائے تو دنیا کے لیے عجیب حیرت زا یا مضحکہ خیز معاملہ بن جاتا اور اس کو ظلم سے تعبیر کیا جاتا، لیکن زمانہ آیا کہ تقسیم دولت کے اس قانون کو رحمت سمجھا جانے لگا اور غیر مسلم اقوام نے بھی اس کو قانونی حیثیت دینے کی سعی

یہاں غریبوں کی غالب اکثریت (Over Whelming Majority) اپنی مرضی سے نہ اپنے عقیدہ کا دفاع کر سکتی ہے اور نہ اپنی رائے کا اظہار۔ اگر پاکستان میں ایسے معاشی رواج کا منحوس سایہ (Vicious Shadow) دیکھنا ہو تو بلوچستان کے قبائلی سرداروں کے زیر اثر علاقہ، سندھ کے مخدوموں اور وڈیروں اور پنجاب میں ملتان کے مخدوموں اور ڈیرہ غازی خاں میں بلوچ سرداروں کے علاقوں میں جا کر ملاحظہ کریں۔

حضرت مصنف رحمہ اللہ نے تو آج سے ۷۳، ۸۰ سال قبل ایک بدیشی غاصب برطانوی حکومت کے دور میں برصغیر پاک و ہند میں اس کے پروردہ (Adopted) اسٹیٹ مالکان یا ''ایمپائر'' قابضان کا ذکر کیا ہے وہ بدیشی غاصب انگریز چلا گیا مگر اس کے پروردہ یہ استحصالی گروہ جو زمینداروں، سرداروں، مخدوموں، میاؤں (Mians) اور سرمایہ داروں کے روپ میں ہے ـــــ آج بھی قائم ہے اور ملک کے معاشی وسائل پر قابض ہو کر غریبوں کی غالب اکثریت کا معاشی استحصال کر رہا ہے۔ ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تیری منتظر روزِ مکافات

شروع کر دی اور اب عقل و نقل (Wisdom & Narration) دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ دولت تقسیم کے لیے ہے، جمع کے لیے نہیں۔ بہرحال اسلام نے اس سلسلے میں تمام اقوام سے الگ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا اور قانونِ وراثت کے ذریعہ تقسیمِ دولت کی راہ کھول دی۔ (قرآن مجید میں ارشاد باری ہے):

❶ ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝٧﴾ (۱)

ترجمہ: مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ دیں اور عورتوں کا بھی اس (مال) میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑدیں تھوڑا ہو یا بہت اس میں (خدا کا) مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

❷ ﴿ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝١١﴾ (۲)

ترجمہ: تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے (ان کے متعلق) تم نہیں جانتے کہ تمہارے لیے ان میں سے کون نفع پہنچانے کے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو پابند کر دیا کہ اس کے دنیا سے رخصت ہونے والے اپنے اس دنیا میں زندہ رہنے والوں کو اپنا اندوختہ مال وراثت میں چھوڑیں اور وہ مال اس کے ورثاء میں شریعت اسلامی کی روشنی میں تقسیم ہو کر ارتکاز اور اکتناز دولت کا ذریعہ نہ بنے بلکہ منصفانہ تقسیم کا راستہ ہموار کرے)۔

عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ

(۱) سورۃ النساء (٤) ۷

(۲) سورۃ النساء (٤): ۱۱

وسلم قال: اقسموا المال بين اهل الفرائض على كتاب الله.[1]

(۱) صحیح مسلم (اور ابوداؤد)، کتاب الفرائض، باب الحقوا الفرائض بأهلها.

اس حدیث مبارکہ میں جن "اهل الفرائض" (مقررہ حق والوں) کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی ترتیب تقسیمِ وراثت میں مندرجہ ذیل طریقہ پر ہوگی۔

1. سب سے پہلے میت کے ترکہ سے اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات لیے جائیں گے۔
2. اس کے بعد اگر اس میت کے ذمہ کسی کا قرض واجب الادا ہے تو وہ لیا جائے گا اگر قرض خواہ زیادہ ہوں تو سارے قرض کا مجموعہ نکالا جائے گا۔
3. پھر اگر میت نے اللہ کریم کی رضا کی خاطر اپنے مال میں سے کچھ وصیت (Bequest) کی ہے جو ایک تہائی مال سے زیادہ نہ ہو —— سے منہا کیا جائے گا۔
4. مذکورہ بالا ادائیگیوں (Payments) کے بعد جو مال بچ جائے گا وہ ورثاء (Heirs) میں ان کے مقررہ شرعی حصص کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

ورثاء کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:

(الف) ذوالفروض یعنی بیوی (اگر میت خاوند ہو) یا خاوند (اگر میت بیوی ہو)، والدین، اولاد (بیٹے بیٹیاں)

(ب) ذوالارحام (اگر ذوالفروض میں سے کوئی زندہ نہ ہو یا مفقود الخبر ہو یعنی اس کی موجودگی کی ایک زمانہ تک خبر ہی نہ ہو تو) حصہ دار ہوں گے ذوالارحام بھائیوں اور بہنوں پر مشتمل ہیں۔

(ج) اگر اللہ کریم نہ کرے، ذوالفروض اور ذوالارحام میں سے کوئی نہ ہو تو پھر دور کے (Remoter) رشتہ دار یعنی چچا، ماموں، پھوپھیاں، خالائیں، چچیرے بھائی، ماموں زاد وغیرہم۔ البتہ یہ یاد رہے کہ قاتل وارث نہیں بن سکتا، نہ کافر مسلمان کا، نہ مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہمارے لیے سند اور باعث کامیابی ہیں۔

1. عن أسامه بن زيد رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم. (متفق عليه، بخاری، كتاب الفرائض، باب لا يرث المسلم الكافر. مسلم: كتاب الفرائض)

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے نہ کافر مسلمان کا وارث ہوتا ہے۔

2. عن ابى هريره رضى الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه سلم: القاتل لا يرث. (جامع الترمذى، باب ماجاء فى ابطال ميراث القاتل. ابن ماجه، كتاب الفرائض)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قتل کرنے والا وارث نہیں ہوتا۔

لہٰذا اسلام کے اقتصادی نظام کی رو سے میت کی وراثت کی تقسیم کی مساوات یوں بنے گی۔

مساوات تقسیم وراثت: مجموعی وراثت —— کفن و دفن کے اخراجات —— قرض —— وصیت —— ورثاء =

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما راوی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت میں ''تقسیمِ دولت'' کا جو طریقہ ہے وہ ایسا معتدل اور مدبرانہ ہے کہ اگر صحیح طور پر اس کو اختیار کیا جائے اور سوسائٹی میں اس کا رواج عام ہو جائے تو نہ اس سے سرمایہ دارانہ دولت کے پیدا ہونے کا امکان باقی رہتا ہے کہ جس سے تعلقہ اور ''اسٹیٹ'' بنتے ہیں اور نہ افراد و اشخاص کے درمیان افلاس و فاقہ کشی (Poverty & Hunger) کو فروغ ہو سکتا ہے۔

کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس سے دولت کے سامان ہر وقت گردش میں رہتے ہیں اور ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں پہنچتے رہنے کی وجہ سے کم و بیش ہر ایک فرد کو فائدہ بخشتے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تقسیم وراثت پر تبصرہ:

مفکر اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ [1] نے اس مسئلہ پر نہایت مفصل اور لطیف مقالہ حجۃ اللہ البالغہ میں ''الفرائض'' کے عنوان سے لکھا ہے جو قابل مراجعت ہے۔ اس مقالہ کی تمہید کے چند جملوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''غور کرو! بلاشبہ عقل و ہمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان یہ ''طریقہ'' لازمی اور ضروری ہونا چاہیے کہ اہلِ قبیلہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور دردمندی و بہی خواہی کا ثبوت دیں اور ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا ذاتی نفع و نقصان سمجھیں اور یہ بات ایسی خلقت اور جبلت (Instinct) کے بغیر ناممکن ہے جس کی پشت پر اس کو مضبوط بنانے کے لیے خارجی اسباب اور اس کو محفوظ رکھنے کے لیے

کا مقررہ شرعی حصہ۔ (ورثاء کی ترتیب انہی مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ہوگی)

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعارف باب ۱ کے حاشیہ میں درج ہے۔

سنتِ متوارثہ موجود ہو۔

جبلت ــــ یہاں جبلت تو اس علاقہ کا نام ہے جو باپ اور بیٹے یا مثلاً بھائی بھائی کے درمیان موجود ہے اور اسی طرح وہ چند عزیزوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

اور اسباب خارجی، باہمی الفت و موادت، رہنمائی، غمگساری و ہمدردی وغیرہ کا نام ہے، کیونکہ یہ امور آپس میں محبت پیدا کرتے ہیں اور مصائب و آلام میں ایک دوسرے کی اعانت و نصرت کے لیے بہادر بناتے ہیں۔

سنت ــــ اور سنت ان امور کو کہتے ہیں جن کو شریعت کی زبان لوگوں میں رشتۂ اخوت پیدا کرنے کے لیے ضروری قرار دیتی ہے اور اس کے نہ کرنے پر قابلِ ملامت ٹھہراتی ہے، مثلاً وہ حکم دیتی ہے کہ صلہ رحمی ضروری اور فرض ہے اور ایسا نہ کرنے والا آثم اور گنہگار ہے، مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض انسانی طبائع برے خیالات اور بیہودہ افکار کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور صلۂ رحمی جیسے عمدہ اوصاف کے خلاف بغاوت کرتی ہیں تو بہت سے غیر ضروری کام کرنے پر آمادہ رہتی ہیں۔

تو ایسی حالت میں ایک بات کی ضرورت ہوئی کہ اس قسم کے (اخلاقی) امور کو ضروری قرار دیا جائے اور لوگوں کے قبول و انکار سے بالا تر ہو کر ان پر لازم کر دیا جائے، مثلاً عیادتِ مریض، مصیبت زدہ (مقروض اسیر وغیرہ) کی گلو خلاصی، دیت (اقرباء پر پڑے ہوئے تاوان کی ادائیگی) اپنے ذی رحم محرم کی غلامی سے نجات دلانا وغیرہ اور اس قسم کی معاونت و نصرت کا سب سے زیادہ استحقاق اس وقت ہو جاتا ہے جب انسان موت کے کنارے کھڑا ہو اور مال سے بے پرواہ ہو جائے اس لیے کہ ایسے وقت میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مال کو اپنے

ذاتی معاشرتی اور منزلی مفید کاموں پر زیادہ سے زیادہ صرف کرے اور یا
پھر اپنی موت کے بعد اپنے اقرباء کے لیے چھوڑ جائے اور اس طرح ان
کی اعانت و مدد کرے۔ بہرحال تقسیمِ دولت کا یہ ایک بہترین طریقہ
ہے۔"(۱)

موجودہ مسلمانوں کی حالت زار:

لیکن اسلام کے عادلانہ قانون کے خلاف خود مسلمانوں کی کیا روش ہے اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو مسلم تعلقہ داروں اور ریاست کے نوابوں کے اس مظہر کو دیکھئے جبکہ وہ عدالتوں میں کھڑے ہو کر بے محابا اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم کو قرآنِ عزیز کے بتائے ہوئے قانونِ وراثت کی ضرورت نہیں ہے، ہم تو اپنے املاک کے فیصلے رسم و رواج کے اصولوں پر کرانا چاہتے ہیں، یعنی انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانینِ تحفظ ریاست اور ہندوؤں کے قانون "عدم توریثِ ریاست" کو مانتے ہیں، اور "العیاذ باللہ" اسلام کے قانون توریثِ وراثت کو تسلیم کرنے سے بیزار ہیں۔ پنجاب، بمبئی، گجرات اور مختلف صوبوں کی ان عدالتی شہادتوں کے ریکارڈ کو اگر مطالعہ کیجئے گا جن میں مذکورہ بالا مطالبہ موجود ہے تو بے اختیار کہنا پڑے گا کہ:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَـٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾ (۲)

ترجمہ: (ان یہود کی یہ خصلت ہے) یہ کتاب اللہ کے بعض حصوں پر تو
ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔

کا مظاہرہ اس سے بڑھ کرنا ممکن ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱدْخُلُوا۟ فِى ٱلسِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا۟ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَـٰنِ﴾ (۳)

---

(۱) شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، باب الفرائض، ص ۱۱۷

(۲) سورۃ البقرہ (۲): ۸۵

(۳) سورۃ البقرہ (۲): ۲۰۸

ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر چلنے کی سعی نہ کرو۔

خلاصۂ بحث:

انفرادی ملکیت کے بعض اور اہم جزئیات بھی ہیں جو اقتصادی نظام میں قابلِ غور ہیں مگر ہمارا مقصد تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہے بلکہ اصولی خاکہ پیش کرنا ہے اس لیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ اسلام نے ایک جانب تو انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا اور دوسری جانب اس میں ایسی شرائط و حدود لگا دیں کہ کسی وقت بھی یہ انفرادی ملکیت اجتماعی معیشت کے لیے باعثِ تباہی و بربادی نہ ہو سکے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ اس نے فطری اور نیچرل تفاوتِ مالی (Natural Financial Difference) کو انسانوں میں تسلیم تو کیا ہے، مگر سرمایہ داری کی اس زندگی کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جو سرمایہ کو مخصوص افراد یا گروہ میں جمع کر کے باقی عام مخلوقِ خدا کی اقتصادی تباہی کا باعث بنتی اور انسانوں کو انسانوں پر آقائی اور خداوندی کا حق دیتی ہے۔

وہ یہ تو جائز رکھتا ہے کہ آمدنی اور ذرائع آمدنی کے مختلف شعبوں میں اشخاص و افراد کو حقِ ملکیت حاصل ہو جائے، لیکن اس کو حرام قرار دیتا ہے کہ کوئی بھی انفرادیت کا شعبہ اجتماعی بدحالی کا سبب بن سکے گا، گویا وہ انسانوں کے لیے قدرِ مشترک کے طور پر ایک عادلانہ زندگی کا خواہاں ہے، نہ افراد کی راہ اس کو پسند ہے کہ سرمایہ داری فروغ پا جائے اور نہ تفریط کا راستہ اس کو بھاتا ہے کہ افراد کی ذاتی آمدنی و ذرائع پر بالکل ہی قفل ڈال دیئے جائیں۔

یا یہ کہہ دیجئے کہ اسلام اس فطری نظام (Natural System) کا حامی ہے جو ایسی

مساوات (Equation) تسلیم کرتا ہے جس میں تمام انسان بغیر کسی فرق کے اپنی معاشی زندگی میں بالکل مساوی ہوں اور ان کے درمیان "مالی درجات" (Financial Gradation) کا ادنی سا بھی تفاوت نہ پایا جاتا ہو اور نہ ایسے ظالمانہ تفاوت کا قائل ہے جس میں غربت و امارت کا امتیاز اس طرح قائم ہو جائے کہ غریب نانِ شبینہ کو محتاج ہو اور امیر دولتِ قارون کا مالک بن جائے۔



باب ــــــ ⑫

حصۂ دوم کے شعبے

اخلاقی معاشی ذمہ داریاں

تعارف:

اسلام کے معاشی نظام میں حکومت پر براہِ راست جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا ذکر صفحاتِ گزشتہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے، اب مختصر طور پر بعض ان ذمہ داریوں کا تذکرہ بھی کر دینا مناسب ہے جو نظامِ اسلامی میں قانون کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ترغیب و تلقین (Inducement & Advice) اور اخلاقی خطابت (Ethical Address) کے ذریعہ پبلک کو ان کی جانب توجہ دلائی جاتی اور یہ ذہنیت پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ افراد ملت میں سے ہر فرد کی زندگی جس طرح انفرادیت (Individuality) رکھتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس میں اجتماعیت (Collectivism & Society) کے فرد ہونے کی ذمہ داری عائد ہے اس لیے اس کو زندگی کے کسی ایک لمحہ میں بھی اپنی انفرادیت میں اس طرح گم نہ ہونا چاہیے کہ اجتماعیت کے فرد ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہیں وہ نذرِ تغافل ہو جائیں اور اس کی تمام مالی جد و جہد اور اس کی کامرانی جماعت کے افراد کی مالی ترقی کے لیے مفید و نافع ثابت ہو نہ کہ ضیق اور تنگی (Constraint & Narrowness) کا باعث۔

انفاق فی سبیل اللہ:

قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں ''انفاق فی سبیل اللہ

(Spending in the way of Allah) کا نام بخشا ہے۔

﴿وَأَنفِقُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ [1]

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

افرادِ ملت کے وہ تمام طریقے کہ جن سے ایک دوسرے کو کسی نہ کسی طرح مالی مدد مل سکتی ہے "انفاق" کی حدود میں شامل ہیں، چنانچہ یہ انفاق واجب بھی ہے جیسا کہ گزر چکا اور نفل (حقِ فاضل) (Right In Surplus) بھی ہے جو اس جگہ زیر بحث بھی ہے اور انفاق کی اس دوسری (قسم کو مزید دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے):

❶ پہلی قسم میں کسی حاجت مند کی مالی عطا (مدد) بھی انفاق کی ایک شکل ہے۔ (اس قسم کے انفاق کی فقہاء کرام اور مسلم معیشت دانوں نے یہ شکلیں تجویز کی ہیں:

(الف) صدقات نافلہ

(ب) وقف

(ج) وصیت

(د) ہبہ وغیرہا)

❷ (دوسری قسم میں) مالک بنائے بغیر منفعت کے خیال سے بے پرواہ اور یکسو ہو کر ضرورت مندوں کی مالی مدد کرنا بھی انفاق ہی کے شعبہ میں داخل (کیا گیا) ہے۔ اس قسم انفاق کی شکلیں یہ ہیں:

(الف) قرض حسنہ

(ب) عاریت

(ج) امانت وغیرہا۔

علم الاخلاق میں اس قسم کی اعانت و مدد کو "ایثار و قربانی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(ان تمام مذکورہ شکلوں کا تعارف آئندہ صفحات میں کرایا جارہا ہے)۔

---

(۱) القرآن الکریم، سورۃ البقرہ (۲): ۱۹۵

انفاق فی سبیل اللہ کی پہلی قسم کی صورتیں:

صدقاتِ نافلہ (Optional Charities):

اسلام کے معاشی نظام میں "انفرادی صدقات" (Individual Charities) کو بھی اہمیت حاصل ہے اور زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اسلام نے حاجت مندوں کی وقتی حاجت کے لیے انفرادی عطایا کو "عمل خیر" (Noble Deed) کہہ کر اس کے لیے ترغیب دی ہے اور دنیا و آخرت کے ثواب کو نعم البدل بتا کر قرآنِ عزیز اور احادیث نے اس کے متعلق جگہ جگہ برانگیختہ اور آمادہ کیا ہے (۱) اور چونکہ اس کا

---

(۱) یہاں ان کثیر تعداد میں آیات اور احادیث میں سے صرف چند نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ کریم نے اس اہم موضوع کو ترغیب و تہدید دونوں انداز میں اجاگر فرمایا اور انداز اتنا دلکش کہ روئیں روئیں کو برانگیختہ کر دینے والا۔ آپ بھی پڑھیے:

❶ ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَتۡلُونَ كِتَٰبَ ٱللَّهِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ سِرّٗا وَعَلَانِيَةٗ يَرۡجُونَ تِجَٰرَةٗ لَّن تَبُورَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمۡ أُجُورَهُمۡ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضۡلِهِۦٓۚ إِنَّهُۥ غَفُورٞ شَكُورٞ ﴿٣٠﴾ ﴾ (سورۃ فاطر (۳۵):)

ترجمہ: یقیناً وہ لوگ جو اللہ کریم کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں بطور رزق دے رکھا ہے، اس میں سے وہ کھلے چھپے خرچ کرتے ہیں، دراصل وہ ایسی تجارت کے طلب گار ہیں جس میں گھاٹے کا تو امکان ہی نہیں۔ ان کے ہی اعمال کا نتیجہ ہے کہ (اللہ کریم) انہیں پورا پورا بدلہ دے اور اپنی خصوصی مہربانی سے انہیں اس کے علاوہ مزید انعام سے بھی نوازے، یقیناً وہ (قادر کریم) خطاؤں کو بخش دینے والا، قدر شناس ہے۔

❷ ﴿ وَبَشِّرِ ٱلۡمُخۡبِتِينَ ﴿٣٤﴾ ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ ٱللَّهُ وَجِلَتۡ قُلُوبُهُمۡ وَٱلصَّٰبِرِينَ عَلَىٰ مَآ أَصَابَهُمۡ وَٱلۡمُقِيمِي ٱلصَّلَوٰةِ وَمِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾ ﴾ (سورۃ الحج (۲۲): ۳۴، ۳۵)

ترجمہ: اور سر افگندہ لوگوں کو خوشخبری دیجیے، وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کریم کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل فرطِ خشیت سے پھڑک اٹھتے ہیں، جو انہیں تکلیف پہنچتی ہے اس پر صبر کر لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے انہیں بطور رزق دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

❸ ﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمۡ عَنِ ٱلۡمَضَاجِعِ يَدۡعُونَ رَبَّهُمۡ خَوۡفٗا وَطَمَعٗا وَمِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ يُنفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٞ مَّآ أُخۡفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعۡيُنٖ جَزَآءَۢ بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴿١٧﴾ ﴾ (سورۃ السجدۃ (۳۲): ۱۶، ۱۷)

ترجمہ: ان (مخلص بندوں) کے پہلو (رات تہجد کے لیے) خواب گاہوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں وہ اپنے

پروردگار کو خوف اور امید کے ملے جلے جذبات سے پکارتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق کے طور پر دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ کوئی بھی اس راز کو نہیں جانتا کہ ایسے لوگوں کے لیے (پردہ غیب میں) آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پوشیدہ ہے ان کے اعمال کے بدلہ میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

ایسی خوش خبری دینے والے، اور وجدان پر گہرا اثر چھوڑنے والے ارشادات الٰہیہ کا اثر تھا جس نے مومنین کو ایسا بنادیا جس کی خبر قرآن نے دی۔

❹ ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (سورة الحشر (۵۹):۹)

ترجمہ: اور وہ (سچے مومنین اور مخلص بندے) تو ہیں ہی ایسے کہ اپنی ذات پر دوسرے (محتاجوں) کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود کتنی تنگدستی اور فاقہ کشی کا شکار ہوں۔

اب نمونہ کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سن لیجئے، اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کا اندازہ کرتے جائیے۔

❶ عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: انفق يا ابن آدم، ينفق عليك. (متفق عليه، رياض الصالحين، باب الكرم والجود والأنفاق الخ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے (انسان) (اللہ کریم کی راہ میں محتاجوں پر) خرچ کر (قدردانی کے طور پر) تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔

❷ عن إبن مسعود رضی الله تعالىٰ عنهما عن النبی صلى الله عليه وسلم قال: ولا حسد إلا فی اثنين: رجل آتاه الله مالا فسلطه على هلكته فی الحق، ورجل آتاه الله حكمة فهو يقضی بها ويعلمها. (متفق عليه، رياض الصالحين، حواله بالا)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: دو بندوں کے سوا کسی پر رشک کرنا نہیں چاہیے: ایک وہ جسے اللہ کریم نے مال عطا فرمایا پھر اسے حق کی راہ میں خرچ کرنے پر لگادیا، دوسرا وہ جسے اللہ کریم نے حکمت (دانائی) عطا فرمائی، پھر وہ اس دانائی سے فیصلہ کرے اور اسے آگے سکھائے بھی۔

❸ عن ابی هريرة رضی الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه سلم: ما من يوم يصبح العباد فيه إلا ملكان ينزلان فيقول أحدهما: أللهم إعط منفقا خلفا، ويقول الآخر: أللهم إعط ممسكا تلفا. (متفق عليه، رياض الصالحين، حواله بالا)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی دن صبح نہیں ہوئی مگر اس میں (آسمان سے) دو فرشتے نازل ہوتے ہیں: ان میں کا ایک کہتا ہے: اے اللہ کریم! (تیری راہ میں محتاجوں پر خرچ کرنے والے کو اور دے، دوسرا دعا کرتا ہے: اے اللہ کریم! روک رکھنے والے (بخیل) کو تباہی دے۔

❹ عن أبی أمامة صدی بن عجلان رضی الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه

تعلق انفرادی عطاء سے ہے اور یہ اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ (Good Actions) کی ایک کڑی ہے اس لیے اس میں دو اخلاقی خطرات کے پیش آجانے کا اندیشہ تھا:

❶ ایک یہ کہ معطی (Granter - Grantor) اپنی عطا کا احسان جتانے اور حاجت مند کو نادم اور شرم سار کر کے اس کو اذیت پہنچائے۔

❷ دوسرے یہ کہ اس کا یہ انفاق رضائے الٰہی اور غرباء کے لیے حاجت روائی کے لیے نہ ہو بلکہ دکھاوے اور نمائش کے لیے ہو، چنانچہ ان دونوں کے انسداد کے لیے نفس امارہ (Self inclined to evil) کی زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) اور انانیت و خودی (Selfness & Egotism) پر تہدید (Warning) کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُبۡطِلُواْ صَدَقَٰتِكُم بِٱلۡمَنِّ وَٱلۡأَذَىٰ كَٱلَّذِي يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۖ﴾ (۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات و خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر ضائع مت کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر یقین رکھتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔

اوقاف (Endowments):

انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی وسائل میں سے ایک بہترین وسیلہ (Best Mean)

وسلم: يا إبن آدم! إنك أن تبذل الفضل خير لك، وإن تمسكه شر لك، ولا تلام على كفاف، وابداء بمن تعول واليد العليا خير من اليد السفلى. (رواه مسلم، رياض الصالحين، حوالہ بالا)

ترجمہ: حضرت ابو امامہ صدی بن عجلان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے (یعنی انسان)! اگر تو ضرورت سے زائد مال (اللہ کریم کی راہ میں) خرچ کر دے تو بہتر ہے۔ اور اگر تو اسے روکے رکھے تو تیرے (دنیوی معاش اور آخرت دونوں کے) لیے برا ہے، البتہ بقدر ضرورت روک رکھنے میں حرج نہیں، اور (جب خرچ کرنے لگو تو) اس سے شروع کرو، جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہو۔ اور (یاد رکھو!) دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

(۱) سورة البقرہ (۲): ۲٦٤

وقف بھی ہے۔ اس لیے اسلام کے معاشی نظام نے اس کے اجراء اور توسیع کے لیے بہت زیادہ ترغیب دی ہے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے اس کو مستحکم اور مضبوط بنادیا ہے۔

اربابِ ثروت (The Rich) کی شبانہ روز زندگی کا یہ نقشہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک شخص اپنی پیدا کی ہوئی یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کو اگرچہ اپنی ضروریات سے فاضل سمجھتا ہے پھر بھی دولت کی محبت اور سرمایہ کی فراہمی کا عشق اکثر و بیشتر اس کو حاجت مندوں کی اعانت اور جماعت کے غریب افراد کی امداد کی جانب کسی طرح متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ لیکن جب اس کا آخری وقت آتا ہے اور وہ موت کے فولادی پنجہ (Steely Clutch) کی گرفت میں آکر مغلوب ہو جاتا ہے تو باحسرت و یاس اس دولت سے منہ موڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مگر اس صبح و شام پیش آنے والے منظر کے باوجود دولت میں سرشار دولت مندوں کو وقت سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں آتا اور یتامی، بیوگان اور دوسرے حاجت مندوں کی فریادیں اس کی ہوس کے مستحکم قلعوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اس لیے اسلام اہل ثروت کے اجتماعی حقوق سے تغافل کو دور کرنے اور جذبات عالیہ اور اخلاقِ حسنہ کی روح پیدا کرنے کے لیے توجہ دلاتا ہے کہ اہل ثروت کی فاضل دولت کو کارِ خیر میں صرف کرنے اور اجتماعی حیات کو فروغ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آنے سے قبل بحالتِ صحت و تندرستی اور بقاء ہوش و حواس اپنی دولت کا ایک حصہ ''صدقہ جاریہ'' (Continuous Charity) کر دے اسی کا نام ''وقف'' ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز میں اس قسم کے انفاق اور اجتماعی افادیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (۱)

---

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۹۲

ترجمہ: تم ہرگز خیر اور بھلائی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک (خدا کی راہ میں) اس چیز کو خرچ نہ کر دو جو تمہارے لیے سب سے پیاری اور محبوب ہے۔

اور داعئ انقلاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی تشریح اس طرح فرمائی:

عن ابی هریرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم، قال: إذا مات الإنسان إنقطع عنه عمله، إلا من ثلثة، صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له.[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے تمام عمل ختم ہو جاتے ہیں مگر تین مُستثنیٰ ہیں: ایک "صدقہ جاریہ" دوسرا "علم نافع" اور تیسرا "نیک اولاد" جو اس کے لیے ہر وقت دعا گو رہے۔[2]

---

(۱) مسلم، صحیح ج ۲ کتاب الوصیة، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته. نسائی: السنن، ج ۲، کتاب الوصایا، باب فضل الصدقة عن المیت

(۲) ایک دوسری حدیث میں نبی الرحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف بننے والے اموال و اشیاء اور جاری ثواب کا ذریعہ بننے والے اعمال و افعال کی فہرست میں اضافہ فرمایا تاکہ امت کے نیکو کاروں کو کوتاہ اعمال والوں کو زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کی خوشخبری اور حوصلہ و امید سے آس دلائی جائے۔

عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰه صلي اللّٰه عليه وسلم: أن مما يلحق المؤمن من عمله حسناته بعد موته: علما علمه ونشره، وولدا صالحا تركه، ومصحفا ورثه، أو مسجداً بناه أو بيتا لابن السبيل بناه، أو نهرا أكراه، أو صدقة أخرجها من ماله في صحة حياته تلحقه من بعد موته. (رواه ابن ماجه)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن بندہ کو موت کے بعد جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب ملتا رہتا ہے ان میں شامل ہیں:

❶ علم جو کسی کو سکھایا ہو اور اس کی اشاعت کی ہو۔

❷ صالح اولاد جسے وہ (تربیت کر کے) چھوڑ گیا ہو۔

❸ قرآن مجید جو میراث میں (پڑھ کر کتاب کی صورت میں یا اولاد کو پڑھا یا پڑھوا کر) چھوڑ گیا ہو۔

=

صدقۂ جاریہ کی جس قدر جزئیات علمائے اسلام نے شمار کرائی ہیں ان سب میں ''وقف'' اعلیٰ اور مقدم ہے اور اسی لیے سب سے پہلے متمول صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس ترغیب پر لبیک کہا اور اپنی ملکیت کو وقف کر کے خدا کی ملک بنایا۔

اس سلسلہ میں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقف کا واقعہ تمام محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی کتب احادیث میں نقل کیا ہے۔ آئیے امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت کردہ حدیث پڑھتے ہیں:

(عن أنس رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: كان أبو طلحه رضی اللّٰہ تعالٰی عنه أكثر الأنصار رضی اللہ تعالٰی عنهم بالمدينة مالا من نخل، وكان أحب أمواله إليه بيرحاء، وكانت مستقبلة المسجد وكان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يدخلها و يشرب من ماء فيها طيب. قال انس رضی اللّٰہ تعالٰی عنه: فلما انزلت هذه الاية: ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾''[1]

قام أبو طلحة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فقال: يا رسول اللّٰه! أن اللّٰه تعالٰی يقول: ﴿لَن تَنَالُواْ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ وأن أحب مالى إلىّ بيرحاء وأنّها صدقة! اللّٰه تعالٰی اجرو برها وذخرها عند اللّٰه. فضعها يا رسول اللّٰه! حيث أراك اللّٰه الخ.)[2]

---

❹ مسجد یا مسافر خانہ (فقیر اور محتاج مسافروں کے لیے) بنا کر چھوڑ گیا ہو۔

❺ نہر جو جاری کر یا کرا گیا ہو۔

❻ اپنے مال میں سے ایسا صدقہ جس کو اپنی زندگی اور صحت میں کر گیا ہو۔

مرنے کے بعد ان کا ثواب اس (خوش نصیب) کو ملتا رہے گا۔ (اللهم اجعلنا منه)

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۹۲

(۲) صحيح الامام البخارى، كتاب الزكاة، باب الزكاة على الأقارب، كتاب الوصايا، باب من تصدق إلى وكيله الخ. ترمذى، كتاب الوقف. رياض الصالحين، باب الإنفاق مما يحب ومن الجيد

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کے انصاریوں رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سب سے زیادہ مالدار تھے اور ان کا سب سے زیادہ محبوب مال بیرحا تھا (کھجوروں کا باغ) جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب اور سامنے تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے اور وہاں کا شیریں پانی پیتے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یہ فرماتا ہے اور میں اپنے مال میں سب سے زیادہ محبوب بیرحا کو سمجھتا ہوں اور آج سے یہ اللہ کے نام صدقہ ہے (وقف ہے) میں خدا تعالیٰ کے اجر اور اس کے ذخیرۂ خیر کا طالب ہوں، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختار ہیں جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کے اقرباء واعزاء میں اس کی آمدنی کو وقف کر دیا، اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارض خیبر کی ”جاگیر“ کو جو ان کے حصہ میں آئی تھی، اللہ کے نام پر وقف کر دیا تھا۔

محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی کتبِ احادیث میں اس وقف کو مختلف عنادین —— مثلاً الوقف، العطایا، الصدقۃ الجاریۃ وغیرہ —— کے تحت ذکر کیا ہے مگر حدیث کا متن تمام محدثین کے ہاں ایک ہی ہے۔ آئیے پہلے پورا متن پھر اس کا ترجمہ پڑھ لیتے ہیں:

(عن ابن عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ ان عمر رضی اللہ عنہ اصاب أرضا بخيبر، فاتى النبى صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله (صلى الله عليه وسلم)! أنى أصبت أرضا بخيبر، لم أصب مالا قط أنفس عندى منه، فما تأمرنى به؟ قال: إن شئت

حبثت أصلها وتصدقت بها، فتصدق بها عمر رضى الله تعالٰى عنه، أنه لا يباع أصلها، ولا يوهب، ولا يورث وتصدق بها فى الفقراء وفى القربٰى وفى الرقاب وفى سبيل الله وابن السبيل، والضيف لا جناح على من وليها ان يأكل منها بالمعروف أو يطعم غير متمول.[1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں: (میرے والد) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر (کے اموالِ غنیمت) سے ایک زمین بطور جاگیر ملی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: مجھے خیبر (کے غنائم) سے زمین ملی ہے، اور میرے پاس اس سے عمدہ مال آج تک نہیں آیا (اور عمدہ مال تو اللہ کریم کی رضا کے لیے خرچ ہونا چاہیے) اب آپ مجھے کیا حکم فرمانا چاہیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر چاہو تو اصل زمین باقی اور (اس کے ثمرات اور پیداوار سے اللہ کریم کی راہ میں) صدقہ کرتے رہو۔)
پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو صدقہ (وقف) کر دیا اس شرط کے ساتھ کہ اس زمین کو نہ خرید وفروخت کیا جائے، نہ وراثت اس میں جاری ہو اور نہ ہبہ کیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو فقراء، اقرباء، غلاموں کی آزادی کارہائے خیر اور مسافروں اور مہمانوں کے لیے وقف کر دیا اور یہ بھی تصریح کر دی کہ جو اس کا متولی ہو وہ اس سے مناسب طور پر اپنا روزینہ لے سکتا ہے اور ذخیرہ کیے بغیر اپنے دوست کو بھی مناسب طریق پر کھلا سکتا ہے۔[2]

(۱) متفق عليه، مشكوة المصابيح باب العطايا، فصل اول - ابن سعد: طبقات، ج ۳، مطبوعه بيروت، ۱٤۱۸ھ/۱۹۹۷ء: ص ۲۷۲

(۲) صحيح بخارى، كتاب الوصايا، باب الوقف كيف يكتب. صحيح مسلم اور جامع

وقف کی تعریف:

وقف کی صحیح تعریف یہی ہے جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ میں مذکور ہے یعنی جو جائداد یا کوئی شے خدا کے نام پر وقف ہو اس کی آمدنی فقراء مساکین، مسافر قرض خواہوں ذوی القربی، یتامی وغیرہ پر صرف کی جائے اور اس کو نہ کوئی فروخت کر سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ وہ واقف کے ورثاء میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

قوانین وقف:

❶ وقف اگر جائداد اور اراضی کی شکل میں ہے تو وہ "خلیفہ" اور حاکم کے ان تصرفات اور مداخلت سے آزاد رہتا ہے جو مصالح وقف کے خلاف ہوں جو دوسری قسم کی اراضی میں عموماً جائز سمجھے جاتے ہیں اس لیے بغیر مصالح وقف کے اس میں تبدیلی درست ہے اور نہ اس پر کوئی ایسا عمل کیا جا سکتا ہے جو اس کی آمدنی اور ذرائع آمدنی میں کمی کا باعث ہو یا اس کو تباہ و برباد کرنے کا موجب ہو۔

❷ وقف میں سب سے زیادہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ واقف کی بیان کردہ جائز اغراض کو شریعت کے صاف اور صریح احکام کی طرح پورا کرنا ازبس ضروری ہے۔ البتہ عرف عام بعض اوقات کسی حکم عام (General Rule) میں تخصیص (Specification) پیدا کر سکتا ہے۔

❸ بہرحال لگان و مالگذاری کے طے شدہ مالیہ کے علاوہ وقف کی اصلاح و مصالح سے الگ اس پر مزید ٹیکس لگانے اور باعث نقصان قیود و عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ کسی ذاتی (پراپرٹی) یا شخصی ملکیت نہیں رہتا بلکہ "رفاہ عامہ" (Commen Weal) کا ایک قائم و دائم سرمایہ بن جاتا ہے۔[1]

ترمذی میں کتاب الوقف. ابن عابدین: الدر المختار، ج ۳، کتاب الوقف. شیخ منصور علی ناشف رحمہ اللہ تعالیٰ: التاج الجامع الاصول، ۲/۲۷۳

(۱) ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: ردالمحتار، ج ۳، کتاب الوقف. جامع الفصول: ۲/۱۷۷

اقسام وقف:

وقف کی دو قسمیں ہیں، ایک وقف اہلی (وقف علی الاولاد) (Endowment for Family's Welfare) اور دوسری وقف خیری (وقف علی الخیر (Endowment for Commen Welfare) وقف اہل یعنی وقف علی الاولاد میں، اولاد و اقرباء کے نام بھی وقف ہوتا ہے اور ساتھ ہی امور خیر کے لیے بھی اور وقف خیری میں صرف امور خیر ہی کے لیے وقف کیا جاتا ہے، بہرحال وقف میں تابید (Perpetuity) شرط ہے۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقف (وقف اہلی (Endowment for the endower's in laws) میں شمار کیا گیا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقف، وقف علی الخیر (Endowment for common Welfare) کی قسم میں رکھا گیا۔[2]

لیکن قانونِ وقف میں یہ سب اقسام بحیثیت وقف ایک ہی حکم رکھتی ہیں، البتہ وقف علی الاولاد میں آمدنی وقف جب افرادِ اہلی میں تقسیم ہو جائے تو اس پر ٹیکس اور مزید محصولات کی وہ تمام قیود اور پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں جو ذاتی املاک رکھنے والوں پر عائد ہوتی ہیں۔

ہبہ (Gift):

مقصد و مدعا:

اجتماعی معاشی نظام میں ہبہ بھی ایک مفید طریق کار ہے بشرطیکہ واہب (Grantor) کا مقصد نیک ہو اور حقوق اللہ (زکوٰۃ و صدقات) اور حقوقِ عباد (دوسرے انسانوں کے عائد شدہ حقوق) میں سے کسی کی حق تلفی پیشِ نظر نہ ہو۔ اس لیے اس کی افادیت کی شکل یہ ہے کہ ایک متمول شخص اگر اپنے ذاتی حقوق اور اجتماعی حقوق سے سبکدوشی کے بعد بھی فاضل (Surplus) مال پاتا ہے تو اس کے لیے یہ مناسب ہے

---

(۱) یعنی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو، خاص وقت میں محدود نہ ہو۔

(۲) ناشف، شیخ منصور علی: التاج الجامع الاصول، ۲/۷۳

کہ وہ اس فاضل پونجی (Surplus Possession) کو حاجت مندوں کی حاجت میں صرف کرے اور اخلاقی راہ سے بھی اجتماعی خدمت سے منہ نہ موڑے اور اس ''انفاق'' (Spending) کی جہاں اور مختلف راہیں ہیں ان میں سے ایک راہ یہ ہے کہ وہ نقد یا مال کسی ضرورت مند کو ہبہ کر دے۔

قانونِ ہبہ میں اگرچہ فقیر یا حاجت مند کی شرط نہیں بلکہ غنی اور مالدار کے نام بھی ہبہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کے معاشی نظام میں ہماری بحث ہبہ کی صرف اسی شق کے ساتھ محدود ہے، جس کا تعلق غرباء اور اہلِ حاجت کی غربت و حاجت کے انسداد سے ہے[1]، حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہبہ کی ترغیب دیتے

(۱) پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہدیہ ـــــ جو معاشی دکھوں کے ماروں کی معاشی مشکلات کا مداوہ یا کم از کم کرنے میں مددگار ہو ـــــ کو واپس لے لینے اور اس معاشی مدد کو اگرچہ کم ہی ہو، کو ختم ہونے سے بچانے کے لیے سختی سے منع فرمادیا۔

عن إبن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: العائد فی هبة كالكلب يعود فی قيئه، ليس لنا مثل السوء. (صحیح بخاری، كتاب الهبة، باب لا يحل لاحد أن يرجع فی هبته. صحيح مسلم، كتاب الهبات، باب تحريم الرجوع فی الصدقة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے (کسی کو دیئے گئے) ہبہ کو واپس لینے والا اس کتا کی طرح ہے جو اپنی کی ہوئی قے کو چاٹ لیتا ہے، ہم مسلمانوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم ایسی بری مثال کے مشابہ قرار دیئے جائیں (یعنی اپنا دیا ہوا ہبہ ہرگز واپس نہ لیں)۔

گویا یہ مسلمان کی ـــــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کے شرف کی وجہ سے ـــــ عظمت کے خلاف ہے کہ کسی محتاج کو ہبہ دے کر اور اس کا معاشی ذریعہ بنا کر بھی واپس لے لیں۔ البتہ فقہاء احناف کے نزدیک باپ اپنے بیٹے کو کیا ہوا ہبہ ـــــ اس کی کسی گستاخی یا دیگر اولاد میں انصاف قائم رکھنے کے لیے ـــــ واپس لے سکتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دوسرا ارشاد ہے:

عن عبداللّٰه بن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لا يرجع أحد فی هبته إلا الوالد من ولده. (النسائی، كتاب الهبة، باب رجوع الوالد فيما يعطی ولده. ابن ماجه، كتاب الهبات، باب من اعطی ولده ثم رجع فيه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہوئے یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ ہدیہ اور ہبہ کی عادت ڈالو کہ یہ رسم باہمی محبت و مؤدت کے قیام و استحکام (Strengthning) کے لیے از بس مفید ہے ارشاد مبارک ہے:

(عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنها، عن النبی صلی اللہ علیه

کوئی شخص اپنا دیا ہوا ہبہ واپس نہ لے، البتہ باپ بیٹے سے واپس لے سکتا ہے۔

مذکورہ دونوں ارشادات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ہدیہ دینے والا ایسا کریم النفس انسان ہو جو دے کر پچھتائے نہ اور واپس لینے کے لیے للچائے نہ۔ کیونکہ ہمارے موضوع کی رو سے کسی کا معاشی وسیلہ ـــــ اگرچہ وہ کتنا عارضی اور کم کیوں نہ ہو بنانے کے بعد اسے واپس لے کر اس محتاج کو مزید پریشان کرنا اخلاقی اور دینی دونوں اعتبار سے بہت ہی برا ہے کہ اسے کتے کی قے اور پھر اسے چاٹ لینے کے مترادف قرار دیا گیا۔

ان ارشادات میں ایک اور لطیف اشارہ اور اعلیٰ نفسیاتی درس بھی پوشیدہ ہے کہ ایسے کم ظرف کا ہدیہ ہی قبول نہ کیا جائے جس سے دے کر واپس لینے کی توقع ہو یا سابقہ تجربہ سے اس کی کم ظرفی کا علم ہو، کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایک واقعہ اسی کی طرف مشیر ہے:

عن أبي هريرة رضی اللہ عنه أن أعرابيا أهدی لرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بكرة فعرضه (فعوضه) منها ست بكرات. فتسخط. فبلغ ذلك النبی صلی اللہ علیه وسلم، فحمد اللہ واثنی علیه ثم قال: أن فلانا أهدی إلی ناقه، فعوضته منها ست بكرات، فظل ساخطا. لقد همت أن لا أقبل هدية إلا من قرشي أو انصاری أو ثقفی أو دوسی. (ابوداود، كتاب البيوع، باب فی قبول الهدايا. نسائی: كتاب العمری، باب عطية المرأة. جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی مناق ثقيف)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ میں ایک اونٹنی پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قبول کر کے) بدلہ میں اسے چھ اونٹنیاں عنایت فرمائیں۔ مگر وہ پھر بھی رنجیدہ رہا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے پہلے اللہ کریم کی تعریف کی، اس کی پاکیزگی بیان کی، پھر فرمایا: مجھے فلاں شخص نے ایک اونٹنی ہدیہ میں دی، میں نے اس کے بدلہ میں اسے چھ اونٹنیاں دیں، مگر وہ پھر بھی ناخوش ہے اب (اس کے رویہ سے) میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ قریشی یا انصاری یا ثقفی یا دوسی کے سوا کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔

قریشی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ سے تھے، انصاری سے مراد مدینہ منورہ کے انصار باوفا رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں ثقفی قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھنے والا اور دوسی قبیلہ دوس کا فرد مراد ہے۔ یہ مذکورہ قبائل کرامۃ النفس، سخاوت، علو ظرف اور وسعت قلب میں اپنا نام رکھتے تھے، دراصل یہ وہی قبائل تھے جنہوں نے مشکل حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

وسلم قال): تهادوا تحابوا فان الهدية تذهب الضغائن.[1]

ترجمہ: (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا): آپس میں ہدیہ لیا دیا کرو، اس طرح باہم محبت کی طرح ڈالو (کیونکہ ہدیہ (کا تبادلہ) دل کی کدورتیں مٹا دیتا ہے۔)

تعریف:

فقہ اسلامی میں ہبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے ''کسی شے کو دوسرے کی ملکیت میں بغیر عوض کے دے دینا ہبہ کہلاتا ہے'' اور حدیث صحیح میں اس کی حکمت ''معاشی وسائل میں اضافہ'' بتائی گئی ہے، ارشاد ہے:

(عن خالد بن علی الجهنی قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: من بلغه عن أخیه معروف من غیر مسئلة ولا أشراف نفس فلیقبله ولا یرده، فأنما هو رزق ساقه الله عزوجل.[2]

ترجمہ: حضرت خالد بن علی جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:

---

(۱) ابو یعلی: مسند از جامع صغیر، ۱/۴۵۴. مشکوۃ المصابیح باب العطایا، فصل ثانی

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کچھ اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے:

عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: تهادوا، فان الهدية تذهب وحر الصدر. ولا تحقرهن جارة لجارتها ولو بشق فرسن بشاة. (جامع الترمذی، ابواب الهبة والولاء، باب فی حث النبی صلی الله علیه وسلم علی التهادی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہدیہ دیا کرو۔ یقیناً ہدیہ (کا لینا دینا) سینہ کی کدورت دور کرتا ہے۔ لہذا کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کے ہدیہ کو حقیر نہ جانے خواہ وہ بکری کے کھر کا ایک حصہ ہی ہو۔

(۲) سعیدیات حصہ دوم ص ۱۳ نصف آخر۔ اسی مضمون کی ابو داود نے نقل کی ہے جیسا کہ مشکوۃ المصابیح، باب من لا تحلله المسئلة ومن تحل له، الفصل الثالث میں آیا ہے۔ امام احمد: مسند، روایات خالد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن حبان، صحیح امام حاکم، الترغیب میں نقل کیا گیا ہے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:) اگر سوال اور انتظار کے بغیر ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مالی بھلائی کرتا ہے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے اور رد نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بہانہ سے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔

وصیت (Will):

مدعا:

وصیت بھی بظاہر ایسے امور میں سے ہے جن کے متعلق یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس کا بھی کوئی تعلق معاشی نظام سے ہو سکتا ہے لیکن اس کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بے شبہ اس کو بھی معاشی نظام میں ایک حد تک دخل ہے اور مفید دخل ہے۔

انسان اپنی زندگی کے لحات میں موت کی حقیقت سے آگاہ ہونے اور مسلسل مشاہدہ کرتے رہنے کے باوجود اکثر حقوقِ واجبہ و نافلہ (Obligatory & Optional Rights) سے غافل رہتا ہے لیکن جب یقین یہ ہو جاتا ہے کہ پنجۂ موت نے دبا لیا ہے تب اضطرابی کیفیت کے ساتھ تلاش کرتا ہے کہ کیا اب بھی مکافات (Compensation) کی کوئی شکل ممکن ہے، تو اسلامی قانون میں صرف ایک شکل نظر آتی ہے، جس کا نام وصیت ہے۔

تعریف اور شرائط:

اسلامی شریعت میں کسی شے کو یا اس کے منافع کو بہ طریق حسنِ سلوک یہ کہہ دینا یا لکھ دینا کہ میری موت کے بعد فلاں کے لیے ہے، وصیت کہلاتا ہے (شریعت مطہرہ نے اس اہم ذریعہ گردشِ دولت (Circulation of Wealth) اور انفاق فی سبیل اللہ کو چند اہم شرائط سے مشروط کیا ہے مثلاً)

1. اب چونکہ مرنے والے کے مال میں ورثہ کا حق بھی ہو گیا ہے اس لیے شریعت

نے صرف ثلث (تہائی) میں وصیت کو جائز اور نافذ قرار دیا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أوص بالثلث والثلث كثير.[۱]

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک تہائی کی وصیت کرو اور ایک تہائی حصہ بھی بہت زیادہ ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں اشارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکیمانہ نصیحت کی طرف ہے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مالدار، مگر سخی اور دنیا کی محبت پر آخرت کی کامیابی اور اللہ کریم کی رضا کو ترجیح دینے والے، صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمائی۔ سارا واقعہ انہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی سن لیجئے:

قال عادني رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأنا مريض. فقال: أوصيت؟ قلت: نعم. قال: بكم؟ قلت: بمالي كله في سبيل الله. قال فما تركت لولدك؟ قلت: هم اغنياء بخير. فقال: أوص بالعشر. مما زلت أنا قصه حتى قال (رسول الله صلى الله عليه وسلم): أوص بالثلث، والثلث كثير. إنك أنْ تدعو ورثتك اغنياء خير أن تدعهم عالة يتكففون الناس في أيديهم.[۲]

ترجمہ: میں بیمار تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے میرے ہاں تشریف لائے، مجھ سے دریافت فرمایا: کیا تو نے وصیت کر دی ہے؟ میں نے جواب میں عرض کیا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کتنے (مال) میں؟ میں نے عرض کیا: میں نے اپنا سارا مال

---

(۱) صحيح بخاری، كتاب الوصايا، باب ان يترك ورثة اغنياء خير من ان يتكففوا الناس. الشوكانی: نيل الاوطار، ج ٦، كتاب الوصايا، باب ماجاء في كراهية مجاوزة الثلث والايصاء للوارث

(۲) رواه الترمذی كذا في مشكوة المصابيح، باب الوصايا، الفصل الثانی.

اللہ کریم کی راہ میں وصیت کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: تو نے اپنی اولاد کے لیے کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا: وہ سارے امیر و تو انگر ہیں، خوشحال ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: (مال کا) دسواں (۱۰ واں) حصہ وصیت کر دو۔ میں اس (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دسواں حصہ وصیت میں دینے کے حکم) کو برابر تھوڑا کہتا رہا، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (تیسرا حصہ وصیت دینے میں آمادہ ہوئے تو آپ) نے فرمایا: بس تیسرے حصہ میں وصیت جاری کر دو، اور تیسرا حصہ بھی بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنے ورثہ کو غنی چھوڑو، یہ تمہارے لیے اس لیے بہتر ہے کہ انہیں مفلس چھوڑو کہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔)

❷ اور اس کے علاوہ بھی اور شرائط مقرر فرمادی ہیں مثلاً:

لا وصية لوارث.[1]

ترجمہ: وارث کے لیے وصیت درست نہیں۔

اس لیے کہ وہ بحیثیت وراثت حقدار ہے تو اب اس کا وصیت کرنا گویا دوسرے ورثہ کی حق تلفی کرنا ہے مثلاً:

قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم. الاضرار فى الوصية من الكبائر.[2]

---

(۱) مشکوۃ المصابیح، باب الوصایا، الفصل الثانی میں نقل کیا ہے ابن ماجه: السنن، ج ۱، باب لا وصية لوارث

(۲) الشوکانی، نیل الاوطار، ج ٦، کتاب الوصایا باب اول کی حدیث اول کی شرح میں درج ہے رواه سعید بن منصور موقوفا باسناد صحیح رواه النسائی مرفوعا.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنی ساری جائید اد ـــــــ جو چھ غلاموں پر مشتمل تھی ـــــــ وصیت کے ذریعہ خیرات کر دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے۔ آئیے حدیث کا پورا متن اور ترجمہ پڑھ لیتے ہیں۔

=

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لیے وصیت کرنا کہ اس کے ذریعہ کسی حقدار کو نقصان پہنچایا جائے کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔

۳ یا مثلاً:

وليس لقاتل وصية.[1]

ترجمہ: قاتل کے لیے کسی حال میں بھی وصیت درست نہیں ہے۔

۴ اور ان سب شرائط سے مقدم شرط یہ ہے کہ وصیت کرنے والا اس قدر مقروض نہ ہو کہ جس مال کی وصیت وہ کر رہا ہے، سب اداء قرض ہی میں چلا جائے کیونکہ ادائے قرض وصیت اور وراثت دونوں پر مقدم ہے۔

غرض وصیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ سے ایک متمول اپنے آخری

عن عمران بن حصين رضى الله تعالىٰ عنه أن رجلا أعتق ستة مملوكين له عند موته، ولم يكن له مال غيرهم. فدعا بهم رسول الله صلى الله عليه وسلم فجزّاهم أثلاثا، ثم أقرع بينهم فأعتق إثنين وأرق أربعة. وقال قولا شديدا. (رواه مسلم و رواه نسائى عنه و ذكر: لقد همّت أن لا أُصلّى عليه بدل و قال له قولا شديدا. و فى رواية ابى داود قال: لو شهدته قبل أن يدفن لم يدفن فى مقابر المسلمين)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھ غلام آزاد کر دیئے جبکہ اس کے پاس ان چھ غلاموں کے سوا کوئی مال نہ تھا (جب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے ان غلاموں کو بلایا اور (دو دو کی تعداد میں) ان کے تین حصہ کیے۔ پھر ان کے درمیان قرعہ ڈالا۔ اس کے نتیجہ میں دو کو آزاد فرمادیا اور چار کو باقی رکھا۔ اور (یوں تمام چھ کو) زآد کرنے والے سے اظہار ناراضگی فرماتے ہوئے سخت الفاظ فرمائے۔

نسائی کی روایت ـــــ جو انہی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے ـــــ میں ہے: ان ”سخت الفاظ فرمائے“ کی بجائے یہ الفاظ ہیں: میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص کی نماز جنازہ نہ پڑھوں۔ ابو داود کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں اس (کی تدفین سے پہلے اس کے جنازہ) کو پالیتا تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جاتا۔

غالباً ان صاحب سے یہ غلطی ہوئی ہوگی کہ انہوں نے ورثاء کو ضرر پہنچانے یعنی حق وراثت سے محروم کرنے کے لیے چھ غلاموں ـــــ جو اسکی کل دنیوی جائیداد تھے ـــــ کو وصیت میں آزاد کر دیا۔

(۱) ابن قدامه: المغنى ج ٦، كتاب الوصايا، باب الوصية للقاتل

لمحاتِ حیات میں تبرع (Voluntary Charity) اور حسنِ سلوک کے طور پر غرباء اور اہلِ حاجات کو مالی فائدہ پہنچا دیتا ہے اور بسا اوقات اس طریقِ کار سے اہم اور ضروری اجتماعی کام بخوبی انجام پا جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن عزیز نے وراثت کے احکام بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ وصیت وراثت سے مقدم ہے۔ ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ﴾ [1]

انفاق کی دوسری قسم کی شکلیں:

قرضِ حسنہ:

مدعا:

"انفاق فی سبیل اللہ" اور "تعاون باہمی" (Mutual Co- Operation) کے وسائل میں سے ایک مفید اور کارآمد وسیلہ "قرضِ حسنہ" ہے، یہ حاجت مند کی وقتی حاجت روائی کا بھی ذریعہ ہے اور غریب اور بے مایہ انسان کو تجارتی زراعتی یا صنعتی کاروبار کے لیے بھی مؤثر وسیلہ ہے۔

تعریف و ضوابط:

قرض حسن کی تعریف یہ ہے کہ ایک دولت مند کسی ضرورت مند کی ضرورت

---

(۱) سورة النساء (٤): ۱۲ وصیت کی معاشی اہمیت اور دینی فضیلت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بخشش کی خوشخبری دی ہے۔ ارشاد گرامی پڑھئے:

عن جابر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من مات علی وصیة مات علی سبیل وسنة، ومات علی تقی وشهادة، ومات مغفور له. (ابن ماجه: السنن، کتاب الوصایا، باب الحث علی الوصیة)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص وصیت کر کے فوت ہوا (یعنی اس نے وصیت کی کہ اس کے مال کچھ حصہ اللہ کریم کی رضا کی خاطر محتاجوں کی معاشی کفالت پر خرچ کیا جائے) تو وہ (تین طرح کی بشارتوں کے ساتھ) ہے:

1. راہ مستقیم اور سنت (یعنی پسندیدہ طریقہ) پر مرا۔
2. وہ تقوی اور شہادت (اللہ کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی دے یا شہادت) کی موت مرا۔
3. وہ اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش کر دی گئی۔ (سبحان اللہ)

کے انسداد اور اس کی حاجت روائی کے لیے اس طرح اپنی رقم سے اس کو فائدہ پہنچائے کہ اس کا کوئی بدل (سود) اس سے حاصل نہ کرے اور چونکہ یہ اخلاقی مسئلہ ہے اس لیے احادیث میں قرض خواہ کو قرض دار کی دعوت قبول کرنے سے بھی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے تاکہ عوض خواہی کا قطعاً سد باب ہو جائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ قرض دار اس لیے قرض خواہ کی دعوت کرتا یا اس کو ہدیہ پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے قرض کا جلد مطالبہ نہ کرے اور اس حالت میں یہ بھی ایک قسم کا ربوا ہو جائے گا الا یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس معاملہ سے قبل بھی اس قسم کے تعلقات قائم ہوں۔ (اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

اذا أقرض أحدكم أخاه قرضا فأهدى اليه طبقا فلا يقبله أو حمله على دابته فلا يركبها إلا أن يكون جيرى بينه و بينه قبل ذالك.[1]

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قرض دے اور قرض دار اسے کوئی تحفہ دے تو قرض خواہ کو وہ تحفہ قبول نہ کرنا چاہیے یا اگر قرض دار قرض خواہ کو سواری کے لیے کوئی جانور پیش کرے تو قرض خواہ کو اس پر سوار نہ ہونا چاہیے البتہ اگر ان دونوں میں اس قسم کی راہ و رسم پہلے سے موجود ہو (تو حرج نہیں)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی فتویٰ اور تعامل ہے۔)[2]

اور چونکہ اس معاملہ میں قرض ۔ ر کی جانب سے بددیانتی اور وفائے عہد کے فقدان کا زبردست خطرہ ہے اس لیے اس قسم کی اعانت کو واجب نہیں کیا گیا بلکہ خدا تعالیٰ کے انعام و اکرام کے وعدوں کے ساتھ صرف اخلاقی ترغیب ہی پر اکتفا کیا گیا

---

(۱) سیوطی، جامع الصغیر، روایت نمبر ٤٦٧

(۲) ابن قیم جوزیہ: اعلام المعوقین، ۱٤۹/۳، ۱٥۲

ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١١﴾ ﴾[1]

ترجمہ: کوئی شخص ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے اور اللہ اس کو اپنی مرضی سے چند در چند کر کے ادا کر دے (یعنی آخرت کا اجر عطا فرمائے) جو دنیوی منافع سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے لیے پسندیدہ ثواب ہے۔

اور ساتھ ہی قرض دار کو بھی سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ قرض حسن کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدرتِ ادا کے باوجود دوسرے کی رقم کو ہضم کر جائے یا تاخیر کر کے قرض دہندہ کو نقصان پہنچائے، چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشادات مبارک ہیں:

❶ مطل الغنی ظلم.[2]

ترجمہ: دینے کی قدرت کے باوجود دوسروں کے حق مطالبہ کی اداء میں تاخیر بہت بڑا ظلم ہے۔

❷ عن أبی امامة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه سلم یقول: الدین مقضی.[3]

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: قرض کی بروقت واپسی واجب اور فرض ہے۔

---

(۱) سورۃ الحدید (۵۷): ۱۱

(۲) صحیح الامام البخاری، ج ۱، کتاب الاستقراض واداء الدیون الخ. ابن ماجه، السنن، ج ۱، باب الحواله. امام نووی رحمه اللّٰہ تعالٰی: ریاض الصالحین، باب تحریم مطل الغنی بحق طلبه صاحبه. مشکوۃ المصابیح، باب الأفلاس والأنظار

(۳) ابوداود: السنن، ج ۲. ابن ماجه: ج ۱، باب کتاب البیوع. مشکوۃ المصابیح، باب الغصب والعاریة، فصل دوم

❸ (عن سمرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال:) قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: عمل الید ما اخذت حتی تودیه.[۱]

ترجمہ: حضرت سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۲] سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو چیز کسی نے کسی سے لی ہے جب تک اس کو ادا نہ کرے اس کا بارِ ادا اس پر برابر قائم ہے۔

بہر حال قرض حسنہ میں دینے والا اگر دیانت دار اور بد دیانت کا لحاظ رکھ کر اس کے لیے اقدام کرتا ہے تو یہ اس کا واجبی حق ہے اور قرض لینے والوں کی اخلاقی قوت پر ہی اس کی ترویج کا دارومدار ہے۔[۳]

---

(۱) مشکوۃ المصابیح، باب الغصب والعاریة، فصل دوم. ابن ماجه: السنن، باب العاریة، عن سمرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه

(۲) حضرت سمرہ بن جندب الفزاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ مدینہ منورہ میں پلے بڑھے، سیکھے پڑھے، پھر کوفہ یا بصرہ چلے گئے۔ کوفہ اور بصرہ کے نائب گورنر بنے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں بصرہ کے مستقل گورنر بنے۔ بیمار رہ کر ۹۰ھ میں وفات پائی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سو (۱۰۰) سے زائد احادیث صحاح ستہ میں منقول ہیں۔ (اکمال فی اسماء الرجال ذیل مشکوۃ المصابیح)

(۳) جہاں قرض دار (Borrower) کو سخت الفاظ میں تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنا لیا ہوا قرض استطاعت کے ہوتے ہوئے وعدہ کے مطابق فوراً ادا کرے بلکہ احسن طریقہ پر احسان مندی کے اظہار کے ساتھ ادا کرے، اسی طرح قرض خواہ (Leander) کو بھی تلقین کی گئی ہے، بشارتیں اور خوشخبریاں سنا کر تیار کیا گیا ہے کہ وہ مفلس مقروض کو مہلت دے بلکہ اگر اسے سارا قرض یا اس کا کچھ حصہ معاف ہی کر دے تو باہمی تعلقات، مفلس کی معاشی سہولت اور قرض خواہ کے بلندی درجات کے لیے بہتر ہو گا۔ قرآن کریم میں اللہ کریم کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ ﴾ (سورة البقرة: ۲۸۰)

ترجمہ: اور اگر مقروض تنگدست ہے تو اسے فراخی (حاصل ہونے) تک مہلت دے دو اور اگر اسے (اس کی مفلوک الحال پر ترس کھا کر) معاف ہی کر دو تو ایسا کرنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہوتے (تو ایسا ضرور کرتے)۔

فقراء اور معاشی دکھوں کے مارے انسانوں کے سچے غم خوار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے بس و مجبور مقروضوں کو سہولت دینے یا معاف کر دینے کی ترغیب اپنے بہت سے ارشادات میں فرمائی، صرف تین ارشادات یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں آپ بھی پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ نبی کریم صلی اللہ =

علیہ وسلم مجبور و مفلس مقروضوں کا مقام اور ان سے امیر قرضخواہوں کے درگذر کرنے کو کس قدر گہرا اثر چھوڑنے والے انداز میں بیان فرماتے ہیں:

❶ عن ابی قتادة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: من سره ینجیه اللّٰہ من کرب یوم القیامة، فلینفس عن معسر أو یصنع عنه. (رواه مسلم، کتاب البیوع، باب فصل انظار المعسر. ریاض الصالحین، باب فضل السماحة فی البیع والشراء)

ترجمہ: حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جس کسی (قرض خواہ) کو یہ بات بھلی لگتی ہو کہ اللہ کریم اسے قیامت کی تنگیوں سے خلاصی عطا فرمادے تو پھر اسے چاہیے کہ وہ تنگدست (قرض دار) کو مہلت دیا کرے یا اس کا قرضہ معاف ہی کر دیا کرے۔

❷ عن أبی مسعود رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: حوسب رجل ممن کان قبلکم، فلم یوجد له من الخیر شیء، إلا أنه کان یخالط الناس. وکان مؤسرا، وکان یأمر غلمانه أن یتجاوز عن المعسر. قال اللّٰہ عزوجل: نحن أحق بذلك منه، تجاوزوا عنه. (حواله بالا)

ترجمہ: حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ —— جنہوں نے غزوہ بدر میں شرکت فرمائی تھی —— روایت کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں میں سے ایک شخص کا (موت کے بعد) حساب لیا گیا، تو اس کے (نامۂ اعمال میں اس کے) پاس کوئی بھلائی کا کام نہ ملا۔ البتہ وہ لوگوں سے لین دین کا معاملہ کرتا تھا اور خوشحال تھا۔ اور اس نے اپنے کاروباری نوجوانوں کو سمجھا رکھا تھا کہ وہ تنگدست (مقروض) سے درگذر کیا کریں۔ عظیم و جلیل اللہ نے (اس کے اس عمل کی قدردانی فرماتے ہوئے فرشتوں سے) فرمایا: ہم اس درگزر کرنے میں اس شخص سے زیادہ اہل ہیں، اس (میرے بندہ) سے درگذر کرلو۔

❸ عن أبی هریرة رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: من أنظر معسرا، أو وضع له، اظله اللّٰہ یوم القیامة تحت ظل عرشه، یوم لا ظل إلا ظله. (جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی انظار المعسر والرفق به)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے تنگدست کو مہلت دی یا اس کو (بار قرض سے) سبکدوش کر دیا، اللہ کریم (قدردانی کے طور پر) قیامت کے دن اپنے عرش کے سایہ میں جگہ عطا فرمائیں گے، جس دن اس (عرش) کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ مل سکے گا۔

اب ذرا مزید رخ قرض دار کے لیے تعلیمات کا بھی ملاحظہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیکھئے کتنی تہدید آمیز تلقین کرتے نظر آتے ہیں:

من أدان أموال الناس، یرید أداءها أدی اللّٰہ عنه، ومن اخذها یرید أتلافها اتلفه اللّٰہ. (بخاری: کتاب استقراض)

=

عاریت(Lending):

اقتصادی نظام کے اخلاقی شعبہ میں "عاریت" بھی نمایاں جگہ رکھتی ہے، کسی شخص کا اپنی ملکیت کے منافع کو بغیر معاوضہ کے دوسرے کی ملک بنا دینا اسلامی نقطۂ نظر سے عاریت کہلاتا ہے، عاریت کا سسٹم کس لیے ہے اس کا جواز اسلامی فقہ میں اس طرح دیا جاتا ہے:

واجتمعت الأمة على جوازها واستحبابها واستحسانها لما فيها من إجابة المضطر و إغاثة الملهوف.[1]

ترجمہ: امت کا اس پر اجماع ہے کہ عاریت نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس لیے کہ اس میں مضطر کی حاجت روائی اور نادار کی اعانت وامداد ہے۔

افادیت:

کون نہیں جانتا کہ ضرورت کی ہر شے ہر شخص کے پاس نہیں ہوتی اور وہ بھی انسان ہیں جو قوتِ خرید بھی نہیں رکھتے، پس اگر ان کی اعانت کا یہ طریقہ جو عاریت کی

ترجمہ: جس کسی نے لوگوں (سے ان) کے اموال قرض لیے اور اسے ادا کرنا چاہا۔ اللہ کریم نے اسے ادا کرنے کی توفیق سے نواز دیا، مگر جس نے (لوگوں کے اموال بطور) قرض لیے اور انہیں (واپس نہ کر کے) تلف کر دیا، اللہ کریم اس کو بھی (بطور سزا معاشی اور اخروی لحاظ سے) تباہ کر دیں گے۔

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرض سے بکثرت پناہ مانگا کرتے تھے۔ بخاری رحمہ اللہ ہی کی روایت پڑھئے:

أللهم انى اعوذبك من المأثم والمغرم. فقيل له: إنك تستعيد من المغرم كثيرا يا رسول الله! فقال: ان الرجل اذا غرم حدث فكذب، ووعد فأخلف. (بخاري: كتاب الاستقراض واداء الديون، باب من استعاذ من الدين)

ترجمہ: اے اللہ کریم! میں تیری پناہ چاہتا ہوں، گناہگاری (کے مقام وسبب) سے اور قرض (کے وبال) سے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: اے اللہ کریم کے رسول کریم! آپ (موجب) قرض سے بہت زیادہ پناہ کیوں چاہتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لیے کہ (قرض بہت سی برائیوں کا موجب بنتا ہے): جب کوئی شخص قرض لیتا ہے وہ (ادائیگی قرض کی) بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب (ادائیگی قرض کا) وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔

(۱)سعیدیات: ۲/۱۳۱

شکل میں پیش آتا ہے معاشی نظام کا حصہ نہ بنے اور اس کو رائج کرنے کے لیے اقدام نہ کیا جائے تو باہمی معاشی تعاون کا ایک ضروری حصہ معدوم ہو جائے، قرآن عزیز میں ان انسانوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو ایسے مضطر اور نادار کی امداد و اعانت سے باز رہتے اور اپنی چیز کو عاریت پر دینے سے گریز کرتے ہیں (چنانچہ قرآن مجید میں اللہ کریم کا) ارشاد ہے:

﴿ وَيَمْنَعُونَ ٱلْمَاعُونَ ۝٧ ﴾[1]

ترجمہ: اور ان کے لیے بھی ہلاکت ہے جو برتنے کی چیز عاریت پر نہ دیں۔

بہر حال عاریت، ایثار اور اخلاقی بلندی کا ایک ثبوت ہے جس کے لیے اخلاقی ترغیبات ہی سے کام لیا گیا ہے اور چونکہ اس میں چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اس لیے عاریت پر لینے والے کو بھی سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ عاریت پر لی ہوئی چیز کو اپنی ملک نہ سمجھے اور ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد فوراً مالک کو واپس کر دے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع ارشاد جو بہت سے معاشی مضامین کو شامل ہے، جن کا تعلق اس حصہ دوم کے شعبہ سے ہے۔

عن أبي امامة رضي الله تعالیٰ عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: العارية مؤداة والمنيحة مردودة، والدين مقضي والزعم غارم.[2]

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: عاریت کی واپسی عاریت لینے

---

(۱) سورۃ الماعون (۱۰۷):۷

(۲) رواه الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی العاریة مواداة. ابن ماجه: السنن، ج ۱، باب العاریة علاوہ ازیں اس حدیث کو ترمذی ابوداود نے بھی روایت کیا ہے، کذا فی مشکوۃ المصابیح، باب الغصب والعاریة، فصل دوم

والے کے ذمہ ہے۔ منحہ کا لوٹانا ضروری ہے، قرض کا ادا کرنا ضروری ہے اور ضامن ضمانت پوری کرنے کا پابند ہے۔

منحہ کسی شخص کا اپنا جانور دودھ والا یا بیل (وغیرہ) یا اپنی زمین یا باغ وغیرہ کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو صرف اس کی معاشی کفالت کے لیے دے دینے کو کہتے ہیں۔"

عاریت کی واپسی اور اس کی حفاظت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے:

عن السائب بن یزید عن ابیه عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: علی الید ما اخذت حتی تؤدی.[1]

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید[2] اپنے والد رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کسی سے مستعار لی گئی شے اس مستعیر) ہاتھ کے ذمہ ہے جب تک وہ واپس نہ کر دی جائے۔

امانت:

اگرچہ ظاہر بین نگاہوں میں اس کا تعلق معاشی نظام سے نظر نہیں آتا لیکن

---

(۱) جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی تضمین العاریة. ابن ماجه، کتاب الصدقات، باب العاریة

(۲) حضرت سائب بن یزید کندی لیثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۲ھ یا ۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چھ سات سال کی عمر میں والد محترم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ حجۃ الوداع میں شرکت کی سعادت پائی۔ انہیں عموماً ابن اخت النمر (شیر کی بہن کا بیٹا) کہا جاتا تھا کیونکہ نمر بن جبل ان کے والد حضرت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ماموں تھے۔ ایک بار بیمار ہوئے تو ان کی والدہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئیں، آپ نے دعا کی، سر پر دست شفقت پھیرا، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی پیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں مدینہ منورہ کے بازار کا محتسب یا نگران بنایا تھا۔ آپ نے ۸۰ھ میں وفات پائی۔ آپ سے امام زہری رحمہ اللہ، محمد بن یوسف رحمہ اللہ وغیر ہما نے روایت کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (الکمال فی اسماء الرجال، ترجمه السائب بن یزید رضی اللّٰه تعالٰی عنه)

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی بعض حالات میں اہم معاشی ضرورت کے پورا کرنے کی کفیل ہے، ایک شخص اگر نقد یا مال کسی دوسرے شخص کے پاس امانت رکھتا ہے اور امین کو اس کی ضرورت کے وقت امانت میں تصرف کرنے کی اجازت دے دیتا ہے تو کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کس قدر اہلِ حاجات کی ضروری حاجات کو پورا کیا جا سکتا ہے اور جبکہ امانت کے معاملہ میں خیانت کا ہر وقت خوف رہتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جانب اخلاقی دباؤ ڈالا جائے، ذاتی ضرورت سے فاضل مال رکھنے والوں کو جہاں انفاق فی سبیل اللہ کے دوسرے طریقوں کی ترغیب دی جائے وہاں "امانت" کی بھی ترغیب دی جائے تا کہ اس بہانہ سے اہل حاجات کی حاجت پورا ہونے کی ایک اور سبیل پیدا ہو اور ساتھ ہی امین (Trustee) کو خائن (Treacherous) نہ بننے کی ترغیب دی جائے اور عذاب الٰہی اور دنیا کی رسوائی کا خوف دلا کر صحیح معنی میں "امین" رہنے پر آمادہ کیا جائے، چنانچہ قرآن عزیز میں ان دونوں باتوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا۟ ٱلْأَمَـٰنَـٰتِ إِلَىٰٓ أَهْلِهَا﴾ (۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ جس شے کے تم امین بنائے گئے ہو اس کے مالک شے کے پاس امانت کے ساتھ واپس کرو۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کی حفاظت کرنے کی کس طرح تلقین فرمائی ملاحظہ کیجئے):

❶ أدّ الأمانة الى من ائتمنك ولا تخن من خانك. (۲)

ترجمہ: امانت کو امین کے پاس رکھو اور اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ

---

(۱) سورة النساء (٤) ٥٨

(۲) ترمذی: الجامع، ابواب البیوع ماجاء أن أد الأمانة باب ماجاء ان العارية مؤداة مشکوة المصابيح، کتاب الايمان، ابوداود: السنن، کتاب البيوع، باب من يأخذ حقه، الشوکانی نيل الاوطار ج ٦ کتاب الودية والعارية

خیانت کی ہے تب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔

❷ لا إيمان لمن لا أمانة له.[1]

ترجمہ: جس میں امانت کا مادہ نہیں اس کو ایمان سے بھی حصہ نہیں ملا۔

قرآن کریم میں اللہ کریم نے امانت میں خیانت کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝٥٨﴾[2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

امین (Trustee) اور جدید بینکوں کے کردار کا موازنہ:

غرض "امانت" اجتماعی معاشیات میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اس لیے کہ اگر ایک متمول اور دولت مند اپنی فاضل "دولت" کو بغرضِ حفاظت کسی امین کے پاس امانت رکھتا ہے اور ساتھ ہی اس کو اجازت دیتا ہے کہ وہ حسبِ ضرورت اس سے اس شرط کے ساتھ استفادہ کر سکتا ہے کہ بوقتِ طلب بجنسہ واپس کر دے تو یہ معاملہ قریب قریب موجودہ زمانے میں بینکوں کے اندر روپیہ داخل کرنے کی مثال بن جاتا ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ بینک میں روپیہ داخل کرنے پر سود کی ایک مقدار سالانہ ملتی رہتی ہے اور خود بینک بھی اس روپیہ سے سودی کاروبار کرتے رہتے ہیں، لیکن "امانت بشرطِ تصرف" (Deposit with permission to use) میں سود کے لین دین دونوں صفر اور نفی کے درجہ میں رہتے ہیں۔

پس بینک میں سپرد امانت کا نتیجہ تو بینکر (Banker) کے لیے مذموم سرمایہ داری کی تخلیق نکلتا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق "امانت سے استفادہ" (To Benefit)

(۱) ترمذی: الجامع، ابواب البیوع باب ماجاء ان ادلامانة قبل باب ماجاء ان العاریة مؤداة. مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان. ابوداود: السنن، کتاب البیوع، باب من یأخذ حقه. الشوکانی نیل الاوطار، ج ٦، کتاب الودیة والعاریة

(۲) سورة الانفال (۸):۵۸

اس مذموم طریقہ کا انسداد کر کے صاحب دولت کی دولت کو بھی ہلاکت سے بچاتا ہے اور اصحابِ حاجت کی تکمیل حاجات مثلاً تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ یا وقتی حصولِ معیشت کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اور ''بنک سسٹم'' کی طرح چند افراد میں ''اکتناز'' کی راہ سے دولت کو سمیٹ کر عوام کی معاشی تباہی و تنگ دستی اور ان کے افلاس کا باعث نہیں بنتا۔

اسی لیے اسلام کے معاشی نظام میں ''امانت'' کے مفید پہلو کو باقی رکھا گیا اور سرمایہ دارانہ نظام کی مضرت کو فنا کرنے کے لیے اس کے ربوی (Usurious) شعبہ کو حرام قرار دے دیا۔

چنانچہ ایک حدیث میں اس کے افادی پہلو کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا:

الامانة غنى.[1]

ترجمہ: امانت ایک قسم کی مالی رفاہیت ہے۔

اور مشہور محدث ابن اثیر رحمہ اللہ نے نہایہ میں اس جملہ کی یہ تصریح فرمائی ہے:

> ''حدیث کے جملہ کی مراد یہ ہے کہ امانت، امین کی رفاہیت کا باعث بنتی ہے اس لیے کہ جب اس کی امانت داری کی شہرت ہوگی تو لوگ کثرت سے اپنے فاضل مال کو اس کی امانت میں رکھنے کا اقدام کریں گے اور اس طرح یہ معاملات اس کی رفاہیت کے باعث ہوں گے۔''[2]

اقتصادی انقلاب کے دو فطری طریقے

عقل اور دلیل دونوں اس بات کی راہنمائی کرتے ہیں کہ جماعتی زندگی میں معاشی وسائل کو عام کرنے، سرمایہ اور دولت کو محدود طبقوں میں ''کنز'' اور ''جمع''

(۱) ابن اثیر: النهاية، مطبوعه مصر: ج ۱، باب الامانة

(۲) ابن اثیر: النهاية، مطبوعه مصر ج ۱، باب الامانة

(Hoarding & Concentration) ہونے سے بچانے اور مذموم سرمایہ دارانہ نظام کو قائم نہ ہونے دینے کے لیے دو ہی مؤثر طریقے ہو سکتے ہیں۔

❶ ایک یہ کہ قانون کے ذریعے ایسی تمام راہیں بند کر دی جائیں کہ جن سے عوام کی تباہی و بربادی پر خواص (Selected Persons / Elites) کی مالی سربلندی (Development) کی عمارت تعمیر ہوتی ہو اور جو شخص بھی اس کی خلاف ورزی کرے وہ قانونی مجرم قرار دیا جائے اور اس طرح لوگوں کی خوشی و ناخوشی سے بلند تر ہو کر قانون کی ایسی حدود قائم کر دی جائیں کہ اقتصادی نظام کی تمام تر بنیادیں صرف اسی پر قائم ہوں اور اس کا فائدہ زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے۔

❷ دوسرے یہ کہ سوسائٹی اور جماعت میں مذہب کی راہ سے اخلاق کی ایسی عملی تعلیم دی جائے جو مذموم سرمایہ داری کا قلع قمع کرتی اور احتکار و اکتناز کی جگہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

چنانچہ اسلام نے ان دونوں پہلوؤں کو اپنے اقتصادی نظام میں مؤثر جگہ دے کر کائنات انسانی کی فلاح عام کا بیڑہ اٹھایا اور خلافتِ راشدہ کے مقدس دور نے عملاً ان کو بحد کمال پہنچایا۔

پس اسلامی احکام میں سود، مسکرات (Intoxicants) کی خرید و فروخت، نجس اشیاء کی بیع و شراء، قمار اور قمار کی طرح کے کاروبار اور تعلقہ داری اور جاگیر داری کے ظالمانہ رسم و رواج کا انسداد اور زکوٰۃ، صدقاتِ واجبہ، عشر و خراج، وراثت کا ایجاب و لزوم (Acceptance of their obligation and then compulsarily carry it into effect) پہلی قسم کی بہترین مثالیں ہیں۔

اور حتی الامکان زمینداری کو مستقل معاشی زندگی بنانے سے پرہیز، مضاربت، عنان اور عقدِ شرکت کے ذریعے باہمی تعاون اور صدقات و اوقاف اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے دوسروں کے ساتھ اخوت و ہمدردی، دوسری قسم کی صحیح اور عمدہ مثالیں ہیں۔

لہذا بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عالمگیر اقتصادی نظام کے لیے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ اپنے عملی تجربہ اور علمی نظریہ دونوں کے اعتبار سے اس مشکل کا بہترین اور منصفانہ حل ہے جو دنیا کے مدبروں کے سامنے اقتصادی نقطۂ نظر سے سرمایہ دار و مزدور یا سرمایہ و محنت کی جنگ کا باعث بنتی ہے اور بنتی رہی ہے۔



باب ــــ ⑭

اسلام کے اقتصادی نظام اور دیگر نظامہائے اقتصادی کا موازنہ

اسلام کے اقتصادی نظام کا یہ مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد حسبِ وعدہ ہم کو بعض دوسرے نظامہائے اقتصادی پر نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ موضوع کتاب پر مزید روشنی پڑ سکے، ہمارے سامنے عالم کے اقتصادی نظام دو راہوں سے آتے ہیں، ایک مذہبی اور دوسرے دنیوی۔

مذاہب عالم اور اسلام کا اقتصادی نظام:

مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اسلام کے علاوہ نصرانیت، یہودیت، ویدک دھرم اور زرتشتی مذہب بڑے مذاہب شمار ہوتے ہیں جن کی پشت پر اپنی مستقل تاریخ ہے۔ اس لیے ہمارا موضوعِ سخن ان چار کے اندر ہی محدود رہنا مناسب ہے۔

(الف) عیسائیت کی معاشی تعلیمات:

ان مذاہب میں سے نصرانیت (Christianity) کی بنیاد یوحنا، متی، مرقس، لوقا، حواریوں کی چار انجیلوں (Evangels) پر قائم ہے ان چار انجیلوں کی تعلیم کا بغور مطالعہ کرنے سے ہم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ عیسوی عقیدہ میں یہ بات نمایاں طور پر ملتی ہے کہ وہ بار بار لوگوں کو رہبانیت (جوگی پن) (Monasticism) کی تعلیم دیتا ہے اور اربابِ ثروت و دولت کے لیے خدا کی بادشاہت میں کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتا۔

محنت سے نفرت کی تعلیم:

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے کیا پئیں گے؟ اور نہ ہی اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بولتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی ہمارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔"(۱)

جوڑ اور سنبھال کر نہ رکھنے کی تعلیم:

"اور اس نے اس سے کہا کہ خبردار اپنے آپ کو ہر طرح کے لالچ سے بچائے رکھو کیونکہ کسی کی زندگی اس کے مال کی کثرت پر موقوف نہیں، اس نے ان سے ایک تمثیل کہی کہ کسی دولت مند کی زمین میں بڑی فصل ہوئی، پس وہ اپنے دل میں سوچ کر کہنے لگا کہ میں کیا کروں کہ میرے یہاں جگہ نہیں جہاں پیداوار بھر رکھوں، اس نے کہا میں یہ کروں گا: اپنی کوٹھیاں ان سے بڑی بناؤں گا اور ان میں اپنا سارا اناج اور مال بھر رکھوں گا اور اپنی جان سے کہوں گا اے جان! تیرے پاس بہت برسوں کے لیے بہت سا مال جمع ہے، چین کر، کھا پی خوش رہ۔ مگر خدا نے اس سے کہا اے نادان! اسی رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے گی، پس جو تو نے تیار کیا ہے وہ کس کا ہو گا، ایسا ہی وہ شخص ہے جو اپنے لیے خزانہ جمع کرتا ہے اور خدا کے نزدیک دولت مند نہیں۔"(۲)

دولت سے نفرت کی تعلیم:

پھر اس نے اپنے شاگردوں سے کہا اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان

---

(۱) انجیل متی، باب ۶ آیات ۲۴، ۲۶

(۲) انجیل متی، باب ۶ آیات ۲۴، ۲۶

کا فکر نہ کیا کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے؟ کیونکہ جان خوراک سے بڑھ کر ہے اور بدن پوشاک سے۔"(۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔"(۲)

سرمایہ داری ناپسندیدہ:

غرض عہد نامہ جدید (اناجیل اَربعہ) کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت "سرمایہ داری" کو ناپسند کرتی ہے لیکن اقتصادی نظام کے نقطۂ نظر سے اس میں ترغیب و تلقین کے علاوہ کوئی قانونی عملی حیثیت مذکور نہیں کہ جس کو سامنے رکھ کر اقتصادی عادلانہ نظام مرتب کیا جا سکے اور ایک دیندار کو صحیح دنیا دار بنا کر جماعتی زندگی کا مفید جز بنایا جا سکے، بلکہ اس کے برعکس اس سے صرف "رہبانیت" اور دنیا کشی کی تعلیم نکلتی ہے اور بس، اور ایک دیندار اور خدا رسیدہ انسان کو بہترین دنیا دار بنانے اور جماعتی زندگی میں کسی بہتر مالی نظام قائم کرانے کی اس میں مطلق کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

کسی اقتصادی نظام کی عدم موجودگی:

عہد نامۂ جدید (انجیل) کے بعد عہد نامۂ قدیم (توراۃ) (Torah) کو لے لیجئے اور اس کے ابواب "قاضیوں" اور "سلاطین" کا غائر نظر سے مطالعہ کیجئے جو حکومت سے متعلق ہیں تو کسی ایک مقام میں بھی "اقتصادی نظام" کی جھلک نظر نہ آئے گی(۳)

(۱) لوقا، انجیل، آیات ۱۵، ۲۱

(۲) انجیل متی، باب ۶ آیات ۲۳، ۲۴

(۳) اناجیل اربعہ (Four Evangels) ـــــ عہد نامہ جدید (New Testaments) ـــــ ہو یا تورات (Torah) ـــــ عہد نامہ قدیم (Old Testaments) ہوں ان میں معاشی جدوجہد، کمانے اور خرچ کرنے کی تعلیمات کا =

ان کی پوری داستان یا دشمنوں سے مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے متعلق ہے، اوریا بادشاہت کے جاہ و حشم، دولت و ثروت صولت و شوکت کی مدح و منقبت سے معمور ہے اور ان دونوں ابواب کے علاوہ جو اس مسئلہ کے خصوصی مواقع ہو سکتے تھے پورے عہد نامہ میں کوئی مضمون ایسا نہیں ملتا کہ جس سے چند اصول یا چند احکام اس نظام کے لیے حاصل کیے جا سکیں یا کم از کم عہد نامہ جدید کی طرح سرمایہ داری کی مذمت کے لیے اخلاقی سرمایہ ہی بہم پہنچا سکے۔

کاروبار شراب کا جواز:

علاوہ ازیں عہد نامہ جدید و قدیم میں ایک بات نمایاں اور امتیازی طور پر یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان میں ''شراب'' کے استعمال کا نہ صرف جواز بتایا گیا ہے بلکہ مقدس نبیوں اور رسولوں کی ضیافتوں میں بھی اس کا استعمال تقدس اور برکت کی شکل میں ظاہر

ورق سرے سے خالی نظر آتا ہے، یہاں کسی معاشی نظام کا ذکر نہیں، فرد کے لیے معاشی تعلیمات ہیں نہ معاشرہ و حکومت کے لیے یہاں نہ کوئی اثباتی معاشیات (Positive Economic) کا تصور ابھرتا ہے نہ معیاری معاشیات (Normative Economics) کا ذکر، نہ کہیں جزوی معاشیات (Micro- Economics) ڈھونڈنے سے ملتی ہے نہ کلی معاشیات (Macro- Economics) کے قدموں کے نشان، صرف توکل (میں نے جوگی مین (Monasticism) کا لفظ مصلحتاً استعمال نہیں کیا، ورنہ حقیقت وہی ہے) کی تعلیم ملتی ہے۔ پھر یہ عیسائیوں کی روز افزوں جدید معاشیات میں نئی نئی تعلیمات اور اختراعات کیونکر؟ کیا عیسائیت کے بعد کے مذہبی پیشواؤں کی ان تعلیمات کا اثر ہے کہ قیصر (بادشاہ، حکومت، معیشت) کو قیصر کا حق دو اور گرجا گھر (خدا، یسوع مسیح، عبادت خانہ) کو گرجا گھر کا حق دو یعنی مذہب کا کھاتہ الگ، معیشت کا دھندہ الگ۔ دونوں اکٹھے نہیں رہ اور چل سکتے۔ یا یوں کہیں کہ عیسائیت کے پیرو کاروں نے اپنے مذہب کو پس پشت ڈال کر معیشت (Economics) کی الگ راہ نکالی ہے کو دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں کار گاہ حیات میں جہاں جس سے کام نکلتا نظر آیا اسے استعمال کر لیا۔ عربوں کا تیل ہتھیانہ ہو تو معیشت کا استحصالی حربہ (Exploitative Tool) استعمال کر لیا، جب عراق پر قبضہ کرنا ہو تو مقدس مذہبی صلیبی جنگ کا مجاہد (Crusader) بن گیا

انجیل (قدیم ہو یا جدید) کے بعد کے مذہبی پیشواؤں نے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں سے متاثر ہو کر معاشی تعلیمات کو اپنی دینی تعلیمات اور مواعظ کا موضوع نہیں بنایا۔ میرے محدود مطالعہ میں صرف سینٹ پیوس (Saint Pius) دہم وہ پہلے (اور غالباً آخری) پاپائے روم ہیں جو فقراء کے طبقہ کی اصلاح کے لیے فکر مند ہوئے۔ (منیر بعلبکی المورد (قاموس، انگلیزی۔ عربی) جزو معجم الأعلام حصہ ''P'' میں دیکھیں)

کیا گیا ہے جس سے بآسانی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس نظام میں شراب کی خرید و فروخت اور عام بیع و شرا اور استعمال اقتصادی زندگی کے لیے مفید سمجھا گیا ہے بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزو مانا گیا ہے۔

سودی کاروبار:

علاوہ ازیں انجیل و تورات سے ''سودی'' لین دین کی بھی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ البتہ تورات میں یہ شرط بھی مذکور ہے کہ ''سود'' محتاج اسرائیلی سے نہ لیا جائے۔ بلکہ صرف اسرائیلی (یہودی) سے نہیں لینا چاہیے، باقی افرادِ انسانی سے سود لینا درست ہے، چنانچہ موجودہ انجیل کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام) ایک تمثیل میں فرماتے ہیں۔

> ''اس کے مالک نے جواب میں اس سے کہا: اے شریر اور سست نوکر! تو جانتا تھا کہ جہاں میں نے نہیں بویا وہاں سے کاٹتا ہوں اور جہاں میں نے نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتا ہوں بس تجھے لازم تھا کہ میرا روپیہ ساہو کاروں کو دیتا تو میں آکر اپنا سود سمیت لیتا۔''(۱)

اور انجیل لوقا میں ہے:

> ''پھر تو نے میرا روپیہ ساہو کار کے یہاں کیوں نہ رکھ دیا تاکہ میں آکر اسے سود سمیت لے لیتا۔''(۲)

اور توراۃ میں ہے:

> ''اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر۔''(۳)

اور دوسری جگہ مذکور ہے:

(۱) انجیل متی، باب ۲۵ آیات: ۲۷، ۲۸

(۲) انجیل لوقا، باب ۱۹، آیت ۲۴

(۳) تورات، باب ۲۲، آیت ۲۵ خروج

"تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دیجیو، نہ نقد کے سود پر، نہ غلہ جات کے سود پر نہ کسی چیز کے جس کی رعایت سود پر کی جاتی ہو، تو اجنبی کو سودی قرض دے سکتا ہے پر اپنے بھائی کو سودی مت دیجیو۔"(۱)

---

(۱) تورات استثناء، باب ۲۳، آیات ۱۹، ۲۰۔ حضرت مصنف رحمہ اللہ نے گو یہاں نصرانیت کے ساتھ ملا کر یہودیت کی معاشی تعلیمات کا ذکر کر دیا ہے اور بالخصوص حوالہ ۷، ۸ توراۃ (Torah) یہود کی مذہبی کتاب ہی کے حوالہ جات ہیں مگر دونوں —— یعنی عیسایت اور یہودیت کی معاشی تعلیم —— الگ الگ بیان نہیں کیا۔ میں نے ابھی تک توراۃ کا مطالعہ نہیں کیا البتہ عالم اسلام کے مقتدر عالم شیخ الاستاذ محمد یوسف قرضاوی، پروفیسر شریعۃ کالج دوحہ، قطر کا ایک بیان جو یہودیت کی معاشی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہے —— میرے سامنے ہے، اس کا ترجمہ یہاں نقل کر رہا ہوں۔ آپ بھی پڑھ لیں:

"اسلامی معاشرہ نے دین کے زیر سایہ اپنا دنیوی (معاشی) سفر جاری رکھا۔ مسلمان تجارتی کاروبار کرتے تھے اور یہ کاروباری سرگرمیاں (Business Activities) انہیں اللہ کریم کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھیں۔ اس کے برعکس قرون وسطی (Middle Ages) کے بڑے بڑے ممالک اور عیسائی یورپ کی حکومتوں کے عوام تجارتی سرگرمیوں کے بارہ میں دو نظریوں (Theories) کی کشمکش کا شکار تھے۔ ایک نظریہ تخلیص تھا، جس کے مطابق معاشی گرمی اور تجارت میں مشغولی کی وجہ سے دل میں جو گناہوں کی گندگی پیدا ہوئی ہے اس سے اسے کس طرح پاک و صاف کیا جائے؟ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ ان (یہود) کے دینی رہنماؤں کی مخالفانہ تعلیمات کے باوجود جو لوگ تجارت اور صنعت و حرفت (Commerce & Industry) میں لگ جاتے ہیں وہ ملعون (Cursed) ہو جاتے ہیں کیونکہ معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہو جانا کوئی عام گناہ نہیں بلکہ ابدالآباد کی (Ever Lasting) لعنت کا موجب بن جاتا ہے۔ (ایسے کاروباری لوگوں پر) یہ لعنت زمین میں بھی برستی ہے اور آسمان سے بھی، دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ مشہور یہودی قسیس (Priest) اگیتن کے بقول: معاشی کاروبار دراصل گناہ ہے کیونکہ یہ نفس (دل) کی توجہ حق (اللہ کریم) سے ہٹا دیتا ہے۔" (علامہ قرضاوی: الحلال والحرام فی الاسلام، باب ثانی، الکسب، موقف الکنیسۃ فی التجارۃ)

اب آپ اندازہ فرمائیں کہ اتنی سخت اور تہدید آمیز مذہبی مخالفت کے بعد کون ہو گا جو معاشی سرگرمیوں میں حصہ لے گا جو ایسی مذہبی تعلیمات کا پیرو ہوتے ہوئے کمانے اور خرچ کرنے کا سوچے گا؟ غالباً یہ مخالفت مذہبی نہیں اس مذہب کے قسیسین (Priests) اور راہبوں کے ذہن اور رجحان کی پیداوار ہوں گی، جن سے آخر کار یہود نے بغاوت کی ہو گی اور آج وہ دنیا کے سرمایہ اور بازار زر (Money Market) کو سود خواری کے آلہ (Tool) سے کنٹرول کر رہے ہیں یہاں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ علامہ قرضاوی نے کنیسہ (Synagogue- Synagog) (یہودی عبادت گاہوں کو کہتے ہیں۔) کا ذکر کر کے دراصل یہاں یہودیت کی معاشی تعلیمات پر ہی روشنی ڈالی ہے۔

یہود کے قسیسین (Priests) نے نہایت عیاری سے جواز سود کے لیے طریقہ اختیار کیا کہ توراۃ کی پرانی

(ب) زرتشتی مذہب کی معاشی تعلیم:

زرتشتی تعلیم کی مبینہ الہامی کتابیں "ژند اور اوستا" کا اگرچہ میں نے مطالعہ نہیں کیا لیکن اس مذہب کے عقیدہ کے مطابق بانی مذہب (زرتشت) کے علاوہ نبیوں اور رسولوں کے صحیفے جو "دساتیر آسمانی" کے نام سے موسوم ہیں، فارسی اور پہلوی زبان میں نہ صرف میری نظر سے گزرے ہیں بلکہ عرصۂ دراز تک زیر مطالعہ رہے ہیں، مگر توراۃ اور انجیل کی طرح یہاں بھی اس سلسلے میں مجھے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور ظالمانہ طریق پر حصولِ دولت و ثروت کی ہجو و مذمت کے باوجود بصورت احکام و قوانین اقتصادی نظام کی ترتیب میں مطلق کوئی مدد نہیں ملتی۔

(ج) ویدک دھرم کی معاشی تعلیم:

اسی طرح ویدوں کی اصل زبان سنسکرت سے ناواقفیت کی وجہ سے مجھ کو ان کے معتبر تراجم اور ان کی بنیادی تشریحات کی کتابوں ستھیارتھ پرکاش "اور آدی بھاشیہ بھومکا" پر ہی اعتماد کرنا پڑا، میں نے عرصۂ دراز تک ایک مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ مختلف اوقات میں ان کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور کافی غور و خوض کے ساتھ ان کے مطالب و معانی اور مفہوم و مراد تک پہنچنے کی سعی بلیغ کی ہے لیکن بلا شائبہ تعصب و ارادہ مبالغہ، دیانت و انصاف کے ساتھ اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان میں بھی یہ مسئلہ دولت مندوں کے بے جا مظالم کے خلاف چند پند و نصائح یا ان کے مقابلہ میں جنگ کے علاوہ اقتصادی نظام کے لیے احکام و قوانین کی دفعات و جزئیات کی شکل میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

تعلیمات یعنی عہد نامہ قدیم (Old Testaments) میں تحریف کر کے "اپنے بھائی" کا مفہوم صرف "یہودی بھائی" لے لیا اور باقی تمام انسانیت کو سود کے استحصالی حربہ (Exploitative Tool) سے معاشی ہلاکت سے ہمکنار کرنے کا راستہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ "سفر تثنیۃ الاشتراع" میں ہے۔

"تو اجنبی (غیر یہودی) کو سود پر قرضہ دے دیا کر مگر اپنے بھائی (یہودی) کو سود پر قرضہ مت دینا۔" (استثنا: ۲۳، ۲۰)

آج ساری دنیا کی معاشی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے۔ (العیاذ باللہ)

(د) منو کا قانون برائے سود و سرمایہ کاری:

مزید برآں یہ کہ ''منو'' کا قانون جس پر ہندوستان کے مشہور و قدیم مذہب کے نظامِ تمدن کی بنیاد قائم ہے، ایک حد تک ''سود'' کی اجازت دیتا ہے، وراثت میں تقسیمِ دولت کی بجائے مشترک خاندان (Joint Family) کے نام سے ''کنز'' اور ''جمع دولت'' کو جائز قرار دیتا ہے اور اس طرح ''مذموم سرمایہ داری'' کو دھرم کی پناہ مل جاتی ہے۔

> ''اس کی شہادت موجود ہے کہ سودی قرض دینے کا کام ویدوں کے عہد میں یعنی اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے بھی کیا جاتا تھا، پانچویں صدی قبل مسیح سے ایسے پیشہ ور بینکروں کے بارے میں پکی شہادتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو روپیہ قرض دیتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنڈیاں روانہ کرتے تھے، ان بینکروں کو ''سریستی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔''

بدھ عہد کے مشہور تجارتی مرکزوں یعنی چمپا کا راجہ گریہا، سر اوستی، کوسامبی اور آونتی میں بہت سے نہایت باثر سریستی، یعنی بینکر (Bankers) رہا کرتے تھے۔[1]

کوتلیا کے ارتھ شاستر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سود لی جا سکتی ہے؟ دھرم شاستروں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، ارتھ شاستروں اور دھرم شاستروں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ ارتھ شاستروں میں کسی خاص ذات کے لیے ساہو کاری کے پیشہ کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے لکہ دھرم شاستروں میں یہ پیشہ صرف ''ویشوں'' کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔[2]

(ر) مباحث کا خلاصہ:

ان حوالہ جات سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس نظامِ

---

(۱) ماخوذ از مضمون رسالہ جامعہ دہلی، فروری ۱۹۳۹ء

(۲) حوالہ بالا

اقتصادی میں ''مہاجنی سود'' اور ''جمع سرمایہ'' کو باقاعدہ قبول کیا گیا ہو، اس میں مذموم سرمایہ داری کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے اور مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش اور سرمایہ و محنت کی کشائش کا اس کے ذریعہ سے حل کرنا، ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ (۱)

---

(۱) علاوہ ازیں، جہاں معاشی پیشوں (Economic Professions) کی مذہبی تقسیم معاشرتی طبقات کی بنیاد پر کی جائے کہ اعلیٰ نسل کا برہمن صرف وعظ اور حکومتی حکم کے ذریعہ سے معاش کمائے گا، شتری (کھتری) فوجی خدمات کو ذریعہ روزگار بنائے گا، ویش زراعت اور تجارت کر کے معاش بنائیں گے اور شودر صرف حقیر خدمات یا زیادہ سے زیادہ عام پیشے مثلاً آہن گری، نجاری، ظروف سازی وغیرہ اختیار کر کے ذلت آمیز معاش پر قانع رہیں گے۔ وہاں معاشی خوشحالی کہاں سے آئے گی؟ البتہ یہاں دولت اور ذرائع دولت کی غیر منصفانہ بلکہ ظالمانہ تقسیم ہوگی، غریب اور امیر کا فرق نمایاں ہوگا اور طبقاتی کشمکش کو زور آزمائی کا کھلا میدان ملے گا۔
اس طبقاتی نظام کے قانون کا مؤلف منو سمرتی (۵۰۰ ق م) لکھتا ہے: بھگوان (عظیم و جلیل پروردگار) نے دنیا کی بھلائی کے لیے برہمن کو اپنے منہ سے، مشتری کو اپنے بازوؤں سے، ویش کو اپنی رانوں سے اور شودر کو اپنے پاؤں سے پیدا کیا اور ان کے لیے دنیا کی بھلائی کے لیے علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں تفویض (Assign) کر دیں۔ برہمن کے ذمہ وید کا پڑھانا سکھانا، بھگوان کے نذر و نیاز اور صدقات کا قبول کرنا اور لاگو کرنا، شتری (کھتری) کے ذمہ لوگوں کا دفاع کرنا، صدقہ اور نذر و نیاز دینا اور وید کا پڑھانا لکھانا اور شہوات سے بچ کر رہنا ویش مواشی پالے گا ان کی دیکھ بھال کرے گا، وید کی تلاوت کرے گا اور تجارت اور زراعت کرے گا جبکہ شودر کے ذمہ صرف مذکورہ بالا تین طبقات کی خدمت کرنا ہوگی۔ (منو شاستر: باب اول) علاوہ ازیں برہمن کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شودر کا مال بغیر کسی رکاوٹ جب چاہے اور جتنا چاہے لے لے، شودر اس کا غلام ہے اور غلام کا مال آقا کا مال ہوتا ہے (منو، باب ۸) بادشاہ (حکومت) اس (برہمن) پر کسی بھی حالت میں کوئی ٹیکس نہیں لگا سکتا، مجبوری (فاقہ وغیرہ) کی حالت میں برہمن لڑ کر (یعنی دوسروں سے چھین کر) بھی اپنی بھوک مٹا سکتا ہے، اور اس کشمکش میں اگر برہمن (اس کو بھوک مٹانے سے روکنے والے کو) قتل کر دے تو حکومت قصاص میں صرف اس کا سر مونڈ سکتی ہے، اگر دوسرا برہمن کو قتل کرے تو اسے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا (منو، باب ۲) اور شودر مال کما سکتا ہے نہ جمع کر سکتا ہے کیونکہ اس طرح وہ برہمن کو ناراض کرے گا۔ (منو، باب ۱۰)
پھر اس تقسیم کو مذہبی تقدس (Sanctity) بھی حاصل ہو۔ اس معاشرہ یا ملک میں معاشی ترقی کبھی متوازن (Balanced) نہیں ہوگی، فرد (Individual) مخصوص خاندان، گروپ یا طبقات ترقی کریں گے مگر عام یا تمام معاشرہ ترقی نہیں کرے گا، یہاں ایک طرف کروڑ پتی (Millionaires) ہوں گے تو ان کے ساتھ بنیادی ضروریات زندگی سے محروم (Paupers) بھی ہوں گے موجودہ ہندوستان ـــــ جو اب معاشی میدان میں ایک دوسری عالمی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے کی معاشی ترقی کا حال دیکھ لیں۔ جہاں ایک طرف بے حساب دھن =

اس جگہ مذاہب عالم کے ان شواہد و نظائر پیش کرنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ اقتصادی نظام کے اساس و بنیاد اور نصب العین (Creed) کے پیشِ نظر نیز سرمایہ و محنت اور سرمایہ دار غریب سے متعلق جدید و قدیم کشمکش کے متعلق "مذہب" اور دھرم کی معرفت قانونی اور اخلاقی دونوں طریقوں سے جس قدر صاف اور تفصیلی حل اسلام کے اقتصادی نظام میں پایا جاتا ہے، دوسرے مذاہب کی روایات و تعلیم بھی نظر نہیں آتا، بلکہ اکثر مذاہب ؍ ادیانِ موجودہ میں مذہب کی معرفت اقتصادی نظام کا وجود ہی مفقود ہے۔

دیگر دنیوی نظام ہائے معاش اور اسلام کا اقتصادی نظام

گذشتہ سطور میں اسلام کے اقتصادی نظام کا اور موجودہ مذاہبِ عالم کے اقتصادی نقطۂ ہائے نظر کا مقابلہ زیر بحث آچکا، اب ضروری ہے کہ اس کے دوسرے جزو کو بھی زیرِ بحث لایا جائے، یعنی اسلام کے معاشی نظام اور دنیوی معاشی نظام کے درمیان بھی موازنہ کیا جائے تاکہ اسلام کے نظامِ معاشی کی برتری واضح ہوسکے۔

اس بحث کا مطمح نظر ہے کہ دنیوی نظامہائے اقتصادی جو اس دورِ جدید میں دنیا یا دنیا کی حکومتوں پر مسلط ہیں اور یا پراپیگنڈا کے ذریعے مسلط ہونا چاہتے ہیں، اسلامی اقتصادی نظام کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اور کیا واقعی اقتصادی نظام کے مقصد عظمی (Great Aim) کا حل ان کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے؟ یا اسلام کا اقتصادی نصام ہی اس مرض کا واحد علاج ہے؟

موجودہ دور میں دنیا کی حکومتوں پر مختلف شکلوں میں مکمل یا ناقص دو ہی انتظاموں کا تسلط ہے اور اس لیے وہی دونوں قابل بحث ہیں ایک فیسزم (Fascism) اور دوسرا سوشلزم (Socialism)۔

پائے کوب ہے تو دوسری طرف بھوک، افلاس اور محرومی کا دیو رقص کناں نظر آرہا ہے یہ معاشی ترقی تو نہیں معاشیات کی طبقاتی تقسیم ضرور ہے۔

فاشیت یا نا تسیت (Fascist):

بنیادی معاشی اصول:

❶ فسیزم یا فاشیت کا نظریہ یا فلسفہ اگرچہ اپنے اندر ایک طویل بحث رکھتا ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ حسبِ ذیل چند اصول پر قائم ہے اور اس کا تمام نظام ان ہی اصول کے ساتھ وابستہ ہے۔[1]

(۱) نازی ازم (Nazi Ism) یا ناتسیت بھی اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ نازی ازم یا فاشزم کا اصل روپ وہی ہے جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۵ء میں اوڈلف ہٹلر (Adolf Hitler) کے دور اقتدار میں جرمنی میں نظر آیا، مگر اس کا فلسفہ یا سوچ کے ڈانڈے انسان اور حکومت کے تصور کے ابتدائی دور سے جا ملتے ہیں۔ اگر سادہ الفاظ میں کہنے کی کوشش کی جائے تو فاشزم نسلی برتری کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان یا گروہ اس لیے برتر ہے کہ وہ خاص نسل یا خون سے تعلق رکھتا ہے یہی بات ہٹلر نے یہودیوں کے خلاف اپنے آپ کو آریائی ہونے کی وجہ سے برتر ہونے کے لیے کہی تھی۔ دراصل یہ قوم اسی کا فلسفہ ہے مگر اس کے بہت سے اور پہلو بھی ہیں۔ یہ ہنگامہ آرائی میں پھلتا پھولتا ہے اور امن پسندی سے نفرت کرتا ہے بینتو مسولینی (Benito Mussolini) (۱۸۸۳ء - ۱۹۴۵ء) انسائیکلو پیڈیا اٹالیانہ (Encyclopaedia Italiana) میں لکھتا ہے: فاشزم مستقل امن کی ضروریات یا افادیت پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ امن پسندی سے نفرت کرتا ہے۔ اس کے مطابق امن پسندی جدوجہد سے گریزاں اور قربانی کے موقع پر بزدلی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ صرف اور صرف جنگ ہی تناؤ کی شدت کے مطابق انسانی توانائیوں کو ابھارتی ہے اور ان لوگوں کی عظمت پر مہر ثبت کر دیتی ہے، جو اسے قبول کرتے ہیں، بقیہ تمام آزمائش افراد کو موت یا زندگی کے انتخاب سے دوچار نہیں کرتیں۔ فاشزم ریاست کو ایک دیوتا کا درجہ دیتا ہے جس کی قربان گاہ پر فرد کے حقوق اور آزادی کی بھینٹ چڑھانا ضروری ہے۔ بقول گیووانی جیسٹائل (ایک ممتاز فاشسٹ فلاسفر) میری شخصیت دبی نہیں بلکہ خاندان، ریاست اور جذبہ میں مدغم ہو کر ابھری، مضبوط اور وسیع ہوئی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ فاشزم کا سارا نظریہ ہی ریاست کا رہین منت ہے لہذا فاشزم کا شعار (Motto) ہی ریاست کو تقویت دینے، زیادہ با اختیار بنانے بلکہ مقدس گائے بنانے پر ہے۔ فاشسٹ ماٹو (Fascist Motto) کے الفاظ پڑھ کر آپ اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

"Each for all and all for each. Nothting outside the state. Nothing against the State. Every thing in the state" (Quoted by Al- Haj A. d. Ajijola: The Islamic Concept of Social Justice., Islamic Publications, Lahore,. 1977. P. 286)

ترجمہ: ہر ایک سب کے لیے اور سب ہر ایک کے لیے مگر ریاست کے باہر کچھ (ایسا) نہیں (ہو گا) ریاست کے خلاف کچھ نہیں ہو گا، ہر شے (پر تعلق دور کوشش) ریاست کے اندر رہ کر ہی ہو گی۔

=

❶ تمام ذرائع پیداوار افراد کے ہاتھوں میں اس طرح آزاد ہوں کہ ان کا مفاد مخصوص افراد (Certain Individuals) کے حق میں ثابت ہو نہ کہ جماعت اور سماج کی اکثریت (Majority of the Society) کے حق میں۔

❷ پیداوار نجی فائدہ (Personal or private benefit) کے اصول پر ہو نہ کہ عوام کی ضروریات کے فائدہ کے اصول پر اور اس لیے وہ ضروریات کے تخمینہ کی مطابقت کی بجائے ذاتی اغراض (Personal Motives) کے اندھادھند طریقہ پر ہو۔

❸ ان ہر دو مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے ایسے طرزِ حکومت کی طرح (Base) ڈالی جائے جس میں قوانین کے ذریعے سرمایہ داری کی حفاظت و ترقی کا سامان فراہم ہو سکے۔

فاشیت کی مختصر تاریخ:

اس اجمال کی تفصیل کے لیے فاشیٹ یا نسطائیت کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے کائناتِ انسانی میں عادلانہ نظام کے مقابلہ میں سرمایہ دارانہ نظام نے ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں ابھرنے اور دنیا پر چھا جانے کی سعی کی ہے اور اس کو اپنی سعی میں کامیابی بھی ہوتی رہی ہے۔ قریبی زمانے میں ایسی سعی و کوشش کا ترقی یافتہ نظام ''قسطائیت'' کے نام سے موسوم ہے جو یورپ کی حکومتوں میں جرمنی اور اٹلی پر خصوصیت کے ساتھ حاوی ہے اور انگلستان و فرانس کو بڑی حد تک اس نے فتح کر لیا

سرمایہ داری کے خلاف متعدد نعرے اور انقلابی طریقہ کار رکھنے کے باوجود فاشزم رجعت پسند عناصر اور سرمایہ داروں کا خلیف ہے کیونکہ سرمایہ داروں کو جب محنت کشوں (Working Class) کی طرف سے خطرہ ہو اور خطرہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب ہنگامہ اقتصادی بحران (Economic Depression) کا زمانہ ہو اگر ملکیت رکھنے والا اور حکمران طبقہ محنت کشوں کو پولیس یا فوج کے ذریعہ معمول کے جمہوری طریقہ سے نہ دبا سکے تو یہ فاشٹ طریقہ اپنا لیتا ہے۔ یہ مقبول عوامی تحریک پیدا کرتا ہے، جسے بے روزگار نوجوانوں کی حمایت جلد اور زیادہ مل جاتی ہے اور نتیجہ سرمایہ داروں کا دفاع میں نکلتا ہے۔

فاشزم جمہوریت اور سوشلزم کا مخالف اور سرمایہ دارانہ ڈکٹیٹر شپ کا حامی بلکہ داعی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: معارف فیچر سروس اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، شمارہ نمبر ۱۶۵، یکم جولائی ۲۰۰۷ء جمہوریت اور آمریت از جواہر لال نہرو: ص ۱ تا ۴)

ہے اور امریکہ اور جاپان بھی اس کے لیے گہوارہ بنے ہوئے ہیں۔

جاگیر داری دور:

یورپ میں تقریباً پندرہویں صدی عیسوی سے دورِ جہالت ختم اور دورِ علم و ترقی شروع ہو گیا تھا، اور بعض یورپین حکومتیں دنیا کی جدید دریافت اور حصول زر و مال کے لیے ادھر ادھر تگ و دو میں منہمک نظر آنے لگی تھیں، اس وقت انگلستان میں جاگیر داری (Land Lordism) اور شاہی استبدادیت (Tyranny of Monarchisn) کا دور دورہ تھا، مگر آہستہ آہستہ تجارتی اور کاروباری طبقہ (Business Class) مضبوط ہوتا جارہا تھا، اور بعض سیاسی حالات نے ان کی قوت کو اور زیادہ مضبوط بنادیا تھا اور وہ ملک کی بہت بڑی طاقت سمجھے جانے لگے تھے۔ ان کا بیشتر کاروبارِ تجارت ''اون کی تجارت'' تھا۔ خاندانِ اسٹوارٹ (Staurt) جب انگلستان پر حکمران ہوا تو اس نے ان تاجروں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر تجارت پر قانونی پابندیاں عائد کرنی شروع کر دیں، نتیجہ یہ نکلا کہ تاجر پیشہ طبقہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور ۱۶۴۴ء میں انگلستان کی مشہور خانہ جنگی میں انہوں نے فتح پائی اور جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ اور شاہی نام کو برقرار رکھتے ہوئے شاہی اقتدار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ان کو اپنی تجارت کے فروغ دینے کا کافی موقع میسر آیا اور قوانینِ حکومت کے ذریعے ان کو بیش از بیش مدد ملی۔

تجارتی دور:

اگرچہ انگلستان کے اس دور میں جاگیرداری سسٹم ختم ہو چکا تھا مگر تجارت کے اس دور میں تجارت کا مفہوم عوام کی فلاح و بہود نہ تھا بلکہ مخصوص افراد اور خاص طبقہ کی برتری تھا۔ اس لیے اس طبقہ نے ذاتی اور نجی کارخانے کھول کر دولت کمانی شروع کی اور قوانین کی مدد سے اس کی ترقی کے ممکن ذرائع بہم پہنچائے، لیکن ابھی تک چونکہ کارخانوں میں صرف ہاتھ ہی سے کام (Manual Work) ہوتا تھا اس لیے آمدنی

بھی محدود ہوتی تھی اور مال بھی حسبِ ضرورت تیار نہ ہو پاتا تھا اور دولت و سرمایہ کے پجاری (Avaricious) فراوانی دولت کے دوسرے بہترین ذرائع کے لیے بیقراری کے ساتھ متلاشی نظر آتے تھے۔

مشینی دور:

تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد یعنی اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشینوں کی ایجاد شروع ہو گئی۔ اب دستی کارخانوں (Handi Factories) کی جگہ مشینری کارخانوں نے لے لی اور اس طرح ان تاجروں اور سرمایہ داری کے مخصوص طبقہ نے دولت کے بے شمار خزانے حاصل کرنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب مشینوں کے ذریعے کام شروع ہو گیا تو دست کاروں پر آفت نازل ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو اپنا کام بند کر دینا پڑا اور افلاس کی مصیبت سے محفوظ رہنے کے لیے مشینی کارخانوں میں ایک مزدور کی حیثیت سے وہ اپنی ''محنت'' کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور ہوئے اور کارخانہ دار ہونے کی بجائے مشین مالک کے غلام بن کر رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

اس واقعہ سے ہٹ کر پھر ایک مرتبہ چودھویں صدی عیسوی کی طرف نظر ڈالیے، انگلستان میں اون کی تجارت کے فروغ پا جانے سے زمینداروں کو فراوانی دولت کے لالچ نے مجبور کیا کہ وہ کاشتکاروں سے زمینیں خالی کرائیں اور ان میں ''باڑے'' قائم کر کے بھیڑوں کی پرورش کریں تاکہ اون کی تجارت سے فائدہ اٹھائیں، جو زمینداری آمدنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی، یہ وباء اس قدر پھیلی کہ ہزاروں لاکھوں کسان افلاس اور بھوک کا شکار ہونے لگے اور بیکاری ترقی پانے لگی۔

اب جبکہ مشینوں کا دور شروع ہوا تو زمینداروں نے کاشت بھی مشینوں کے ذریعہ شروع کر دی اور کسانوں کی رہی سہی معاشی سبیل (Economic Means) کو اس طرح ختم کر دیا گیا۔ اب ان کے لیے بھی بجز غلامانہ مزدوری (Slavish Labour) کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ پھر بھی ایک بہت بڑی تعداد کی قوت لا یموت کے لیے

سامان مہیا نہ ہو سکا اور طرفہ یہ کہ مشینوں کے اس صنعتی انقلاب نے ان دونوں "کاریگروں" (Artisons) اور "کسانوں" (Farmers) کو دیہات و قصبات کی آزاد اور پر فضا زندگی کو خیر باد کہہ کر شہروں کے غلیظ اور گندہ مقامات میں غلامی کی طرح آباد ہونا پڑے۔

صنعتی دور:

صنعتی انقلاب کا یہ وہ ابتدائی دور تھا جس میں فیکٹریوں کے متعلق نہ قوانین تھے اور نہ مزدوروں کی ترقی یافتہ یونین تھی۔ لہذا سرمایہ داروں نے من مانی حکومت کی اور اپنی فراوانی دولت کے لیے مزدوروں پر بے پناہ مظالم روا رکھے۔ ان سے چودہ سے لے کر سولہ سترہ گھنٹہ تک عموماً کام لیا جاتا اور بعض اہم کاموں کے موقع پر مسلسل بیس سے تیس گھنٹہ تک بھی ان کو مصروف رہنا پڑتا، اور اس طرح ضعیف و ناتواں افراد بہت جلد موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس بہیمانہ محنت (Beastly Labour) کرانے کے بعد ان کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی۔ اور رہنے کے لیے ایک چھوٹی کوٹھڑی یا ایک ایسا کمرہ دیا جاتا تھا، جس میں بہ مشکل لیٹنے کے لیے جگہ میسر آسکتی تھی اور وہ غلاظت، عفونت اور کمروں میں ہوا کے نفوذ کے لیے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے جہنم زار بنے ہوتے تھے۔

سرمایہ داری دور:

سرمایہ داری کا یہ وہ بھیانک نقشہ ہے جو سب سے پہلے انگلستان میں بروئے کار آیا اور اس کے بعد یورپ کی تمام حکومتوں پر اصول بن کر چھا گیا، چونکہ سرمایہ داری کے اس سسٹم میں مفادِ عامہ (Common Weal) اور عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی سوال ہی نہ تھا، بلکہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تمام ذرائع پیدائش کو اپنی ذاتی مفاد کے لیے خاص کر لیا جاتا تھا اس لیے فیکٹریوں اور مشینوں میں جو سامان تیار ہوتا تھا وہ کم سے کم اجرت دے کر زائد سے زائد مال تیار کرانے اور ذاتی فائدہ

حاصل کرنے کے اصول پر عالم وجود میں آتا تھا۔ اس لیے گوداموں میں مال کی فراوانی ہونے لگی اور نکاسی کی محدود راہوں کی وجہ سے مال ضائع ہونے لگا، نیز اس فراوانی سے مزدوروں اور غریبوں کو مطلق فائدہ نہ پہنچا اور وہ اپنی ضروریات کے لیے ان چیزوں کی خریداری سے اب بھی اسی طرح محروم رہے جس طرح مال کے بنانے کے ابتدائی دور میں تھے۔[1]

نوآبادیات کا آغاز (Start of Colonization):

لہذا سرمایہ داری کے اس بھوت نے دوسرے ممالک پر لالچ اور حرص و آز کی نگاہ ڈالنی شروع کر دی اور ''ھل من مزید'' پکارتے ہوئے ان کو محکوم بنانے کے لیے قدم آگے بڑھایا اور اپنی جوع الارض (زمین کی بھوک) کو پورا کرنے کے لیے اپنے ملک کے آزاد کاروباری لوگوں کو غلام بنانے کے بعد کمزور ملکوں اور قوموں کو غلام بنانا شروع کر دیا اور اٹھارہویں، انیسویں صدی میں افریقہ جیسے براعظم میں یورپین نوآبادیات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی آخر اسی استعمار (Colonialism) کی نظر ہو گیا اور اس طرح تھوڑے سے عرصہ میں ساری دنیا ایک طرح انگلستان کے سرمایہ داروں کی خصوصاً اور دوسری سرمایہ دار طاقتوں کی عموماً تجارتی منڈی بن گئی۔

ذرائع پیداوار کو مخصوص طبقے کی ذاتی ملکیت قرار دینے اور عوام کی بہبودی سے قطع نظر ان کی پیداوار کو نجی اور انفرادی مفاد کی بھینٹ چڑھا دینے کا یہ سسٹم اب بھی مطمئن نہیں ہے اور اب خود آپس میں دست بہ گریباں نظر آتا ہے۔ ہر ایک ملک اپنی اس تجارتی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے جانا چاہتا ہے اور اس دوڑ میں آزاد

---

(۱) یہ بات کہ مشینوں کی بدولت کثرت سے مال تیار ہونے اور گوداموں کے پُر ہو کر مال کے ضائع جانے کی حالت میں مزدور اور غریب کی قوت خرید اس سے فائدہ اٹھا نہیں سکتی اور سابق بدحالی ہی میں گزارتی ہے، تفصیل طلب اقتصادی مسئلہ ہے جو قوت خرید اور توازن تیاری کی بحثوں پر مبنی ہے اس کے لیے اقتصادی معلومات کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (مصنف)

قوموں کو غلام بنانے، تباہ و برباد کرنے اور صفحۂ دنیا سے مٹا دینے کو بھی اپنا جائز حق تصور کرتا ہے۔ جرمنی، اٹلی، انگلستان، فرانس، جاپان، امریکہ وغیرہ فاشیت حکومتوں کی اس مسابقت میں عراق، البانیہ، فلسطین، زیکوسلیویکیہ، چین اور خود فرانس کا جو حشر ہوا اور ہو رہا ہے وہ اس دعوی کی روشن دلیل ہے۔ [1]

سرمایہ دارانہ نظام کا اصل روپ:

اس تفصیل سے اب آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ سرمایہ داری نظام (فسطائیت) کیا ہے اور یہ کس طرح آہستہ آہستہ عوام کی تباہی و بربادی کا باعث بنتا اور امن عام کو جنگ کی شعلہ زار ہولناکیوں میں ڈال کر خاکستر بنا دیتا ہے؟ یہ شروع میں تو اپنی شکل و صورت کو جمہوریت کی نام نہاد شکل و صورت میں چھپا کر دنیا کے سامنے آتا اور فریب دے کر عوام کو تباہ کرتا ہے جیسا کہ انگلستان اور امریکہ میں نظر آتا ہے۔ اور جب اس کا مفاد اس شکل و صورت میں خطرہ میں پڑنے لگتا ہے تو صاف کھل کر خالص آمریت (Dictatorship) کے اصل رنگ و روپ میں ظاہر ہو جاتا ہے، جیسا کہ جرمن، اٹلی اور جاپان میں ہو رہا ہے، اس لیے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ جمہوری حکومتیں فسیسزم (فسطائیت) سے الگ کوئی چیز ہیں بلکہ ڈکٹیٹری (آمریت) ہو یا کوئی موجودہ جمہوری نظام ان سب میں وہی سرمایہ دارانہ

---

(۱) اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت میں تو اس جنگِ عظیم نے بہت ہی بھیانک نقشہ تیار کر دیا ہے اور جوع الارض میں مسابقت اور تنگ ودو کے نتیجہ نے ان طاقتوں کی باہمی رقابت کو ہلاکتِ عالم کا اجارہ دار بنا دیا ہے سچ ہے "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ" خشکی اور تری میں جو فساد برپا ہے یہ انسانوں کے خود اپنے ہاتھوں کا کمایا ہوا ہے۔

اور جبکہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے بساطِ جنگ پر جرمنی، اٹلی اور جاپان کا فاسشزم اور نازی ازم تو شکست کھا کر موت کی آغوش میں جا چکا ہے اور برطانیہ اور امریکہ کی مفروضہ ڈیماکریسی (جمہوریت) فریب آمیز رنگ میں اسی فسطائیت اور نازیت کا نفرت انگیز مظاہرہ کر رہی ہے اور ایشیائی اقوام کو غلام رکھنے میں ہولناک استبداد کا ثبوت دے رہی ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ روس جو عوام کی فلاح اور انسانی مساوات کا علمبر دار بننے کا دعوی کرتا ہے اپنی مکمل مصالح کے پیشِ نظر ان دونوں کا حلیف اور معین بنا ہوا ہے۔ "ان هذا لشی عجاب"

نظام کار فرما ہے اور ان سب کے پیشِ نظر یہی ایک مقصد ہے (بقول شاعر مشرق علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ)

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

بہرحال تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی ابتداء انگلستان سے ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ تمام یورپ پر چھا گیا، اور آج جرمنی و اٹلی اس کے بہت بڑے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور مملکت انگلستان و امریکہ بھی اصولاً ان کی تائید ہی میں ہے اور اگرچہ اس وقت حریف یا باہمی مسابقت میں قریب نظر آتے ہیں لیکن اصول میں متحد و متفق ہیں اور اس طرح جرمنی کا نازی ازم، جمہوریتِ امریکہ، برٹش ڈیما کریسی (British Democracy) و شاہی نظام، اٹلی کی فسطائیت اور جاپان کا شہنشاہیت پسند نظام (Imperialism) یہ سب ایک ہی قسم کی سرمایہ داری کے مختلف نام یا ایک ہی صورت کے مختلف رنگ سے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام (فسطائی نظام) کا اسلامی اقتصادی نظام سے موازنہ:

اس تفصیل کے بعد بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے مقابلے میں "فسطائیت" کو پیش کرنا دراصل اقتصادی نظام کی توہین کرنا ہے۔

اسلام میں اگرچہ پیداوار اور ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت (Individual Private Ownership) ایک حد تک جائز رکھی گئی ہے لیکن اس کا جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ انفرادی ملکیت جماعتی مفاد (Collective Welfare) سے کسی حال میں متصادم نہ ہونے پائے، بلکہ اجتماعی مفاد (Social Welfare) کے لیے ممد و معاون اور باعثِ تقویت ثابت ہو۔ اور جس جگہ اس تصادم کا غالب گمان ہو، وہاں اس کے مقابلہ میں جماعتی مفاد کو ترجیح دی جائے اس لیے محض اس جواز کی مشابہت سے اسلامی نظام کو فاشیت کے ہمنوا قرار دینا یا اس کے قریب تر ثابت کرنا اسلام پر بہت بڑا ظلم اور حد درجہ ناانصافی ہے۔ ذیل کے نقشہ سے اس کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام	فسطائی اقتصادی نظام
① دولت و ذرائع دولت کا مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر عوام کی معاشی ہلاکت کا باعث بننا حرام ہے۔	① دولت و ذرائع دولت کو مخصوص طبقہ کی انفرادی و اجتماعی اغراض کے لیے ہونا از بس ضروری ہے۔
② انفرادی ملکیت پر شرائط کی حدود عائد ہیں۔	② انفرادی ملکیت لامحدود ہے۔
③ انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق کے زیر اثر ہے۔	③ انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق اور مفادِ عامہ سے مستغنی و بالاتر (Over & Above) ہے۔
④ اقتصادی نظام کی بنیاد عوام کے مفاد اور حاجات کے انسداد (Fulfillment of Needs) پر قائم ہے۔	④ اقتصادی نصام کی بنیاد مخصوص افراد اور خاص طبقہ کے مفاد پر قائم ہے۔
⑤ عام معاشی خوشحالی (Common Weal) ضروری ہے۔	⑤ عوام کی معاشی تباہی (Economic Crisis) و کساد بازاری (Commercial Decline) اس کا لازمی نتیجہ ہے۔
⑥ معاشی دستبرد (Economic Exploitation) کے ذریعہ حاکمیت و محکومیت اقوام لعنت ہے۔	⑥ معاشی دستبرد کے ذریعے غلامی اور اقوام کی محکومی لازمی و ضروری ہے۔

⑦اکتناز (جمع خزانہ) واحتکار (اجتماعی حقوق سے باز رہنا) کی مطلق گنجائش نہیں۔	⑦اکتناز و احتکار ضروری اور موجبِ سعادت امورِ اقتصادی ہیں۔
⑧نسلی، خاندانی اور جغرافیائی، امتیازات اس سلسلہ میں قابلِ تسلیم نہیں۔	⑧نسلی، جغرافیائی اور طبقاتی امتیازات ضروری ہیں۔

خلاصہ بحث:

ان امتیازات سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام اور فسطائی سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان کوئی ایسی مشترک کڑی (Common Feature) نہیں پائی جاتی جس کی بدولت ان دونوں میں کسی قسم کی بھی مفاہمت (Compromise) ممکن ہو سکے، اسی لیے یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ایسے نظام کو اسلامی اقتصادی نظام کے ساتھ کس طرح جوڑا جا سکتا ہے جو چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسانوں کی خوشحالی، عیش پسندی اور راحت کوشی کی قربان گاہ پر کروڑوں انسانوں کو بھینٹ چڑھادے، اور صرف یہی نہیں بلکہ عام کساد بازاری اور بیروزگاری کا باعث بن کر دنیا کے امن و امان کی تباہی و بربادی اور مظلوموں کو محکوم بنا کر ظالم کے ہاتھوں ہلاکت آفرینی کا موقع بہم پہنچائے۔

اشتراکیت (Socialism):

مختصر تعارف:

سرمایہ دارانہ نظام کے اس ظالمانہ دستبرد نے آخر مزدوروں اور غریبوں میں بھی شعور، احساس اور بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا اور انہوں نے ردِ عمل کے طور پر حقوق کے نام سے شور و غوغا مچایا، مجالس اور یونینیں قائم کیں، بغاوتیں کیں اور اٹھارہویں صدی کے آخر ہی سے شوشلزم کے نظریہ نے ان کی حمایت شروع کر دی اور روس جیسے بڑے ملک میں اس بیسویں صدی میں انقلاب برپا ہونے کے بعد کارل مارکس (Karl Marx) کے نظریہ ”شوشلزم“ کے ماتحت جدید اقتصادی نظام بھی قائم ہو گیا۔

جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مفادِ عامہ کا داعی اور مزدوروں، کسانوں اور پست مظلوم طبقوں کا حامی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا اس سے بھی موازنہ کیا جائے اور محض مذہب کے اتباع اور حسنِ ظن کی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ دونوں نظامہائے اقتصادی کے اصولوں اور عملی تجربوں کے زیرِ اثر عدل و انصاف کے ساتھ محاکمہ اور تبصرہ کیا جائے۔

مختصر تاریخ:

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سوشلزم کی تاریخ کا آغاز بھی اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ہی ہو جاتا ہے "ہیگل"[1] نے اس کو اول ایک علمی نظریہ (Theory) کی شکل میں پیش کیا اور اقتصادی امور میں بنیاد قرار دیا اور اس کے اس نظریہ کو اقتصادی زندگی بخشنے بلکہ معاشرتی اصول بنانے اور تمدنی پروگرام میں ڈھالنے والا شخص "کارل مارکس" ہے[2] اور یہی نظریہ آج کل کمیونزم کی شکل میں روس پر حاوی ہے اور دنیا میں

---

(۱) ہیگل، جورج ولہلم فریڈرک (Georg Wilhelm Friedrich Hagel) (۱۷۷۰ــــ۱۸۳۱م) مشہور جرمن فلسفی اور معیشت دان تھا۔ دراصل سوشلزم کی بنیاد اور اسے علمی اور منطقی مواد فراہم کرنے والا ہی شخص تھا۔ اس نے سوشلزم کی ابتداء اپنے نظریہ "جدلی منطق" سے کی جس کے مطابق تمام معاشی نظام بنتے، کمزور اور ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے معاشی نظام لے لیتے ہیں۔ اس کی ساری منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی ایک معاشی نظام اپنی تعلیمات اور نظریات کے ساتھ آتا ہے، لوگ اس کے پیروکار بن کر اس کے معاون بن جاتے ہیں کچھ عرصہ بعد ـــــ جغرافیائی یا قدرتی یا انسانی ذرائع کی تبدیلی کی وجہ سے وہ نظام کمزور یا غیر مقبول ہو جاتا ہے، ایک دوسرا نظام آتا ہے کچھ لوگ اس کے پیروکار بن جاتے ہیں، کچھ پہلے نظام سے چمٹے رہتے ہیں، دونوں نظاموں کے پیروکاروں میں جدل (جنگ) ہوتی ہے، بعد میں آنے والے نظام کے پیرو کار پہلے پرانے نظام کے پیرو کاروں کو ہرا کر دوسرا نظام لاگو کر دیتے ہیں۔ اور ہیگل کے مطابق یہ قصہ ابتدائے افرینش (دنیا) سے چل رہا ہے، اور چلتا رہے گا، ہیگل کے اس نظریہ کی رو سے تمام دنیوی جنگوں اور اختلافات کا موجب یہی معاشی نظام ہی ہوتا ہے۔

دراصل وہ اس بعید از قیاس اور دور از کار نظریہ کی آڑ میں کہنا یہ چاہتا ہے کہ سوشلزم کے پرچاک اس نظام کو لاگو کرنے کے لیے پہلے تمام معاشی نظاموں ـــــ اور کوئی ہیں تو ـــــ کے ماننے والوں سے جنگ و جدال کریں اور سوشلزم کو کامیاب کریں کیونکہ یہی نظام ان کے معاشی دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے۔

(۲) فریڈرک انگلز (Engels Friedrich) (۱۸۲۰ــــ۱۸۹۵م) مشہور جرمن معیشت دان کارل مارکس کے =

انقلاب برپا کرنے میں مشغول و مصروف نظر آتا ہے۔[1]

اسلام کا اقتصادی نظام اور سوشلزم:

گزشتہ صفحات میں جو اشارات اس سلسلہ میں سپرد قلم کیے گئے ہیں ان سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام جس مکمل قانون کا نام ہے اس کے ساتھ اشتراکیت (کمیونزم) کا بھی رابطہ اتحاد ناممکن ہے، اس لیے کہ کارل مارکس اور دوسرے اشتراکی راہنماؤں نے جس فلسفہ پر (مارکسزم) کی بنیاد قائم کی ہے اس میں خدا سے انکار اور الہیات کی نفی (Negation) صفِ اول میں درجہ پاتے ہیں اور اس لیے اس کا علم الاخلاق بھی اسی روشنی میں مہذب و مرتب کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے فلسفہ لادینیت کے ساتھ اسلام کا کوئی رابطہ اور تعلق قائم نہیں ہو سکتا، لیکن جب ہم اس فلسفہ کے فقط اقتصادی پہلو سے بحث کرتے ہیں اور دنیا کے دوسرے غیر اسلامی نظامہائے معاشی کے مقابلہ میں اس کو پیشِ نظر لاتے ہیں تو اس وقت ہم کو اس حقیقتِ ثابتہ (Acknowledged Reality) کے اظہار میں کوئی باک (Hesitation) نہ ہونا چاہیے کہ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی نظام کے بہت سے امور میں اسلام اور اشتراکیت باہم متقارب (Complementary) نظر آتے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دونوں ہم آہنگ ہیں اگرچہ بطریقِ کار کے اختلاف سے دونوں کی راہیں اس وادی میں قطعاً جدا جدا ہیں۔

دست راست تصور کیے جاتے تھے۔ ان علمی و عملی جد و جہد کا بھی اس تحریک میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سوشلزم کی تحریک و اشاعت میں ایک بڑا نام فرانسیسی معیشت دان فوریر شارل (۱۷۷۲ـــــ۱۸۳۷) (Fourier Charles) کا ہے، جس نے سوشلزم کے پرچار اور اس کی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ (منیز بعلبکی، المورد، جزو "معجم اعلام" حصہ F)

(۱) اگرچہ آج جرمنی کے جارحانہ اقدام کا بری طرح شکار ہے۔ (مصنف)

یہ حضرت مصنف رحمہ اللہ کی رائے آج سے ۷۰، ۲۷ سال قبل کی تھی، جب اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا۔ مگر آج کا روس اس دور کا "سویت اشتراکی جمہوریاؤں کا اتحاد" (USSR. Union of Soviet Socialist Republic) نہیں رہا، نہ اشتراکی نقلابات کی بات۔ مزید تفصیل کے لیے پہلے باب کا حاشیہ دیکھیں۔

بظاہر مشترکہ امور:

اسلامی نظامِ اقتصادی اور اشتراکی نظامِ اقتصادی کے درمیان جن امور میں اتفاق ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

❶ اکتناز اور احتکار یا جمع دولت اور مخصوص طبقہ میں دولت کی تحدید، نہ یہ جائز قرار دیتا ہے اور نہ وہ، دونوں ان ہر دو امور کو باطل اور اقتصادی زندگی کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔

❷ دونوں ضروری سمجھتے ہیں کہ اقتصادی نظام کی اساس و بنیاد عام معاشی مفاد پر قائم ہو اور ہر شخص کو معاش سے حصہ ملے اور کوئی شخص بھی اس سے محروم نہ رہے۔

❸ دونوں کا یہ دعوی ہے کہ اقتصادی نظام کے دائرہ میں تمام انسانی دنیا جغرافیائی طبقاتی اور نسلی و خاندانی امتیازات سے یکسر جدا ہو کر یکساں اور برابر حیثیت میں شمار ہو۔

❹ ان دونوں کے درمیان اس میں بھی اتفاق ہے کہ جماعتی حقوق انفرادی حقوق پر مقدم ہوں۔

❺ ان دونوں کے درمیان یہ بھی مسلم ہے کہ معاشی دستبرد کے ذریعہ حاکم و محکوم اور غلام و آقا کا سسٹم قائم نہ ہو سکے اور قائم شدہ کو مٹا دیا جائے۔

اختلافی امور:

یہ وہ امور ہیں جن میں دونوں اقتصادی نظام ہم آہنگ نظر آتے ہیں لیکن دو امر ایسے ہیں کہ جن میں ان دونوں کے درمیان بنیادی اور اساسی اختلاف ہے اور ان ہر دو امور میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح مطابقت نہیں پیدا کی جا سکتی اور یہ اختلاف اس وقت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ رونما ہو جاتا ہے جبکہ سوشلزم کا آخری درجہ ''کمیونزم'' کی شکل میں سامنے آتا ہے اور جس کا تجربہ آج کل روس میں کیا جا رہا ہے:

اسلامی اقتصادی نظام	اشتراکی اقتصادی نظام
① دولت و ذرائع دولت میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حدود قائم کر دی جائیں۔	① دولت و ذرائع دولت سے انفرادی ملکیت کو مٹا دیا جائے۔
② حق معیشت کی مساوات کے اعتراف کے ساتھ بلحاظِ معیشت، اختلاف مدارج تسلیم کرتے ہوئے احتکار کو روکا جائے۔	② بلحاظِ معیشت اختلافِ درجات کا انکار کیا جائے اور معاشی لحاظ سے بھی سوسائٹی میں مساوات تسلیم کی جائے۔

انفرادی ملکیت کا مسئلہ:

پہلا اختلافی مسئلہ اس طرح قابلِ غور ہے کہ اگر آمدنی اور ذرائع آمدنی پر انفرادی ملکیت کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو عقل اور تجربہ اس طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ ایسا ہو جانے کے بعد ذرائع پیداوار اور آمدنی میں بہت بڑا اختلال (Helter- Skelter) اور اضمحلال (Decline) پیدا ہو جائے گا اس لیے کہ انفرادی ملکیت کے نظام کو یکسر تباہ و برباد کرنے اور اس تمام سلسلہ کو اسٹیٹ کے حوالہ کر دینے کے بعد انسانوں کے قوائے عمل میں وہ زبردست تحریک پیدا نہیں ہو سکتی جو انفرادی ملکیت کی مسابقت کی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ جبکہ میری تمام ذاتی جدوجہد اور حاجات و ضروریات کا عملی نظام اسٹیٹ کے ذمہ اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے تو میں کس لیے اپنے قواءِ دماغی (Intellectual Powers) قواءِ جسمانی (Physical Powers) اور قواءِ عملی (Practical Powers) کو زیادہ محنت میں لگاؤں اور تنازع للبقاء (Struggle for Survival) کے اس میدان میں کس لیے گوئے مسابقت (Victory) حاصل کرنے کی سعی کروں۔

لیکن اس کے برعکس انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی مسابقت اور دوڑ میں جو خرابی پیدا ہونے اور اجتماعی نقصانات کے بروئے کار آنے کے اندیشے پائے جاتے ہیں، اگر ان کا انسداد ضروری قرار دے کر قواءِ عملی و دماغی کو بھی اپنی فطری نشو و

نما (Natural Growth) کے مطابق کام کرنے کے لیے موقع بہم پہنچایا جائے تو یہ طریق کار ہی صحیح طریقِ کار ہو سکتا ہے، چنانچہ روس کے گزشتہ دس سالہ پروگرام کی ترمیم نے بھی اس کی تصدیق اس طرح کر دی ہے کہ بہت سی زمینیں معطل (Waste) رہ جانے اور ذرائع پیداوار میں رفتار کے سست پڑ جانے کی وجہ سے اب جدید دس سالہ پروگرام میں ایک حد تک زمینوں میں انفرادی قبضہ کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور بعض مقامات پر ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت داخل ہونے لگی ہے اور تجربہ سے حقائق تک پہنچنے کی اگر یہی طلب صادق رہی تو وہ وقت دور نہیں کہ اسلام کے نظریہ اور اصول ہی کو اصولِ کار بنانا پڑے۔

اس لیے قرآن عزیز نے باوجود اس بات کے تسلیم کر لینے کے کہ اصل ملکیت صرف خدا کی ہے اور اسی لیے تمہاری انفرادی ملکیت میں خدا کی عام مخلوق کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس میں اجتماعی حقوق مقدم ہیں، ذاتی ملکیت کا اعتراف و اقرار کر کے انسان کے فطری قوائے عملی و دماغی (Natural Practical & Intallectual Powers) میں مسابقت (Competition) کا جذبہ پیدا کیا جائے ان کو کشمکشِ حیات (Struggle for Life) میں داخل کر کے ان پر حصولِ معاش کی راہیں کھول دیں، نیز عقل و تجربہ کی بنا پر یہی راہ صحیح اور درست ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے اور پھر اس پر یہ جماعتی بوجھ ڈالا جائے۔

﴿لَن تَنَالُوا۟ ٱلْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا۟ مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ﴾[1]

ترجمہ: تم ہرگز بھلائی کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب مال میں سے خرچ نہ کرو۔

اور قانونی و غیر قانونی ضابطوں کے ذریعہ انفرادی ملکیت کا رخ بھی جماعتی فلاح اور بہبودیِ عامہ کی طرف پھیر دیا جائے اس موقعہ پر اس اندیشہ کا اظہار کیا جاتا ہے یہ

(۱) سورۃ آل عمران (۳): ۹۲

ایسی حالت میں تو ممکن ہے کہ انفرادی ملکیت کو تو کسی حالت تک تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کے غیر محدود ہونے اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے حیلہ بن جانے کے انسدادی قوانین موجود نہ ہوں لیکن جب اسلام انفرادی ملکیت کو محدود صورت میں تسلیم کرنے کے بعد اقتصادی نظام میں ایسی دفعاتِ قانونی بھی بیان کرتا ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت پر قابو پانے سے روکتی اور سرمایہ دارانہ نظام کا سر کچلتے رہنے کے لیے اپنی قانونی تیشہ سے کام لیتی رہتی ہیں تو پھر ایک وہمی اندیشہ کی بنا پر انسانوں کو ان کے فطری حق سے روک دینا ظلم ہے اور راہِ عدل سے ہٹ کر افراط و تفریط کے غار میں گر جانا ہے۔

معاشی درجہ بندی:

دوسرا اختلاف "معیشت کے درجات" سے متعلق ہے، اسلام حقِ معیشت کی مساوات کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ ضروری قرار دیتا ہے، لیکن مدارجِ معیشت میں مساوات کا قائل نہیں ہے یعنی وہ اس کو نہیں مانتا کہ یہ ضروری ہے کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامانِ معیشت حاصل ہو لیکن یہ ضروری سمجھتا ہے کہ سب کو ملے، اور جدوجہد اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائیں، اس کے برعکس سوشلزم حقِ معیشت کی مساوات کے ساتھ نفسِ معیشت کی بھی مساوات کا قائل ہے اور مدارجِ معیشت کا قطعاً انکار کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ احوالِ معیشت کا یہ اختلاف قدرتی نہیں ہے بلکہ سوسائٹی کا خود پیدا کردہ ہے، پس اگر آئندہ سوسائٹی کا نظامِ معیشت مساوات کے اصول پر قائم کر دیا جائے تو دوسری طرح کے محرکاتِ ذہنی پیدا ہو جائیں گے اور کارخانۂ معیشت کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں گی جس طرح آج جاری ہیں۔

اس دوسری صورتِ اختلاف کو بھی غائر نظر سے دیکھا جائے تو اقرار کرنا پڑے گا کہ اس میں بھی اسلام کی بتائی ہوئی راہ ہی صحیح ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں ہے اور جب استعداد یکساں نہیں

ہے تو سعی معیشت (Economic Struggle) کے نتائج و ثمرات کا اختلاف بھی ضروری اور ناگزیر ہے اور ایسی صورت میں سوسائٹی کا ایسا نظام قائم کرنا جس کی بنیاد معیشت کی مساوات پر ہو کسی طرح بھی صحیح اور درست نہیں ہے اور یہ کہنا بھی ناقابلِ قبول ہے کہ اس قسم کے نظام کے بعد ذہنی و معنوی محرکات (Intellectual & Metaphorical Motives) میں بھی ایسی تبدیلی ہو جائے گی کہ جس سے معیشت کا کارخانہ اسی طرح سرگرمی سے جاری رہے گا۔

بہرحال جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف کو مان لینے کے بعد معیشت کا اختلاف بالکل فطری ہو جاتا ہے، اسی لیے قرآنِ عزیز نے اس طرف راہنمائی کی ہے کہ یہ اختلاف قدرتی ہے۔ اور کارخانۂ عالم کی فطری قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لیے ایسا ہونا ضروری تھا، اگر یہ نہ ہوتا اور سب کی حالت یکساں ہوتی تو مسابقت اور مزاحمت (Competition & Resistance) کی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اور ان قوتوں کو ابھرنے کا موقعہ کبھی نہ ملتا اور اگر یہ موقعہ میسر نہ آتا تو اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں سرد ہو کر رہ جاتیں، جس پر نظامِ عالم کا یہ کارخانہ چل رہا ہے:

❶ ﴿ وَٱللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِى ٱلرِّزْقِ ﴾ (۱)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔

❷ ﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ ﴾ (۲)

ترجمہ: ہم نے دنیوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے اور ان سب کو یکساں درجہ میں نہیں رکھا بلکہ بعض کو بعض پر برتری دی ہے۔

---

(۱) سورۃ النحل (١٦): ٧١

(۲) سورۃ الزخرف (٤٣): ٣٢

❸ ﴿وَهُوَ ٱلَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ ٱلْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ ٱلْعِقَابِ وَإِنَّهُۥ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٥﴾﴾ (۱)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے بلاشبہ تمہارا پروردگار (بدعملیوں کی) فوراً سزا دینے والا اور بلاشبہ وہ بڑا ہی بخش دینے والا رحمت والا ہے۔

ان تمام آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے اس چکر میں ایک دوسرے کی جانشینی کا سلسلہ قائم ہے یعنی ایک جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اس کے ثمرات کا وارث بنتا ہے اور یہ کہ تمام انسان درجہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، نیز یہ کہ معیشت کے مدارج کی یہ اونچ نیچ اس لیے قائم کی گئی ہے تاکہ انسان کو اس کے عمل و تصرف میں آزمایا جائے اور یہ موقعہ دیا جائے کہ جس درجہ کو وہ اپنی سعی عمل سے حاصل کر سکتا ہے کر لے اور یہ بھی امتحان لیا جائے کہ وہ ان تفاوتِ درجات کی موجودگی میں کس حالت میں خدا سے غافل رہتا ہے اور کس حالت میں نہیں رہتا۔

خلاصہ بحث:

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کا مقصد اگرچہ ایک نظر آتا ہے، وہ یہ کہ عام انسانی افراد کی مالی تباہی، افلاس اور بدبختی کو دور کیا جائے اور ان کی بھاری اکثریت کی بدحالی کو ختم کیا جائے اور دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے کہ مذموم سرمایہ داری کو ختم کیا جائے، یعنی "جمع دولت" اور اکتناز کو باقی نہ چھوڑا جائے لیکن طریقِ کار میں دونوں کے درمیان یہ دو بنیادی اختلاف ضرور

---

(۱) سورۃ الانعام (٦): ١٦٥

پائے جاتے ہیں کہ ایک معیشت کے اختلاف کو قبول کرتا اور انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور دوسرا ان دونوں کا انکار کر کے ان کو فنا کرنا چاہتا ہے، اسلام نے حقِ معیشت کی مساوات کو تسلیم کیا اور سعی و ترقی کی راہیں سب کے لیے یکساں طور پر کھلی رکھیں اور اس نے احتکار کی وہ تمام رکاوٹیں ختم کر دیں جن کی بدولت خاص افراد یا گروہ نے کمزور افراد اور گروہ کی خوشحالی و ترقی میں قائم کر رکھی تھیں اس نے قانون سازی کے ذریعے زکوٰۃ اور وراثت اور بعض تجارتی اصولوں کو لازم قرار دے کر اور سود قمار اور اس قسم کے تمام کاروبار کو ناجائز بتا کر اکتناز و احتکار کو فنا کر دیا اور تمام ایسی بے اعتدالانہ راہوں کا سدباب کر دیا جو ظالمانہ سرمایہ داری کا موجب بنتی ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سوشلزم کے مسطورہ بالا ہر دو اصول دراصل اس نظام اور اس سوسائٹی بلکہ اس مذہبی گروہ کے مقابلہ میں انتقامانہ جذبات (Retaliative Passions) کے ماتحت اصول قرار پائے ہیں جن کے ظالمانہ ماحول سے متاثر ہو کر کارل مارکس اور ہیگل نے اپنے نظریوں کا اختراع کیا ورنہ یہ ہر دو اصول نہ عملی تجربہ کی خراد پر ٹھیک اترتے ہیں اور نہ عقلی دلائل کی روشنی میں صحیح نظر آتے ہیں اور اس لیے راہِ حق کے قطعاً خلاف اور اعتدال کے منافی ہیں۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا مختصر خاکہ:

اب ان تمام ایں و آں کے بعد اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی اور اصولی خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے:

❶ اکتناز (جمع دولت) اور احتکار (خاص افراد یا طبقات میں دولت کا محصور ہو جانا) ممنوع ہے یعنی سرمایہ داری کے مسطورۂ بالا طریقوں کو کسی حال میں وجود پذیر نہ ہونے دیا جائے اور اگر پہلے سے موجود ہوں تو اُن کو فوراً فنا کر دیا جائے اور اس نظریہ کو کامیاب بنانے کے لیے قانونی اور اخلاقی طور پر زکوٰۃ، وراثت، وقف، انفاق فی سبیل اللہ کو نافذ کیا جائے، سود اور اس کی تمام شکلوں، قمار اور اس کی تمام صورتوں کو ممنوع اور موجودہ تعلقہ داری کے جابرانہ سسٹم کو ختم کر دیا جائے۔

❷ معیشت میں اختلافِ مدارج کو تسلیم کرتے ہوئے حقِ معیشت میں مساوات کو ضروری اور فطری عقیدہ تسلیم کیا جائے تاکہ سرمایہ اور محنت میں صحیح توازن قائم رہ سکے اور سرمایہ کسی وقت بھی محنت کو اپنی خود غرضانہ ہوس کا آلۂ کار نہ بنا سکے اور عام خوشحالی پیدا ہو جائے اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے ان تمام قوانین کو ضروری قرار دیا جائے جو کانوں، کارخانوں اور فیکٹریوں اور امداد باہمی کے بارہ میں بیان کیے جا چکے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کو قوت پہنچانے والے تمام کاروبارِ تجارت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

❸ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایسی قیود اور پابندیاں عائد کی جائیں جن سے اس کا مفاد ''اجتماعی مفاد'' کے زیرِ اثر آ جائے اور خود غرضانہ جراثیم کو کسی قسم کی مدد نہ ملنے پائے اور اس کو قائم کرنے کے لیے شخصی زمینوں، ذاتی کمپنیوں اور ذاتی تجارتوں سے متعلق بیان کردہ احکام کو نافذ کیا جائے۔

❹ ان اصولوں کو قائم کرنے کے لیے ایسے طرزِ حکومت کو رائج کیا جائے جو خدا کی مخلوق (پبلک) کے سامنے جواب دہ ہو، حاکمیت کی جگہ خدمت اس کا نصب العین ہو، رعایا کے ہر فرد کی معاش کا متکفل (Maintainer) ہو، عوام کا نمائندہ ہو اور عادلانہ نظام کے قوانین کی قوتِ نفاذ کے علاوہ تمام امور میں خلیفۂ عمالِ حکومت اور رعایا کے حقوق ''اس میں'' یکساں ہوں اور اس طرزِ حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے بیت المال، سرکاری وظائف، اعداد و شمار کی تکمیل اور اس قسم کے دوسرے بیان کردہ وسائل و ذرائع کو اختیار کیا جائے اور موجودہ تمام جابرانہ و سرمایہ دارانہ نظامہائے حکومت اور ریاستی سسٹم کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا جائے [1] اس اجمالی خاکہ کو مندرجہ

---

(۱) لطیفہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرماتے ہیں، یہ مکاشفہ ان کو اس وقت ہوا تھا جبکہ وہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر دربارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے مستفید ہو رہے تھے، فرماتے ہیں: ''مجھ پر نیند میں ایک کیفیت طاری ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں نظامِ عالم میں خدا کی مشیت کو پورا کرنے کے لیے ''امام'' بنا دیا گیا ہوں'' (اس کے بعد غلبۂ کفار اور مسلمانوں کی مغلوبیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں) اس غیظ و غضب کی حالت میں مسلمانوں نے مجھ سے دریافت کیا

ذیل اجمالی نقشہ کی شکل میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی نقشہ

اعلاء کلمۃ اللّٰہ وخدمت خلق

❶ ہر شخص کی معاشی کفالت کے اصول پر شوروی حکومت کا قیام۔

❷ خلیفہ، عمالِ حکومت اور رعایا کے اقتصادی حقوق میں یکسانیت و مساوات کے اصول کا لزوم۔

❸ بیروزگاروں اور حاجت مندوں کی کفالت عام، عسکری نظام کی ضرورت اور اجتماعی خدمت کے پیشِ نظر اعداد و شمار کی ترتیب و وظائف کا قیام۔

❹ زکوٰۃ، میراث، وقف، انفاق کے قانونِ وجوب کے اصول پر ''اکتناز'' یعنی سرمایہ داری کا انسداد۔

❺ سود، قمار، منشیات کی بیع و شراء تجارتی و صنعتی بد عنوانیوں کی قانونی حرمت کے اصول پر ''احتکار'' سرمایہ داری کے دوسرے نقطہ کا انسداد۔

❻ کانوں، فیکٹریوں، کارخانوں، ملوں زمینوں، انفرادی حقوق کے مقابلہ میں اجتماعی حقوق کی ترجیح کا اعتراف و قیام اور اس کی عملی تشکیل۔

❼ انفرادی ملکیت کے لیے تجارت اور دیگر کاروبار میں شرکتِ نفع کے اصول پر سرمایہ و محنت کے عادلانہ توازن کا قیام۔

❽ آمدنی و ذرائع آمدنی میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے سرمایہ داری کے اصول کے انکار پر ان کی تحدید و تعیین۔

❾ مدارجِ معیشت کے اعتراف کے ساتھ طبقاتی، نسلی و جغرافیائی قسم کے

کہ اب اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟ ''ماذا حکم اللّٰہ فی ھذہ الساعۃ'' میں نے جواب دیا ''فك كل نظام'' یعنی کسی عادلانہ نظام قائم کرنے سے پہلے سب سے اہم فرض یہ ہے کہ انقلاب پیدا کر کے موجودہ دنیا کے تمام نظامہائے حکومت کو درہم برہم کر دیا جائے۔ (فیوض الحرمین: ص ۸۹)

امتیازات کے انسداد کے اصول پر حقِ معیشت میں یکسانیت و مساوات کا قانونی قیام۔

⑩ ریاستی و تعلقہ داری سسٹم کا انسداد۔

⑪ امداد باہمی کے اصول پر غیر سودی انجمنوں کے قیام اور شرکتِ نفع کے صحیح اصول پر تجارتی کاروبار کا فروغ۔

⑫ غیر سرمایہ دارانہ اصول پر تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے لیے اسباب کی فراہمی کا لزوم و وجوب۔

⑬ عصبیت قومی کے انکار اور اخوتِ عام کے اصول پر غیر ترجیحی اور آزاد تجارت کی حمایت۔

⑭ کاروبار کے لیے سکہ و ٹکسال کا قیام اور عوام کو ٹکسال میں سکہ بنانے کی اجازت اور شرح مبادلہ میں عادلانہ اصول کا اجراء۔

⑮ رفاہِ عامہ، اجتماعی ضروریات، انفرادی حاجات اور حکومت کی ضروریات کی کفالت کے لیے بیت المال کا قیام۔

⑯ خلیفہ عمالِ حکومت اور تمام انسانوں میں عیش پسندی کے وسائل کو قانون و اخلاق کے ذریعہ مٹا کر سادہ زندگی کی شاہراہ پر قائم کرنا۔

پس جس اقتصادی نظام میں افراط و تفریط کا شائبہ نہ ہو، اس کی اساس و بنیاد ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر انتقامانہ جذبات پر قائم نہ ہو، وہ ایسے طرزِ حکومت کا حامی ہو جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کے لیے مساوی حقوق کا حکم دیا گیا ہو، وہ تمام انسانوں کی معاشی زندگی کا متکفل اور خوشحالی کا ضامن ہو، مخصوص افراد و طبقات میں جمع دولت اور حصر دولت (Concentration of Wealth) کے وجود کو فنا کرتا اور اکتناز و احتکار کی بنیادوں کو مٹاتا ہو، وہی اس قابل ہے کہ دنیا کی معاشی زندگی کا کارخانہ بہتر طریقہ پر چلا سکے اور سرمایہ و محنت کی کش مکش کا عمدہ طور پر حل کر سکے اور اس کا دائرہ عمل ہمہ گیر اور عالمگیر ہو اور وہی دنیا کی اقتصادی ساکھ کو بحال کر کے عام خوشحالی اور مسرور زندگی کا ضامن بنے، ایسے ہی نظام کا دوسرا نام ”اسلام کا اقتصادی نظام“ ہے

اور اسی کی سربلندی کی دعوت میری اس جنبشِ قلم کا مقصدِ عظمیٰ اور مثلِ اعلیٰ ہے۔
"واللّٰہ بصیر بالعباد" (اور اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے)

احساسِ فرض:

میری اس کدو کاوش کا مقصد علمی تفریح اور اسلامی لٹریچر میں اضافہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک صدائے قلب ہے جو صرف اس لیے تہ قلب سے نکل کر نوکِ قلم پر آئی ہے کہ تمنا اور آرزو یہ ہے کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے پھر اس بھولے ہوئے سبق کی یاد تازہ ہو جس نے تیس سالہ پاک حکومت کے دور میں ایران، فارس، سندھ و مکران، روم، مصر، شام، عراق اور سرزمین عرب کے گوشہ گوشہ میں امن و اطمینان، خوشحالی و خوشدلی پیدا کر دی تھی اور جس نے سرمایہ و محنت اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان عدل کی ترازو اس طرح قائم کی تھی کہ اس دور میں نہ طبقاتی جنگ کی ضرورت پیش آئی اور نہ موجودہ کشمکش ہی کا ہنگامہ برپا ہوا، کیونکہ وہاں نہ صرف سرمایہ داری کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ غریبوں کو اپنی اغراض پر قربان کر سکے اور نہ مزدور و محنت کش کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ غیر کی ملکیت پر قابض ہونے کے خواب دیکھے، بلکہ اس نظام میں تمام ملکوں، شہروں اور آبادیوں میں ایک ایسی درمیانی حالت قائم ہو گئی تھی کہ اختلافِ مدارج کے باوجود سب خوشحال تھے، چین و آرام ہر ایک کو میسر تھا، زکوٰۃ و خیرات دینے والے بہت تھے مگر لینے والا ایک بھی میسر نہ تھا۔ پس اگر فیسزم جرمنی و اٹلی پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اگر سوشلزم روس پر تسلط جما سکتا ہے تو اسلام کا اقتصادی نظام کیوں (پاکستان) ترکی، ایران، افغانستان، مصر یا حجاز و یمن پر نہیں چھا سکتا؟ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ ہماری آواز ان آزاد حکومتوں تک پہنچے اور کوئی ایک سلطنت ہی یورپین نظامہائے اقتصادی سے مرعوب ہوئے بغیر اسلام کے اقتصادی نظام کو بروئے کار لائے، دنیا کے سامنے نمونہ بن کر دکھلائے اور بتائے کہ محنت و سرمایہ کی کشمکش کے انسداد اور عام خوشحالی کی ضمانت کے لیے اس سے بہتر کوئی "نسخۂ کیمیا" نہیں

ہے یا پھر عام مسلمان خدا کا نام لے کر اٹھیں اور اپنا فرض ادا کریں۔ ''وما علینا الا البلاغ''

﴿وَمَآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ أَجۡرٍۖ إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ١٢٧﴾ (١)

ترجمہ: اور میں تم سے اس کا عوض نہیں چاہتا، میرا اجر تو خدا کے علاوہ اور کسی کے ذمہ نہیں ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہم نے ہمت کا قدم آگے بڑھایا تو خدا کی حمایت و نصرت ہمارے ساتھ ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُواْ وَلَا تَحۡزَنُواْ وَأَنتُمُ ٱلۡأَعۡلَوۡنَ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ١٣٩﴾ (٢)

ترجمہ: نہ پست ہمت بنو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی سربلند ہو گے اگر تم سچے مسلمان ہو۔



(١) سورۃ الشعراء (٢٦): ١٢٧، ١٤٥، ١٦٤ اور ١٨٠

(٢) سورۃ آل عمران (٣): ١٣٩

باب ــــ ⑭

ہند میں معاشی مسئلہ کا حل

گذشتہ ابواب میں جن جذبات کے تحت ممالک اسلامی میں اپیل کی گئی اور ان کے سامنے اسلام کا اہم مطالبہ کیا گیا۔ اسلام ہم سے بھی اسی مطالبہ کا حق دار ہے۔

البتہ اداء فرض میں آزاد اسلامی ممالک اور ہمارے (محکوم ممالک کے مسلمان شہریوں کے) درمیان نمایاں فرق ہے کہ ان کے سامنے صرف طرزِ حکومت کے رخ بدل دینے کا سوال ہے اور ہم ابھی اپنی محکومیت کا شکار اور حکومت تسلطہ (اقتدار پر مسلط و قابض حکومت) کے زیر اقتدار ہیں اور محکومیت پر مزید یہ کہ بعض غیر مسلم ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں محکوم ہیں (ان) پورے ممالک میں مسلمان اور غیر مسلم اقوام (یا شہریوں کے درمیان) چولی دامن کا ساتھ ہے۔[1]

اس لیے اس سے قطع نظر کہ ہندوستان (جیسے ملک) کے آئندہ نظامِ حکومت کا خاکہ کیا ہونا چاہیے اور اس سلسلہ کے نظریاتی مباحث سے دامن کشاں ہو کر کتاب کے موضوع "اقتصادی نظام" کے پیشِ نظر ہمارے لیے ادائے فرض کی بہترین شکل یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں پر تحریر و تقریر سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ علمی و عملی دونوں پہلوؤں سے کائناتِ انسانی کے لیے امن و اطمینان اور فوز و فلاح

---

(۱) فاضل مؤلف رحمہ اللہ نے چونکہ یہ کتاب قیام پاکستان (یعنی ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے تحریر فرمائی تھی اس لیے انہوں نے اس عنوان کو "ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل" تحریر کیا تھا۔ چونکہ مقصد ایک ایسی ریاست یا ملک میں اسلامی معاشی نظام کے مظائل کا حل تجویز کرنا تھا جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی اقلیت آباد ہو۔ لہذا ہندوستان ہی کو مخصوص کرنے کی بجائے عام غیر مسلم ممالک کو بھی لیا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں، پاکستان کی زمینوں کے مسائل پر بھی مصنف رحمہ اللہ کے نگارشات کی روشنی میں غور کیا جا سکتا ہے۔

صرف اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول و قوانینِ اساسی کو اپنا راہنما بنالیا جائے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری:

اگر ہندوستان جنت نشان میں کمیونزم، سوشلزم، نیشلزم، فیسزم اپنے اپنے نظامہائے معاشی کی تبلیغ و دعوت میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نظام معاشی کی دعوت و تبلیغ کے لیے میدان تنگ سمجھ کر ہم دست و پا بریدہ بن جائیں اور حرمان و یاس کو رفیقِ حیات بنالیں۔

کیونکہ اگر دنیوی نظامہائے اقتصادی کی مقبولیت کے لیے اس ملک کا دامن وسیع ہے تو روحانیت کی راہ سے آئے ہوئے معاشی نظام کے لیے اس کا دامن کیسے کوتاہ رہ سکتا ہے، البتہ یہ شرط ہے کہ اس نظام کی دعوت و تبلیغ کے لیے نفرت کی جگہ مودت، خشونت کی بجائے رقت و نرمی، تنگ نظری کے بدلے وسعتِ نظر اور عداوت و بد اخلاقی کی جگہ مواسات و حسنِ اخلاق جیسے برتر اصولوں کو اسوہ بنایا جائے اور قرآن حکیم کے اس مقدس اصولِ دعوت کو معیارِ یقین کیا جائے۔

﴿ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ ٱلْحَسَنَةِ ۖ وَجَٰدِلْهُم بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ﴾ (۱)

ترجمہ: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے پروردگار کی جانب دعوت دو، دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مجادلہ (تبادلہ خیالات) کرو اس طریقہ پر جو بہت ہی خوب اور بہتر سے بہتر ہو۔

پس اگر ہم نے حسنِ اخلاق کے ساتھ روشن دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے سج کر مسلم و غیر مسلم پر اسلام کے اقتصادی نظام کی برتری کو روشن کر دیا تو وہ وقت دور نہیں کہ مادیت کے انتہائی عروج اور روحانیت کے سخت انحطاط کے اس دور میں بھی

(۱) القرآن الکریم، سورۃ النحل (۱۶): ۱۲۵

جو سعید روحیں امنِ عالم اور کائناتِ انسانی کی اخوتِ عام اور فلاح دوام کے لیے حقیقی معنی میں بے چین و مضطرب ہیں ان کے ہاتھوں توپ و تفنگ اور مادی اسلحہ کی گرم بازاریوں کے بغیر ہی ایسا انقلاب برپا ہو جائے کہ سرزمینِ ہند کا ہر ایک طبقہ اور ہر ایک ملت و قوم اس مقدس نظام کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس طرح خدائے برتر کا پیغامِ حق اپنی پوری رعنائیوں اور دل نوازیوں کے ساتھ برضا و رغبت اس سرزمین میں عملی صورت اختیار کر لے اور آج کا یہ محکوم کل کو تمام کائنات کے لیے نمونۂ راہ اور راہنما ثابت ہو۔ ''وما ذالك على الله بعزیز''

ہندوستان میں صحیح معاشی نظام اور اس کی مشکلات:

ہندوستان میں اگر صحیح معاشی نظام کو بروئے کار لایا جائے تو اس سلسلہ میں دو مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں، ایک ''سود کا مسئلہ'' اور دوسرا بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا مسئلہ۔ اس لیے کہ ان دونوں ہی مسئلوں کے ساتھ باشندگانِ ہند کا بہت گہرا تعلق موجود ہے۔ خصوصاً مسئلہ سود تو اس درجہ خطرناک ہے کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر مسلم و غیر مسلم آبادی کی معاشی بدحالی و فاقہ مستی کا یہی واحد اجارہ دار ہے اور اس کے بعد ان بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا درجہ ہے جن میں کاشتکار کو اسلام، اخلاق اور انصاف کے خلاف غلام سمجھا جاتا اور غلاموں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے اور جو عوام کی معاشی تباہی کے لیے جونک کا کام کر رہی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ شریعتِ اسلامی کے اہم قانونِ وراثت کے خلاف مجرمانہ جرأت کے ساتھ یہ زمین دار اور تعلقہ دار سرکاری عدالتوں میں یہ بیان دیتے چلے آتے ہیں کہ ہم اپنی اسٹیٹ اور اپنے تعلقہ کی وراثت کے مسئلہ میں اسلامی قانون پر رسم و رواج کو ترجیح دیتے ہیں اور تقسیمِ وراثت کا انکار کرتے ہوئے اسٹیٹ اور تعلقہ سے متعلق رسم و رواج کے قانون کو واجب العمل یقین کرتے ہیں۔

اس لیے یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں نہ ''سود'' کے

لیے کوئی گنجائش ہے اور نہ ذاتی اسٹیٹ اور تعلقہ کے موجودہ سسٹم کے لیے کوئی گنجائش ہے۔

ان ہر دو مسائل میں سے ''سود'' تو ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی قباحت و شناعت واضح اور عام طور پر مسلم ہے اور معاشی نظام میں اس کی تباہ کاریاں روشن و ظاہر ہیں، البتہ بڑی بڑی زمینداریوں کے موجودہ سسٹم کی قباحت و شناعت (Condemnation) میں شخصی ملکیت کا مسئلہ حائل ہو جاتا ہے اور اس کے لیے اس کے خلاف اقتصادی نظام کا اقدام نہ صرف غیر مسلم کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے بلکہ خود مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو احکام اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر اس اقدام کو غیر اسلامی سمجھتے اور کمیونزم یا سوشلزم کی کورانہ تقلید جانتے ہیں۔ اس لیے از بس ضروری ہے کہ اس مقام پر علمائے اسلام کے وہ چند فتاویٰ یا اسلامی فیصلے پیش کر دیئے جائیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اور عامہ مسلمین کی فلاح و بہبود کا تقاضا ہو تو امام اور امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفتوحہ ملک کی اراضی کو شخصی ملک بنانے کی بجائے بیت المال اور حکومت (خلافت) کی ملک قرار دے۔

اراضی ہند پر علماء اسلام کے فتاویٰ:

علمائے اسلام کے یہ فتاویٰ مغل بادشاہوں کے دور میں اور برٹش حکومت (British Government) کے ابتدائی دور میں اس سلسلہ میں زیر تحریر آئے ہیں کہ ''اراضی ہند'' اشخاص و افراد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ وقف للمسلمین کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) کی ملکیت ہیں، اور ایسی زمین کو اسلام کے معاشی نظام کی اصطلاح میں ''ارض المملکۃ'' یا ''ارض الحوزہ'' (Domain) کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''ارضِ عراق'' کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا اور جمہور صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے آئندہ کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

(الف) شیخ جلال الدین تھانیسری رحمہ اللہ کا فتویٰ:

چنانچہ شیخ جلال الدین تھانیسری رحمہ اللہ [1] نے ایک مستقل رسالہ "تحقیق اراضی ہند" کے نام سے اسی غرض سے تصنیف فرمایا کہ "اراضی ہند" شخصی ملک نہیں بلکہ "ارض مملکت" اور وقف للمسلمین ہو کر بیت المال کی ملکیت ہیں، شیخ فرماتے ہیں:

والحجة لعلمائنا فی تقریر أمیر المؤمنین عمر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہ لسواد عراق بموافقة من الصحابة رضوان اللّٰہ علیهم اجمعین. فی الهدایة فی باب الغنائم. و إذا فتح الامام بلدة عنوة أی قهرا فهو بالخیار ان شاء قسمه ما بین المسلمین کما فعل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بخیبر، و إن شاء أقرّ أهله علیه ووضع علیهم الجزیة وعلی أراضیهم الخراج. کذلك فعل عمر لسواد العراق بموافقه من الصحابة رضوان اللّٰہ علیهم أجمعین ولم یحمد من مانعه وفی کل ذلك قدوة فیتخیّر. [2]

ترجمہ: اور تقریر [3] کے متعلق ہمارے علماء (احناف) کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ تقریر ہے جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی موافقت کے ساتھ سوادِ عراق کے متعلق ان سے عمل میں آئی، ہدایہ [4]

---

(۱) شیخ جلال الدین تھانیسری رحمہ اللہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے مرید، متبحر عالم اور شیخ کامل تھے۔ دہلی کے قریب پنجاب کے علاقہ تھانیسر وطن مالوف تھا اور وہیں پچانوے سال زندہ رہ کر ۱۴ر ذی الحجہ ۹۸۹ھ میں انتقال فرمایا اُن کا مذکورہ بالا یہ رسالہ مطبوعہ ہے مگر خود شیخ کے ہاتھ کا قلمی نسخہ برٹش میوزم لندن میں بتایا جاتا ہے۔

(۲) تھانیسری، جلال الدین رحمہ اللہ: تحقیق اراضی ہند: ص ۳

(۳) خلیفہ کا ملک کی زمین کو مسلمانوں کی انفرادی ملکیت بنانے کی بجائے مفتوح غیر مسلموں کے قبضہ میں باقی رکھنا اور اس کی ملکیت کو حکومت کی ملکیت قرار دینا "تقریر" کہلاتا ہے۔

(۴) امام برہان الدین علی بن ابو بکر مرغینانی رحمہ اللہ کی کتاب ہے جو فقہ حنفی میں درسی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

باب الغنائم میں ہے کہ اگر امام کسی شہر کو قہر وغلبہ کے ساتھ فتح کرے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اس کی اراضی کو مسلمانوں میں تقسیم کر دے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کے متعلق کیا اور چاہے تو مفتوح آبادی کے قبضہ میں اس کو رہنے دے اور اس پر جزیہ مقرر کر کے ان کی زمینوں پر خراج مقرر کر دے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی موافقت کے ساتھ کیا اور جس کسی نے مخالفت کی تو اس کو ناپسند سمجھا گیا بہرحال امام ان دونوں باتوں میں مختار ہے اور دونوں اس کی صوابدید کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔"

اور ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وفی نفی الملك عن الكفار فی صورة التقرير وجعلهم كالاكرة العاملة للمسلمين فوائد نيرة ومنافع كثيرة لأهل الإسلام المستحقين إذا الأرض والخرج بالمنع والعطاء للمستحقين.[1]

ترجمہ: اور اراضیٔ ہند کے بارہ میں "تقریر کی شکل میں" یہ کہنا کہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کی ملکیت نہیں ہے اور ان کو کاشت کاروں اور اجارہ داروں کی طرح قرار دینا جو مسلمانوں کے (بیت المال) کے لیے عامل کی حیثیت میں ہیں مسلمانوں کے لیے روشن فوائد اور کثیر منافع کا باعث ہے اس لیے کہ زمین اور خراج کے دینے اور نہ دینے کا معاملہ دراصل مستحقین کے پیشِ نظر ہے۔

اور دوسری جگہ اراضی ہند کو مختلف انواع پر منقسم بتلاتے ہوئے

ثم إعلم أن أراضی ولاية الهند ليست علی سنن واحد بل هی

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۱

علی أنواع شتی.[1]

ترجمہ: پھر جاننا چاہیے کہ ہندوستان کی زمین کسی ایک قانون کی پابند نہیں، بلکہ اس کے استعمال کے لیے متنوع قوانین بنائے گئے ہیں۔

صرف ایک نوع میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:

منها ما أعطى الإمام بأوّل الفتح لبعض الغانمين أو بعض المستحقين.[2]

ترجمہ: منجملہ ایک صورت یہ ہے کہ امام نے جس وقت ملک ہندوستان کو فتح کیا تو اس فتح کی ابتدا ہی میں بعض زمینیں مجاہدین یا مستحقین کو عطا کر دیں۔

اور آخر میں اس بحث کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہندوستان کی اکثر و بیشتر اراضی ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہے جو اس پر قابض ہیں سوچو اور سمجھو، پھر معلوم رہے کہ جب کہ ہندوستان کی اراضی ان انواعِ مختلفہ پر قائم ہے جن کا گذشتہ ذکر ہو چکا ہے تو اراضی ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت و عدمِ ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک یقین کے ساتھ حکم لگانے والے کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے، پس جس زمین کے بارے میں جس نوع سے متعلق ہونے کا یقین ہو جائے اس کے مطابق حکم دینا چاہیے، لیکن اگر علمِ یقین حاصل نہ ہو تو فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اس لیے کہ فصل قضایا کی بحث میں اس طرح فتویٰ

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۱

(۲) حوالہ بالا: ص ۱۱

دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[۱]

شیخ جلال الدین نور اللہ مرقدہ کے یہی فقہی ارشادات یا فیصلے اس زمانہ سے متعلق ہیں جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا دور تھا، مغلِ اعظم کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کی مفتاح سعید (Lucky Key) تھی۔

مولانا محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ کا فتویٰ:

اور ہندوستان کے مشہور مُحقّق عالم مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے بھی اپنے رسالہ میں اراضی ہند کے متعلق یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ فرد یا جماعت کی شخصی ملکیت نہیں ہیں بلکہ ارض مملکت اور ارضِ بیت المال ہیں۔

اور مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ ہیں، یعنی حکومت کے بیت المال کی ملکیت ہیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہیں۔[۲]

مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کا فتویٰ:

شیخ جلال الدین اور محمد اعلیٰ رحمہما اللہ کے چند صدی بعد جب برٹش حکومت کا تسلط ہوا تو علمائے اسلام کے سامنے پھر یہ مسئلہ آیا کہ اراضی ہند شخصی ملکیت ہیں یا نہیں اور ان پر عشر یا خراج واجب ہے یا نہیں؟ تو مُحقّقِ عصر حضرت شاہ عبد العزیز نور اللہ مرقدہ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس وقت بھی یہی فیصلہ دیا کہ اراضی ہند بیت المال کی ملکیت ہیں، شخصی مملوکہ نہیں ہیں اور یہاں زمیندار و تعلقہ دار مالک کی حیثیت میں نہیں، اس لیے اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی، فرماتے ہیں:

> وحضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز رسالہ در احکام اراضی ہند قلمی فرمودہ اند، دراں رسالہ ایں مذہب را بشواہد ودلائل بسیار ابطال

---

(۱) حوالہ بالا: ص ۱۱، ۱۲

(۲) العرف الشذی (شرح جامع الترمذی)، ص ۲۸۶، تقریر درس رأس المحدثین حضرت الشیخ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہ

فرمودہ تحقیق فرمودہ اند کہ اراضی ہند بدستور اراضی سواد عراق موقوف بر ملک عامۂ مسلمین بے تخصیص است یعنی ملک در بیت المال است وزمینداراں رابیش از قیم بودن دخلے نیست وقاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ نیز دریں باب رسالہ [1] نوشتہ وہمیں مسلک راترجیح دادہ الخ۔

ترجمہ: اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارہ میں لکھااور اس رسالہ میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملک ہے) بہت سے دلائل وشواہد سے باطل قرار دیاہے اور یہ ثابت کیاہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لیے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں کسی شخص و فرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے۔ اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ نے بھی اس بارہ میں ایک رسالہ تصنیف کیاہے اور انہوں نے اس میں شیخ جلال ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

مگر بنا برآنچہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ دررسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہدِ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مفتوح شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال است و زمینداراں رابیش از تولیت و داروغگی تردد و فراہم آوردن مزارعین و اعانت و زراعت و حفظ دخلے نیست، چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعار بآں میکند وتغیر وتبدل زمینداری وعزل ونصب زمینداری واخراج بعضے از آنہاواقرار بعضے وعطائے بعضی اراضی بافغاناں وبلوچاں وسادات و

(۱) یہ رسالہ برٹش میوزم لندن میں موجود ہے۔

فدوانیاں بصیغہ زمینداری دلالت صریحہ بریں مے کند۔ (۱)

ترجمہ: شاید اس مسلک کی بنیاد پر کہ حضرت شیخ جلال تھانیسری نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ابتداء فتح میں عراق کی طرح ہو (جو کہ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے، اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور فکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔ چنانچہ لفظ زمیندار بھی اس کی خبر دیتا ہے اور زمینداری میں تغیر و تبدل اور عزل نصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لیے اثبات اور بعض کو داد و دہش، مثلاً افغاناں، بلوچ، سادات، مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعوی کی صریح تائید کرتے ہیں۔

خلاصہ:

علماءِ اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضی ہند پر جو تصرفات قائم رکھے، نیز شاہ عالم نے سرطامس روکو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمینداروں کے متعلق جو معاہدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالہ کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معاہدہ کیا وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت اراضی ہند کو زمیندار اور تعلقہ دار کی ذاتی و شخصی ملکیت نہیں سمجھتے اور حکومت کی ملک شمار کرتے ہوئے ان کو نگران اور "قیم" کی حیثیت دیتے تھے۔

پس جبکہ علمائے اسلام کے فتاویٰ سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کی زمین

(۱) فتاوی عزیزی: ج ۱، مطبوعہ مجتبائی، دھلی: ص ۴۳

حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے اور انہوں نے اس فیصلہ میں عامۂ مسلمین کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر مخصوص طبقۂ زمینداران و تعلقہ داران کے نقصان کو قابلِ نظر انداز سمجھا اور اس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلۂ ''ارضِ عراق'' کو اسوۂ حسنہ قرار دیا تو آئندہ کے لیے ہندوستان کے معاشی نظام میں اس قسم کے اقدام کو غیر اسلامی کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ البتہ یہ دیکھنا ازبس ضروری ہو گا کہ یہ اقدام عامۃ المسلمین کی معاشی فلاح کے لیے مفید ثابت ہو۔ (آمین)

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ ط

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)



ضمیمہ ——— ①

تذکرہ آئمہ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ

اس باب میں ان آئمہ حدیث اور محدثوں کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے، جن کی کتب احادیث سے اس کی تیاری میں احادیث نقل کی گئی ہیں۔ یہاں مصنفین صحاح ستہ (Six Authentic Books) اور دیگر محدثین مثلاً امام طبرانی، امام بیہقی، امام محمد، امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم کا اجمالی تعارف درج کیا جارہا ہے۔ آئیے آغاز حضرت امام بخاری رحمہ اللہ مؤلف صحیح بخاری سے کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ

ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرۃ بن بروزیۃ الجعفی البخاری رحمہ اللہ جعفی یمن کا ایک قبیلہ سے تعلق کی بنا پر جعفی کہلائے اور بخاری اس لیے کہ آپ کے پردادا مغیرہ آتش پرستی سے حضرت یمان بخاری رحمہ اللہ کے دست مبارک پر دولت اسلام پا کر مسلمان ہوئے۔ لہذا بخاری نسبت والے بن گئے۔ آپ بروز جمعۃ المبارک ۱۳ شوال ۱۹۴ھ (مطابق ۸۱۰ء) بخارا میں پیدا ہوئے، صغر سنی میں یتامت کا مزا چکھ کر در یتیم بن گئے، والدہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے تربیت کی۔

طلب علم میں بہت سے دیار و امصار کا سفر کیا مثلاً کوفہ، بصرہ، بغداد، بلخ، عسقلان، شام، حمص وغیرہا۔ اس دور کے کبار اساتذہ حدیث اور محدثین عظام رحمہم اللہ تعالیٰ سے احادیث کی سماعت اور تحریر دونوں کام کیے، جن میں مکی ابن ابراہیم بلخی، وکیع بن الجراح، عبد اللہ ابن مبارک، عبد اللہ بن عثمان مروزی، عبید اللہ بن موسیٰ عبسی، ابو نعیم فضل بن دکین، علی بن مدینی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین رحمہم اللہ

تعالیٰ جیسے اساطین علم و فضل شامل ہیں۔ آپ کی زندگی میں آپ سے نوے ہزار (۹۰۰۰۰) اہل علم نے بخاری شریف کی سماعت کی اور اسے آگے روایت کیا۔ ذہانت اور حافظہ کا یہ عالم کہ دس سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کی اور گیارہ سال کی عمر میں استاد پر اعتراض کرنے لگے۔ ہوا یوں کہ ان سے استاد رحمہ اللہ نے حدیث پڑھاتے ہوئے یوں سند بیان کی: ''حدثنا سفیان عن ابی الزھیر عن ابراھیم'' بخاری رحمہ اللہ نے استاد سے باادب عرض کیا کہ ابراہیم رحمہ اللہ نے ابو زہیر رحمہ اللہ سے کوئی روایت نہیں کی۔ استاد رحمہ اللہ نے لڑکا سمجھ کر ڈانٹا مگر گھر جا کر مسودات کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو نو عمر شاگرد رشید رحمہ اللہ کی خداداد ذہانت اور علمیت کے معترف ہو گئے اور برملا اپنی غلطی کا اعتراف اور شاگر رشید رحمہ اللہ کی ستائش کی۔ صرف ۱۶ سال کی عمر میں امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور امام وکیع بن الجراح رحمہ اللہ کی مسندات حفظ کر چکے تھے۔ پھر تعلیمی اسفار شروع کیے۔

آپ نے بہت سی مفید تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں الجامع الصحیح، ادب المفرد، کتاب بر الوالدین، تاریخ کبیر، صغیر اور اوسط، کتاب خلف افعال العباد، کتاب الضعفاء، جامع کبیر، مسند کبیر وغیرہا مشہور ہیں۔ مگر جس نے کتاب کے ذریعہ اللہ کریم نے آپ کو شہرت دوام بخشی وہ الجامع الصحیح یا صحیح البخاری ہے۔ آپ نے اس کتاب کی تصنیف پر ۱۶ (سولہ) سال محنت کی اور ہر حدیث نقل کرنے سے پہلے وضو کرتے، دو رکعات نفل ادا کرتے پھر حدیث نقل کرتے۔ آپ کے بے پناہ حافظہ اور ذہانت کے بے شمار قصص اور حکایات ہیں۔ قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ درج کرنے کی سعادت پا رہا ہوں۔

جب آپ بغداد تشریف لے گئے تو وہاں کے اصحابِ حدیث نے ان کا امتحان لینے کے لیے سو احادیث منتخب کیں اور دس اشخاص چن کر انہیں دس دس احادیث دیں کہ وہ انہیں امام بخاری رحمہ اللہ کے سامنے پیش کر کے دریافت کریں کہ وہ سند اور متن کے اعتبار سے کیسی ہیں؟ ان اصحاب حدیث نے یوں کہا کہ ان تمام سو

احادیث کے متون (Texts) اور اسناد (Chain of Transmitters) کو تبدیل کر دیا۔ پھر ایک ایک کر کے سب نے اپنی احادیث امام صاحب رحمہ اللہ کو سنائیں۔ آپ ہر ایک کی حدیث سن کر کہتے جاتے: مجھے معلوم نہیں۔ پھر آپ نے ان میں سے ہر ایک کی دس دس اور کل ملا کر سو احادیث کو صحیح متون اور اسناد کے ساتھ سنا کر سب کو حیران کر دیا۔

آپ توکل، اعتماد، ثابت قدمی اور استقلال کا کوہ گراں تھے اور ان کے کمالات والے شخص کو سنگ یا سلاخوں سے واسطہ نہ پڑے تو گویا ان کمالات کا حق ہی ادا نہیں ہوتا۔ دیگر اہل صدق و وفا کی طرح حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کو آخر عمر میں حکمرانوں اور حساد کی طرف ان کے کمالات کا آزمانے کا موقع ملا۔ تنگ آ کر آپ بخارا کو الوداع کہہ کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ربذہ کی طرح خرتنگ ـــــ بخارا کے ایک گاؤں ـــــ میں جا کر دکھوں بھری زندگی گزارتے رہے اور شب عید الفطر ۲۵۶ھ (مطابق ۸۷۰ء) موت کا پل عبور کر کے اپنے پیاروں کے پاس چلے گئے ـــــ الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب اس وقت آپ کی عمر ۱۳ یوم کم ۶۲ سال تھی۔[1]

امام مسلم رحمہ اللہ

ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری النیشاپوری رحمہ اللہ ۲۰۴ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں طلب علم میں نکل پڑے اور اس عہد کے کبار اساتذہ کرام سے اکتساب فیض کیا، جن میں یحییٰ بن یحییٰ التمیمی، اسحاق بن راہویہ، قعنبی، سعید بن منصور، عون بن سلام، احمد بن یونس الیربوعی، داؤد ابن عمر الضبی، حرملۃ بن یحییٰ، قتیبہ بن سعید، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اور دیگر اساتذہ

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: مظاهر حق، ج ٤، اسماء الرجال، ترجمہ بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ ـــ ـــ ابوالسنور محمد الاحمدی، رئیس وزیر الاوقاف المصریة، احادیث القدسیة، مطبوعہ قاهرة، دیباچہ

حدیث شامل ہیں۔ آپ نے ان اساتذہ کرام کی تلاش میں حجاز، عراق، مصر، شام وغیرہا کا سفر کیا۔ بغداد کئی بار گئے، آخری بار ۲۵۷ھ میں تشریف لے گئے۔ آپ سے بے شمار متلاشیان علم نے استفادہ کیا۔ آپ نے متعدد کتب تصنیف کیں مگر اللہ کریم نے جس شہرت و قبولیت سے ان کی "صحیح مسلم" کو نوازا وہ ان کی کسی دوسری تصنیف کے حصہ میں نہ آئی۔ فرمایا کرتے تھے: میں نے تین لاکھ احادیث میں سے اخذ کر کے یہ کتاب لکھی ہے۔ ایک رات تلاش حدیث میں رات بھر جاگتے رہے اور ساتھ ساتھ کھجوریں بھی تناول فرماتے رہے، حدیث مل گئی، کھجوروں کا مجموعہ بھی ختم ہو گیا۔ بیمار پڑ گئے رجب ۲۶۱ ھ کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ (۱)

امام ابو داود رحمہ اللہ

ابو داود سلیمان بن اشعث بن اسحاق اسدی سجستانی رحمہ اللہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب علم میں خراسان، مصر، عراق، شام وغیرہ کا سفر کیا۔ آپ نے علم حدیث امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کے شیوخ سے حاصل کیا۔ نمایاں اساتذہ کرام میں احمد بن حنبل، عثمان بن ابی شیبہ، قتیبہ بن سعید رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم ہیں۔ آپ کے تلامذہ راشدہ میں ان کے صاحبزادہ عبد اللہ، ابو عبد الرحمٰن النسائی، ابو علی اللؤلوی رحمہم اللہ تعالیٰ اور بہت سے دیگر اصحاب ہیں۔ آپ اپنی کتاب "سنن ابی داود" پانچ لاکھ احادیث کا مجموعہ لکھ کر اس سے پھر چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) احادیث منتخب کر کے تدوین کی۔ جس میں صرف احادیث صحیحہ کو اکٹھا کیا اور اس پر علماء امت نے اتفاق بھی کیا۔ آپ رحمہ اللہ اعلیٰ درجہ کے محدث، فقیہ، امام اور متقی انسان تھے۔ آپ نے بصرہ میں ۱۴ر شوال ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ (۲)

---

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: اسماء الرجال پر کتب

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن خلکان: وفیات الاعیان

امام ترمذی رحمہ اللہ

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی السلمی رحمہ اللہ آپ نے ۲۲۰ (دو سو) ہجری میں ترمذ —— بلخ کے نزدیک دریائے جیحون سے متصل —— میں ولادت پائی۔ اپنے زمانہ کے ممتاز محدثین اور اساتذہ حدیث سے اکتساب علم حدیث کی۔ مشہور اساتذہ کرام میں قیبہ بن سعید، محمد بن بشار، علامہ علی بن حجر رحمہم اللہ تعالیٰ وغیر ہم شامل ہیں۔ آپ نے حجاز، عراق اور خراسان کا تعلیمی اور علمی سفر اختیار کیا۔ آپ نے الجامع الترمذی، شمائل الترمذی تصنیف کیں جنہیں امت مسلمہ کے علماء اسلام نے سر آنکھوں پر لیا۔ جامع الترمذی صحاح ستہ میں شامل ہے بلکہ دینی مدارس کے نصاب میں ترجیحی بنیاد پر شامل ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نہایت عابد، متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ اللہ کریم کے خوف سے روتے روتے ان کی آنکھیں چلی گئیں۔ آپ نے ترمذ میں ہی دس رجب ۲۷۵ھ یا ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ [۱]

امام نسائی رحمہ اللہ

ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر النسائی الخراسانی رحمہ اللہ ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قتیبہ بن سعید، علی بن خشرم، اسحاق بن ابراہیم، محمد بن بشار، ابوداود سجستانی، ابن راہویہ وغیر ہم رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے حجاز، عراق، شام، خراسان اور جزیرہ کا سفر کیا۔ آخر میں مصر میں مقیم ہو گئے آپ کے طلبہ میں امام طبرانی رحمہ اللہ اور ابن رشیق رحمہ اللہ شامل ہیں۔ آخر عمر میں آپ حج کی غرض سے آپ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور یہیں ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ صفا و مروہ کے درمیان آخری آرام گاہ پائی۔ [۲]

---

(۱) دیکھیے اسماء الرجال پر کتب: ابن خلکان: وفیات الاعیان

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: ولی الدین خطیب رحمہ اللہ تعالیٰ، مشکوۃ المصابیح کے ذیل میں الکمال فی اسماء الرجال، ابن خلکان وفیات الاعیان

امام ابن ماجہ رحمہ اللہ

ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی رحمہ اللہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تحصیل علم کے لیے بغداد عراق، شام، کوفہ، بصرہ، مصر وغیرہا کا سفر کر کے وہاں کے مشاہیر علماء حدیث و فقہ سے اکتساب علم کیا۔ نامور اساتذہ کرام میں محمد بن عبداللہ بن نمیر، ابراہیم بن منذر، عبداللہ بن معاویہ رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ آپ کی ''سنن ابن ماجہ'' صحاح ستہ میں شامل ہے، اس ''سنن'' میں ۳۲ کتب، ۱۵۰ ابواب اور چار ہزار (۴۰۰۰) احادیث ہیں۔ اس ''سنن'' کے علاوہ آپ نے قرآن کریم کی ''تفسیر حافل'' اور ''تاریخ کامل'' لکھیں۔ آپ کے طلبہ حدیث میں بڑے کبار علماء حدیث و فن شامل ہیں مثلاً ابن سیبویہ، محمد بن عیسیٰ الصغار، اسحاق بن محمد اور علی بن ابراہیم رحمہم اللہ تعالیٰ۔ آپ نے رمضان ۲۷۳ھ میں وفات پائی، اس وقت عمر ۶۴ سال تھی۔ (۱)

امام بیہقی رحمہ اللہ

احمد بن حسین بن علی ابو بکر البیہقی رحمہ اللہ پانچویں صدی ہجری کے کبار علماء امت میں سے نامور محدث، فقیہ اور مصنف گزرے ہیں آپ رحمہ اللہ نے بہق (نزد نیشاپور) کے صدر مقام خسرو جرد میں ۳۸۴ھ میں ولادت پائی۔ بڑے ہو کر خراسان کے جید علماء حدیث سے اکتساب علم کیا، پھر بغداد، کوفہ اور دیگر کئی علمی مراکز میں جا کر علم حاصل کیا۔ مشہور اساتذہ کرام میں امام حاکم (صاحب مستدرک) ابن فورک، شیخ الاسلام عبداللہ انصاری رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے حدیث، فضائل صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور مواعظ میں بہت عمدہ تصانیف کی ہیں، جن میں کتاب الاسماء والصفات (ذات و صفات باری تعالیٰ سے متعلق احادیث) کتاب السنن والاثار، کتاب جامع المصنف فی شعب الایمان، دلائل النبوۃ مشہور ہیں۔

(۱) دیکھئے: ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ: ۵۲/۱

مگر ان کی نیک نامی اور قابلیت کو ہمیشہ باقی رکھنے کے لیے "السنن الکبری" کا ہونا ہی کافی ہے یہ کتاب دائرۃ المعارف الاسلامیۃ، حیدر آباد، ہند نے شائع کی تھی۔ آپ نے بیہق میں ہی ۱۰ جمادی الاول ۴۵۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر دنیا کو چھوڑ دیا۔ رحمہ اللہ [۱]

امام الطبرانی رحمہ اللہ

سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی الشامی رحمہ اللہ کا کبار علماء حدیث اور محدثین میں شمار ہوتا ہے، اصل میں شام کے علاقہ طبریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لہذا طبرانی کہلائے۔ آپ نے ۲۶۰ھ میں ولادت پائی اور تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں حصولِ علم حدیث میں لگ گئے۔ شام، حرمین شریفین، یمن، مصر، بغداد، کوفہ، بصرہ، اصفہان اور جزیرہ کا تعلیمی سفر کیا اور تقریباً تیرہ ہزار (۱۳۰۰۰) محدثین سے احادیث سنیں۔ نہایت ذہین اور اعلیٰ درجہ کا حافظہ رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں المعجم الصغیر، تفسیر میں آپ کی کتب الاوائل، دلائل النبوۃ مشہور ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے اصفہان میں ایک سو سال دس ماہ کی عمر میں ۳۶۰ (تین سو ساٹھ) ہجری میں وفات پائی۔ [۲]

امام الدارمی رحمہ اللہ

عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن فضل بن بہرام التمیمی الدارمی السمرقندی رحمہ اللہ کبار علماء حدیث اور آئمہ محدثین میں سے ہیں۔ ۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچے تو طلب علم میں لگ گئے۔ امام نضر بن شمیل، ابو عاصم اور ابو نضر ہاشم رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا۔ آپ رحمہ اللہ سے احادیث کی سماعت کرنے والوں میں صحاح

---

(۱) برائے تفصیل دیکھیں: ولی الدین الخطیب: مشکاۃ کے اسماء الرجال میں البیہقی رحمہ اللہ ——— ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۱/۷۵، ۷۶ ——— علامہ الزرکلی: الاعلام، ۱/۱۱۳

(۲) ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ: مشکاۃ المصابیح کا اسماء الرجال، تذکرہ الطبرانی رحمہ اللہ تعالیٰ ——— ابن خلکان: وفیات الاعیان، ۲/۲۹۷

ستہ کے مصنفین امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اساطین علم و فضل شامل ہیں۔ نہایت متقی، عابد، زاہد عاقل تھے۔ آپ کو ایک مرتبہ سمر قند کا قاضی بنایا گیا۔ ایک روز عدالت میں گئے ایک فیصلہ سنایا اور استعفیٰ دے کر واپس گھر چلے گئے۔ آپ کی بیش قیمت تصنیفات میں تفسیر جامع اور مسند شامل ہیں، صحیح مسلم میں آپ سے ۱۷ (سترہ) احادیث مروی ہیں۔ آپ رحمہ اللہ نے ۲۵۵ھ یوم ترویہ کو وفات پائی۔ (۱)

الدارقطنی رحمہ اللہ

علی بن عمر بن احمد البغدادی الدارقطنی رحمہ اللہ بغداد کے مشہور محلہ دارقطن میں ۳۰۶ھ میں متولد ہوئے۔ جلیل القدر عظیم المرتبت محدث ہونے کے علاوہ فقیہ، قاری، مفسر اور شاعر تھے۔ آپ کے اساتذہ کرام میں امام ابن بہلول، ابن صادر اور ابن درید رحمہم اللہ تعالیٰ حدیث میں، علامہ ابو سعید الاصطغری شافعی فقہ میں اور قرأت میں محمد بن حسن النقاش، ابو سعید القراز اور محمد طبری رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔ آپ کے تلامذہ میں امام حاکم، ابو نعیم اصفہانی، برقانی اور ابو حامد اسفرائنی رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے اکابر ائمہ شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں سے "سنن دارقطنی" اور "کتاب العلل" مشہور ہیں۔ آپ نے ذی القعدہ ۳۵۸ھ میں وفات پائی۔ (۲)

امام ابو یعلی رحمہ اللہ

احمد بن علی بن المثنی التمیمی الموصلی ابو یعلی رحمہ اللہ موصل میں ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

---

(۱) دیکھئے: ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ: مشکوۃ المصابیح کا ذیل الکمال فی اسماء الرجال، تذکرہ الدارمی رحمہ اللہ تعالیٰ

(۲) دیکھئے: امام ذہبی: تذکرہ الحفاظ، تذکرہ الدار قطنی —— الکمال فی اسماء الرجال از ولی الدین الخطیب رحمہ اللہ تعالیٰ ترجمہ الدارمی رحمہ اللہ تعالیٰ

بغداد پہنچ کر احمد بن حاتم الطویل، یحییٰ بن معین اور علی بن الجعد رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے فضلاء روزگار سے فیض حاصل کیا۔ آپ کی "المسند" پر جامعہ اسلامیہ المدینۃ المنورہ میں تحقیقی کام ہوا ہے۔ امید ہے اللہ کریم نے اشاعت کے وسائل مہیا فرما دیئے ہوں گے۔ آپ رحمہ اللہ نے ۳۰۷ھ میں وفات پائی۔ (۱)

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ

امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ العبسی الکوفی رحمہ اللہ ۱۵۹ ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ عالم، حافظ حدیث اور مفسر تھے۔ آپ کی مفید کتب میں مشہور "المسند"، "المصنف" اور "التفسیر" ہیں۔ آپ کا شمار سات اقطاب حدیث (یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما، امام علقمہ، امام ابراہیم نخعی، منصور بن معتمر، امام سفیان ثوری، امام وکیع بن الجراح اور ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہم اللہ) میں ہوتا ہے۔ آپ نے امام یحییٰ قطان، امام وکیع بن الجراح، امام ابن عیینہ، ابوداود طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عفان الصغار، ابواحمد الزبیری، یزید بن ہارون اور یحییٰ بن آدم قرشی رحمہم اللہ تعالیٰ سے علم حدیث و فقہ کی تعلیم پائی۔ آپ کے شاگردان میں امام احمد بن حنبل، صحاح ستہ کے مصنفین (سوائے امام نسائی اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ) ابو زرعہ، ابو حاتم وغیرہم ایسے کبار علماء و محدثین اور فقہاء کرام شامل ہیں۔ ۲۳۵ھ میں وفات پائی۔ (۲)

امام الہیثمی رحمہ اللہ

امام علی بن ابی بکر بن سلیمان بن ابی بکر بن عمر بن صالح نورالدین ابوالحسن

---

(۱) دیکھئے: ابن کثیر: البدایة والنهایة ۱۱/۱۳۰، فؤاد سزکین: تاریخ التراث العربی (ترجمه ذفهمی مجازی اور ذفهی ابوالفضل) مطبوعه قاهرة ۱۹۷۷ھ، ۱/۲۷۱

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: دیباچه المصنف ابن ابی شیبه، تحقیق محمد عوامه، تهذیب الکمال: ۱۶/۳٤ ـــــ ابن عدی: الکامل، ۱/۱۳۸. تهذیب التهذیب: ۹/۷۸

الہیثمی رحمہ اللہ نے رجب المرجب ۷۳۵ھ کو قاہرہ میں ایک دکاندار کے گھر ولادت پائی۔ آپ نے قرآن مجید پڑھ کر شیخ زین الدین عراقی رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کی، ان کے ساتھ قاہرہ، حرمین شریفین، بیت المقدس، دمشق، بعلبک، حلب، طرابلس اور حماۃ وغیرہ کا علمی اور سیاحتی سفر کیا۔ (آپ اپنے) استاد محترم شیخ زین الدین رحمہ اللہ کے معتمد، مؤدب اور محب تھے۔ استاد رحمہ اللہ نے اپنی فاضلہ بیٹی خدیجہ رحمۃ اللہ علیہا کا آپ رحمہ اللہ سے نکاح کر دیا۔ آپ کی اولادیں بھی ہوئیں۔ آپ نے اپنے استاد گرامی کی تمام کتابوں کو مدون کیا۔ اور انہیں اپنی مشہور کتاب "مجمع الزوائد و منبع الفوائد" میں جمع کیا۔ علماء حدیث کے مطابق "مجمع الزوائد و منبع الفوائد" طبرانی، مسند احمد، البزار، مسند ابی یعلی تمام کتب احادیث کا مجموعہ ہے۔ آپ نہایت قوی الحافظہ، حاضر جواب، متکلم، محدث اور فقیہ تھے۔ نہایت زاہد، عبادت گزار، متواضع، اہل علم (بالخصوص اپنے استاد محترم رحمہ اللہ) سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنے والے تھے۔ منکرات پر خاموش نہیں رہتے تھے۔ آپ نے منگل کی رات (لیلۃ الثلاثاء) ۲۹ رمضان المبارک ۸۰۷ھ کو قاہرہ میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔ (۱)



(۱) برائے تفصیل دیکھیں: علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ: تذکرۃ الحفاظ (ذیول) ترجمہ الهیثمی رحمہ اللہ تعالیٰ ـــــ مجمع الزوائد منبع الفوائد ج ۱ ابتدایہ بعنوان: "کلمة عن حیات المؤلف". شذرات الذهب

ضمیمہ ——— ②

مختلف اموال زکاۃ کی شرح زکاۃ

سونے کی زکوٰۃ:

- نصاب: ۲۰ مثقال = ۸۵ گرام
(پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے اوزان میں ساڑھے سات تولہ)
- شرح: ۲½ فی صد
- شرط: سال کا پورا ہونا۔

چاندی کی زکوٰۃ:

- نصاب: ۲۰۰ درہم = ۵۹۵ گرام
(پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے اوزان میں ساڑھے باون تولہ)
- شرط: سال کا پورا ہونا

زرعی پیداوار کی زکوٰۃ (عشر):

- نصاب: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مطابق زمینی پیداوار کی ہر مقدار کم و بیش پر زکوٰۃ (عشر) واجب ہے۔

البتہ صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ) اور فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے مطابق زمینی پیداوار کی مقدار ۵ وسق ہو تو زکاۃ (عشر) واجب ہوگی۔ ۵ وسق = ۳۰۰ صاع = ۶۵۳ کیلو گرام۔

- شرح: ① عشر (۱۰٪ دس فیصد) بارش کے ذریعہ سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار میں۔

②نصف عشر (۵٪ ۵ فیصد) آلات کے ذریعہ یا محنت کر کے اور خرچ برداشت کر کے آبپاشی کرنے کی صورت میں۔

-وجوب کا وقت: فصل کٹنے اور برداشت کرنے کے دن یا پھل وغیرہ توڑنے یا اکٹھا کرنے کے دن۔

سائمہ مواشی کی زکوٰۃ:

①اونٹ:

-نصاب: ۵ اونٹ

-شرح: ۵ تا ۹ اونٹوں پر ایک بکری

۱۰ تا ۱۴ اونٹوں پر دو بکریاں

۱۵ تا ۱۹ اونٹوں پر تین بکریاں

۲۰ تا ۲۴ اونٹوں پر چار بکریاں

۲۵ تا ۳۴ اونٹوں پر ایک بنت مخاض (اونٹنی جو اپنی عمر کے دوسرے سال میں ہو)

۳۵ تا ۴۵ اونٹوں پر ایک بنت لبون (اونٹنی جو اپنی عمر کے تیسرے سال میں ہو)

۴۶ تا ۶۰ اونٹوں پر ایک حقہ (اونٹنی جو اپنی عمر کے چوتھے سال میں ہو)

۶۱ تا ۷۵ اونٹوں پر ایک جذعہ (اونٹنی جو اپنی عمر کے پانچویں سال میں ہو)

۷۶ تا ۹۰ اونٹوں پر دو بنت لبون

۹۱ تا ۱۲۰ اونٹوں پر دو حقہ

۱۲۱ تا ۱۴۴ اونٹوں پر بحساب ہر ۵ اونٹ پر ایک بکری ۱۲۰ اونٹوں کے بعد

۱۴۵ تا ۱۴۹ اونٹوں پر دو حقہ اور ایک بنت مخاض

۱۵۰ اونٹوں پر تین حقہ

۱۵۱ تا ۱۷۴ اونٹوں پر تین حقہ ایک بکری (بحساب ہر ۵ ویں اونٹ پر ۱۵۰ اونٹوں کے بعد)

۱۷۵ تا ۱۸۵ اونٹوں پر تین حقہ اور ایک بنت لبون۔

۱۸۶ تا ۲۰۰ اونٹوں پر چار حقہ یا اگر صاحب مال چاہے تو وہ پانچ (۵) بنت لبون بھی دے سکتا ہے۔

(۲) بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ:

بھیڑ بکری دونوں کو زکوٰۃ کے مسئلہ میں ایک ہی جنس تسلیم کیا گیا ہے۔ لہذا دونوں مل کر بھی ایک نصاب بن سکتی ہیں۔ شرح کی مقدار یوں ہوگی۔

۳۹ بکریوں بھیڑوں پر زکاۃ نہیں ہوگی۔

۴۰ تا ۱۲۰ بکریوں (بھیڑوں) پر ایک بکری، بھیڑ بطور زکوٰۃ۔

۱۲۱ تا ۲۰۰ بکریوں (بھیڑوں) پر دو بکریاں، بھیڑیں۔

۲۰۱ تا ۳۹۹ بکریوں (بھیڑوں) پر تین بکریاں، بھیڑیں۔

۴۰۰ تا ۴۹۹ بکریوں (بھیڑوں) پر چار بکریاں، بھیڑیں۔

۵۰۰ تا ۵۹۹ بکریوں (بھیڑوں) پر پانچ بکریاں، بھیڑیں۔

۶۰۰ ـــــ بکریوں پر چھ بکریاں، بھیڑیں۔

(۳) گائے کی زکاۃ:

-نصاب: ۳۰ گائیں (مشہور قول کے مطابق)

-شرح: ۳۰ تا ۳۹ گایوں پر ایک سالہ بچھڑا یا بچھڑی۔

۴۰ تا ۵۹ گایوں پر دو سالہ بچھڑا یا بچھڑی۔

۶۰ تا ۶۹ گایوں پر ایک سالہ دو بچھڑے۔

۷۰ تا ۷۹ گایوں پر ایک سالہ بچھڑا اور ایک دو سالہ بچھڑا۔

۸۰ تا ۸۹ گایوں پر دو بچھڑے دو سالہ۔

۹۰ تا ۹۹ گایوں پر تین بچھڑے ایک سالہ۔

۱۰۰ ـــــ گایوں پر ایک دو سالہ اور دو ایک سالہ بچھڑے۔

-شرط: تمام قسم کے مواشی کی ملکیت پر ایک سال کا پورا ہونا۔

اموالِ تجارت کی زکوٰۃ:

- نصاب: مال کی اتنی مقدار جس کی قیمت نقدی کے نصاب کے بقدر ہو۔
- شرح: ۲½ فی صد
- شرط: سال کا پورا ہونا

زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ: سال مکمل ہو جانے پر اموال تجارت کی قیمت بازار کے تھوک بھاؤ سے لگائی جائے اور اس میں نقد سرمایہ اور متوقع وصول طلب قرضوں کی رقم شامل کر دی جائے اس مجموعی رقم میں سے واجب الادا قرضوں کی رقم وضع کرنے کے بعد جو رقم بچ جائے اس پر ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

صدقۂ فطر کی مقدار:

ایک صاع = ۲۱۷۶ گرام (۲ کیلو ایک سو چھہتر گرام)



ضمیمہ ——— ③

اسلامی اوزان و پیمانے

(Islamic Weights & Measures)

اوزان	پیمانے
درہم	۲ء۹۷۵ گرام
دینار	ایک مثقال = ۴ء۲۵ گرام
مثقال	۴ء۲۵ گرام
۲۰ مثقال	۸۵ گرام (۷½ تولہ پاک، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے وزن کے مط
اوقیہ	۴۰ درہم = ۱۱۹ گرام
مد	۱½ رطل
مدی	۱۴۰ رطال
رطل	۱۲ اوقیہ ۹۰ مثقال
قسط	۸ ارطال (جمع رطل) = ½ صاع = ۱ء۸۸ کیلو گرام
صاع	۲ء۱۷۶ کیلو گرام
ارداب (مصری)	۲۴ صاع = ۵۲ء۲۲۴ کیلو گرام
وسق	۶۰ صاع = ۱۳۰ء۵۶۰ کیلو گرام
۵ وسق	۳۰۰ صاع = ۶۵۳ کیلو گرام
جریب	۴ قفیز = ۵۲ء۲۲۴ کیلو گرام

قفیز	٦ صاع = ۱۳٫۰۵٦ کیلو گرام
کیلاجا	غیلون (Gallon) = ½۱ صاع = ۲٫۸۲ کیلو گرام
ذراع (مکی)	۱۸۷٫۵۸ سینٹی میٹر
ذراع (دمشقی)	۲۰۳٫۲۱ سم تقریباً (ذراع دمشقی مدینہ منورہ کا پیمانہ تھا)

شرح اوران کا اختلاف:

(الف) مذکورہ بالا شرعی اوزان کے متبادل تقریباً متفق علیہا ہیں مگر بعض محققین مختلف متبادل بھی لاتے ہیں مثلاً:

مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف (King Fahd Complex for the prenting of the Holy Quran) سے شائع شدہ قرآن کریم کی انگریزی ترجمہ (The Holy Quran) کی مسرد (Glossory) میں ان شرعی اور ان کی شرح تبادلہ (Rate of Exchange) مختلف ہے مثلاً:

❶ درہم = ½۱۲ اوقیہ = ۲٫۴۸ گرام (تقریباً)

❷ وسق ٦۰ صاع = ۱۳۵ کیلو گرام (تقریباً)

❸ صاع = ۴ مد = ۳ کیلو گرام (تقریباً)

(ب) اسی قرآن مجید کی مسرد (Glossory) کے مطابق چند مزید اوزان کی شرح تبادلہ:

❶ قیراط = ½ دانق = ۰٫۲۴۹ گرام (تقریباً)

❷ دانق = ⅙ درہم = ۰٫۴۹۹ گرام (تقریباً)

(ج) علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق چند اوزان کی شرح تبادلہ:

❶ جریب = ۲۵ سیر

❷ اردب (مصری) = ۲ من (۸۰ سیر)

(ملاحظہ ہو "الفاروق" عنوان: بیت المال کا خیال)

(د) ایک اور تحقیق کے مطابق اوزان کی شرح تبادلہ:

❶ ۲۰ مثقال یا ½۷ تولہ = ۸۷ء۴۷۹ گرام (سونے کا نصاب)

❷ ۲۰۰ درہم یا ½۵۲ تولہ = ۶۱۲ء۳۵ گرام (چاندی کا نصاب)

❸ ۵ اَوسق = ۶۷۳ء۵ کیلو گرام

(ضرب مومن، زکوٰۃ و عشر کے مسائل، مطبوعہ دارالافتاء والارشاد، ناظم آباد، کراچی ۱۴۲۵ھ)

نوٹ: پہلی جدول میں دی گئی شرح تبادلہ اور اس جدول میں مذکور شرح تبادلہ کا فرق معمولی ہے زیادہ پریشانی کا معاملہ نہیں، البتہ علم کے لیے ان کا تذکرہ ضروری تھا۔



مصادر و مراجع

نوٹ: ❶ "اسلام کا اقتصادی" کی تیاری میں جن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ وہ دو حصوں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں ایک وہ جنہیں فاضل مصنف رحمہ اللہ نے دوران تدوین کتاب زیر مطالعہ رکھا، دوسرے وہ جنہیں احقر مرتب نے ضروری اضافوں کے لیے پڑھا اور ان سے مدد لی۔ اس طرح کتاب کے مصادر و مراجع کی ایک طویل فہرست ہے، جو اس قسم کی علمی و تحقیقی کتاب کے لیے ضروری بھی تھی۔

❷ احقر نے قارئین کرام کی آسانی کے لیے ان مصادر کتاب کو مختلف مضامین کی وجہ سے الگ الگ عنوانات کے تحت لکھ دیا ہے، البتہ مصنفین کتب کے اسماء گرامی میں حروف تہجی کی رعایت نہیں رکھی گئی، اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

❸ یہ فہرست تقریبا ان ماخذوں کی ہے، جن کے حوالہ جات اس کتاب میں دیئے گئے ہیں۔

(الف) تفسیر قرآن کریم و متعلقات تفسیر

- ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱ھ - ۷۷۴ھ): تفسیر القرآن العظیم مشہور بہ تفسیر ابن کثیر۔
- ابن حبان، محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حبان اندلسی غرناطی رحمہ اللہ: البحر المحیط
- آلوسی، علامہ محمود شکری آلوسی رحمہ اللہ: روح المعانی
- آزاد، مولانا احمد ابوالکلام رحمہ اللہ: ترجمان القرآن، لاہور
- زمخشری، قاسم بن محمود بن عمر جار اللہ زمخشری خوارزمی رحمہ اللہ: الکشاف، مطبوعہ مصر ۱۳۵۴ھ
- الشوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمہ اللہ: فتح القدیر
- مولانا تھانوی، محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ: بیان القرآن

- طبری رحمہ اللہ، علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن مشہور بہ تفسیر طبری
- علامہ رشید رضا رحمہ اللہ: تفسیر المنار، مطبوعہ بیروت
- قرطبی، عبد اللہ محمد بن احمد رحمہ اللہ: الجامع لاحکام القرآن
- امام جصاص، ابوبکر احمد ابن علی الجصاص الرازی رحمہ اللہ: احکام القرآن
- صارم، مولانا عبد الصمد صارم الازہری رحمہ اللہ: تاریخ التفسیر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۹ء

(ب) حدیث و متعلقات حدیث

- بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ: الجامع الصحیح، صحیح بخاری
- مسلم، ابوالحسن مسلم بن حجاج القشیری نیشاپوری رحمہ اللہ: صحیح مسلم
- ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی رحمہ اللہ: جامع ترمذی
- ابوداد، سلیمان بن اشعث سجستانی رحمہ اللہ: سنن ابی داود
- نسائی، قاضی احمد بن شعیب بن علی نسائی رحمہ اللہ: سنن نسائی
- ابن ماجہ، علامہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی رحمہ اللہ: سنن ابن ماجہ
- مالک، امام مالک بن انس بن مالک اصبحی رحمہ اللہ: موطا
- ابن حنبل، ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی رحمہ اللہ: مسند احمد، تحقیق احمد شاکر ۱۵ اجزاء مطبوعہ قاہرۃ، ۱۹۵۹ء
- نووی، امام ابوبکر یحییٰ بن اشرف النووی رحمہ اللہ: ریاض الصالحین
- البیہقی، ابوبکر احمد بن حسین البیہقی رحمہ اللہ: السنن الکبری
- بغوی و تبریزی، علامہ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی رحمہ اللہ، شیخ ولی الدین محمد خطیب تبریزی رحمہ اللہ، مشکوۃ المصابیح
- ابن قیم، علامہ شمس الدین بن قیم جوزیہ رحمہ اللہ: زاد المعاد
- ابن قیم جوزیہ: اعلام المعوقین عن رب العالمین
- برہان پوری، علامہ علاؤالدین علی المتقی بن حسام الدین برہان پوری رحمہ اللہ: کنز العمال
- حاکم، ابو عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری رحمہ اللہ: المستدرک

- امام محمد، محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ: موطا، مع التعلیق المجد از مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ، مطبع مجتبائی، لاہور، پاکستان
- ابن حجر، علامہ حافظ احمد بن علی محمد ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: فتح الباری، مطبوعہ قاہرۃ ۱۹۵۹م
- ــــــ نخبۃ الفکر فی اصول الحدیث
- علامہ عینی، بدرالدین ابو محمود بن احمد العینی رحمہ اللہ: عمدۃ القاری (شرح صحیح بخاری)
- الہیثمی، نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی رحمہ اللہ: مجمع الزوائد و منبع الفوائد، مطبوعہ مکتبہ القدسی، قاہرۃ، ۱۳۵۲ء
- ابو یعلی، احمد بن علی ابو یعلی التمیمی رحمہ اللہ: مسند (از الجامع الصغیر) مکتبہ شہید علی باشا رحمہ اللہ شمارہ ۵۶۴، استنبول، ترکی (مخطوطہ)
- طبرانی رحمہ اللہ: المعجم الاوسط، مکتبہ قرۃ جلبی زادہ، شمارہ ۷۲، ۷۳ مخطوطہ، استنبول، ترکی
- علامہ خطابی رحمہ اللہ: احمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب ابو سلیمان: معالم السنن (شرح سنن ابی داود) ۸ اجزاء، تحقیق محمد حامد فقی، مطبوعہ قاہرۃ، ۱۹۴۸، ۱۹۴۹
- علامہ کشمیری، سید محمد انور شاہ مولانا کشمیری رحمہ اللہ: العرف الشذی شرح جامع الترمذی
- ابن ابی شیبہ، عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) مصنف، مکتبہ مدینہ شمارہ نمبر ۳۳۳، ۳۳۴ استنبول، ترکی
- الدارقطنی، حافظ علی بن عمر الدارقطنی رحمہ اللہ: السنن، مطبع انصاری، دہلی
- الاعظمی، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی: دراسات فی الحدیث النبوی و تاریخ تدوینہ، مطبوعہ ریاض، سعودی عرب
- ناشف، شیخ منصور علی ناشف رحمہ اللہ: التاج الجامع الاصول
- الجزری، فخرالدین ابن الاثیر الجزری رحمہ اللہ: النہایۃ فی غریب الحدیث، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء
- اصبہانی، علامہ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی رحمہ اللہ (م ۴۳۰ھ) حلیۃ الاولیاء فی الحدیث

- السباعی، استاذ مصطفیٰ السباعی رحمہ اللہ: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، قاہرۃ، ۱۳۸۰ھ

فقہ و متعلقات فقہ

- مرغینانی، برہان الدین مرغینانی رحمہ اللہ: الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدی، مطبع خیریہ، قاہرۃ ۱۳۲۶ھ، ۱۳۲۷ھ
- سرخسی، ابوبکر محمد ابن شمس الدین ابی سہل شمس الائمۃ رحمہ اللہ: المبسوط شرح الکافی، مطبوعہ مصر ۱۳۳۱ھ
- الکاسانی، علاؤ الدین الکاسانی رحمہ اللہ: بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مصر ۱۳۲۷ھ، ۱۳۲۸ھ
- الحصکفی، محمد علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: الدر المختار شرح تنویر الابصار، مطبوعہ مصر
- نسفی، حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ ابن احمد ابن محمود النسفی رحمہ اللہ: کنز الدقائق
- ابن عابدین، محمد امین ابن عابدین ابن عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ: رد المختار، دار السعادۃ، قاہرۃ، ۱۳۲۴ھ
- ابن نجیم، زین العابدین ابن نجیم رحمہ اللہ: بحر الرائق شرح کنز الدقائق، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۴ھ
- قاضی خان، علامہ فخر الدین حسن بن محمود اوز جندی رحمہ اللہ: فتاویٰ قاضی خان، کلکتہ ۱۳۴۳ھ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری
- عالمگیر، محی الدین اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ: فتاویٰ عالمگیریہ، فتاویٰ ہندیۃ
- حنفی، سید علی زادہ حنفی رحمہ اللہ: شرح شرعۃ الاسلام
- فتاویٰ عزیزی، مطبع مجتبائی، دہلی
- امام مالک بن انس رحمہ اللہ: المدونۃ الکبری (بروایت سحنون رحمہ اللہ) مطبع السعادۃ، قاہرۃ، ۱۳۲۳ھ
- ابن رشد الحفید رحمہ اللہ: کتاب المقدمات والمہدات علی المدونۃ الکبری
- ــــــ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد (المقتصد) مطبوعہ قاہرہ
- امام شافعی، امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ: کتاب الام، بولاق، قاہرۃ، ۱۳۲۵ھ

- ابن قدامہ، موفق الدین ابن قدامۃ رحمہ اللہ: کتاب المغنی، مطبع المنار، طبع دوم
- ابن حزم، محمد بن علی ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ: المحلی
- الشوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمہ اللہ: نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، مطبع حلبی، قاہرۃ ۱۳۴۸ھ
- الجزیری، عبدالرحمٰن الجزیری رحمہ اللہ: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ
- خضری، علامہ محمد خضری بے: تاریخ التشریع الاسلامی، مطبعۃ دار احیاء الکتب العربیۃ، قاہرۃ، ۱۹۳۶ء
- محمصانی، ڈاکٹر صبحی رجب محمصانی رحمہ اللہ: فلسفۃ التشریع فی الاسلام، مطبوعہ بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۶۱ء
- شیخ الہند، مولانا محمود الحسن شیخ الہند رحمہ اللہ: ایضاع الادلۃ، مطبوعہ ایچ، ایم، سعید کمپنی، کراچی ۱۴۰۷ھ

اسلامی معاشیات و عام معاشیات و متعلقات

- ابو یوسف، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری رحمہ اللہ: کتاب الخراج، مکتبہ العلمیہ، لیک روڈ، لاہور
- القرشی، امام یحیٰی ابن آدم القرشی رحمہ اللہ: کتاب الخراج، مطبوعہ لیدن ۱۹۵۸ء
- ابو عبید، ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ: کتاب الاموال، تحقیق محمد حامد فقی، مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ
- ابن زنجویۃ، حمید ابن زنجویہ رحمہ اللہ: کتاب الاموال، مطبوعہ مرکز الملک فیصل للدراسات الاسلامیہ، ریاض
- ڈاکٹر محمد یوسف الدین رحمہ اللہ: اسلام کے معاشی نظریے، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد (ہند)، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء
- ڈاکٹر غفاری، نور محمد: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــــ اسلام کا معاشی نظام، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی

- ـــــ اسلام کا نظام تکافل اجتماعی، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــ اسلام کا قانون تجارت، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــ اسلام کا قانون محاصل، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- ـــــ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کمزوروں اور غریبوں کے وکیل، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی کراچی
- البغدادی، محمد بن حبیب البغدادی رحمہ اللہ: المحبر، مطبوعہ حیدرآباد (ہند)، ۱۳۶۱ھ
- تھانیسری، مولانا جلال الدین رحمہ اللہ: تحقیق آراضی ہند
- قریشی، ڈاکٹر انور اقبال قریشی رحمہ اللہ: اسلام اور سود، مکتبہ الھانیۃ، لاہور کینٹ، لاہور
- مقریزی، علامہ تقی الدین ابو محمد مقریزی رحمہ اللہ: النقود الاسلامیۃ المسمی شذوذ العقود فی ذکر النقود، مطبوعہ نجف، عراق
- نقشبندی، نصیر الدین محمود نقشبندی رحمہ اللہ: الدینار الاسلامی فی المتحف العراقی، مطبوعہ بغداد، عراق
- ذاکر حسین، ڈاکٹر (سابق صدر جمہوریہ ہند): معاشیات، مقصد و منہاج
- اصطخری، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی رحمہ اللہ: مسالک الممالک، مطبوعہ لیدن، ۱۸۷۰ء

معیشت و سیاست و اجتماع

- جوزیہ، علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ: الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشریعۃ، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۷ھ
- ابن قتیبہ، ابو محمد عبداللہ بن مسلم دینوری: الامامۃ والسیاسۃ، مطبوعہ مصر
- الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد ابن حبیب الماوردی رحمہ اللہ: الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ، مطبع محمودیہ، قاہرۃ، ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء
- کرد، محمد علی کرد رحمہ اللہ: الاسلام والحضارۃ العربیۃ، مطبوعہ قاہرہ
- ابن تیمیہ، تقی الدین ابو العباس احمد ابن تیمیہ رحمہ اللہ: السیاسۃ الشریعۃ، مطبوعہ مصر
- الحسبۃ فی الاسلام مطبوعہ، ریاض ۱۹۸۰ء
- حمید اللہ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ: الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی، مطبوعہ لجنۃ التالیف

والترجمة، قاہرہ، ۱۹۴۱ء

- علامہ طنطاوی: نظام العالم والامم
- کتانی، عبدالحیٔ کتانی: التراتیب الاداریة، اردو ترجمہ از رضی الدین فخری، دارالقرآن، کراچی ۱۹۹۱ء
- الفراء، قاضی ابویعلی الفراء: الاحکام السلطانیة، مطبوعہ بیروت، ۱۹۴۷ء
- ابوحامد غزالی: التبر المسبوک، مطبوعہ قاہرة
- ابومحمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام: قواعد الاحکام فی مصالح الانام، مطبوعہ قاہرة

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و تاریخ اسلام و تاریخ عالم

- ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابوالفدا اسماعیل بن عمر ابن کثیر رحمہ اللہ: الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موسسة علوم القرآن، دمشق، بیروت، دارالقلم، دمشق بیروت ۱۳۹۹ھ، ۱۴۰۰ھ
- البدایة والنہایة، ۱۴ اجزاء مطبوعہ قاہرۃ ۱۹۳۲ء
- ابن سعد، محمد ابن سعد کاتب الواقدی رحمہ اللہ: الطبقات الکبری، مطبوعہ بیروت، دار صادر ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء
- ابن جریر، علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ: تاریخ الامم والملوک معروف بہ تاریخ طبری، مطبوعہ لیدن،
- ابن ہشام، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ہشام رحمہ اللہ: السیرۃ النبویة، مطبوعہ مصر
- جزری، امام فخرالدین بن اثیر جزری رحمہ اللہ: الکامل فی التاریخ، دارالکتاب، بیروت ۱۹۸۳ء
- ابن اثیر، علامہ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد جزری ابن اثیر رحمہ اللہ: اسد الغابة فی معرفة الصحابة
- ابن حجر، علامہ احمد بن علی بن محمد المعروف بابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: اصابة فی تمیز الصحابة رحمہ اللہ تعالیٰ
- ابن عبدالبر، علامہ حافظ ابن عبدالبر المالکی الاندلسی رحمہ اللہ: الاستیعاب فی اسماء الاصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم، مطبعة نہضة، قاہرة

- بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری رحمہ اللہ: فتوح البلدان، مطبوعہ قاہرۃ، ۱۹۵۶ء
- ـــــ کتاب الاشراف، تحقیق محمد حمید اللہ قاہرۃ، ۱۹۵۹ء
- ابن جوزی، علامہ شمس الدین بن علی بن محمد الجوزی رحمہ اللہ: صفۃ الصفوۃ
- یاقوت حموی، امام شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت حموی رحمہ اللہ: معجم الادباء، مطبع رافع، قاہرۃ
- ...... معجم البلدان
- سیوطی، علامہ جلال الدین محمد بن احمد سیوطی رحمہ اللہ: حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ، مطبوعہ قاہرۃ
- ـــــ تاریخ الخلفاء
- محب طبری: الریاض النضرۃ فی فضائل العشرۃ، مکتبہ ندوۃ العلماء، لکھنو، ہند
- ابن عبدالحکم، ابو محمد عبداللہ ابن عبدالحکم رحمہ اللہ: سیرۃ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، قاہرۃ ۱۹۷۲ء، دمشق ۱۹۶۶ء
- محمد ابن طولون: اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین، مطبع القدسی، دمشق، شام
- ندوی، ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ: الرسول الأعظم صلی اللہ علیہ وسلم، لکھنو، ہند ۱۴۰۵ھ/۱۹۷۵ء
- شبلی نعمانی: الفاروق، مطبوعہ ملتان، پاکستان
- ہیکل، محمد حسین ہیکل رحمہ اللہ: الفاروق عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مطبوعہ قاہرہ
- ابن الوری، زین العابدین عمر ابن الوری رحمہ اللہ: تتمۃ المختصر فی اخبار البشر، مطبوعہ مصر
- مقریزی، علامہ تاج الدین احمد بن علی مقریزی رحمہ اللہ: الخطط والآثار
- یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب بن واضح الکاتب یعقوبی رحمہ اللہ: تاریخ، مطبوعہ نجف، عراق ۱۹۶۴ء
- ـــــ کتاب البلدان، مطبوعہ لیدن ۱۸۹۱ء
- ابن جوزی، جمال الدین ابن جوزی رحمہ اللہ: سیرۃ العمرین، مطبع رحمانیہ، قاہرہ
- ـــــ مناقب امام احمد بن حنبل، مطبوعہ قاہرۃ، ۱۳۹۴ھ

- السہمی، حمزہ بن یوسف السہمی رحمہ اللہ: تاریخ جرجان، مطبوعہ حیدر آباد، ہند، ۱۳۶۹ھ
- ابن ندیم: الفہرست، تحقیق فلو جل لیبزج، ۱۸۷۱ء
- الزرکلی، خیر الدین: الأعلام، مطبوعہ مکتبہ عربیۃ، دمشق
- ابن خلکان، احمد بن محمد بن ابوبکر خلکان رحمہ اللہ (م ۶۸۱ھ) وفیات الاعیان، تحقیق احسان عباس، دارالثقافۃ، بیروت
- اصبہانی، ابونعیم احمد بن عبد اللہ بن احمد اصبہانی رحمہ اللہ (م ۴۳۰ھ): حلیۃ الاولیاء
- فواد سزکین: تاریخ التراث العربی (عربی ترجمہ از ذہنی حجازی اور ذہنی ابوالفضل)، مطبوعہ الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، قاہرۃ، ۱۹۷۷ء
- حاجی خلیفہ (ملا کاتب جلبی) مولی مصطفی بن عبد اللہ قسطنطنی رومی حنفی رحمہ اللہ: کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء
- محمد بن یحییٰ بن ابی بکر رحمہ اللہ: التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان رحمہ اللہ، بیروت ۱۹۶۴ء
- ذہبی، علامہ حافظ شمس الدین ابو عبد اللہ الذہبی رحمہ اللہ: تاریخ الاسلام، مطبوعہ، مکتبۃ القدسی، قاہرۃ، ۱۳۶۸ء
- ـــــ تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد، (ہند)
- .... کتاب دول الاسلام فی التاریخ، حیدر آباد، ہند
- .... سیر اعلام النبلاء، دارالکتب الظاہریۃ، دمشق
- الفسوی، یعقوب بن سفیان الفسوی رحمہ اللہ: تاریخ، مکتبہ روان کشک، رقم ۱۵۵۴
- المزی، علامہ یوسف بن الزکی عبدالرحمٰن المزی رحمہ اللہ: تہذیب الکمال، دارالکتب المصریۃ، قاہرۃ
- ارشد، عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور
- ابن حزم رحمہ اللہ: طوق الحمامۃ، مطبوعہ مصر
- ابوزہرۃ، شیخ محمد ابوزہرۃ رحمہ اللہ: حیاۃ ابن حزم رحمہ اللہ، مطبوعہ مصر
- البعلبکی، منیر بعلبکی: المورد (انگلیزی عربی) جز معجم الاعلام
- شہرستانی رحمہ اللہ: الملل والنحل، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۷ھ، ۱۳۴۸ھ

- رضوی، سید محبوب: مکتوبات نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)، مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۵ء
- احمد شوقی، اشعر الشعراء، الھمزیۃ النبویۃ، مطبوعہ مصر و لاہور

مختلف علوم پر جامع کتب

- امام غزالی، امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی رحمہ اللہ: احیاء علوم الدین: مطبع عثمانیہ، مصر ۱۹۳۳ء
- شاہ ولی اللہ، شیخ الاسلام احمد ولی اللہ بن عبد الرحیم الدہلوی رحمہ اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، مطبوعہ مصر
- ابن قتیبہ، ابو محمد عبد اللہ بن مسلم دینوری رحمہ اللہ: کتاب المعارف، مطبع اسلامیہ، مصر، ۱۹۳۴م
- مصری، علی پاشا مصری رحمہ اللہ: خواطر فی القضاء والاقتصاد والاجتماع، مطبوعہ مصر
- وجدی، استاد محمد فرید وجدی رحمہ اللہ: دائرۃ المعارف القرن العشرین
- زبیدی، سید مرتضی زبیدی رحمہ اللہ: اتحاف السادۃ المتقین (شرح احیاء علوم الدین)
- سید قطب: العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، مطبوعہ مصر
- بستانی، معلم بطرس بستانی: دائرۃ المعارف، مطبوعہ ایران
- القرضاوی، الاستاذ محمد یوسف القرضاوی: الحلال والحرام فی الاسلام
- ـــــــ فقہ الزکاۃ

علمی مجلات و رسائل

- البلاغ (ماہوار)، دار العلوم کراچی، شمارہ نومبر ۱۹۸۸ء
- بحث و نظر (سہ ماہی)، پھلواری شریف، پٹنہ، ہند، شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء
- بینات (ماہوار)، جامعۃ اسلامیۃ بنوریۃ، بنوری ٹاؤن، کراچی، شمارہ ۳، جلد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ / مئی ۱۹۷۱ء
- رسالہ، جامع دہلی، شمارہ فروری ۱۹۳۹م
- ترجمان القرآن، جماعت اسلامی، اچھرہ لاہور، شمارہ و جلد ۳۳، تعداد ۱، ۲، ۳ ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء

- معارف فیچر سروس، اسلامک ریسرچ اکادمی، فیڈرل بی ایریا، کراچی
- منہاج (سہ ماہی) اسلامی معیشت نمبر شعبہ تحقیق، دیال سنگھ لائبریری، لاہور جلد ۱۰، ۱۹۹۲ء

دیگر مذاہب کی کتب

- انجیل، مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور ۱۹۵۶ء (British & Foreign Bible Society, Lahore, 1956)
- توراۃ، مطبوعہ، مذکورہ بالا سوسائٹی
- حنا، ڈاکٹر یوسف حنا نصر اللہ: الکنز المرصود فی قواعد التلمود
- سرسوتی، دیانند سرسوتی: منوشاستر
- آتوبا آشور آتوبا: ہندوستانی تمدن

BIBLIOGRAPHY

- Bosworth Smith, Mohammad and Mohammadanism, London, 1976.
- Cambridge History of Islam, Cambridge, 1970.
- Ghifari, Dr Noor Muhammad, Book an Finance (English Translation of Abu Ubdaid,s Kitab al – Amwal), National Hijrah Council, Islamabad, 1991.
- Encyclopaedia of Religion and Ethics, 1939.
- Hamidullah, Dr. Muhammad, Introduction to Islam, Dawah Academy, International Islamic University, Islamabad.
- Imran Ahsan Khan Nyazee, Islamic Jurisprudence, International Institute of Islamic Thought, Islamabad, 2000.
- Muir, Sir William, Annals of the Early Caliphate, London, 1882.
- Philp k. Hitti Dr; A Short History of the Arabs, London, 1965.
- Siddiqi, S. A. Public Finance In Islam, Lahore, 1968.
- The Federal Shariat Court, Pakistan, Select Judgements, 1992.
- Dr. S.M. Hasan- uz- Zaman, The Economic Functions of the Early Islamic State, International Islamic Publications, Nazimabad, Karachi, 1981.

مطبوعات شیخ الھند اکیڈمی کراچی

1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی (صدارتی ایوارڈ یافتہ)
مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

2) اسلام کا معاشی نظام — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

3) موجودہ نظام انشورنس اور اسلام کا نظام تکافل — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

4) تجارت کے اسلامی اصول وضوابط — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

5) حضرت ابوذر غفاریؓ — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

6) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مظلوم صحابہؓ — مصنف: پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

7) نیک اعمال کے فضائل، فوائد، ثمرات، برکات — حافظ ضیاء الدین المقدسی
ترجمہ وفوائد پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری

8) شہادت حضرت حسینؓ — امام الھند مولانا ابوالکلام آزادؒ

9) بکھرے موتی — مولانا محمد یونس پالنپوری

ادارۃ الانور
دوکان نمبر 2 انور مینشن
بالمقابل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵
فون: ۴۹۱۴۵۹۶_۴۹۱۹۶۷۳